رخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ

(پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ)

ترتیب

سید محمد اشرف مارہروی

ناشر

البرکات اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ

نام کتاب	:	رخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ
ترتیب	:	سید محمد اشرف مارہروی
سنۂ اشاعت	:	نومبر ۲۰۱۶ء
صفحات	:	۶۴۸
تعداد	:	
قیمت	:	

ناشر

البرکات اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ

پوسٹ ADF نزد جمال پور، ریلوے کراسنگ

انوپ شہر روڈ، علی گڑھ، PIN: 202122

abirtipublications@gmail.com

0571-6500603

انتساب

جگر گوشۂ رسول کریم

خاتونِ جنت، بتولِ زہرا

اُمِ ابیہا

سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا

کے

نام

سیدہ زاہرہ طیبہ طاہرہ

جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام

(سید محمد اشرفؔ)

فہرست مضامین

پیش لفظ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اہل سنت کی آواز کے خصوصی شماروں کا کتابوں میں تبدیل ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ الحمد للہ یہ تجربہ بہت کامیاب اور مفید رہا۔ ''عشرہ مبشرہ'' اور ''اہل بیت اطہار'' کو بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے افراد خاندان برکات کو یہ توفیق دی کہ اپنی حسب اوقات دین متین کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی شرکت درج کرائیں۔

آج تمام عالم اسلام کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ سیرت محمدی ﷺ اور حقیقت محمدی ﷺ کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ ضرورت دوسروں کو سمجھانے کی ہے۔ اس زمانے میں کچھ ناعاقبت اندیش نصرانی اور صیہونی طاقتیں اس مذہب کو سرنگوں کرنے کے لئے ہمارے نبی ﷺ کی ذات والا ہی کو نشانہ بنا رہی ہیں۔ وہ اس دانائے سبل مولائے کل کے بارے میں زبانیں دراز کررہے ہیں جس نے غبار راہ کو فروغ وادیٔ سینا عطا کیا۔ جس کو عالم وعالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ جو کائنات میں سب سے افضل سب سے بہتر ہے۔ جس کے ہونے میں اس کائنات کا ہونا مقصود ٹھہرا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ منصب رسالت پر رتی بھر انگلی اٹھانے جیسی ہر ایک مذموم کوشش کو ہر محاذ پر ناکام کیا جائے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ جب تمام عالم کو عملی اعتراف کرادیا جائے کہ مسلمان اپنے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ اور اس کا احسن طریقہ یہ ہے کہ سیرت طیبہ کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہر زبان میں کی جائے۔ کتب اور رسائل خصوصی طور پر سیرت پاک سے منتسب ہوں۔ اخبار، رسائل اور ماس میڈیا

اور جتنے بھی ذرائع ابلاغ ہیں ان کے ذریعہ یہ خبر تمام اسلام اور رسول دشمن طاقتوں کے درمیان عام کرائی جائے کہ مسلمان اپنے قلب وروح میں محبت رسول ﷺ کی وہ جلوہ سامانی رکھتا ہے کہ گستاخ عناصرین کی ہر مذموم کوشش مسلمانوں کے عرفان محمدی پر نیا باب وا کریگی۔

سیرت مبارکہ پر قدیم زمانے سے لے کر اب تک کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری وساری ہے لیکن اس کام کا حق نہ کبھی ادا ہوا نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ کی ذات مبارک ایسی کثیر الجہت ہے کہ ان کو سمجھنا اور سمجھانا ان کے خالق اور مالک نے اپنے ہی دست قدرت میں رکھا ہے حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے اس پورے اسرار کو سمجھنے میں اپنے اس شعر سے بہت بہتر رہنمائی فرمائی ؎

اے رضا خود صاحب قرآں ہے مداح حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

ہم تو ہم ہیں مستشرقین بھی اس بات پر انگشت بدنداں ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں جس کا احاطہ کرنے کے لئے تحقیق کو خود ایک نئے پیرائے میں زندہ ہونا پڑے گا۔ وہ اکملیت کی اس معراج پر فائز ہیں کہ دوسرا اس دنیا میں اور آنے والی دنیا میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا ہے۔ اور یہی بات ہے کہ جب مستشرقین حضور ﷺ کی ذات والا صفات کا کلی و جزوی جائزہ لیتے ہیں تو اس ذات میں دنیا اور دین کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ہر شخص کے واسطے رسول کریم کی ذات ہدایت کا روشن مینارہ نظر آتی ہے۔

Orientalist کا طبقہ ہو یا دوسرے اور مذاہب کے Researchers ہوں ان سب کی نظر میں ہمارے آقا ﷺ ایک Ideal Human Being اور ممتاز مذہبی رہنما تصور کیے جاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں سیرت پاک کے وہ تمام مخصوص گوشے لئے گئے جو عوام الناس کو جاننا ضروری ہے اور الحمد للہ یہ تمام مضامین ان صاحبان قلم کی محنتوں کا ثمرہ ہیں جو اپنے علم اور علمی دیانت داری کے سبب بڑے ممتاز اور معتبر تصور کئے جاتے ہیں۔ ان حضرات میں بزرگ قلم کار بھی ہیں اور وہ نوجوان صاحب قلم بھی ہیں جو اپنی علمی سنجیدگی اور شخصی متانت کے سبب نوجوانی میں بزرگوں جیسا مرتبہ حاصل کرچکے ہیں۔

خانقاہ برکاتیہ کے ذریعہ قائم شدہ ''البرکات اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ''، تصنیف وتالیف کے کاموں میں انہماک کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ علمائے کرام کی ایک بڑی ٹیم اس کام میں دلجمعی کے ساتھ معاون اور مددگار ہے۔ ماشاء اللہ گذشتہ تین چار سال میں حضرت امین ملت کی سرپرستی میں تقریباً ۱۵؍ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انشاء اللہ اس سال بھی ۴؍ کتابیں منظر عام پر لانے کا ارادہ ہے، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو یہ توفیق دے کہ وہ اپنے اس خاندانی علمی ورثے کو مزید بام عروج پر پہنچائیں اور ہمارے چاہنے والے ہمارے حوصلوں کو پائندگی بخشتے رہیں۔

عزیزم احمد میاں سلمہٗ اور عزیزم سید محمد امان سلمہٗ کے لیے دعائیں کہ علی گڑھ میں ان دونوں کی نگرانی میں یہ کام حسن وخوبی انجام پذیر ہورہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے بچوں کو مزید نیک توفیق اچھی صلاحیتوں کے ساتھ عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

مضامین کی پروف ریڈنگ میں مولانا نعمان احمد ازہری، برخوردار سید محمد عثمان اور مولانا توحید احمد برکاتی صاحب کی قیادت میں علمائے کرام نے جو یہ کار خیر انجام دیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

عزیزم حارث میاں ہمارے بہت عزیز ہیں، جو ایام عرس میں ٹائپنگ کے تمام مرحلوں کو رات رات بھر کام کر کے آسان کرتے ہیں، ان کے لئے دلی دعائیں۔

اللہ برادر معظم امین ملت مدظلہٗ، برادران عزیز سید محمد افضل اور سید نجیب حیدر کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے اور گلشن برکات میں ان کے دم سے بہاریں رہیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

کتاب کو پڑھئے اور اپنے آقا کی سیرت سے مستفیض ہو کر دوسرے احباب کو فائدہ پہنچائیے، میں اسی گذارش کے ساتھ قلم رکھتا ہوں۔

آپ کا

سید محمد شرف

کلمات عالیہ

حضرت امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی

صاحب سجادہ آستانۂ عالیہ برکاتیہ مارہرہ شریف

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ارباب خاندان برکات سے اللہ تبارک وتعالیٰ اچھے اور نیک کام لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ اس نے اپنے حبیب ﷺ کی سچی پکی محبت عطا فرمائی۔ ہم کو اپنے رسول کی محبت کی ترویج واشاعت کی توفیق رفیق عطا فرمائی۔ آج سب سے زیادہ ضرورت اپنے نبی ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ہے اور یہ کام تبھی ہوسکتا ہے کہ جب ہم سیرت مبارکہ کے روشن پہلوؤں سے آشنا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ خانقاہ برکاتیہ کی جانب سے مذہبی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ جامعہ البرکات میں اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا قیام اس حوالے سے بے حد متحرک وفعال ہے۔ الحمد للہ ہماری کوشش ہے تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ کا کام ہماری جانب سے کما حقہ ہو۔ دین کے کام کے لئے وسائل سے زیادہ جذبے کی ضرورت ہوتی ہے اور جذبہ و نیت خادمان خاندان برکات کی الحمد للہ ہمیشہ سے اخلاص سے بھری ہوتی ہے۔

برادرم سید محمد اشرف نے اہل سنت کی آواز کو کتابی شکل میں تبدیل کرنے کا جوعزم کیا وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں اور ماشاءاللہ یہ تمام کتابیں عرف عام میں بے حد مقبول ہورہی ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ سیرت مبارکہ پر اس کتاب کی اشاعت عاشقان مصطفیٰ کے لئے خوشی کا باعث ہوگی۔ اس بہترین پیش کش کے لئے اشرف میاں کو دلی مبارک باد اور ان حضرات کا بے حد شکریہ جو حضرات اس کتاب کی تزئین میں ان کے معاون ہیں۔

میں ان تمام صاحبان قلم کا ممنون ہوں جن کے مضامین اس کتاب کی زینت ہیں۔ رب کریم ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مذہب مہذب اسلام اور مسلک اہل سنت کی سچی خدمات انجام دینے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

دعا گو

سید محمد امین قادری

خادم سجادہ آستانۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ
مارہرہ شریف

تقریظ

خیرالاذکیا صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات وسابق صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارکپور

نحمدہٗ و نصلی علی رسوله الکریم

اسلام ہی خدا کا پسندیدہ دین ہے اور قرآن مجید بندوں کی جانب اس کا آخری اور دائمی پیغام ہے جس میں عقائد، احکام، معاملات، اخلاق اور تزکیۂ باطن کی تعلیم دی گئی ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْن (الحجر:۹) بے شک ہم نے ہی قرآن اتارا ہے اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

پھر قرآن کریم میں بہت سے مقامات تشریح وتفسیر کے طالب تھے ان کی عقدہ کشائی پیغمبر اسلام رسول عربی ﷺ کی احادیث مبارکہ اور سیرت مقدسہ سے ہوتی ہے۔ اس لیے رب تعالیٰ کی طرف سے احادیث وسیر کی حفاظت کا بھی انتظام ہوا، ایسے عالی دماغ اور ژرف نگاہ محدثین وعلما پیدا ہوئے جو صحیح وضعیف اور مقبول ونا مقبول کی چھان بین کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اصول حدیث، اسماء الرجال اور اصول جرح وتعدیل جیسے علوم ایجاد کیے جن کی روشنی میں صحت وضعف کی جانچ ہوتی رہی اور ردّ وقبول کی گرہیں کھلتی رہیں۔ ان کی سرگرم

کاوشوں کے نتیجے میں امت کو احادیث مبارکہ اور سیرت مقدسہ کا ایک مستند اور معتبر ذخیرہ نصیب ہوا جس کی بدولت دین کو سمجھنا اور اپنے اخلاق و کردار کو بلند اور پاکیزہ بنانا آسان ہو گیا۔

دوسری طرف دشمنان اسلام کی ہمیشہ یہ سازش رہی کہ عام دنیا اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت طیبہ سے آگاہ نہ ہو اور اگر کچھ آگاہ ہو تو اس طرح کہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے رغبت اور محبت کی بجائے نفرت اور عداوت کا بازار گرم ہو۔

اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لیے ان کے بڑے بڑے دانشور اور عقلا خطوط بناتے ہیں، حکومتیں ان کو مدد دیتی ہیں، کثیر سرمایہ صرف ہوتا ہے، ذرائع ابلاغ کا بے جا استعمال ہوتا ہے، منافقت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ خفیہ اور علانیہ ایسی جارحانہ سرگرمیاں روا رکھی جاتی ہیں جن کے آئینے میں ان کی قلبی عداوت کا آتش فشاں صاف دہکتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان حالات میں امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی بے داغ تعلیمات کو عام سے عام تر کرے۔ پیغمبر اسلام مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی صاف و شفاف سیرتِ مبارکہ اور ان کے اخلاق عالیہ کا حسین و جمیل آئینہ ہر فرد بشر کی نظر میں لائے تا کہ وہ اعدا کی سازشوں کا شکار ہونے سے بچ سکے۔

خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے اس رخ پر توجہ دیتے ہوئے ۲۰۰۶ء میں ایک گلدستۂ مقالات شائع کیا تھا جو مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی سیرت طاہرہ کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی افادیت زیادہ عام کرنے کی خاطر اب پھر کتابی شکل میں اس کی اشاعت نو عمل میں آرہی ہے۔ ''اداریہ'' میں رفیق ملت سید نجیب حیدر قادری برکاتی نوری دام ظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''سواد اعظم کو اس وقت ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے جو انہیں اس قابل بنا سکے کہ وہ اسلام دشمنوں کی ہر مذموم کوشش کا جواب دے سکیں۔ ''اہل سنت کی آواز'' کا

یہ خصوصی شمارہ ''مصطفیٰ جان رحمت'' ہماری اسی کوشش کا حصہ اور بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں حقیر سا نذرانۂ محبت ہے۔

سیرت کی باضابطہ کتابیں ہم میں سے بیش تر کی قوت خرید سے باہر ہیں۔ سیرت مصطفیٰ ﷺ پر اور زمانۂ موجودہ میں دشمنان رسول اور دشمنان اسلام کا مناسب جواب دینے کے لیے اس خصوصی شمارے میں وافر سامان موجود ہے۔ اس شمارے کی جامعیت کا دعویٰ کریں تو یہ نافہمی ہوگی لیکن کوشش یہ کی گئی ہے کہ سیرت طیبہ سے متعلق خاص خاص موضوعات کا احاطہ کیا جا سکے۔''

فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے موضوعات اور اصحاب قلم کا علم ہو سکتا ہے۔ کتاب کی ورق گردانی سے میں نے یہ محسوس کیا کہ اہل قلم نے اپنے موضوعات کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی اختصار اور جامعیت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ہر مضمون پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے تا کہ وقت ضرورت کام آسکے اور اشاعت کا مقصد حاصل ہو۔

اس وقیع اور مفید کتاب کی اشاعت پر ہم قلمی معاونین کے ساتھ ارباب خانقاہ مطہرہ کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں اور مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ ایک بیش بہا علمی تحفہ سپرد قوم ہو رہا ہے۔ واللہ ولی الجزاء۔

محمد احمد مصباحی
رکن المجمع الاسلامی
و ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل

غوث اعظم محبوب سبحانی سیدنا شیخ
عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تمام اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن المطلب بن ہاشم، اللہ کے رسول، تمام رسولوں کے سردار اور آخری نبی ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانوں اور تمام جنات کے لیے بھیجا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ .(ہم نے آپ کو تمام آدمیوں کے لیے بھیجا ہے)وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ.(ہم نے آپ کو جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام نبیوں پر چار باتوں میں فضیلت دی ہے۔ اول یہ کہ مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا۔ (آخری حدیث تک) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات دیئے گئے جو آپ کے سوا کسی پیغمبر کو نہیں دیئے گئے۔ بعض علما نے ان معجزات کی تعداد ایک ہزار شمار کی ہے، ان تمام معجزات میں سے ایک معجزہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن کریم کی ترتیب عبارت ایسے نرالے طریقے سے ہے جو کلام عرب کے تمام اسالیب بیان اور ان کے نظم و ترتیب سے جدا ہے، اس کی ترتیب و ترکیب، اس کی فصاحت، بلاغت ہر فصیح و بلیغ کی فصاحت و بلاغت سے بلند تر ہے، اہل عرب اس کی ایک سورۃ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا تھا: فَاْتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ.
(قرآن جیسی دس سورتیں از خود بنا کر لے آؤ اگر [اگر لا سکتے ہو] لیکن لوگ نہ لا سکے)۔ پھر فرمایا کہ ایک ہی سورۃ بنا لاؤ۔ فَاْتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ (قرآن کے مانند ایک سورۃ ہی بنالاؤ)۔

چنانچہ ایک سورۃ بھی لانے میں عاجز رہے (پورا قرآن لانا تو بڑی بات تھی) باوجود یکہ تمام عالم سے ان کی فصاحت و بلاغت بڑھ چڑھ کر تھی، فصحائے عرب گنگ ہو گئے۔ (اپنی زبانیں کٹوا بیٹھے) اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام لوگوں پر ظاہر ہو گئی اور قرآن پاک آپ کا اسی طرح ایک معجزہ قرار پایا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے تھے کہ ہر طرف ساحروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، جادوگروں کا طوطی بول رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب اُن ساحروں کا مقابلہ ہوا اور انھوں نے اپنے جادو کے کمالات دکھائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدہا بن کر اُن (رسیوں کے سانپوں) کو نگل لیا، جادوگر مغلوب ہو گئے، وہ ذلیل ہو کر پلٹے اور بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیتے اور مادرزاد نابینا اور کوڑھ میں گرفتار لوگوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہی ایسے زمانے میں ہوئی تھی جو بڑے بڑے ماہر فن اطبا کا دور تھا۔ لوگ ان کے سامنے ایسے لاعلاج بیماروں کو پیش کرتے تھے جو حاذق طبیبوں کے علاج سے شفایاب نہیں ہو سکے تھے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ دیکھ کر) آخر کار تمام طبیب اُن کے فرمانبردار ہو گئے اور ایمان لے آئے، اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فن طب اور مہارت فن میں ان سب سے آگے بڑھ گئے تھے اور صاحب معجزہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ قرآن پاک کی فصاحت اور اس کا اعجاز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معجزہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ کا عصا اور حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا معجزہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے:

حضور کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہونا، تھوڑا کھانا بکثرت لوگوں کے لیے کافی ہوجانا، زہریلی بکری کے اعضا کا یہ کہنا کہ ہم کو تناول نہ فرمائیں ہم زہریلے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہیں۔ چاند کے دو ٹکڑے ہوجانا، اونٹ کا کلام کرنا، کھجور کے تنے کا رونا، آپ کی جانب درخت کا آنا بھی آپ کے معجزات ہیں، اسی قبیل کے اور بہت سے معجزے آپ کے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ وسلم کو حضرت موسیٰ کے عصا کی مانند یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح مریضوں کو اچھا کردینا، اندھوں کو بینائی واپس کردینا، کوڑھیوں کو جذام سے صحت یاب کردینا، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی جیسے معجزے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے عطا نہیں ہوئے تھے کہ حضور کی امت اُن کی تکذیب کرکے ہلاکت میں نہ پڑے جس طرح پہلی اُمتیں (تکذیب کرکے) ہلاک ہوگئیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُرْسِلَ بِالایٰاتِ اِلَّا اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْن. (ہم کو سابقہ معجزوں کی طرح اپنی نشانیاں بھیجنے سے صرف اس مصلحت نے روکا کہ اگر یہ بھی تکذیب کریں گے تو ہلاک ہوجائیں گے۔)

ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اگر سابقہ نبیوں کی طرح اگر آپ بھی ایسے ہی معجزے پیش فرماتے تو لوگ کہتے کہ آپ کوئی نئی بات تو نہیں لائے، آپ نے خود ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ باتیں فرمائی ہیں، اس لیے آپ بھی اُن کے متبعین میں سے ہیں۔ جب تک آپ ایسی کوئی چیز نہ لائیں جو انبیاے سابقین نہ لائے ہوں، اس وقت تک ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو وہ معجزہ عطا نہیں فرمایا جو دوسرے نبی کو عطا فرمایا گیا تھا۔ چنانچہ ہر نبی کو ایک مخصوص معجزہ عطا کیا گیا۔

امت محمدیہ کی افضلیت:

اہل سنت اس بات کے معتقد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تمام اُمتوں سے بہتر ہے اور ان میں اس زمانے کے لوگ تمام لوگوں سے بہتر اور افضل ہیں جنھوں نے حضور کو دیکھا، آپ کی تصدیق کی، آپ کی بیعت کی اور آپ کی پیروی کی، جہاد کیا، اپنا مال اور اپنی جانیں قربان کیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور ان لوگوں میں حدیبیہ والے افضل ہیں جنھوں نے (ایک درخت کے نیچے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی، یہ اصحاب ایک ہزار چار سو ہیں، ان میں افضل اہل بدر ہیں جن کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) ہے جو اصحاب طالوت کی تعداد کے برابر ہیں اور ان (۳۱۳) میں افضل وہ دار الخیز ان والے اصحاب ہیں جن کی تعداد بشمول حضرت عمر رضی اللہ عنہ چالیس ہوجاتی ہے اور ان (چالیس) میں افضل وہ دس اصحاب ہیں جن کے جنتی ہونے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دی۔

وہ دس اصحاب یہ ہیں:

۱- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
۲- حضرت عمر رضی اللہ عنہ
۳- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ
۴- حضرت علی رضی اللہ عنہ
۵- حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ
۶- حضرت زبیر رضی اللہ عنہ
۷- حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ
۸- حضرت سعد رضی اللہ عنہ
۹- حضرت سعید رضی اللہ عنہ
۱۰- حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔

ان میں پہلے چار حضرات خلفائے راشدین سب سے افضل ہیں اور ان چاروں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت حاصل ہے۔ ان چاروں حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (بطور مجموعی) تیس سال تک خلافت کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دو سال سے کچھ اوپر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دس سال، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چھ سال خلیفہ رہے۔ خلفائے راشدین کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو نو سال تک خلافت کا والی بنادیا گیا، اس سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو شام کا امیر بنایا تھا۔ اس عہدہ پر آپ بیس سال تک فائز رہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کا مبارک سراپا

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ

چہرۂ انور:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور، آئینہ جمال الٰہی ومظہر انوار لامتناہی ہے۔ بخاری ومسلم میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوبرو اور خوش خو تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

مارأیت شیئا احسن من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین وبہتر کسی چیز کو نہ دیکھا۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے قول ما رأیت شیئا (کسی چیز کو نہ دیکھا) فرمایا اور مارأیت انسانا یا رجلا (کسی انسان یا مرد کو نہ دیکھا) نہیں فرمایا کیوں کہ اس میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کی خوبی وحسن ہر چیز پر فائق تھی اور انہوں نے فرمایا کہ چہرۂ انور ایسا روشن وتاباں تھا کہ گویا آفتاب آپ کے رُخ انور میں پیر رہا تھا۔

تا شب نیست روز ہستی زاد
آفتابے چو تو ندارد یاد

یعنی کسی رات کے بعد ایسا دن طلوع نہ ہوا جیسا آپ کا چہرۂ انور روشن

وتاباں تھا۔مقصود یہ ہے کہ آپ کے چہرۂ انور، روئے روشن کی آب وتاب، بہت زیادہ تھی۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا، کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے روشن صفائی وتابانی میں شمشیر کی مانند تھا؟ فرمایا نہیں بلکہ چاند کی مانند تھا۔ کیوں کہ شمشیر کی تشبیہ میں گولائی مفقود ہے، اس لیے انہوں نے چاند سے تشبیہ دی۔ چاند میں چمک دمک بھی ہے اور گولائی بھی۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیا نہیں! بلکہ آفتاب وماہتاب کی مانند تھا۔ یعنی متدیر اور گولائی میں۔ اگر چہ ماہتاب کے مقابلہ میں آفتاب میں چمک دمک زیادہ ہے لیکن ماہتاب میں جو ملاحت ہے وہ آفتاب میں نہیں۔ اور ملاحت ایسی خوبی ہے جو دیکھنے میں پر لطف اور دل نشیں ہوتی ہے، جس کا ذوق سلیم ہی ادراک کر سکتا ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور دائرہ قمر کی مانند تھا۔'' دائرۂ قمر ہالہ کو کہتے ہیں، جسے فارسی میں ''خرمنِ ماہ'' کہا جاتا ہے۔

طالبان مشتاق ہمیشہ جمال آرا صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں ایام بیض کی راتوں میں مشرف رہتے تھے اور اس مشاہدہ سے وہ کبھی غافل وفارغ نہ ہوتے تھے، کیوں کہ دیدار نقد ہے۔ حضرت جابرسمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاندنی راتوں میں دیکھا اس وقت آپ کے جسم اطہر پر سرخ جوڑا تھا۔ میں کبھی آپ کے روئے انور کو دیکھتا اور کبھی چاند کی تابانی کو۔ خدا کی قسم میرے نزدیک چاند سے زیادہ بہتر آپ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے الفاظ ''میرے نزدیک'' میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن وجمال سے لذت اندوز

ہونے کا اظہار موجود ہے۔ یہ ان کا اپنا اظہار تلذذ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کا حسن وجمال سب سے بڑھ کر حسین تھا۔

چشم مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک پر دو وجہوں پر بحث کی جاتی ہے۔ پہلی وجہ خانۂ چشم اور اس کی شکل وہیئت کے وصف میں ہے۔ چنانچہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ آپ کی چشم مبارک بڑی اور بھنویں دراز تھیں چشم مبارک کے بڑی ہونے کا مطلب تنگی اور کوتاہی کی نفی کرنا ہے۔ نہ کہ اتنی بڑی کہ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آپ کے اعضائے شریفہ کے اظہار میں قاعدۂ کلیہ، توسط واعتدال ہے۔ کیوں کہ مدار حسن وجمال اور بنائے فضل وکمال یہی توسط واعتدال ہے۔

ایک اور حدیث میں ''اشہل العینین'' آیا ہے یعنی آپ کی چشم مبارک سفیدی سرخی لیے ہوئے تھیں۔ مطلب یہ کہ آنکھوں کی باریک رگیں سرخ تھیں۔ اور ''شہلہ'' یعنی سیاہی سرخی ہونا۔ یہ صفت آپ کی چشم مبارک کی تعریف میں بہت ہی کم مذکور ہے لیکن نہایہ میں کہا گیا ہے کہ : كان اشهل العينين ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں چشم مبارک اشہل تھیں اور سیاہی میں سرخی کو اشہل کہا جاتا ہے۔''

ایک روایت میں اَدْعَجَ الْعُیُنَیْن بھی آیا ہے۔ اَدعج گہری سیاہ آنکھ کو کہتے ہیں۔ ایک روایت میں اکحل العینین منقول ہے۔ یعنی حضور کی آنکھیں سرگیں تھیں۔

دوسری وجہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصارت وبینائی کی تعریف میں ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں بھی ویسا ہی دیکھتے تھے جیسا دن کی روشنی میں۔ (رواہ البخاری) بیہقی نے بھی سیدنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کتاب الشفا میں بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ثریا میں گیارہ ستارے ملاحظہ فرماتے تھے اور سہیلی کے نزدیک بارہ منقول ہیں۔ آپ کی

نظریں آسمان کی نسبت زمین کی طرف زیادہ رہتی تھیں یہ حد درجہ شرم وحیا کی دلیل ہے۔ حدیثوں میں جو یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، تو ایسا انتظار وحی کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ ورنہ نظر مبارک کا زمین کی طرف رکھنا روز مرہ کے معمولات میں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر گوشۂ چشم سے نظر فرماتے تھے جو نظر براہِ راست ہوا سے جوق دماق کہتے ہیں۔ آپ کا گوشۂ چشم سے ملاحظہ فرمانا انتہائی حیا ووقار کے سبب تھا لیکن جب آپ کسی کی جانب التفات فرماتے تو مکمل طور پر گھوم جاتے تھے۔ دائیں بائیں پہلو بدلنے یا محض گردن گھمالینے اور دزدیدہ نظری سے آپ گریز فرماتے تھے، کیوں کہ یہ متکبروں اور سہل انگاروں کا شیوہ ہے۔ آپ کی نظر مبارک سامنے اور پس پشت یکساں تھی۔ چنانچہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے کہ آپ مقتدیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ رکوع وسجود میں مجھ سے پہل نہ کیا کرو، کیوں کہ میں تمہیں اپنے آگے اور پیچھے سے یکساں دیکھتا ہوں اور مجھ سے تمہارا رکوع وسجود پوشیدہ نہیں ہے۔ اس روایت کی حقیقت کو خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھی۔ یہی نہیں بلکہ آپ کے تمام اعضائے شریفہ کا یہی حال ہے۔

گوشہائے مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعتِ شریفہ کے بارے میں ایک حدیث میں وارد ہے کہ آپ نے فرمایا: میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں جن کو تم نہیں دیکھ سکتے اور میں اُن آوازوں کو سنتا ہوں جن کو تم نہیں سن سکتے۔ میں آسمان کی اطیط (خاص قسم کی آواز ہے) کو سن رہا ہوں، اونٹ کے پالان کی آواز، خالی معدہ کی آواز، درد وکرب سے اونٹ کے بلبلانے کی آواز یا کسی قسم کی آواز ہو، ان سب کو ''اطیط'' کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا آسمان کو بھی لائق ہے کہ آواز نکالے کیوں کہ آسمان میں ایک بالشت (ایک روایت میں چار انگل) کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے، جہاں کسی فرشتے نے سجدہ نہ کیا ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ بکثرت فرشتے سجدے میں ہیں یا قیام میں۔ سیر کی

کتابوں میں آپ کے گوش مبارک کے تمام صفات وہیئت کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں جامع صغیر میں ایک روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشہائے مبارک کامل ومکمل تھے۔

جبین مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جبین مبارک کی تعریف وتوصیف میں سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ **واضح الجبین** (کشادہ پیشانی) تھے۔ ایک دوسری روایت میں ''**صلت الجبین**''، بمعنی کشادہ پیشانی آیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ''**واسع الجبین**'' ایک روایت میں ''**واسع الجبة**'' منقول ہے۔ ان سب کے معنی فراخ پیشانی ہے۔ چہرۂ انور کے تذکرے میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے گزر چکا ہے کہ جب آپ کی پیشانی شکن آلودہ ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اہل سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ کی پیشانی مبارک سے نیک بختی، سعادتمندی اور نورانیت مترشح ہوتی رہتی تھی اور سرنوشت (جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے) کا مقام پیشانی ہے۔ بسا اوقات اس معنی کا مشاہدہ خانۂ کعبہ کے دروازے میں ہوتا ہے۔ جب یہاں عادتاً پیشانی کو اس سے رگڑتے اور ملتے ہیں تو پیشانی سے نیک بختی وسعادت مندی کے آثار خوب واضح طریقہ پر ظاہر ہوجاتے ہیں۔

مبارک بھنویں:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھنوؤں کی توصیف میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ پیشانی کشادہ اور بھنویں ملی ہوئی تھیں۔ قرن ابرو کا مطلب بھنوؤں کے بالوں کا ملا ہوا ہونا ہے، لیکن ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ جو کہ واصفانِ حلیہ شریف میں سے ہیں، ان کی حدیث میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے (ابرو کے بال ملے ہوئے نہ تھے۔ ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے)۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ صحیح روایت یہ ہے کہ آپ غیر متصل ابرو تھے اور بظاہر

یہ اتصال بہت گہرا نہ تھا جس سے دونوں ابرو کے بال باہم خوب پیوست ہو گئے ہوں اور نہ درمیان میں اتنی خالی جگہ تھی جسے غیر متصل کہا جائے بلکہ چند خفیف بالوں کا اتصال تھا۔ اس بنا پر اتصال وعدم اتصال کا اطلاق بادی النظر والخیال میں صحیح ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اہل سیر فرماتے ہیں کہ دونوں ابرو کے درمیان ایک رگ تھی جو حالتِ غضب میں نمودار ہوتی تھی۔ نیز ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ''ازجّ الحواجب'' آیا ہے۔ ازج کے معنی لمبی کمان، کثیر بال اور کشیدہ ابرو کے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ''ازج الحواجب'' سوابغ'' (کشیدہ ابرو و گھنے بال) آیا ہے۔ قاموس اور صحاح میں زج کے معنی باریکی ابرو یا درازی ابرو کے ہیں جیسے فارسی میں کمان ابرو کو کہتے ہیں۔ اور بیہقی میں بعض صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''احسن الوجه عظیم الجبهه، دقیق الحاجبین '' دیکھا ہے۔ یعنی آپ کا چہرہ نہایت حسین، پیشانی عظیم اور ابرو باریک تھے۔ باریکی کا مطلب یہ ہے کہ ابرو کے بالوں کا گپھا نہ تھا اور بالوں کی کثرت کا یہ مطلب ہے کہ بال کم اور کہیں کہیں نہ تھے یہ نہ تو پراگندہ تھے، نہ چھدرے۔

بینی شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بینی مبارک ایسی نورانی اور روشن تھی کہ دیکھنے والا جب تک بغور نہ دیکھے، یہی گمان کرتا تھا کہ آپ کی بینی شریف بلند ہے، حالانکہ بلند نہ تھی بلکہ یہ بلندی نور کی تھی جو ہر ایک شئے کو نمایاں دکھا۔ نیز اس خوبی میں نیک بختی اور سعادت مندی کی نشانی بھی ہے۔

دہن شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک کے بارے میں صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فراخ دہان تھے۔

اس طرح حضرت ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے جو شمائل ترمذی میں حلیہ مبارک کی طویل حدیث میں مذکور ہے کہ اہل عرب مردوں کے لیے فراخ دہنی کو قابل تعریف اور تنگ دہنی کو لائق مذمت ٹھہراتے تھے۔ عرب کے شعراء، تنگ دہن کو معشوق اور محبوب سے نسبت دیتے تھے گویا کہ ان کے نزدیک وہ عورتوں کے حکم میں تھے۔ لیکن بعضوں نے کہا کہ یہ کم سخنی اور محبوبی سے کنایہ ہے۔ دوسری حدیث میں '' لفظ ضلیع الفم'' (فراخ دہنی) کے بعد یہ عبارت زیادہ کی ہے جس سے فراخ دہنی مراد لیتے ہیں۔ ''یفتح الکلام ویختمہ باشداقہ۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کلام کو کشادگی دہن سے آغاز فرماتے اور اپنے شدق سے اسے ختم کرتے۔ شدق بکسر شین کنج دہاں، اور شدق بتحریک فراخی دہاں کو کہتے ہیں۔ ''خطیب اشدق'' تالو کشادہ اور متشدق فصاحت سے بولنے والے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کے دہن مبارک سے کلام، تام، کامل اور بھرا ہوا نکلتا تھا۔ شکستہ وناقص الفاظ نہ نکلتے تھے۔ لہٰذا اس بیان سے فصاحت اور اثبات فصاحت دونوں کا اجتماع حاصل ہو گیا اور معلوم ہوا کہ آپ فصیح کامل تھے۔ ایسا تشدقِ لسانی مذموم وقبیح ہے جو بطریق تکلّف، بناوٹ اور ناحق ہو بعض اہل سیر نے کشادگی دہن سے ہونٹوں کی نزدیکی مراد لی ہے۔

آپ کے سامنے کے دانت کشادہ تھے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ کے سامنے کے دانت روشن تر، آبدار اور کشادہ مروی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا کہ آپ کے لبہائے مبارک کشادہ تھے جب گفتگو فرماتے تو ایسا دیکھا جاتا کہ گویا سامنے کے دندانہائے مبارک کی شکادگی کے درمیان سے نور نکل رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ بوصیر پر رحم فرمائے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

کانها اللؤلؤ المکنون فی صدف
من معدن نه منطق منه و مبتسم

گویا کہ دندانہائے مبارک صدف میں چھپے ہوئے ہیں جو اپنے معدن میں

بولتے اور تبسم فرماتے ہیں۔

طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لبہائے مبارک اور دہن شریف کا مہرہ تمام لوگوں سے زیادہ حسین ولطیف تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ دندانہائے مبارک عظیم تھے ان سب روایتوں کا مفہوم یہی ہے کہ آپ کا دہن شریف حسن و جمال کے مطابق درست وصحیح تھا۔

لعاب دہن شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن بیماروں اور دلفگاروں کے لیے شفائے کامل تھا۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں روز خیبر حضرت علی مرتضٰی کی آنکھوں کے آشوب میں لعاب دہن لگانا اور اسی وقت صحیح وتندرست ہو جانا مذکور ہے، مشہور ہے۔ آپ کے حضور پانی کا ایک ڈول لایا گیا اور آپ نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر اس میں کلّی کردی پھر جب اس ڈول کے پانی کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو اس کنویں سے کستوری کی مانند خوشبو پھیل گئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان کے کنویں میں جب آپ نے لعاب دہن ڈالا تو مدینہ طیبہ میں کوئی کنواں اس سے زیادہ شیریں نہ تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں کچھ شیر خوار بچے لائے گئے! آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ پھر تو وہ ایسے سیراب ہوئے کہ اس دن انہوں نے دودھ ہی نہ پیا۔ ایک دن حضرت امام حسن مجتبٰی رضی اللہ عنہ، سخت تشنگی میں تھے۔ آپ نے اپنی زبانِ مبارک ان کے منہ میں دے دی۔ وہ اسے چوستے رہے۔ پھر وہ سارے دن سیراب رہے۔ اس قسم کے بے شمار معجزات مروی ہیں۔

تبسم شریف:

صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے کبھی بھی آپ کو اس طرح قہقہہ لگا کر ہنستے نہ دیکھا جس سے آپ کے حلق کے

اندرونی حصے کوے تک نظر آجائیں۔

حضرت شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تمام حدیثوں سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سے بڑی حالتوں اور اکثر اوقات میں تبسم سے آگے تجاوز نہیں فرماتے تھے۔ ممکن ہے کبھی اس سے تجاوز بھی کیا ہو مگر ضحک (تبسم) کی حد سے آگے نہ بڑھے ہوں گے۔ لیکن یہ قہقہہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا! کیوں کہ یہ مکروہ ہے۔ کثرت کے ساتھ ہنسنے اور اس میں زیادتی کرنے سے آدمی کا وقار جاتا رہتا ہے۔ بیہقی نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضحک فرماتے تھے تو دیواریں روشن ہو جاتی تھیں اور ان پر آپ کے دندانہائے مبارک کا نور آفتاب کی شعاعوں کی طرح جلوہ افروز ہوتا تھا۔ یہی حال آپ کی گریہ کا تھا۔ آواز قطعاً بلند نہ ہوتی تھی۔ البتہ چشمِ مبارک سے آنسو جاری ہو جاتے اور سینۂ اطہر سے ایک مخصوص آواز سنائی دیتی تھی۔ ایسی آواز جیسے تانبے کی دیگ میں جوش آ گیا ہو۔ بعض روایتوں میں اسے چکی کی آواز کی مانند کہا گیا ہے۔ آپ کا فعل گریہ فرمانا اللہ تعالیٰ کے جلالی صفت کی تجلی یا امتِ مرحومہ پر شفقت فرمانے یا میت پر طلب رحمت کی بنا پر ہوتا تھا۔ یہ کیفیت اکثر قرآن کریم سنتے وقت یا بعض اوقات رات کی نماز میں طاری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جماہی لینے سے محفوظ رکھا ہے۔ کیوں کہ جماہی کسلمندی اور اعضاء کی سستی کی نشانی ہے۔ تاریخ بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جماہی نہ لی۔ بعض روایتوں میں یعنی کسی نبی نے کبھی جماہی نہ لی بھی وارد ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جماہی شیطان کی طرف سے ہے۔ اور اگر جماہی غلبہ کرے تو چاہیے کہ بایاں ہاتھ منھ پر رکھے یا لبوں کو دانتوں میں دبائے۔ وہ لوگ جو ہاہاہا یا آہ آہ کی آواز نکالتے ہیں، وہ حد درجہ فعل قبیح کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو ایسا کرتا ہے، شیطان اس کے منہ میں ہنستا ہے۔

آوازِ مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک غایت درجہ پیاری تھی۔ آپ کی آواز اور اس کی شیرینی تمام آوازوں سے زیادہ حسین ودلکش تھی اور کوئی شخص بھی آپ سے بڑھ کر خوش آواز شیریں کلام نہیں گزرا۔ آپ کے کلام کی توصیف میں آیا ہے ''اصدق الناس لہجۃ'' آیا ہے یعنی آپ کا لب ولہجہ نہایت ستھرا تھا کیوں کہ آپ کی زبان مبارک، مخارج سے کلام فرمانے میں جیسا کہ اس کا حق ہے، سب سے بڑھ کر راست تر، درست تر اور بہتر تھی۔ آج تک کوئی ایک بھی اس پر قادر نہ ہوسکا۔ فصاحت کے ساتھ کلام فرمانے کو صدق لہجہ کہتے ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہ بھیجا مگر خوش آواز اور خوش رو حتی کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف میں سب سے فائق تھے۔ اسی مقام پر کسی نے کہا ہے کہ ؎

در دل ہر امتی گر حق مزہ است
روئے آوازِ پیغمبر معجزہ است

جہاں تک کسی کی آواز پہنچ نہ سکتی تھی، وہاں تک آپ کی آواز مبارک بے تکلف پہنچ جاتی تھی۔ خصوصاً ایسے خطبوں کی آواز جس میں نصیحت، تخویف یا خدا سے ڈرانا ہوتا تھا۔ چنانچہ پردہ میں بیٹھی ہوئی مستورات بھی آپ کی آواز سنتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایامِ حج میں منیٰ میں جو خطبہ دیا تھا، اس نے تمام لوگوں کے کان کھول دیے اور ہر ایک نے اس خطبہ کو اپنی اپنی منزلوں میں سنا (منیٰ میں دور ونزدیک جو بھی تھا ہر ایک نے سنا) وہ جو دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دیتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے اس کی تعبیر کرتے جاتے تھے تو اس سے مراد کلام کی تفسیر وتوضیح اور شرح وبیان اور اس سے رفع اشتباہ ہے، نہ کہ آواز کو سنوانا۔

فصاحت شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کی فصاحت، جوامع کلم، انوکھا اظہار بیان اور عجیب وغریب حکم وفیصلے اتنے زیادہ ہیں کہ شاید ہی کوئی فکر واندیشہ کا محاسب اس کے حصر واحاطہ کے گرد پھر سکے۔ آپ کے اوصاف کا بیان اور ان کے بیان کا زبان کے ساتھ اظہار ممکن ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ فصیح وشیریں بیان دوسرا پیدا ہی نہ فرمایا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! نہ تو آپ کہیں باہر تشریف لے گئے اور نہ آپ نے لوگوں میں نشست وبرخاست رکھی پھر آپ ایسی فصاحت کہاں سے لے آئے۔ آپ نے فرمایا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی لغت اور اصطلاح جو ناپید اور فنا ہوچکی تھی، اسے میرے پاس جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے جسے میں نے یاد کرلیا ہے نیز آپ نے فرمایا: ادّبنی ربنی فاحسن تادیبی میرے رب نے مجھے ادب سکھایا تو میرے ادب کو بہت اچھا کردیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوب واضح اور مفصل کلام کے ساتھ تکلم فرماتے تھے اور جدا جدا ان کلمات کو گنا جاسکتا تھا۔ آپ ایک کلمہ کی تین تین بار تکرار فرمایا کرتے تھے تا کہ خوب سمجھ لیا جائے۔ یہ تکرار گفتگو کے ابہام واشتباہ کو دور کرنے کے لیے ہوتی ہوگی ورنہ آپ ہر بات اور ہر کلام میں ایسا نہ کرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

داڑھی شریف:

ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم كث اللحية رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں بال بکثرت تھے۔

آپ کی ریش مبارک کے بال اس کثرت سے تھے کہ جس سے آپ کا سینہ مبارک بھر گیا تھا اور ریش مبارک کی لمبائی میں کوئی معین انداز کتابوں میں نظر سے نہیں

گزرا۔ وظائف النبی میں کہا گیا ہے کہ حضور کی ریش مبارک طبعًا چار انگل تھی۔ اس سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس پر کوئی سند نہیں پائی جاتی اور داڑھی کا لمبا کرنا موجبِ حسن و جمال ہے، خصوصاً جب داڑھی گھنی ہو۔ واللہ اعلم۔

نیز یہ بات اس چیز کے مخالف ہے جو کہ شفا میں مذکور ہے اور اس روایت کے منافی ہے جو ترمذی کی حدیث میں آئی ہے کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک پکڑتے اور لبوں کو ترشواتے اور فرماتے جو لبوں کو نہ ترشوائے، وہ ہم میں سے نہیں۔''

صحیحین میں مذکور ہے کہ مشرکوں کی شکل کی مخالفت کرو اور ایک روایت میں ہے کہ مجوس یعنی آتش پرستوں کی مخالفت کرو اور بہت کرو۔ اور اپنی داڑھیوں کو بڑھاؤ اور لبوں کے پست کرنے اور اس کے ترشوانے میں مبالغہ کرو۔

عانہ شریف:

موئے زیر ناف صاف کرنے کے بارے میں بعض حدیثوں میں آیا ہے، مونڈتے تھے اور بعض میں آیا ہے کہ نورہ استعمال کرتے تھے۔ دونوں جانب کی حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ حمام تشریف لے گئے، نہ اسے دیکھا۔ حمام کا ظہور آپ کی رحلت کے بعد بلاد عجم فتح ہوتے وقت ہوا۔ لیکن حضور نے حمام کے ہونے کی خبر دے دی تھی اور عورتوں کو حمام میں جانے کی ممانعت کر دی تھی مگر کسی ضرورت کے تحت جیسے فصد، اور علاج وغیرہ ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن بعض روایتوں میں جمعرات کے دن لبیں اور ناخونہائے مبارک ترشواتے تھے۔ ناخونوں کے کاٹنے کی کیفیت میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ لیکن اتنی بات پائی جاتی ہے کہ ناخونوں کے کاٹنے کی ابتدا سبابہ یعنی انگشت شہادت سے فرماتے اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کرتے تھے۔ وہ نظم جو حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اس میں ہے ؎

قلم الاظفار بالسنة و الادب
یمنها خواسب یسارها اوخسب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک اور کنگھی کبھی جدا نہ فرماتے تھے۔ جب تیل ملتے تھے تو داڑھی شریف میں کنگھی فرماتے تھے اور اپنے جمال شریف کو آئینہ میں ملاحظہ فرماتے تھے۔ ''الحق'' آئینہ دیکھنا آپ ہی کو سزاوار ہے کیوں کہ آپ کا جمالِ جہاں آراءنور، مطلع نور الٰہی اور مظہر اسرار لا متناہی ہے ؎

ز آئینہ حسن ترا جدائی نیست
غرض تجلی حسن است خود نمائی نیست

صلی اللہ علیہ و آلہ قد حسنہ و جمالہ

گردن شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن شریف کے بارے میں ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

آپ کی گردن مبارک چاندی کی صفائی میں چمکدار اور دمیہ کی مانند تھی۔

''دمیہ''، بضم دال وسکون میم، وہ مجسمہ جو ہاتھی دانت سے تراشا گیا ہو'' کذا فی النہایۃ'' قاموس میں ہے وہ مجسمہ جو سنگ سفید سے تراشا گیا ہو۔ اگرچہ آپ کی گردن مبارکہ کی صنم یا مجسمہ سے تشبیہ دینے میں شان ادب کے خلاف نظر آتا ہے۔ لیکن چوں کہ اس کی کاریگری میں خوب آراستگی اور مبالغہ کیا جاتا ہے اس لیے اس سے تشبیہ دی گئی ہے ''کذا فی النہایۃ'' اور شمائل ترمذی کے حاشیہ میں ہے کہ ''الدمیۃ الغزال'' یعنی دمیہ غزال یعنی ہرن کو کہتے ہیں اور دوسرے حاشیہ میں دمیہ ہرن کے بچہ کو کہتے ہیں۔ لیکن لغت کی کتابوں میں یہ معنی نہیں پائے گئے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ آپ کی گردن مبارک سفید تھی گویا کہ چاندی سے بنائی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صفات میں سے یہ صفت علیحدہ ہے۔

مبارک کاندھے:

اس کے وصف میں واقع ہوا ہے کہ دونوں منکب کے درمیان دوری تھی۔

سینۂ مبارکہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک سینہ کشادہ اور محسوس تھا۔ یہ صورت ظاہری کے حلیہ کے بیان میں داخل ہے اس لیے اس قدر بیان ہے ورنہ صدر معنوی وہ ہے کہ جس کا ذکر آیت کریمہ میں یوں آیا ہے: ''الم نشرح لك صدرك'' اے محبوب کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہ فرمایا۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کا مقام بہت عالی ہے، کیوں کہ اس کا تمام وکمال، ذات بابرکات حضرت سید السادات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔

قلب اطہر:

مواہب لدنیہ میں قلب اطہر کا بھی ذکر آیا ہے (چوں کہ دل باطنی اعضا سے ہے اور یہاں اس کی ظاہری صورت سے بحث نہیں، اس لیے غور وفکر کرنا چاہیے۔ بعض روایتوں میں، نہ سینہ شکم سے بلند اور نہ شکم سینہ سے بلند تھا۔

بطن اطہر:

دونوں برابر اور ہموار تھے۔ حضرت ابن ام ہانی رضی اللہ عنہ نے آپ کے بطن شریف کی توصیف میں کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم اطہر کو دیکھا ہے۔ وہ گویا کاغذ تھا جنہیں لپیٹ کر تہہ کر کے ایک دوسرے پر رکھ دیا ہے۔

سینہ کے موئے مبارک:

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، سینہ مبارکہ کے موئے مبارک کی توصیف میں فرماتے ہیں کہ ''ذومسربۃ'' تھے۔ اور حدیث ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ میں دقیق مسربۃ ہے۔ مسربۃ ان بالوں کو کہتے ہیں جو سینہ کے اوپر سے ناف تک ہوں۔ یہ

باریک تھے لہٰذا اسے خط (ڈورا یا شاخ) سے تعبیر کرتے ہیں اور صراح میں مسربہ بضم را، سینہ وناف کے درمیان بالوں کو لکھا ہے بظاہر ''مسربۃ'' کا اشتقاق سرب ہے جس کے معنی راستے کے ہیں۔ صدر شکم کے علاوہ کہیں بال نہ تھے۔ لہٰذا اسی حدیث میں کہا گیا ہے آپ کے سینہ پر دونوں طرف اور شکم اطہر بجز اس قدر بالوں کے جنہیں سربۃ کہا جاتا ہے، خالی تھے۔ اور بیان کرتے ہیں کہ دونوں کلائیاں دونوں بازو، دونوں کندھے، سینہ مبارک کا بالائی حصہ، دونوں پنڈلیاں ٹخنے تک بال والے تھے۔ اور وہ جو آپ کے وصف شریف میں ''اجرد'' یعنی بالوں سے خالی ہونا واقع ہے، وہ اشعر کے مقابل ہے۔ اشعر اسے کہتے ہیں جس کے سارے بدن پر بال ہوں۔

بغل شریف:

آپ کی بغل شریف سارے بدن مبارک کی مانند سفید تھی۔ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام لوگوں کی بغل کا رنگ جدا اور اس میں سیاہی کی جھلک ہوتی ہے۔ اسی طرح قرطبی کے بیان میں اتنا زیادہ ہے کہ آپ کی بغل میں بال نہ تھے لیکن کچھ لوگ اس میں کلام کرتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہے۔ جلد کی سفیدی سے یہ لازم نہیں آتا کہ بغل میں بال ہی نہ ہوں۔ اور بعض حدیثوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغل کے بالوں کو اکھیڑ ڈالا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

پشت مبارک:

آپ کی پشت مبارک ایسی تھی جیسی پگھلی ہوئی چاندی یعنی پاک وصاف اور سفید ہموار۔

مہر نبوت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی کیوں کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔

مہر نبوت ایک ایسی ابھری ہوئی چیز تھی جو ہم رنگ بدن، مشابہ جسد اطہر اور صاف ونورانی تھی۔ اسی کو خاتم النبوۃ یا مہر نبوت کہتے ہیں۔ ''خاتم'' بکسر تاء ختم کا فاعل ہے جس کے معنی آخر میں پہنچ کر مکمل کرنا۔ اور فتح تاء سے بمعنی مہر وانگشتری کے ہے یعنی وہ چیز جو دلیل اس پر ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ آپ کو اسی نام کے ساتھ موسوم کرنے کا سبب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں آپ کی تعریف اسی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ وہ علامت ہے جس سے آپ پہچان لیے جائیں کہ آپ ہی وہ نبی آخر الزماں ہیں جس کی بشارت دی گئی ہے۔ مہر نبوت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں وہ عظیم نشانی ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص فرمایا۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا کہ کوئی مبعوث نہ ہوا مگر یہ کہ ان کے داہنے ہاتھ میں کوئی علامت نبوت ہوتی لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علامتِ نبوت، آپ کے دونوں شانوں کے درمیان تھی۔ کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے ۔

نبوت راتواں آں نامہ درمشت
کہ از تعظیم دارد مہر بر پشت

حضرت شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ آپ کی مہر نبوت میں لکھا ہوا تھا: اللہ وحدہ لاشریك لہ توجہ حیث کنت فانك منصور۔

اللہ یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ آپ جس حال میں بھی ہیں توجہ فرمایئے بلاشبہ آپ ہی فتح یاب ہیں۔

روایتوں میں مرقوم ہے کہ مہر نبوت نوری تھی جو چمکتی تھی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ مہر نبوت روپوش ہوگئی تھی اسی علامت سے معلوم ہوا کہ آپ نے وفات پائی ہے کیوں کہ لوگوں میں شبہ اور اختلاف واقع ہوگیا تھا یا اس لیے کہ دلیل نبوت تھی، اب اس کے اثبات کی حاجت نہ رہی تھی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بھید ہو جسے وہی خوب جانتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ بعد از وفات نبوت باقی

نہ رہی۔ کیوں کہ نبوت و رسالت موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

دست ہائے مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی توصیف میں شمائل ترمذی میں کہا گیا ہے کہ پنجہ دراز تھا۔ مٹھی بند (پنجہ) کی درازی کی تفصیل واضح نہیں کی گئی باوجود یہ کہ ممکن ہے کہ یہ مٹھی بند آپ کے دست مبارک میں دراز واقع ہوا ہو اور بعض روایات دونوں بازو اور کلائیاں فربہ (موٹی) تھیں اور ہتھیلی بھر پور اور مکمل تھی۔ آپ کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نرم تھیں اور موئے مبارک کی توصیف میں پہلے گزر چکا ہے کہ لٹکے ہوئے نرم بال طبرانی نے مستورد بن شداد سے روایت کیا ہے کہ اس نے اپنے والد سے پوچھا انہوں نے کہا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پہنچا اور میں نے آپ کے دستِ اقدس کو چھوا (مصافحہ کیا) آپ کا دستِ مبارک ریشم سے زیادہ نرم اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اور بخاری میں حضرت انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے زیادہ نرم، حریر و دیبا کو نہ پایا۔ حالانکہ حریر تمام ریشمی کپڑوں میں سب سے زیادہ نرم ہوتا ہے اپنے ہاتھ میں درشتی اور سختی کس طرح جمع ہو سکتی ہے۔ ہاں نرمی، فربہی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے جس طرح کہ آپ کا تمام بدن اقدس نرم، لطیف، فربہ اور قوی تھا۔ اسی طرح دستِ مبارک کی ہتھیلیاں بھی نرم اور پر گوشت تھیں۔

قدم مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدم مبارک نرم اور فربہ تھے جس طرح آپ کے دونوں قدم مبارک ہموار تھے، جن میں آلودگی اور شکستگی بالکل نہ تھی۔ ''ینبو عنہما الماء'' اگر اس پر پانی ڈالا جائے تو اپنی لطافت و پاکیزگی کی وجہ سے بہہ جائے اور تیزی سے پانی گزر جائے۔ اور ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ زمین پر قدم مبارک رکھ کر چلتے تو پورے قدم رکھ کر چلتے اور ابھری ہوئی جگہ نہ تھی۔ اسے بیہقی نے روایت کیا اور ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کے پائے اقدس میں ابھار نہ تھا اور زمین پر پورا قدم مبارک رکھتے۔ اسے ابن عساکر نے بیان کیا اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مسیح اسی معنی میں کہا جاتا ہے کیوں کہ ان کے پائے مبارک میں بھی ابھار نہ تھا۔ واللہ اعلم اور ان کے نزدیک تیزی سے پانی بہہ جانا یہ جداگانہ وصف ہے۔

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ فرمایا:

”کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن البشر قدما“ رواہ ابن سعد

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کی ظاہری شکل بہت حسین تھی۔

اور آپ کی ایڑیوں کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کی ایڑیوں پر گوشت کم تھا۔

پنڈلیاں شریف:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیوں کے بارے میں ہے کہ آپ کی دونوں پنڈلیاں باریک ولطیف تھیں پر گوشت نہ تھیں۔ میں نے آپ کی پنڈلی کی طرف نظر ڈالی تو وہ گویا درخت خرما تھا۔

قامت زیبا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قامتِ زیبا یعنی قد مبارک، باغ قدس اور بوستان انس کی شاخ تھا یعنی لطیف، درست اور چست تھا۔ نہ کوتاہ، نہ بہت دراز لیکن مائل بہ درازی تھا لہٰذا حدیث میں آیا ہے کہ آپ قوم میں متوسط القامت تھے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ پستہ قد سے طویل قامت اور طویل قامت سے کوتاہ تھے۔ مطلب یہ کہ پستہ دراز تر اس بنا پر کہ مائل بجانب درازی تھے۔

بے سایہ وسائبان عالم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ نہ آفتاب کی روشنی میں، نہ چاند کی طلعت میں۔ اسے حکیم ترمذی نے ذکوان سے ”نوادر الاصول“ میں روایت کیا ہے۔ ان بزرگوں پر تعجب ہے کہ چراغ کی روشنی کا ذکر نہ فرمایا۔ ”نور“ آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ہے۔ اور نور کا سایہ نہیں ہوتا مولانا جامیؔ نے خوب کہا ہے ؎

امی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایۂ وسائبان عالم

رنگ مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ مبارک روشن وتاباں تھا۔ جمہور صحابہ کا اتفاق ہے کہ آپ کا رنگ مبارک مائل بہ سفیدی تھا۔ سفیدی کے ساتھ ہی آپ کی تعریف وتوصیف کی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سپید رنگ، ملیح بشرہ تھا۔ اس توصیف سے مراد، سفیدی وملاحت ہے حالانکہ ملاحت، آپ کے حسن وجمال اور دیدار جانفزا کی دلربائی ولذت بخشی کے اظہار بیان کے لیے علیحدہ صفت ہے۔ یا خالص سفیدی بغیر نمکینی جسے ابہق کہتے ہیں اس سے بچنے کے لیے ہو۔ اور ابہق کی تفسیر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابہق وہ سفیدی ہے جس میں نہ سرخی ہو، نہ زردی اور نہ گندم گول ہو اور اس سفیدی کے مشابہ ہے جو برص کے مریضوں کے چہرہ پر ہوتی ہے اور جست کے ہم رنگ ہو۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کا چہرۂ انور بہت سفید اور آپ کے موئے ہائے مبارک سخت سیاہ تھے۔ ابو طالب کے اس شعر میں جو انہوں نے آپ کی مدح میں کہا ہے اس میں ہے کہ ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل

یعنی آپ کے چہرۂ انور کی سفیدی سے برسنے والا سفید بادل بارش کی بھیک مانگتا ہے اور آپ یتیموں بیواؤں کی پرورش فرمانے والے ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ آپ کا رنگ سفید مشربی تھا۔ مشرب اس شراب کو کہتے ہیں جس میں ایک رنگ میں دوسرے رنگ کی آمیزش ہو۔ گویا کہ ایک رنگ پلا کر دوسرا رنگ پلا لیا گیا ہو۔ اس جگہ مشرب سے مراد سرخی ہے۔ دوسری روایت میں تصریح بھی آئی ہے کہ آپ کا رنگ سرخ وسفید تھا۔ اور بعض نے ''از ہر اللون'' کہا ہے جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ اس کی بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد چمک اور تابانی ہے۔

چال و رفتار مبارک:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار مبارک کے متعلق حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو جھک کر چلتے گویا کہ اوپر سے اتر رہے ہیں۔

جس طرح پھولوں والی ٹہنی جھکتی ہے اور قدم مبارک چستی طاقت اور سرعت کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر ہمیشہ پورا قدم رکھتے تھے ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ کی رفتار قوت سے بھرپور بے استرخاء وسستی اعضاء تھی۔ حضرت علی مرتضیٰ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ آپ چلتے میں زمین سے پورا قدم اٹھاتے اور کشادہ رکھتے اور آسان وسبک اور تیز بغیر حرکت واضطراب کے چلتے۔ اور ان کا قول گویا کہ زمین کی بلندی سے اس کے نشیب وپستی میں اتر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ تمثیل پورے قدم پاک کے اٹھانے کی قوت کے لیے ہے، نہ کہ سبکی تحریک اور اضطراب کے لیے ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو راہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز تر چلتے نہیں دیکھا۔ گویا کہ زمین آپ کے قدموں

کے نیچے پھٹی جاتی تھی اور ہم آپ کی ہمراہی میں تکان اور محنت محسوس کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کے لیے ہمیں دوڑنا پڑتا تھا جس سے ہمارے سانس پھول جاتے تھے لیکن آپ کو کچھ بھی محسوس نہ ہوتا تھا اور آپ معمول کے مطابق بے تکلف چلتے تھے اور اصلاً اضطراب نہ فرماتے تھے۔ یہ چلنا اولوالعزم اہل ہمت اور شجاعت کا آئینہ دار ہے اور یہ چلنا اقسام رفتار میں قوی واعتدال پر ہے اس سے اعضاء کو راحت وآرام ملتا ہے۔ آپ کبھی نعلین مبارک پہن کر چلتے اور کبھی بغیر نعلین کے۔ کبھی آپ پا پیادہ چلتے اور کبھی سواری پر، خصوصاً غزوات میں ؎

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن بناز
آں سرو من پیادہ خوش است وسوار خوش

اور جب آپ صحابہ کرام کے ساتھ چلتے تو صحابہ کو اپنے آگے چلاتے اور خود ان کے پیچھے رہتے۔ فرماتے میری پشت کو فرشتوں کے لیے خالی چھوڑ دو۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ اپنے اصحاب کو آگے چلاتے تھے۔ آپ سفر میں تمام صحابہ کو بھیجنے کے بعد روانہ ہوتے اور ناتواں وکمزوروں کو سہارا دیتے اور رہ جانے والوں کو سوار فرماتے کبھی پیچھے بٹھا لیتے تھے۔

پسینہ وفضلات کی خوشبو:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرالی وعجیب صفتوں میں سے ایک پاکیزہ وطیب خوشبو ہے۔ یہ آپ کی ذاتی تھی۔ کسی قسم کی خوشبو استعمال کیے بغیر ہی دنیا کی کوئی خوشبو آپ کے جسم اطہر کی خوشبو سے ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ہر ایک خوشبو خواہ مشک ہو یا عنبر سونگھی ہے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبوئے اطہر سے زیادہ کوئی نہ تھی اور ام عاصم زوجہ عتبہ بن فرقد سلمی رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم چار عورتیں عتبہ کی زوجیت میں تھیں اور ہم میں سے ہر ایک یہی کوشش کرتی کہ زیادہ سے زیادہ خوشبو میں بس کر عتبہ کے قریب

جائیں۔ہم سب اس کوشش میں خوب خوشبو کا استعمال کرتے۔لیکن ہم میں سے کسی کی خوشبو عتبہ کی خوشبو تک نہ پہنچتی تھی۔حالانکہ عتبہ رضی اللہ عنہ خوشبو کو بھی اسی حد تک استعمال کرتے تھے کہ روغن کو اپنے ہاتھوں سے چھواتے اور اسے اپنی داڑھی پر ملتے مگر اس کی خوشبو ہم سب پر غالب رہتی۔اور جب عتبہ رضی اللہ عنہ باہر جاتے تو لوگ کہتے کہ ہم خوشبو استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی خوشبو عتبہ کی خوشبو سے زیادہ تیز نہیں ہے۔ام عاصم کہتی ہیں کہ میں نے ایک دن عتبہ سے کہا ہم سب خوشبو کے استعمال میں خوب کوشش کرتے ہیں لیکن تمہاری خوشبو تک ہماری خوشبو نہیں پہنچتی۔اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ مجھے ''شریٰ''، یعنی گرمی دانے جسے پت کہتے ہیں، نکل آئے تھے۔(اس مرض میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارے بدن میں چنگاریاں لگی ہوئی ہیں) تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر اپنے اس مرض کی شکایت کی تاکہ علاج فرمادیں۔اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے بدن سے کپڑے اتار دو۔تو میں کپڑے اتار کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔پھر آپ نے اپنا دست مبارک میری پشت و شکم پر ملا۔اس وقت سے یہ خوشبو مجھ میں پیدا ہوگئی ہے۔اسے طبرانی نے معجم صغیر میں روایت کیا۔

ایک شخص نے اپنی لڑکی کو اس کے شوہر کے گھر بھیجنے کے لیے خوشبو کی جستجو کی مگر اسے نہ مل سکی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس لیے عرض حال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خوشبو عطا فرمادیں مگر کوئی خوشبو موجود نہ تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیشی طلب فرمائی تاکہ اس میں خوشبو ڈال دی جائے۔پھر آپ نے اپنے جسم اقدس سے پسینہ لے کر اس شیشی میں بھر دیا اور فرمایا جاکر اسے اپنی لڑکی کے جسم پر مل دو۔جب اسے ملا گیا تو سارا مدینہ اس کی خوشبو سے مہک گیا تھا اور اس گھر کا نام ہی ''بیت المطیبین''خوشبو کا گھر رکھ دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور دوپہر کے وقت قیلولہ فرمایا۔چوں کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت پسینہ آیا کرتا تھا تو میری والدہ نے جن کا نام ام سلیم ہے شیشی لے کر آپ کا پسینہ مبارکہ اس میں جمع کرنے لگیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔فرمایا اے ام سلیم! کیا کر رہی ہو۔عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا پسینہ مبارکہ جمع کر رہی ہوں تاکہ میں بطور خوشبو استعمال کروں کیوں کہ اس کی خوشبو سب سے زیادہ بہتر ہے۔(رواہ مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی صحابی بقصد حضوری آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور آپ کو کاشانۂ اقدس میں نہ پاتا تو راہ میں آپ کی اس خوشبو کو سونگھتے جو آپ کی گزرگاہ ہونے کے سبب راہ میں پھیلی ہوئی تھی۔مدینہ منورہ کے جس جس کوچے میں وہ خوشبو محسوس کرتے تھے، چلتے جاتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس راہ گزرے ہیں۔

آج بھی مدینہ منورہ کے در دیوار سے آپ کی خوشبوئے جانفزا کی لپٹیں آرہی ہیں جس سے مجنوں کے دماغِ محبت معطر ہوجاتے ہیں۔شاید کہ ایک شمہ اس خوشبو کا بعض غریب و مشتاق اور مفلس و نادار مسافروں کے شامہ ذوق کو بھی میسر ہو۔

دست مبارک کی خوشبو:

آپ کے دستِ مبارک کی توصیف میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نے میرے رخسار پر اپنا دست مبارکہ پھیرا تو میں نے ایسی ٹھنڈک اور خوشبو پائی کہ گویا آپ نے ابھی عطر کی ڈبیہ سے اپنا دستِ اقدس نکالا ہے۔جو کوئی بھی آپ سے مصافحہ کرتا، وہ تمام دن اپنے ہاتھوں میں خوشبو پاتا۔آپ جس بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھتے، وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے تمام بچوں میں ممتاز و معروف ہوجاتا۔

بوقت قضائے حاجت زمین کا شق ہوجانا:

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کا ارادہ فرماتے تو زمین

میں شگاف پڑ جاتا اور زمین آپ کا بول و براز اپنے اندر سمو لیتی اور اس جگہ ایک خوشبو پھیل جاتی تھی۔ آپ کے براز کو کسی نے بھی نہ دیکھا۔ سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علی وسلم استنجا کر کے بیت الخلا سے تشریف لاتے تو میں جا کر دیکھتی تو اس جگہ از قسم براز کچھ نہ دیکھتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ تم نہیں جانتیں، انبیاء کرام علیہ السلام سے جو کچھ ان کے بطنِ اطہر سے نکلتا ہے، زمین اُسے نگل جاتی ہے چنانچہ اسے دیکھا نہیں جاتا۔

ایک صحابی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے ایک جگہ تشریف لے گئے جب آپ واپس تشریف لے گئے تو میں اس جگہ گیا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فراغت فرمائی تھی۔ میں نے اس جگہ بول و براز شریف کا کوئی نشان تک نہ دیکھا۔ البتہ چند ڈھیلے وہاں پڑے تھے میں نے اُسے اٹھا لیا تو اس سے نہایت لطیف و پاکیزہ خوشبو آ رہی تھی۔

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے شفا میں فرمایا ہے کہ اہل علم کی جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''حدثین'' یعنی بول یا براز فرمانے کے بعد وضو کرنے کی قائل ہے اور یہی قول بعض اصحاب امام شافعی رحمۃ اللہ کا ہے۔

بول مبارک:

اب رہی بول مبارک کی کیفیت تو اس کا بکثرت صحابہ نے مشاہدہ کیا ہے اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہ جو آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھیں، انہوں نے اسے پیا بھی ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت مبارک کے نیچے پیالہ رکھا جاتا کہ رات میں اس میں بول مبارک فرما دیں۔ چنانچہ ایک رات جب آپ نے اس میں بول مبارک فرمایا اور صبح ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس تخت کے نیچے ایک پیالہ ہے، اسے

زمین کے سپرد کر دو۔ مگر انہوں نے کچھ نہ پایا۔ ام ایمن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا خدا کی قسم رات مجھے پیاس معلوم ہوئی، میں نے اُسے پی لیا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور نہ انھیں اپنا منہ دھونے کا حکم فرمایا اور نہ دوبارہ ایسا کرنے سے منع فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ اب تمہیں کبھی پیٹ کا درد لاحق نہ ہوگا (خوشا نصیب)۔

ایک عورت تھی جس کا نام برکہ رضی اللہ عنہا تھا، وہ بھی آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھی۔ اس نے بھی آپ کا بول شریف پی لیا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ام یوسف (یہ اس کی کنیت تھی) تم ہمیشہ کے لیے تندرست بن گئیں، کبھی بیمار نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ عورت کبھی بیمار نہ ہوئی بجز اس بیماری کے جس میں اس نے دنیا سے کوچ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کا بول شریف پی لیا تھا تو اس کے جسم سے ہمیشہ خوشبو مہکتی رہی حتی کہ اس کی اولاد میں کئی نسلوں تک یہ خوشبو رہی۔ مواہب اور شفا میں یہ دونوں روایتیں مذکور نہیں ہیں۔

مصطفےٰ جانِ رحمت کا ذکرِ ولادت

سید العابدین سید شاہ اولادِ رسول
مارہروی قدس سرہٗ

بسم الله الرحمن الرحيم
نحمده و نصلی علی رسوله الكريم

مسلمانوں کولازم ہے اس زمانۂ پرآشوب میں اپنے نبی آخرالزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل کے بیان سے تجدید اور تقویت ایمان کرتے رہیں۔ پہلے جاننا چاہیئے کہ باعث آفرینش کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے: اول ماخلق الله نوری یعنی سب سے پہلے جو چیز خدا نے بنائی وہ میرا نور ہے۔ اور یہ بات باتفاق ثابت ہے کہ خدا نے اپنے نور سے تمام مخلوقات سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو پیدا کیا اور وہی نور باعث آفرینش تمام مخلوقات کا ہوا۔ اور بعد سجدہ کرنے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد ہوا۔ میں نے اسی لئے تجھ کو پیدا کیا اور تیرا نام محمد رکھا ابتدائے خلق کروں گا میں تجھ سے اور رسولوں کو ختم کروں گا میں تجھ پر۔ بعد اس کے خالق کون ومکان نے نور پر ظہور سے چار حصے فرمائے۔ پہلے سے عرش دوسرے سے کرسی تیسرے سے لوح چوتھے سے قلم پیدا کیا۔ بعد ازاں قلم کو حکم ہوا لکھ اے قلم توحید میری۔ قلم نے کلمہ لا اله الا الله لوح پر لکھا۔ بعد اس کے حکم ہوا لکھ حال امتوں کا۔ اس طرح سے امت آدم کی جو

کوئی اطاعت کرے گا داخل کرے گا خدا اس کو بہشت میں اور جو کوئی نافرمانی کرے گا داخل کرے گا خدا اس کو دوزخ میں۔ اسی طرح سے اس منشی دیوان قضا نے آدم ونوح اور ابراہیم علیہم الصلوۃ والسلام کی امت سے لے کر تا امت موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوۃ والسلام لکھا۔ بعد اس کے جب نوبت امت بابرکت حضرت خاتم النبیین افضل المرسلین صلوٰۃ اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین کی آئی۔ قلم سابق کی طرح لکھنے لگا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کوئی فرماں برداری کرے گا اور حکم مانے گا خدا کا داخل ہوگا بہشت میں اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اور کہا نہ مانے گا خدا کے قلم نے اس قدر لکھا اور چاہتا تھا کہ لکھے کہ داخل کرے گا خدا اس کو دوزخ میں۔ ہنوز قلم نے یہ لکھا نہ تھا کہ پروردگار نے فرمایا تادب یا قلم تادب یا قلم ادب کر اے قلم ادب کر اے قلم۔ یہ خطاب سن کر قلم شق ہوا اور لکھنے سے رکا اور ہزار برس تک کانپا کیا اور اپنی جسارت سے شرمندہ ہوا۔ پھر اس میں دست قدرت سے قط لگا اور حکم ہوا لکھ امة مذنبة ورب غفور۔ امت گنہگار ہے اور پروردگار غفار ہے۔ قلم نے یہ لکھا۔ سبحان اللہ! اس مقام سے مرتبہ اور شرف حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوۃ والثنا کا سمجھنا چاہیئے کہ جن کے طفیل سے ان کی امت کے حق میں قبل ایجاد عالم اور آدم کے یوں نوازش اور مہربانی فرمائی۔ مسلمانوں کو لائق ہے کہ ایسے نبی محبوب کی محبت میں دل اور جان اور مال سے مشغول رہیں اور اس کی اطاعت سے قدم باہر نہ رکھیں اور ہمیشہ درود اور سلام بھیجا کریں۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　　عَلٰی نَبِیِّكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

روضۃ الاحباب میں لکھا ہے کہ جس وقت خداوند کریم نے سیدنا آدم کو پیدا کیا اور قالب خاکی ان کا بن کر مرتب ہوا۔ کارگزاران قضا وقدر کو حکم فرمایا کہ نور محمدی کو پیشانی آدم علیہ السلام میں امانت رکھو۔ اور فرمایا اے آدم! یہ نور تیرے فرزندوں میں بہتر اور مرسل پیغمبروں کا سرور ہے اور کتب سیر وتواریخ میں مسطور ہے کہ حق تعالیٰ نے نور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے نور سے پیدا کر کے سر عظمت میں ذخیرہ کیا اور اسم

مبارک حضرت کا عرش پر لکھا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور وہ ان کے صلب میں امانت سونپی گئی۔ آدم علیہ السلام اپنی پشت سے آواز طیر خوش آہنگ سننے لگے۔ حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ فرمایا کہ یہ صدا ہدایت ندا تسبیح خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے کہ تیری پشت سے ان کو پیدا کروں گا اور اصلاب طیبہ طاہرہ میں رکھوں گا۔ پھر آدم علیہ السلام نے عرش کی طرف نگاہ کی دیکھا کہ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) لکھا ہے۔ عرض کی اے پروردگار! یہ کس کا اسم شریف ہے کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ ملایا۔ حکم ہوا کہ یہ نام سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے کہ تیری اولاد سے ہوگا۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی نَبِیِّكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمُ

راقم الحروف کہتا ہے کہ روایات تو بہت ہیں مگر صحیح روایت روضۃ الاحباب اور مدارج النبوۃ اور کتب ہائے سیر میں لکھا ہے کہ تحویل نطفہ زکیۂ محمدیہ کے صلب عبد اللہ سے صدف رحم آمنہ ایام حج میں درمیان اوسط ایام تشریق شب جمعہ کو ہوئی۔ اس سبب سے امام احمد بن حنبل شب جمعہ کو فاضل تر لیلۃ القدر سے کہتے ہیں کہ خیرات اور برکات اور کرامات اور سعادات کہ اس رات میں اہل عالم پر فائز اور نازل ہوئیں، کسی اور رات میں تا دور قیامت نازل اور فائز نہ ہوں گی اور بہمیں جہت شب میلاد حضرت کی بہتر شب قدر سے ہوئی۔ اخبار میں آیا ہے کہ اس رات ملک اور ملکوت میں منادی ہوئی کہ تمام عالم کے بانوار قدس منور اور فرشتہ زمین و آسمان کے اظہار سرور اور ابتہاج یکسر کریں اور جبرئیل کو حکم ہوا کہ علم سبز محمدی لے کر فرشتوں کے ساتھ دنیا میں جائیں اور اس علم کو سقف کعبہ پر کھڑا کریں اور ساری دنیا میں خوشخبری دیں کہ نور محمدی نے رحم آمنہ میں قرار پایا۔ بہترین خلائق اور امتوں پر مبعوث ہوگا۔ خوشا نصیب اس امت کے کہ محمد سا پیغمبر ہوا اور خازن بہشت کو حکم ہوا کہ دروازہ فردوس بریں کھولیں اور بفوائح وروائح معطر کرے اور جمیع طبقات سماوات اور بقاع زمین کو بشارت دے کہ

آج کے دن نور محمدی رحم آمنہ میں آیا۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات کو چار پایوں روئے زمین کو گویا کیا اور سب نے کہا بخدائے کعبہ کہ محمد یعنی نطفہ ان کا شکم مادر میں آیا۔ اس رات وحوش وطیور آپس میں بشارت دینے لگے اور اسی طرح اہل دریا ایک دوسرے کو خوشخبری سناتے تھے اور کہتے تھے کہ وقت وہ آیا کہ ابو القاسم پیدا ہوں۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی نَبِیِّكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمُ

روضۃ الاحباب میں لکھا ہے کہ پیش از انکہ آمنہ حاملہ ہوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے، قریش بلائے قحط اور خشک سالی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ درخت باغوں کے خشک اور چار پائے لاغر۔ جس وقت آمنہ حامل ہوئیں، مینھ خوب برسا اور نہریں جاری ہوئیں۔ درخت سرسبز اور شاداب ہوئے۔ حق تعالیٰ نے ان کے سبب سے سب اہل مکہ پر ارزانی فرمائی اور بی بی آمنہ سے روایت ہے کہ چھ مہینے تک مجھ کو آثار حمل نہ معلوم ہوئے مگر بعد چھ مہینے کے کسی شخص نے خواب میں کہا کہ آمنہ تو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاملہ ہے، جب مجھے یقین ہوا کہ میں حاملہ ہوں۔ مدارج النبوۃ میں مرقوم ہے کہ وفات فرمانا سید عبد اللہ کا مدینہ منورہ میں ہوا اور آپ واسطے تجارت کے کسی قریش کے ساتھ گئے تھے سو قضاء الٰہی سے بیمار ہوئے اور وفات پائی۔ عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ جب عبد اللہ نے وفات پائی۔ فرشتوں نے کہا یتیم ہوا پیغمبر اور حبیب تیرا حق تعالیٰ نے فرمایا میں حافظ اور نصیر اور کفیل اس کا ہوں درود اور سلام اس پر بھیجو اور برکات اس کے حق میں چاہو اور دعا کرو۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی نَبِیِّكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمُ

مولد ابن جوزی محدث میں لکھا ہے کہ جس وقت حضرت آمنہ کو درد زہ پیدا ہوا تنہائی سے گھبرا کر خدا کی جانب میں رجوع کیں اور کہنے لگیں کاش بیٹیاں عبد مناف اس وقت میرے پاس ہوتیں یہ کہتی ہیں کہ کیا دیکھتی ہیں کہ عورتیں خوب صورت اس

قدر حاضر ہوئیں کہ سارا گھر بھر گیا اور وہ عورتیں کہنے لگی کہ ہم حوریں ہیں حق تعالی نے
بہشت سے تمہاری خدمت کے واسطے ہم کو بھیجا ہے اور ہم سب تم پر فدا ہیں ۔ بی بی
آمنہ فرماتی ہیں کہ وہ حوریں وقت پیدا ہونے آنحضرت کے بیٹھی رہیں اور میری خاطر
جمع کرتی رہیں اور حضرت آمنہ سے روایت ہے کہ وقت دردِزہ کے اور قریب زمانہ
ولادت ایک آواز دہشت ناک سننے لگیں کہ جس کے سننے سے خوف اور ترس
نہایت مجھ کو معلوم ہوا پھر دیکھا کہ میں نے ایک مرغ سفید پیدا ہوا اور اس نے اپنے
بازو میری پیٹھ سے ملے ۔ وہ خوف اور ترس سب مجھ سے دور ہوا پھر وہ مرغ ایک جوان
نرم و نازک خوش شکل اور اس کے ہاتھ میں پیالہ شراب طہور کا تھا میرے روبرو رکھا
سپید زیادہ دودھ سے اور میٹھا زیادہ شہد سے وہ پیالہ میرے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ پی ۔
میں نے پیا ۔ پھر اس نے میرے پیٹ کی طرف ہاتھ پھیلایا اور اس کو ملنے لگا اور کہنے لگا
کہ اظھر یاسید المرسلین اظھریا سید العلمین اظھر یا خاتم النبیین اظھر
یا رحمة للعالمین اظھر یا نبی اللہ اظھر یا رسول اللہ اظھر یا خلیق اللہ
اظھر یا نورا من نور اللہ بسم اللہ اظھریا محمد بن عبداللہ فظھر صلی اللہ
علیہ و سلم کا لبدر المنیر بارہویں تاریخ ربیع الاول کی صبح صادق کے وقت دوشنبہ
کے دن محمد رسول اللہ پیدا ہوئے ۔ الصلوۃ والسلام علیك یا رسول اللہ الصلوۃ
والسلام علیك یا نبی اللہ الصلوۃ والسلام علیك یاحبیب اللہ ۔ بی بی آمنہ
سے روایت ہے کہ جب حضرت پیدا ہوئے چار عورتیں آسمان سے اتریں میں ان کو
دیکھ کر ڈری اور کہا میں نے کون ہو تم کس کی عورتیں ہو؟ انہوں نے کہا کہ اے آمنہ تم نہ
ڈرو اور خوف نہ کرو ایک بولی کہ میں حوا ام البشر ہوں، دوسری نے کہا میں سارہ ام
اسحاق ہوں، تیسری بولی کہ میں ہاجرہ ام اسمٰعیل ہوں، چوتھی کہنے لگی کہ میں آسیہ بنت
مزاحم ہوں ۔ حوا کے پاس طبق سونے کا تھا اور سارہ کے پاس ابریق نقرہ اور اس میں
آب کوثر اور ہاجرہ کے پاس عطر تھا عطر بہشت سے اور آسیہ کے پاس مندیل سبز تھی ۔
حضرت کو غسل دے کر بی بی آمنہ کی گود میں دیا پھر حضرت نے سجدہ کیا اور کہا یا رب

ھب لی امتی اے پروردگار بخش تو واسطے میں میرے میری امت کو ۔ حق تعالی نے
فرمایا وھبتك امتك بـا علی ھمتك بخشا میں نے تیری امت کو بسبب بڑی ہمت
تیری کے اور فرمایا حق تعالی نے گواہ رہو فرشتو میرے کہ دوست میرا نہ بھولا اپنی امت
کو وقت ولادت کے پھر کیونکر بھولے گا اپنی امت کو دن قیامت کے اَلصَّلٰوۃُ وَ
السَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا   عَلٰی نَبِیِّكَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمْ

کتب سیر میں بی بی آمنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت پیدا ہوئے اور
سجدہ کیا اور انگشت تسبیح آسمان کی طرف اٹھائی جیسے کوئی عاجزی کرتا ہے پھر بی بی آمنہ
کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک پارۂ ابر سفید آسمان سے اترا اور حضرت کو لپیٹ کر
اٹھا لے گیا اور میرے سامنے سے غائب ہو گیا ۔ سنتی ہوں کہ منادی ندا کرتا ہے کہ ان کو
بطرف مشرق اور مغرب زمین کے پھراؤ اور موالید انبیاء میں رکھو تا کہ ان کے حق میں
دعائے برکت کریں اور جامہ ملت حنیفہ کا پہناؤ اور حضرت ابراہیم پر عرض کرو اور دریا
اور صحرا پر گذراؤ تا کہ ان کا نام اور صفت پہچانے اور تحقیق نام ان کا ماحی ہے یعنی
مٹانے والا کفر اور شرک اور بدعت کے پھر بی بی آمنہ کہتی ہیں کہ کشادہ ہوا ابر اور لپیٹا
حضرت کو پارۂ حریر سبز میں اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت آمنہ کہتی ہیں کہ بعد
ایک ساعت کے حضرت کو پھر لائے ایک جامہ سپید صوف میں لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے
اور گوینده کہتا تھا کیا خوب کیا خوب مقرر ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا پر یہاں
تک کہ باقی نہ رہے کوئی مخلوق اہل دنیا سے پھر بی بی آمنہ کہتی ہیں کہ دیکھا میں نے
حضرت کو گویا ماہ شب چہاردہم ہیں اور بو مشک کی آپ کے بدن سے آتی تھی اور دیکھا
میں نے تین آدمیوں کو ایک ہاتھ میں ابریق چاندی کا اور دوسرے کے ہاتھ میں طشت
زمرد کا اور تیسرے کے ہاتھ میں حریر سفید تھا پھر نکالی ایک انگشتری کہ اسکے نظارۂ
صفا میں ابصار نظارین کے حیران ہوتے تھے پھر دھویا حضرت کو سات بار اور رکھا ایک

ساعت تک پھر مجھ کو سونپا حضرت عبد المطلب سے منقول ہے کہ میں شب ولادت
حضرت کے خانہ کعبہ میں تھا۔ نیم شب کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں گوشۂ دیوار خانہ کعبہ
بمقام ابراہیم مائل ہوئے اور سجدہ کیا اور آواز تکبیر ان سے بلند ہوئی کہ الله اکبر الله
اکبر رب محمد ن المصطفیٰ الا ن قد طھر نی ربی من انجاس الا صنام و
ارجاس المشرکین یعنی اللہ اکبر پروردگار محمد مصطفیٰ کا اب تحقیق پاک کیا مجھ کو میرے
رب نے ناپاکی بتوں سے اور پلیدی مشرکوں سے اور بت کہ پیرامون خانہ کعبہ تھے
پارہ پارہ ہوئے اور کلاں تر سب بتوں کا نام اس کا ہبل تھا منھ کے بل گر پڑا آواز آئی
کہ آمنہ سے محمد پیدا ہوئے اور سحاب رحمت اور طشت فردوس سے آیا کہ ان کو دھوئے
۔عبد المطلب کہتے ہیں کہ یہ جو میں نے دیکھا اپنی آنکھوں کو ملنے لگا کہ خواب ہے یا
بیداری ہے۔ جب تامل کیا معلوم ہوا کہ میں جاگتا ہوں اور جو کچھ دیکھا سو بیداری
میں دیکھا۔ بعد اس کے عبد المطلب خانہ کعبہ سے متوجہ خانہ آمنہ ہوئے۔ دروازہ
بند پایا پکارا کہ اے آمنہ دروازہ کھولو۔ حضرت آمنہ نے دروازہ کھولا۔ عبد المطلب
کہتے ہیں کہ جب دروازہ کھولا پہلے نگاہ میری آمنہ کے منھ پر پڑی اثر اس نور کا آمنہ
کے چہرہ پر نہ پایا بیطاقت ہوا اور کہا اے آمنہ وہ نور کیا ہوا؟ آمنہ بولیں کہ میرا فرزند
پیدا ہوا۔ عبد المطلب نے کہا میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو دیکھوں اور اس کے جمال با
کمال سے مسرور ہوں۔ آمنہ نے جواب دیا کہ ابھی آپ اس کو نہیں دیکھ سکتے ہیں۔
عبد المطلب نے کہا کیا سبب؟ آمنہ نے یہ قصہ کہا کہ جس وقت حضرت پیدا ہوئے
ایک شخص میرے پاس آیا کہ قد اس کا مانند درخت خرمے کے تھا اور کہا کہ اس لڑکے کو
گھر سے باہر نہ نکالنا اور تین دن تک کسی آدمی کو نہ دکھانا۔ عبد المطلب یہ سن کر غصہ میں
آئے اور تلوار کھینچ کر کہنے لگے کہ آمنہ فرزند دلبند کو جلدی دکھلاؤ نہیں تو تم کو یا آپ کو
ہلاک کرتا ہوں۔ جب آمنہ نے یہ حال عبد المطلب کا دیکھا گھبرا کے کہا فلاں مکان
میں جا کے دیکھو۔ عبد المطلب نے قصد اس مکان کا کیا۔ اندر سے ایک شخص نہایت

باعظمت و ہیبت ظاہر ہوا۔ عبد المطلب کہتے ہیں کہ اس طرح کا شخص میں نے کبھی نہیں
دیکھا تھا۔ شمشیر برہنہ اس کے ہاتھ میں مجھ پر حملہ کیا اور کہا ثکلتك امك روئے تجھ کو
تیری ماں کہاں آتا ہے۔ عبد المطلب نے جواب دیا کہ اس گھر میں آتا ہوں اپنے
فرزند کو دیکھنے کے لئے۔ وہ شخص بولا الٹے پاؤں پھر جا کہ جب تک فرشتہ اس کی
زیارت سے مشرف نہ ہولیں گے کوئی بنی آدم اس کو نہ دیکھے گا۔ عبد المطلب کہتے ہیں
کہ اس وقت لرزہ میرے بدن پر طاری ہوا اور ہاتھ سے میرے تلوار گر پڑی اور میں
باہر آیا کہ قریش کو اس کے حال سے خبردار کروں ہر چند چاہا کہ بیان کروں ہرگز طاقت
نہ پائی کہ اس کو بیان کروں۔ القصہ عبد المطلب نے جب حضرت کو دیکھا بہت خوش
ہوئے اور ان کو اٹھا کے خانہ کعبہ میں لے گئے اور حق تعالیٰ کی پناہ میں سونپا اور محمد نام
رکھا اور دروازہ کعبہ پر کھڑے ہو کر شکر خدا کا بجالائے پھر عبد المطلب حضرت کو وہاں
سے آمنہ کے پاس لائے اور ان کی محافظت کے لئے نہایت تاکید کی اور کہا اس
میرے فرزند کی بڑی شان ہوگی۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَـا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًـا اَبَدًا　　عَـلٰی نَبِیِّكَ خَیْـرِ الْـخَلْقِ كُلِّهِمُ

مدارج النبوۃ میں مرقوم ہے کہ پہلے حضرت ثوبیہ کنیز ابولہب نے دودھ پلایا
اور یہ کنیز وہ ہے جس نے حضرت کے تولد کی خبر ابولہب کو دی اور کہا خوشخبری تم کو کہ
تمہارے بھائی عبد اللہ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ ابولہب یہ بات سن بہت کر خوش ہوا
اور اس مژدہ کی عوض میں ثوبیہ کو آزاد کیا اور حکم دیا کہ حضرت کو دودھ پلائے۔ حق تعالیٰ
نے بدل اس شادی اور سرور کے ابولہب سے دوشنبہ کے دن عذاب کو موقوف کیا چنانچہ
حدیث میں آیا۔

مسلمانوں اس مقام سے اہل موالید کو بڑی سند ہے کہ شب میلاد حضرت
کے سرور اور بذل اموال کریں یعنی ابولہب کو کہ کافر قطعی تھا اور قرآن شریف میں اس
کی مذمت وارد ہے جب حضرت کے تولد کی خوشی کے سبب تخفیف عذاب میں ہوا اور

ہر دوشنبہ کو اس پر عذاب نہ ہو، خوشا حال مسلمانوں کا کہ حضرت کی خوشی میلاد میں کیا کیا ان کو ملے گا۔ حق تعالیٰ سب مومنوں کو توفیق دے میلاد شریف کی شادی کیا کریں اور موافق مقدور کے طعام اور نقد اور جنس خرچ کیا کریں لیکن چاہیئے مجالس میلاد شریف کے بدعت اور ممنوع محرمہ سے خالی اور پاک ہوں تا موجب حرمان طریقہ علماء سلف سے نہ ہو اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى نَبِيِّكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

روایت ہے کہ سات دن حضرت نے اپنی والدہ شریفہ بی بی آمنہ کا دودھ پیا، اس کے بعد چند روز ثوبیہ کنیز ابولہب نے پلایا بعد اس کے یہ سعادت نصیب حلیمہ سعدیہ کے ہوئی حلیمہ سعدیہ سے روایت ہے کہ سال ولادت حضرت کے ہمارے اہل قبیلہ کمال سختی اور نہایت تکلیف اور مشقت میں مبتلا تھے چونکہ وہ سال قحط کا تھا تردد اور پریشانی میں اوقات بسر ہوتے تھے اور میری ایک مادہ خر تھی کہ بسبب لاغری کے طاقت رفتار اس میں نہ تھی اور ایک بڑی اونٹنی میری مملوکہ تھی کہ ایک قطرہ دودھ کا اس کی چھاتیوں میں نہ تھا اور حال ہماری حسرت کا اس درجہ کو پہنچا تھا کہ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔ اس مشقت اور تکلیف میں بہ صبر مشغول رہتی اور شکر خدا کا بجالاتی اور میں اس ایام میں حاملہ تھی قریب سات دن یا تین دن کا فاقہ رہا اور کچھ کھانا میسر نہ ہوا اسی اثناء میں وضع حمل ہوا۔ اس قدر بے ہوشی بسبب بھوک کے طاری ہوئی کہ زمین اور آسمان میں فرق نہ معلوم ہوتا تھا اور راتوں کو کثرت گریہ طفل اور شدت بھوک سے نیند نہ آتی تھی۔ ایک رات کمال ضعف اور سستی سے آنکھیں میری لگ گئی اور نیند مجھ کو آ گئی۔ خواب کیا دیکھتی ہوں کہ ایک آدمی نے مجھ کو اٹھا کر جوئے آب میں کہ پانی اس کا دودھ سے زیادہ تر سفید تھا غوطہ دیا اور مجھ سے کہا کہ اس پانی کو پی کہ دودھ تیرا زیادہ ہوئے پھر وہ پانی میں نے پیا۔ بخدا اس پانی کا ذائقہ شہد سے زیادہ تر شیریں تھا۔ اس وقت اس شخص نے کہا کہ مجھ کو پہچانتی ہو کہ میں کون ہوں۔ میں نے کہا نہیں وہ شخص بولا

کہ میں ترا شکر ہوں کہ حالت تکلیف اور مشقت میں کرتی تھی۔ اے حلیمہ جانب مکہ رواں ہو کہ تیری روزی وہاں کشادہ ہوگی اور ایک نور روشن وہاں سے اپنے ساتھ لائے گی اور اس حال کو کسی سے نہ کہنا خبردار۔ حلیمہ کہتی ہیں جب میں بیدار ہوئی اپنا حال اور دیکھا وہ بھوک اور مشقت کے سابق میں مجھ کو تھی نہ رہی اور چھاتیاں میری دودھ سے بھر گئیں۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى نَبِيِّكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

القصہ حلیمہ اپنے قبیلہ کی عورتوں کے ساتھ مکہ کو روانہ ہوئیں۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ جب میں حوالی بطحا میں پہونچی سنا میں نے ہاتف غیب سے ندا کرتا ہے کہ خبردار اور آگاہ ہو کہ خدا عزوجل نے برکت اس مولود سے کہ قریش میں پیدا ہوا ہے، اس برس کو تم پر سہل اور احسان اور موجب فراغت کیا ہے۔ خوشا وقت ان چھاتیوں کا کہ اس کو دودھ پلائیں اے عورتو بنی سعد کی دوڑو اور شتابی کرو تا کہ اس دولت اور سعادت کو پہونچو۔ جس وقت عورتوں نے یہ مژدہ سنا اپنے اپنے شوہروں سے کہا اور ان کو اس خبر خوش سے خبردار کیا اور ہر چہ شتاب تر متوجہ مکہ ہوئیں اور چلنے میں شتابی کرنے لگیں۔ میری مادہ خر کہ بہت لاغر تھی آہستہ چلتی تھی اور ساتھ کی عورتیں آگے جاتی تھیں اور میں بہ سبب ناتوانی سواری کے پیچھے رہتی تھی اور میرا شوہر تاکید کرتا تھا جلد چلو اور ہانکو کہ زنانہ قبیلہ آگے جاتے ہیں میں اپنے مرکب کو ہر چند ہانکتی مگر کم طاقتی سے وہ مرکب نہ چلتا تھا۔ اس حالت میں اپنے چپ و راست سے یہ آواز غیبی میرے کان میں آئی کہ گویندہ نے کہا ھنیئا لك یا حلیمہ ناگاہ شگاف پہاڑ سے ایک شخص مجھ پر ظاہر ہوا کہ قد اس کا مانند بانس تھا اور اس کا ہاتھ ایک حربا نور کا تھا، میرے مرکب کی پیٹھ پر مارا اور کہا اے حلیمہ حق تعالیٰ نے تجھ کو بشارت دی ہے اور مجھ کو حکم ہوا ہے کہ شیطان اور سرکشوں کو تجھ سے دور کروں۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ اپنے شوہر سے کہا کہ تم سنتے ہو جو میں سنتی ہوں شوہر نے کہا نہیں مگر میں تم کو خوفناک دیکھتا ہوں پھر میرے مرکب

نے چلنے میں شتابی کی دوفرسنگ مکہ رہا کہ اس جگہ مقام کیا۔اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی نَبِیِّکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمُ

حلیمہ سے روایت ہے کہ شب کو منزل میں نے خواب دیکھا کہ ایک درخت سبز شاخوں والے نے میرے سر پر سایہ کیا اور ایک درخت خرما دیکھا کہ انواع رطب اس میں لگے تھے۔عورتیں بنی سعد کی گرد میرے جمع ہیں اور کہتی ہیں کہ اے حلیمہ تو ہماری ملکہ ہے۔ القصہ حلیمہ کہتی ہیں کہ میں مکہ میں داخل ہوئی۔ دیکھا کہ عورتیں میرے قبیلہ کی مجھ سے پہلے مکہ میں پہونچی تھیں۔انہوں نے اطفال قبائل اشراف اور مالدار قریش کے جو تھے سو لے لئے اور میں نے ہر چند تلاش کیا کوئی لڑکا نہ پایا۔ بہت غمناک اور آزردہ خاطر ہوئی۔اسی افسوس میں تھے کہ ناگاہ ایک مرد میں نے دیکھا پھر وہ شخص باآواز بلند کہنے لگا کہ اے عورتوں شیر دار بنی سعد تم میں سے کوئی باقی ہے کہ ہمارے لڑکے کو لے۔حلیمہ نے کہا کہ میں ایک عورت قبیلۂ بنی سعد سے باقی ہوں میرا نام پوچھا میں نے کہا حلیمہ تبسم کیا اور کہا خوش خوش دو خصلتیں نیک ہیں نیک بختی اور بردباری کہ ان دونوں میں عزت سرمدی اور عظمت ابدی ہے پھر عبدالمطلب نے کہا کہ اے حلیمہ میرے پاس ایک لڑکا ہے یتیم، نام اس کا محمد ہے میں نے اس کو عورتوں بنی سعد کو دکھلایا کسی نے قبول نہ کیا پھر عبدالمطلب بولے کہ اے حلیمہ! ہم شرافت اور بزرگی خاندانی رکھتے ہیں۔اس لڑکے کو قبول کرو، شاید اس لڑکے کے سبب سے تجھ کو غنا حاصل ہو۔حلیمہ نے اپنے شوہر سے صلاح لے کر قبول کیا اور آپ کو لے کر اپنے مکان پر لائیں پھر اپنی اونٹنی کو دیکھا کہ پستان اس کی جو خشک ہوگئی تھیں اور ایک قطرہ شیر ان میں نہ تھا دودھ سے بھر گئیں اس کو دوہا اور دودھ پیا اور سیراب ہوئی اور نیند بھر سوئی اور شوہر حلیمہ نے حلیمہ سے کہا کہ بشارت ہو تجھ کو ایسا لڑکا خیر و برکت کا تجھ کو ملا او رخیر و برکت ہمیشہ سے زیادہ ہوگئے۔حلیمہ سے روایت ہے کہ میں حضرت کو لے کر کئی

دن مکہ میں رہی اور بی بی آمنہ سے رخصت ہو کر سب عورتوں کے ساتھ اپنے وطن کو چلی اور حضرت کو اپنے مرکب پر آگے گود میں بٹھا کر روانہ ہوئی اور وہ مرکب جو ضعیف اور لاغر تھا کمال چست اور چالاک ہو کر چلنے لگا یہاں تک کہ سب ساتھ والوں کے مرکبوں سے آگے چلتا تھا اس چالاکی مرکب سے سب عورتیں قبیلے کی تعجب کر کے کہنے لگیں کہ اے حلیمہ یہ وہی مرکب ہے کہ آنے کے وقت چل نہ سکتا تھا اور طاقت رفتار ہرگز اس میں نہ تھی اب اس کی شان عظیم ہے۔حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ وہ مرکب کہتا ہے بخدا میری شان عظیم ہے زندہ کیا مجھ کو میرے پروردگار نے اور فربہ اور توانائی میری کو پھیرا اے عورتوں تم غافل ہو نہیں جانتی کہ مجھ پر سوار خاتم النبین سید المرسلین حبیب رب العالمین ہیں پھر حلیمہ کہتی ہیں کہ راہ میں داہنے اور بائیں سے آوازیں آنے لگیں اے حلیمہ تو تونگر ہوئی اور اپنی قوم میں بسبب اس لڑکے کے قدر اور بزرگی اور مرتبہ تیرا اعالی ہوا۔اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی نَبِیِّکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمُ

اور حلیمہ کہتی ہیں کہ میں جس منزل میں اتری اس مکان کو حق تعالی نے سرسبز کیا پھر جو اپنے قبیلہ میں پہنچی حق تعالی نے حضرت کے قدم برکت سے خیر اور برکت بہت سی میری بکریوں اور جانورں اور مال میں بخشی۔ چنانچہ اس برس میری بکریوں نے بچے دئے اور دودھ بکثرت ان کے ہوا اور میرے جانور اوروں کے جانوروں سے فربہ ہوئے جب قوم نے یہ حال دیکھا سب اپنی بکریوں کو میری بکریوں کے ساتھ چرانے لگے اور میرے یہاں آکر حضرت کے پائے مبارک کو دھو کر اپنے جانوروں کے حوض میں پانی ڈالے، پھر ان کی بکریوں نے بھی بچے دئے اور موٹی تازی ہو کر دودھ بہت دینے لگیں حلیمہ کہتی ہیں کہ حق تعالی نے حضرت کی محبت اس قدر میرے دل میں ڈالی کہ سب کاموں سے غافل ہو کر حضرت کی خدمت ہزار جان سے کرنے لگی اور رات اور دن سوائے پرورش کے حضرت کی اور دھیان نہ رکھتی تھی اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی نَبِیِّکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ

حلیمہ سے روایت ہے کہ حضرت بمقتضائے عادت اطفال اپنے کپڑوں میں کبھی بول وغائط نہیں کرتے تھے۔ بستر اور لباس آپ کا ہرگز آلودہ نجاست نہ ہوا۔ ہر روز ایک وقت معین پر بول وغائط سے فراغت کرتے تھے۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ جب میں ارادہ کرتی کہ دہن مبارک کو دودھ سے پاک کروں بالوں کو دھوؤں غیب سے کفالت اس کام کی ہوتی اور اتفاقاً ستر عورت حضرت کا اگر ظاہر ہو جاتا تو آپ غصہ فرماتے اور ڈھانپ لیتے اور بعض روایات میں آیا کہ غیب سے ڈھانپتے تھے۔ اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی نَبِیِّکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ

حضرت کی بالیدگی کا حال یہ تھا کہ ایک دن میں اس قدر بڑھتے کہ اور لڑکے ایک مہینے میں اور مہینے میں اس قدر بالیدگی ہوتی کہ اور لڑکوں کو ایک برس میں۔ چنانچہ دوسرے مہینے حضرت اپنے ہاتھوں کی قوت سے زیر چلنے لگے اور تیسرے مہینے اپنے پاؤں کھڑے ہو گئے اور چوتھے مہینے ایک ہاتھ دیوار پر رکھ کر چلے اور پانچویں مہینے میں بقوت تمام پھرنے چلنے لگے اور پہلا کلام جو حضرت نے فرمایا اللہ اکبر الحمد للہ رب العالمین وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا ہے۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ نویں مہینے حضرت بفصاحت تمام کلام بلاغت نظام کرنے لگے اور جب چلنے لگے اطفال جو کھیلتے اور لہو لعب میں مشغول دیکھتے ان سے دور ہوتے اور لڑکوں کو کھیلنے سے منع کرتے اور جو لڑکے آپ کو کھیلنے کو کہتے تو آپ فرماتے کہ مجھ کو کھیلنے کے واسطے نہیں پیدا کیا اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی نَبِیِّکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ

حلیمہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ اے مادر مہربان کیا سبب ہے کہ بھائی ہمارے دن کو گھر میں نہیں رہتے۔ حلیمہ بولیں کہ بکریاں چرانے کو جاتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ ہم بھی بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے صحرا

کو جائیں گے حلیمہ نے بلحاظ اس کے خاطر شکنی نہ ہو، اس بات کو قبول کیا۔ وقت صبح کے حضرت کا منہ ہاتھ دھویا اور بالوں میں کنگھی کی اور سرمہ چشم خدا بین میں لگایا اور کپڑے سپید پہنائے۔ القصہ حضرت نے عصا ہاتھ میں لے کر بھائیوں کے ساتھ متوجہ صحرا ہوئے اور قریب آبادی بکریوں کو چرانے میں مشغول رہے۔ دو پہر کے وقت ضمرہ بیٹا حلیمہ کا دوڑتا گرتا پڑتا بدحواس روتا ہوا گھر میں آیا اور گریہ وزاری سے کہنے لگا مادر بھائی محمد حجازی کی خبر لے کہ قریب ہے کہ تو اس کو جیتا نہ پائے اور کام اس کا تمام ہو جائے۔ حلیمہ یہ بات سن کر گھبرا گئیں اور کہنے لگیں کہ تو حال مفصل بیان کر۔ اس نے کہا محمد ہمارے ساتھ چراگاہ میں تھے۔ دو شخص ان کے پاس آکر ان کو اٹھا لے گئے اور پہاڑ پر لیجا کر لٹایا، ان کا پیٹ چیرا پھر مجھ کو معلوم نہیں کہ کیا حال گزرا یہ سن کر حلیمہ اور ان کا شوہر سخت سراسیمہ اور حیران ہوئے اور ترساں اور لرزاں حضرت کی طرف دوڑے۔ افتاں و خیزاں جب آپ کے پاس پہنچے، حضرت کو زندہ پایا کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت پہاڑ پر جلوہ فرما ہیں اور طرف آسمان کے نگاہ کرتے ہیں اور چہرہ مبارک حضرت کا اس وقت منور تھا۔ حلیمہ کو دیکھ کر حضرت نے تبسم فرمایا حلیمہ دوڑ کر آپ کو لپٹ گئیں اور نہایت پیار سے حضرت کے سر و چشم کو بوسہ دیا اور سب ماجرہ پوچھا آپ نے فرمایا کہ اے مادر مہربان بھائیوں کے ساتھ میں کھڑا تھا کہ ناگاہ دو شخص ظاہر ہوئے ایک کے ہاتھ میں طشت زمرد کا دوسرے کے ہاتھ میں ابریق نقرہ۔ مجھ کو بھائیوں کے درمیان سے اٹھا کر پہاڑ پر لے گئے اور ایک نے بلطف اور نرمی لٹا دیا اور میرا سینہ تا ناف شق کیا اور میں اس وقت دیکھتا تھا اور کچھ درد و الم مجھ کو معلوم نہ ہوتا تھا پھر ہاتھ میرے پیٹ میں داخل کر کے رودوں کو نکالا اور برف کے پانی سے دھو کر صاف کر کے بجائے خود رکھا پھر دوسرا شخص اٹھا اور اس نے ہاتھ میرے پیٹ میں ڈالا اور میرے دل کو اپنے مقام سے نکالا اور شق کیا ایک نقطۂ سیاہ خون آلودہ اسے نکال کر پھینکا اور کہا ھذا حظ الشیطان منك یا حبیب اللہ یہ حصہ شیطان کا تھا تجھ سے اے دوست خدا کے۔ بعد اس کے میرے دل کو معرفت حق اور یقین صادق اور نور

ایمان سے بھر کر اس کے مقام پر رکھ دیا اور خاتم نور سے مہر کی کہ اس کی خوشی اب تک ہے پھر ہاتھ میرے سینے کے شگاف پر پھیرا وہ شگاف فی الفور بھر گیا اور سینہ میرا جیسا تھا ویسا ہو گیا پھر سب نے آسمان کی طرف پرواز کی اور میں ان کو دیکھتا تھا اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى نَبِيِّكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

القصہ جب حلیمہ حضرت کو پہاڑ سے لے کر گھر میں گئیں، ان کے شوہر اور آدمیوں نے صلاح کر کے کہا کہ حضرت کو پہونچا دو حلیمہ حضرت کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ اس رسالے کا مختصر کرنا منظور تھا اس واسطے اور روایتیں نہیں لکھیں اوپر اس کے اختصار کیا۔ بعد چند روز کہ مکہ میں پہونچ کر عبد المطلب کے سپرد حضرت کو کیا عبدالمطلب نے حلیمہ کو بہت راضی کر کے رخصت کیا۔

اَلصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى نَبِيِّكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

تھے حبیب حضرت پروردگار
سب سے خوشتر و بس مزین شاندار

مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ

تاج العلما سید شاہ اولاد رسول محمد میاں
قادری برکاتی قدس سرہٗ

افضل الرسل رہبر کامل ہادی سبل شفیع المذنبین، رحمۃ اللعالمین، خیر خلق اللہ اجمعین باعث ایجاد عالم، عالم ما کان و ما یکون، خاتم النّبین حضور سیّدنا محمد رسول اللہ بن سیدنا عبداللہ بن سیدنا عبدالمطلب ابن سیّدنا ہاشم ابن سیدنا عبد مناف ابن سیدنا قصی ابن سیدنا کلاب ابن سیدنا مرہ ابن سیدنا کعب ابن سیدنا لوئی ابن سیدنا غالب ابن سیدنا فہر ابن سیدنا مالک ابن سیدنا نضر ابن سیدنا کنانہ بن سیدنا خزیمہ ابن سیدنا مدرکہ ابن سیدنا الیاس ابن سیدنا نزار ابن سیدنا معد ابن سیدنا عدنان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ جمع آباءَ الکرام واصحابہ العظام وآلہ ذوی الانعام وبارک وسلم ومجد وکرم وشرف وعظم ارباب سیر اور اصحاب علم انساب کے نزدیک نسب کریم ان اکیس پشتوں تک متفق علیہ ہے۔ اس سے اوپر کے اسماء اور ان کی ترتیب وتعداد صحیح طور پر معلوم اور متفق علیہ نہیں اور اسی لئے اکابر کرام نے آگے سکوت مختار واحوط جانا۔ (مدارج النبوۃ وغیرہ)

اور ان اکیس پشتوں تک نسب کریم خود سرور دوعالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بیہقی وابن عساکر کی حدیث میں بطریق مالک عن الزہری عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی رسول اللہ صلیٰ اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہٖ وسلم فرماتے ہیں: وھذہ روایۃ البیھقی" انا محمّد بن عبد اللہ بن عبد

الـمـطلب بن هاشم بن عبد مناف ابن قصى بن كلاب بن مرةبن كعب بن لـئـوى بـن غـالـب بـن فهـر بـن مـالك بـن الـنضر بن كنانة بن خذيمة بن مدركةبن الياس بن نزاء بن معد بن عدنان ما افترق النّاس فرقتين الاجعلنى الله فى خير ها فا خرجت من بين ابوى فلم يصبنى شئى من عهد الجاهلية وخـرجـت مـن نكاح و لم اخرج من سفاح من لدن ادم حتىٰ انتهيت الىٰ ابـى و امـى فـانـا خيـر كـم نـفسـا وخيـر كـم ابـاوفـى لـفـظ فانا خير كم نسبـاو خير كم ابا" میں ہوں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلیہم وسلم)

یونہی اکیس پشتوں تک نسب نامہ مبارک بیان کرکے فرمایا۔ کبھی لوگ دوگروہ نہ ہوئے مگر یہ کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے بہترین گروہ میں کیا تو میں اپنے ماں باپ سے ایسا پیدا ہوا کہ زمانہ جاہلیت کی کوئی بات مجھ تک نہ پہنچی۔ اور میں خالص نکاح صحیح سے پیدا ہوا۔ آدم علیہ السّلام والصّلاۃ سے لے کر اپنے والدین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ علیہا تک تو میرا نفس کریم تم سے افضل اور میرے ماں باپ تم سب کے آباء سے بہتر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آباۂ الکرام وآلہ واصحابہ ولم (شمول) ارباب سیر اور اصحاب علم انساب اتفاق رکھتے ہیں اس پر کہ ہمارے آقائے نامدار حضرت سیّدنا اسمٰعیل ذبیح اللہ کی اولاد امجاد سے ہیں۔ اور حضرت سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت سیّدنا نوح اور حضرت سیدنا ادریس علیہم الصلاۃ والسّلام ہمارے حضور کے اجداد کرام میں ہیں صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیہم وعلیٰ آلہ واصحابہ (مدارج) اس حقیر ذلیل ذرۂ بے مقدار کی کیا مجال جو اس سرکار ابد قرار کی مدح وستائش کے حق سے عہدہ برآ ہو جس کی مداح وواصف خود ذات کبریا ہو۔ جس ذات گرامی کا خلق کریم خود قرآن عظیم ہو اس کے جود وکرم بذل وعطا، رافت ورحمت ودیگر حلائل وفضائل بے نہایت کی تفصیل مجھ کج مج زبان سے کب ترقیم ہو، دونوں جہان کی وہ کون سی نعمت ودولت ہے جو دینے والے نے انہیں دینے سے اٹھا رکھی، وہ کون سا فضل وکمال ہے جو منعام ومفضال نے

ان سے بچا رکھا۔

ہر رتبۂ کہ بود در امکاں بر وست ختم
ہر نعمتے کہ داشت خداشد بر و تمام

جس محبوب مطلق پر اس کے محبّ برحق کی یہ عنایت بے نہایت ہو کہ ہر لحظہ ہر گھڑی ہر آن اُس کی ترقی مرتبت وعلو ورافت ہو "ولـلاخـرة خير لك من الا ولیٰ"۔ اس کے مناقب عظیمہ ومراتب کریمہ کے حصر وشمار کی مخلوق کو کیا قدرت ہو۔

ترا چنانکہ توئی ہرنظر کجا بیند!
بقدر دانش خود ہرکسے کند ادراک

جس کی بات خدا کی بات "وما ينـطـق عـن الهوى، ان هو الاوحى يوحىٰ" جس کے کام خدا کے کام "وما رميت اذ رميت و لكن الله رمىٰ" جس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ان الذين يبايعو نك انما يبايعون الله، يد الله فوق ايد يهم " جس کی اطاعت خدا کی اطاعت من يطع الرسول فقد اطاع الله۔

پھر فہم بشر کی کیا طاقت جو سرقدرت کی کنہ حقیقت تک پہنچ سکے۔

محمد سر قدرت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے
محمد کو خدا جانے خدا کو مصطفیٰ جانے

جہان اور عالمیان خدا کی رضا چاہتے ہیں اور خدا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی رضا "ولسوف يعطيك ربك فترضىٰ"

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد

آدم علیہ الصلاۃ والسلام وعالم سب ان کے امّتی اور وہ ان سب کے امام و نبی "واذاخـذ الـلـه ميثـاق النبيين لمااتيتكم من كتاب و حكمة ثم جاء كم رسـول مـصـدق لما معكم لتومنن به و لتنصرنه قال ااقررتم واخذ تم علےٰ ذالـكم اصرى قا لوا اقررنا الا بلکہ تمام عالم وجود ہی اس لئے ہوا کہ اس عظیم القدر

رفیع الشان کی جلیل منزلت اور جمیل عظمت ان پر ظاہر ہو۔ اگر وہ نہ ہوتے تو دنیا نہ پیدا فرمائی جاتی۔ حدیث قدسی ۔"ولقد خلقت الدنیا واھلھا لاغرفھم کرامتك ومنزلتك عندی ولولاك ماخلقت الدنیا" [ابن عساکر عن سلمان الفارسی رضی اللہ تعالیٰ کمافی تجلی الیقین]

مقصود ذات اوست دگر باہمہ طفیل
منظور نور اوست دگر جملگی ظلام

ایسے محبوب عظیم الشان جلیل البرہان جمیل الفخر رفیع القدر کی عظمت شان، رفعت مکان، وسعت جود، جمال احسان کا اس ذرّہ ناچیز سراپا عصیان کج مج زبان سے کیوں کر بیان ہو بجز اس کے کہ اس سردار عالم مدار میں سر تسلیم و گردن نیاز خم کر کے بہ ہزاراں ہزار بلکہ بے شمار عجز وانکسار اس معروض پر اقتصا ہو۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

ولادت اقدس:

بارہ ربیع الاوّل شریف پیر کے دن صبح صادق کے وقت ہجرت مقدسہ سے ۵۳ برس پہلے بیس اپریل ۵۷۱ء پانسو اکہتّر عیسوی میں مکہ معظّمہ میں ہوئی (نطق ومدارج) اور ابتدائے وحی اور ہجرت مقدسہ اور مدینہ پر سکینہ کو قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمانا، اور مکہ معظّمہ کی فتح ان سب کا بھی دن دوشنبہ مبارک ہی ہے (مدارج) حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسّلام اپنے والدین ماجدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہما کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ اور بموجب روایت امام محمد ابن اسحٰق امام مغازی ہنوز حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام شکم مبارک والدہ ماجدہ ہی میں تھے کہ حضور کے والد نامدار حضرت سیّدنا عبداللہ نے مدینہ منوّرہ میں بحال سفر انتقال فرمایا اور دار نابغہ میں اور مشہور یہ ہے کہ موضع ابواء متصل مدینہ باسکینہ میں دفن ہوئے (مدارج النبوۃ) بعض کہتے ہیں کہ وقت وفات حضرت سیدنا عبداللہ ہمارے آقائے نامدار علیہ وعلی ابویہ

الصلاۃ والسلام دو ماہ کے تھے۔ شیخ محقق مولانا عبدالحق محدّث دہلوی نے مدارج میں اسے اصح الاقوال فرمایا، اور حضرت عبدالمطلب اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے باتفاق رائے حسب بشارت غیبی حضور اقدس کا اسم مبارک "محمّد"، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم رکھا (مدارج) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سات روز اپنی والدۂ ماجدہ حضرت بی بی آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا دودھ پیا، بعد ازاں ثُویبہ ابولہب کی لونڈی نے چند روز آپ کو دودھ پلایا (مدارج وغیرہ) ان ثویبہ کو بعض محدثین نے صحابیات میں شمار کیا ہے۔ کتب سیر میں آیا ہے کہ حضور اقدس علیہ الصّلاۃ والسلام بوجہ رضاعی ماں ہونے کے ان کا اکرام فرماتے اور مدینہ منورّہ سے ان کے لئے کپڑے وغیرہ انعام بھیجتے، واقعہ خیبر سے بعد آٹھویں سال ان کا انتقال ہوا۔ ان ثویبہ نے ابولہب کو ولادت اقدس کی خوشخبری دی تھی، اور ابولہب نے اس خوشخبری پر ان کو آزاد کر کے حکم دیا کہ یہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دودھ پلائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی ولادت پر اس اظہار فرحت وسرور کے عوض ابولہب پر سے عذاب میں کمی فرمادی اور دوشنبہ کے دن اس سے عذاب اٹھالیا کما ورد فی الحدیث۔ حضرت شیخ محقق مدارج میں اسے ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے سند ہے جو شب ولادت اقدس میں مجالس ومحافل میلاد منعقد کرتے اور اظہار سرور وبذل اموال کرتے ہیں یعنی جب کہ ابولہب ایسا کافر قطعی کہ قرآن مجید میں اس کی مذمّت وارد ہوئی ولادت اقدس پر اظہار سرور وفرحت کی جزا عذاب میں کمی پاتا ہے، تو مسلمان جن کے دل حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں، اپنے آقائے کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ولادت باسعادت کی تقریب پر اظہار بہجت وسرور اور مال و زر صرف کرنے پر کیا کچھ مورد انعام الٰہی وفیوض نامتناہی نہ ہوں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس پاک تقریب کو جہال کی ایجاد کردہ بدعتوں گانے بجانے وغیرہ محرمات ومنکرات سے پاک رکھیں۔ الغرض ثویبہ کے بعد حضرت بی بی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا

کہ اپنے نام اور نسبت کے مطابق حلم و وقار و سعادت سے موصوف تھیں، سعادت ارضاع حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام سے مخصوص وممتاز ومشرف ہوئیں۔ آپ کے زمانہ رضاعت میں حضور اقدس صلوات اللہ تعالے وسلامہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ کے بہت سے فضائل وکرامات ومعجزات ظاہر ہوئے کہ بڑی کتابوں مثل مدارج النبوۃ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ حضرت بی بی حلیمہ حضور اقدس کو اپنے گھر نواح طائف میں لے گئیں اور وہیں جب حضور علیہ الصلاۃ والسلام پاؤں چلنے لگے۔ دو برس کے ہوگئے تو پہلی بار شق سینہ مبارک ہوا۔ حضرت حلیمہ نے واقعۂ شق صدر سے اندیشناک ہوکر حضور کو مکہ معظّمہ میں حضور کی والدہ ماجدہ کے پاس پہنچا دیا (مدارج النبوۃ وتواریخ حبیب الہ) اور جب حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کا سن مبارک چھ یا سات برس کا ہوا تو حضرت کی والدہ ماجدہ نے بحالت سفر کہ مدینہ منوّرہ گئی ہوئی تھیں، اور وہاں سے مکہ معظّمہ واپس آرہی تھیں اثنائے مراجعت میں موضع ابواء میں کہ مدینہ منورہ کے قریب ہے وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئیں۔ اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت بی بی آمنہ کی قبر شریف حجون میں مکہ معظّمہ میں جنت المعلی میں ہے اور بعض علماء نے (ان دونوں روایتوں میں تطبیق دینے کے طور پر) یہ کہا کہ ممکن ہے کہ پہلے ابواء میں دفن کیا ہو اور پھر وہاں سے مکہ معظّمہ جنّۃ المعلّے میں نقل کرلیا گیا ہو (مدارج النبوۃ) اس آخری روایت کی موید وہ احادیث بھی ہیں جن میں حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنی والدہ ماجدہ کا زندہ فرمایا جانا اور ان کا حضور پر ایمان لانا بیان فرمایا ہے۔ دیکھو امام جلال الدین سیوطی کا رسالہ نشر العلمین وغیرہ۔ والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد حضور کی کفالت اور پرورش ظاہری کے متکفل حضرت اقدس کے جدا مجد حضرت سیدنا عبدالمطلب رضی اللہ تعالی عنہ ہوئے۔ حضرت عبدالمطلب حضور اقدس کو اپنے سب فرزندوں سے زائد دوست اور ان سب سے زائد حضور کو اعزاز و اکرام سے رکھتے اور حضور اقدس کے بغیر کبھی کھانے کے لئے دسترخوان نہ بچھاتے۔ حضور اقدس ہر حالت خلوت وجلوت میں اپنے دادا کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کی مسند پر تشریف

رکھتے اور اگر کوئی اس سے حضور کو منع کرتا تو فرماتے میرے لخت دل کو میری مسند پر اس کا تشریف رکھنا میرا اشرف ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ میرا نامی و نام دار پوتا ایسے شرف و مرتبے کو پہنچے گا کہ عرب کے اگلے پچھلوں میں سے کوئی اس مرتبے کو نہ پہنچا نہ پہنچے۔ ایک بار عرب میں قحط شدید پڑا اور کئی سال رہا۔ حضرت عبدالمطلب ہاتف غیب کے اشارے سے حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کو اپنے دوش مبارک پر سوار کرکے کوہ بوقبیس پر لے گئے اور حضور کے وسیلے سے پانی برسنے کے لئے دعا کی۔ ببرکت وسیلہ حضور رحمتہ للعالمین ایسا ابر رحمت زور شور سے برسا کہ چند سال خشک سالی کی تلافی ہوگئی۔ حضور کا سن مبارک آٹھ برس کا تھا اور بعض نے نو دس اور چھ برس بھی کہا ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے انتقال فرمایا اور قبل وصال ابوطالب کو کہ حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کے سگے چچا تھے۔ بلاکر حضور کو ان کی کفالت میں دیا اور وصیت فرمائی کہ نہایت حفاظت سے یہ خدمت انجام دینا اور بعض نے کہا ہے کہ خود حضور کی مرضی پر رکھا کہ اپنے چچوں میں سے جسے چاہیں اپنی خدمت کفالت لیے اختیار فرمالیں۔ حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے ابوطالب کو اختیار فرمایا۔ الغرض بعد حضرت عبدالمطلب کے ابوطالب نے ہمارے حضور کی محافظت نہایت اچھی طرح اور پورے طور پر زمانہ قبل نبوت و بعد نبوت دونوں میں کی۔ حضور اقدس کے بغیر کھانا نہ کھاتے اور اپنے قریب حضور کو آرام کراتے اور ہر جگہ حضور کے ہمراہ رہتے۔ ابوطالب کے زمانہ کفالت میں بھی ایک بار قحط عظیم پڑا، اور انہوں نے بھی اپنے والد ماجد حضرت سیّدنا عبدالمطلب کی سنت کے مطابق حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی پشت مبارک کعبہ مکرمہ سے لگا کر بارگاہ ربّ کریم جل مجدہ میں اس کے حبیب رؤف رحیم علیہ الصلاۃ و التسلیم کو نزول باران رحمت کے لئے وسیلہ پکڑا اور حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے آسمان کی طرف اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا۔ باوجودیکہ آسمان پر ابر کا نشان بھی نہ تھا۔ مگر بہ مجرد اشارہ ابر رحمت گھر آیا اور اس قدر برسا کہ میدان پانی سے لبریز ہوگئے اور نہریں جاری ہوگئیں اور عمر شریف کے بارھویں سال میں ابوطالب آپ کو

ہمراہ لے کر بغرض تجارت ملک شام کو گئے۔ راہ میں بحیرا راہب نصاریٰ عرصہ کثیر سے شہر بصری کے پاس ایک گاؤں میں پیغمبر آخرالزمان کی جستجو میں ایک صومعہ میں قیام پذیر تھا اور کتب سماویہ سابقہ سے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی علامات جانتا تھا۔ علامات معلومہ سے حضور کو پہچان گیا اور حضور کے قافلے کی دعوت کی اور مہر نبوت کو بوسہ دیا اور حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی نبوّت کا اقرار اور تصدیق کر کے مشرف بہ ایمان ہوا اور ابوطالب سے کہا کہ یہ صاحبزادے پیغمبر آخرالزماں ہوں گے اور ان کا دین جملہ ادیان سابقہ کا ناسخ ہوگا۔ انہیں ملک شام میں نہ لے جاؤ۔ یہود و نصاریٰ ان کے دشمن ہیں۔ کہیں ان کے ہاتھ سے آزار نہ پہنچے۔ اس سفر میں سات رومی حضور کے قتل کے ارادے سے لگے ہوئے تھے۔ بحیرا نے انہیں سمجھایا کہ یہ وہی صاحبزادے ہیں جن کا ذکر شریف تم توراۃ انجیل وزبور میں پڑھتے ہو۔ یہ پیغمبر برحق ہیں۔ تم ان کی اطاعت کرو اور جو امر خدا نے چاہا ہے تم اسے مٹا نہیں سکتے۔ الغرض بحیرا کے حسب مشورہ ابوطالب وہیں اپنا مال بیچ کر اور نفع کثیر پا کر مکّہ مکرمہ کو واپس آ گئے۔ غرض مشاہدہ ملائکہ وصور نورانیہ وظہور انوار وآثار فضل وکمال حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے روز افزوں ہونے لگا۔ ابوطالب ان حالات کے ظاہر ہونے پر حضور کو کاہنوں اور طبیبوں کے پاس لیجاتے، وہ لوگ یہی کہتے کہ یہ احوال وساوس شیطانی اور امراض جسمانی سے نہیں برکات وانوار رحمانی ہیں۔ یہاں تک کہ پچیسویں برس میں حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام پھر برائے تجارت ملک شام کی طرف تشریف لے گئے اور چونکہ حضور کی امانت ودیانت پہلے سے عرب میں مشہور تھی اور سب حضور کو محمد امین کہتے تھے۔ اس لئے حضرت خدیجہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا مال برائے تجارت حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کے حوالے کر دیا اور اپنے ایک غلام میسرہ اور دوسرے عزیز خزیمہ نام کو حضرت اقدس کی ہمرکابی وخدمت میں بھیجا۔ اس سفر میں جب حضور اقدس بصریٰ پہنچے اور نسطور راہب کے صومعے کے سامنے ایک درخت کے نیچے تشریف رکھی جو بالکل سوکھا اور اس کی لکڑیاں تک بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حضور اقدس

کے تشریف رکھتے ہی وہ درخت سرسبز اور میوہ دار ہو گیا۔ راہب مذکور نے کہا کہ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی نہ بیٹھے گا اور حضور اقدس کے قریب حاضر ہو کر لات وعزّیٰ کی قسم دے کر عرض کیا کہ حضور کا نام اقدس کیا ہے، حضور نے بہت ناراض ہو کر فرمایا کہ عرب کی کوئی بات مجھ پر اس قسم سے زائد گراں اور دشوار نہیں گذری۔ راہب کے ہاتھ میں ایک صحیفہ تھا۔ وہ اسے دیکھتا اور کہتا جاتا تھا کہ خدا کی قسم جس نے عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام پر انجیل اتاری کہ بے شک یہ وہی پیغمبر آخرالزماں ہیں، حضور اقدس نے مال تجارت وہاں فروخت کیا اور دوسروں سے دوگنا منافع پایا اور اہل قافلہ نے حضور کے طفیل نفع پایا۔ [مدارج وغیرہ]

ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے عقد:

اسی سفر مبارک سے واپسی کے بعد بعض خوارق عادات کے بچشم خود معائنہ کرنے اور دوران سفر کے بعض جلائل فضائل وکرامات اپنے غلام میسرہ اور اپنے رشتہ دار خزیمہ کی زبانی معلوم ہونے سے حضرت بی بی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہ نہایت صاحب عقل وفہم وذکاوت شریف ولبیق اور قریش کی عورتوں میں بہت حسیب و نسیب اور بڑی مال دار تھیں اور اکثر عمائد اشراف قریش بخواہش تمام ان سے نکاح کی درخواست کر کے ناکام رہ چکے تھے، ہمارے آقائے نامدار کو اپنے عقد نکاح کا برغبت تمام پیغام دیا۔ حضرت ام المومنین کے دولت خانے میں اعیان وعمائد واشراف قریش وغیرہ کی موجودگی میں ابوطالب نے اپنے مال سے بیس شتر مایہ مہر پر ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کے فضائل عظیمہ ومناقب جلیلہ پر مشتمل پڑھ کر عقد باندھا۔ اور ام المومنین کی جانب سے ان کے چچا عمر بن اسد اور ابن عم ورقہ بن نوفل نے ایجاب وقبول میں شرکت کی۔ مقدار مہر کے بارے میں ایک اور روایت میں چار سو مثقال طلا اور ایک تیسری میں ساڑھے بارہ اوقیہ جس کے پانچ سو درم ہوتے ہیں بھی آئی ہیں اور علماء نے ان میں باہم تطبیق اس طرح کی ہے کہ شاید اس

زمانے میں بیس شتر مایہ کی قیمت چار سو مثقال طلا یا پانسو درم ہوتی ہے۔(مدارج و تواریخ حبیب الہٰ) عمر شریف حضرت ام المومنین سے نکاح کے وقت پچیس برس دو مہینہ دس روز کی تھی۔(شجرۂ طیبہ) اور حضرت ام المومنین کا سن مبارک اس وقت چالیس سال تھا۔(مدارج)

وحی سے پہلے پندرہ برس آپ غیبی آوازیں سنتے اور کوئی آواز دینے والا نظر نہ آتا۔اور ساتھ ایک نور نظر پڑتا جس سے حضور اقدس شادماں ہوا کرتے۔جوں جوں ایام ظہور نبوت نزدیک آتے جاتے حضور صحیح خواب دیکھتے جو حال خواب میں نظر آتا وہی مانند سپیدۂ صبح ظہور میں آتا اور خلوت اور تنہائی آپ کو محبوب ہوتی جاتی۔کچھ سامان خورد ونوش ہمراہ لے کر غار حرا میں جو مکہ مکرمہ سے تین کوس ہے، تشریف لے کر عالم خلوت میں اپنے محبّ ومحبوب جل مجدہ کے ذکر اور یاد میں جان اور دل وزبان سے مصروف ومشغول رہتے۔کئی کئی روز تک اسی طرح وہاں مسلسل مشغولی فرماتے۔اب کہ زمانہ نزول وحی اور قریب تر ہوگیا۔جس درخت اور پتھر کے پاس سے گذرتے وہ بزبان فصیح ''السلام علیک یارسول اللہ ﷺ'' عرض کرتا۔(شجرہ ومدارج وغیرہ)

جب عمر مبارک چالیس سال اور ایک دن کی ہوئی دوشنبہ کے دن ربیع الاوّل شریف کے مہینہ میں تیسری یا آٹھویں یا بارہویں تاریخ غار حرا میں حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور منصب رسالت کی بشارت دے کر عرض گذار ہوئے کہ پڑھئے۔حضور نے ارشاد فرمایا میں پڑھا نہیں ہوں۔انہوں نے آپ سے معانقہ کر کے خوب دبوچا اور پھر یہی عرض کیا اور وہی جواب پایا۔پھر اسی طرح دبوچا اور وہی عرض کیا اور وہی جواب پایا۔اسی طرح تیسری بار پھر دبوچا اور عرض کیا کہ پڑھیئے: اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم اور بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ پہلے حضرت جبریل کے کہنے سے حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے **اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم** پڑھا اور پھر یہ

آیات کریمہ پڑھیں پھر حضرت جبریل نے اپنے پاؤں زمین پر مارے جس سے ایک چشمہ پانی کا ظاہر ہوا اور انہوں نے اس کے پانی سے وضو کیا، اور کلیوں اور ناک میں پانی دینے کے ساتھ منہ اور ہاتھ پاؤں تین تین بار دھوئے اور ایک بار سر کا مسح کیا اور اسی طرح حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے بھی وضو فرمایا۔اس کے بعد حضرت جبریل نے ایک چلو پانی حضور اقدس کے روئے مبارک پر چھڑکا اور پھر آگے جا کر دو رکعت نماز پڑھائی اور حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کی اقتداء فرمائی۔بعد فراغت نماز حضرت جبریل نے عرض کی کہ نماز اور وضو کا یہی طریقہ ہے اس کے بعد حضرت جبریل آسمان پر چڑھ گئے اور حضور اقدس کاشانہ مبارک کو تشریف لے چلے۔جس درخت اور پتھر کے پاس سے گزرتے وہ السلام علیک یارسول اللہ عرض کرتا۔اور چونکہ وحی کے نزول سے بدن اقدس کو بہت تکلیف ہوئی تھی، اس لئے ایسی حالت میں ام المومنین خدیجہ کے کاشانہ مبارک میں پہنچے کہ قلب اقدس اور گردن اور شانہ مبارک کے درمیانی حصے کانپتے تھے، اور حضرت ام المومنین سے فرمایا کہ مجھے اڑھاؤ۔انہوں نے چادر حضور اقدس کو اڑھادی اور ٹھنڈا پانی چھڑکا۔جس سے وہ حالت دور ہوئی (مدارج وشجرہ وغیرہ)

پھر تین سال کے انقطاع کے بعد وحی شائع ہوئی اور پے در پے آنے لگی اور حضور نے تبلیغ احکام اور دعوت اسلام فرمانی شروع فرمائی اور خلق کو شرف اسلام سے مشرف فرمانا شروع کیا۔یہ قوم عرب کو جن کی طبیعت میں کفر وشرک بھر گیا تھا، برا لگا اور انہوں نے حضور اقدس کی تکلیف اور ایذا رسانی میں اپنا سا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔یہاں تک کہ بعثت اقدس کے ساتویں سال حضور کو حضور کے ساتھ دینے والوں کنبہ قبیلہ کے لوگوں بنی ہاشم اور بنی مطلب کے ساتھ ایک گھاٹی میں محاصرہ کرلیا اور حضور اقدس اور حضور کے ان سب ساتھیوں پر ہر طرف سے اناج غلہ وغیرہ جملہ ضروریات زندگی کا پہنچنا ہر طرف سے سختی سے بند کردیا۔اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے شادی بیاہ خرید وفروخت غرض جملہ تعلقات اور سب لین دین قطعی بند کردیا۔اور اس

بائیکاٹ کو تین سال برابر سختی سے جاری رکھا۔ مگر وہ خدا کا پیارا جس کو حکم ربانی تھا کہ "فاصدع بماتؤمرو اعرض عن المشرکین" علانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لو، وہ سب سختیاں جھیلتا رہا لیکن تبلیغ حق و دعوت توحید سے باز نہ آیا یہاں تک کہ خود انہیں بائیکاٹ کرنے والوں میں آپس میں پھوٹ پڑی۔ اور وہ جو بائیکاٹ کا ایک معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا، اس کو چاک کر ڈالنے کی ٹھہری۔ ادھر حضور اقدس کو بتعلیم وحی الٰہی اس بات کی اطلاع ہوئی کہ دیمک نے اس عہد نامے کی ظلم و جور کی عبارت سب کھالی ہے اور صرف اللہ و رسول کا نام چھوڑ دیا ہے۔ حضور نے یہ حال حضرت ابوطالب سے فرمایا اور انہوں نے گھاٹی سے نکل کر یہ بات قریش سے بیان کی اور اسی کی سچائی پر اس بائیکاٹ کا اٹھالیا جانا قرار پایا اور سچائی ظاہر ہونے پر کفار نے وہ محاصرا اٹھالیا اور بعثت اقدس سے دسویں سال حضور اور سب ہمراہی اس گھاٹی سے باہر آئے اور اسی سال میں جب کہ عمر اقدس انچاس سال آٹھ ماہ گیارہ دن کی تھی ابوطالب انتقال کر گئے۔ اب کفار نے ابوطالب کا قدم حمایت درمیان نہ پا کر حضور کی آزار دہی پر اور زائد کمر باندھی۔ یہاں تک ان کے ظلم و جور سے حضور اقدس مکہ مکرمہ میں تشریف نہ رکھ سکے اور آس پاس کے قبائل و مقامات میں دعوت تبلیغ فرمانے تشریف لے گئے اور وہاں بھی پیغام حق سنانے کے بدلے میں منکرین و کفار سے سخت سخت تکلیف پانے کے بعد پھر مکہ مکرمہ کو واپس تشریف لائے۔ اور یہیں بعثت اقدس کے گیارھویں سال ایام حج میں قبیلہ خزرج کے بعض لوگ جو مدینہ منورہ سے آئے ہوئے تھے، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور شرف اسلام سے مشرف ہوکر مدینہ پر سکینہ کو واپس گئے۔ اس کے بعد بعثت اقدس سے بارھویں برس زمانہ قیام مکہ مکرمہ میں برقول مشہور و اصح رجب کی ستائیسویں تاریخ شب یوم مبارک دوشنبہ میں معراج شریف ہوئی اور پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔ اور تیرھویں برس پیر کے دن صفر کی ستائیسوں تاریخ حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ کو بھی پیر ہی کے دن بارہ یا تیرہ ربیع الاول شریف (باختلاف

روایت) قدوم میمنت لزوم سے مشرف و ممتاز فرمایا۔ اور دس برس وہاں تشریف رکھی اور عالم کو برکات و انوار ایمان و توحید سے منور و مالا مال فرمایا۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ و ہدایت خلق میں سعی بلیغ فرمائی۔ اور حکم جہاد نازل ہونے پر کفار و مشرکین و معاندین سے کثیر غزوات فرمائے جن میں سے متعدد میں خود بنفس نفیس بھی مقابلہ فرمایا۔ اور ان کے اپنے دلوں کو کھینچ لینے والی حکمت و موعظت و رافت و رحمت اور الٰہی قوت و سطوت سے کثیر در کثیر ان لوگوں کو جو اس الٰہ برحق واحد لاشریک کے نام سے بھاگتے بھڑکتے تھے، اس کے پاک نام کا والہ و شیدا بنا کر نہ صرف اس کے مطیع و فرمانبردار محبّ بنادیا، بلکہ اس مالک کل کی محبوبیت کے مرتبہ عظیمہ پر فائز فرمادیا۔ غرض زبان و قلم تحریر و تقریر قول و عمل جان و مال ہر طرح سے فریضہ تبلیغ بہ جہد تمام و سعی بلیغ انجام کو پہنچادیا۔ بادشاہان مجازی کو اس شہنشاہ حقیقی کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف بلانے کے لئے اس کے نائب مطلق نے فرامین ارسال فرمائے اور بادشاہان روم و فارس و مصر وغیرہ کو دعوت اسلام دی۔ الغرض شوکت اسلام روز بروز بڑھنے لگی یہاں تک کہ ۸ ھ میں بلد اللہ الحرام کی فتح مبین کا ظہور ہوا۔ قبیلہ خزاعہ پر جو حضور اقدس علیہ السلاۃ والسلام کے عہد میں تھے، بنی بکر نے جو کفار قریش کے ہم عہد تھے، زیادتی کی اور ان پر شبخون مارا جس میں ان کے کئی آدمی مارے گئے اور قریش نے بھی بنی بکر کی مدد کی۔ یہ حال حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کو پہلے باعلام ربّانی معلوم ہوچکا تھا کہ قاصد خزاعہ نے بھی حاضر خدمت ہوکر عرض کیا اور مدد چاہی۔ حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے بپاسداری عہد قصد مکہ معظّمہ فرمایا اور خدا کا وہ پیارا جو کل اس کے حرم اور اس کے گھر سے اس کے دشمنوں کے مظالم و شدائد کے سبب رات کی اندھیری میں ان سے چھپ کر تن تنہا اس طرح انگلیوں کے بل راستہ طے کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے گیا تھا کہ انہیں اس کا کھوج نہ ملے۔ آج اس محبوب کی اپنے چاہنے والے مالک و مولیٰ جل و علا کے حرم میں اسے اس کے دشمنوں اور ان کے گھڑے ہوئے معبودان باطل کی نجاست و غلاظت سے پاک و صاف کرنا اور ان سے بہتوں کی سابق سرکشی و دشمنی دور کر کے

انہیں اس کا محبّ و ہم محبوب بنا دینے کے لئے واپسی اس شان وشوکت وعظمت و جبروت سے کھلّم کھلا دن دھاڑے عمل میں آتی ہے کہ وہ جنہوں نے اپنے مظالم و شدائد کو انتہا پر پہنچا کر خدا کے اس محبوب مطلق کو اس کے حرم سے نکالا تھا، اس کے ساتھ اپنی سی سب کچھ کر چکنے کے بعد قطعاً سپر انداختہ ہو جاتے اور اس کے واپس آنے پر اپنے ان شدید ترین مظالم کا انتقام لئے جانے کے خیال سے ہی گھبرا اٹھتے اور اپنے ایک بڑے سردار کو اس کی خدمت میں اپنی طرف سے عذر معذرت کرنے اور امن و صلح کا عہد موکد کرنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ رات دن ہول اور دھڑکوں میں گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس قادر مطلق کا یہ نائب مطلق ہزاروں جاں نثار غلاموں کے ساز وسامان جنگ سے مسلح و تیار لشکر کے ساتھ چہار شنبہ دس رمضان المبارک ۸ ھ کو عصر کے بعد یا دوسری ماہ مذکورہ کو، برقول اصح تر مدینہ منوّرہ سے برآمد ہو کر ۲۰ ماہ مذکور کو مکہ مکرمہ میں بفتح ونصرت الٰہی وعزت وشوکت لا متناہی اس طرح داخل ہوتا ہے کہ اول اس کے فدائیوں کے گروہ اپنے اپنے علموں نشانوں کے ساتھ رجز پڑھتے اور تکبیر کے نعرے لگاتے یکے بعد دیگرے گزرتے ہیں اور پھر تقریباً پانچ ہزار مخصوص جانثار اعیان مہاجرین واشراف انصار آراستہ وپیراستہ ہر طرح سے مستعد و تیار نعرہ ہائے تکبیر سے زمین وزماں میں غلغلہ ڈالتے جلوئے ،مبارک میں ایک طرف صدیق اکبر اور دوسری جانب اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہمرکاب سعادت اور خود بدولت وعزت و اقبال وکامرانی ناقہ قصوائے مبارک پر سواران سے تکلّم فرماتے سرزمین حرم کو اپنے بابرکت قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرماتے ہیں۔ اور اس کل کی حالت کو آج کی اس شان وشوکت کے ساتھ تصور فرما کر اپنے اس چاہنے والے مالک ومولٰی کی شکر و نعمت میں سر مبارک باظہار تواضع وعبودیت نیچے کی طرف جھکاتے یہاں تک کہ ریش مبارک اونٹنی کے پالان کی لکڑی سے جالگتی اور پالان ہی کے اوپر سر رکھکر سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔ سورہ فتح شریف کی اول آیتوں کی تلاوت اس نعمت عظمٰی کے وفور سرور وغلبہ شوق وشکر میں آواز بڑھا بڑھا کر ہوتی جاتی۔ اللہ اللہ کیا وقت سعید اور زمان

حمید ہے۔ سطوت اسلام کا آفتاب نصف النہار پر طالع ہے اور کفر کی شب دیجور کو ایمان کی صبح صادق کے نور نے کافور کر دیا ہے۔ غلامان سرکار پھولوں نہیں سماتے اور دشمنان ناہنجار سوراخ مور مار تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مگر اللہ اکبر رحمۃ للعٰلمین کی کیا شان رحمت ہے کہ وہ دشمن جو اپنی قابو یافتگی کے وقت خون کے پیاسے تھے اور کوئی دقیقہ دشمنی اور آزار رسانی کا انہوں نے اٹھا نہیں رکھا تھا آج ان پر اس طرح امن و امان کے دروازے کھولے جاتے ہیں کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے۔ سبحان اللہ۔ یہ ابوسفیان وہی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اس محبوب خدا کے سخت دشمنوں میں تھے، آج وہ رحمت کردگار نہ صرف ان کو ہی امن دیتا بلکہ ان کے گھر کو امن کا گھر بنا دیتا ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہے۔ پھر اسی پر اقتصار نہیں ہوتا بلکہ فرمان ہوتا ہے کہ اور جو ہتھیار ڈال دے وہ امن میں ہے۔ اور جو اپنے گھر کے دروازے بند کرلے وہ امن میں ہے۔ اور جو مسجد الحرام میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہے۔ اب کہ خدا کا محبوب اس گھر میں اس دبدبے جلالت و عزت وعظمت وقوت وشوکت کے ساتھ داخل ہو چکا ہے۔ دور دورا اسلام ہے۔ اور ظہور ان العزۃ للہ و لرسولہ و للمومنین بروجہ تمام اعیان قریش وصنادید عرب سامنے حاضر ہیں۔ اور دل اپنے ان مظالم کو یاد کر کے جو وہ اس رحمت عالم پر اب سے پہلے توڑ چکے ہیں دھڑک رہے اور اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ دیکھئے آج ہم سے ان کا کیا بدلہ لیا جاتا ہے، یکا یک وہ رحمت مجسم ارشاد فرماتا ہے کہ اے اھل مکہ آج تم مجھ سے اپنی نسبت کس معاملہ کا گمان رکھتے ہو اور کیا سمجھتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کروں گا۔ وہاں عجز و بیچارگی نے اس کے سوا اور کیا جواب دینے کے قابل رکھا تھا کہ ''نقول خیرا ونظن خیرا اخ کریم وابن اخ کریم قد قدرت'' حضور ہمارے کرم والے بھائی اور کرم والے بھائی کے بیٹے آج حضور ہمارے مالک ہیں اور ہم حضور سے نیکی یعنی عفو و درگذر ہی کا گمان رکھتے ہیں۔ اس پر ارشاد ہوتا ہے اقول ماقال یوسف علیہ الصلوۃ و السلام لاتثریب علیکم الیوم یغفراللہ لکم وھو ارحم

الراحمین ۔میں تم سے وہ فرماتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ آج تم پر کچھ ملامت نہیں ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ جاؤ تم قید و بند سے آزاد ہو۔ اس کے بعد ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرما کر رسوم و عادات جاہلیت و کفر و شرک کی کامل بیخ کنی فرمائی جاتی اور دیت و قصاص کے احکام تعلیم فرما کر اہل جاہلیت کی اس عادت کی مذمت واضح فرمائی جاتی ہے کہ وہ اپنے باپ دادا پر فخر اور تکبّر کرتے اور نسب پر اتراتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ سب آدمی حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی اولاد ہیں اور وہ خاک سے پیدا فرمائے گئے تھے۔ اور کسی کو دوسرے پر فضیلت و بزرگی نہیں ہے مگر تقوے اور پرہیز گاری سے اور یہ آیہ کریمہ تلاوت ہوتی ہے۔" یا ایہا الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثی و جعلنکم شعوبا وقبائل اتعرفوان اکرمکم عنداللہ اتقکم ان اللہ علیم خبیر "بعد فتح مکہ مکرمہ میں پندرہ روز اور بروایت دیگر انیس یا اٹھارہ یا سترہ روز تشریف رکھنے کے بعد پھر مدینہ باسکینہ کو مراجعت فرمائی۔ واقعہ فتح کے بعد آفتاب اسلام کی ضیاباری دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور بفحوائے ورویت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا اطراف واقطار نزدیک و دور سے جوق درجوق مخلوق حاضر خدمت سراپا سعادت ہو کر شرف ایمان وعرفان سے مشرف ہو کر زمرہ غلامان جان نثار میں داخل ہونے لگی۔ اطراف و جوانب کے دیار و قریات سے وفود حاضر خدمت ہوتے اور تعلیم احکام و شرائع اسلام حاصل کر کے اپنے اپنے مقام کو واپس جاتے اور وہاں کے لوگوں کو احکام اسلام سکھاتے بعض غزوات مثل غزوہ حنین وغیرہ بھی اس کے بعد ہوئے اور سن دس ہجری میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ حج بیت اللہ شریف فرمایا۔ یہ خبر پھیلنے پر اس سال اطراف و جوانب سے ایک لاکھ سے زائد لوگ حج میں جمع ہو گئے۔ اس حج کا نام حجۃ الوداع ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعض خطبوں میں حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے ایسے کلمات فرمائے جیسے کوئی کسی کو وداع کرتا ہے۔ اور

فرمایا کہ مجھ سے مناسک حج سیکھ لو، شاید کہ میں آئندہ سال حج نہ فرماؤں اور تم میں تشریف نہ رکھوں۔ (مدارج وشرح شجرہ وتواریخ وغیرہ)

حجۃ الوداع کا خطبہ:

وادی عرفات میں جمعے کے دن بعد زوال آفتاب اونٹنی مبارک پر سوار ہو کر حضور اقدس نے ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں احکام وقواعد اسلام کی تقریر و توضیح اور ایمان و توحید کی تشریح و تاکید اور کفر و شرک اور رسوم واوضاع جاہلیت کی بیخ کنی فرمائی اور مسلمانوں کے مال اور خون کی حرمت وحفاظت کی تاکید فرمائی اور جملہ رسوم واوضاع جاہلیت قطعاً باطل فرمادیں اور فرمایا کہ جس قدر خون زمانہ جاہلیت میں ہوئے، وہ سب ہدر میں یعنی آج سے ان کا دعوی کسی کو کسی پر نہیں پہنچتا اور اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے ابن عم حضرت ربیعہ بن الحارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے ایاس کا خون ہدر فرما دیا۔ اور ارشاد ہوا کہ جاہلیت کے زمانے کے جتنے سود ہیں وہ بھی سب باطل ہیں، آج سے ان کا بھی دعوی کوئی ایک دوسرے پر نہ کرے اور اس سلسلے میں سب میں اول اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعوی ربوا باطل فرمادیا۔ اور اس خطبہ میں مردوں کو عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک اور نیک برتاؤ کرنے کی وصیت و تاکید فرمائی اور جو حقوق جورو کے خاوندوں پر ہیں وہ واضح فرمائے کہ خدائے تعالیٰ سے ان کے معاملے میں ڈریں اور انہیں بے وجہ رنج واذیت نہ دیں۔ اور جو حقوق شوہروں کے عورتوں پر ہیں وہ بھی بیان فرمائے کہ شوہروں کی اطاعت کریں اور غیر مرد کو اپنے پاس نہ آنے دیں اور شوہر اپنی بیویوں کو نان و نفقہ دیں اور ان کے آرام و آسائش کی بطریق معروف خبر گیری رکھیں اور ارشاد ہوا کہ میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اس سے تمسک رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ چیز کتاب اللہ عزوجل ہے۔ اور اس خطبہ وصیت کے بعد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ کل قیامت کے دن جبکہ خدا تعالیٰ تم سے میری

نسبت دریافت فرمائے گا کہ میں نے تم سے کیا معاملہ کیا اور کس طرح تم میں تشریف رکھی تو کیا جواب دو گے صحابہ نے عرض کی کہ ہم عرض کریں گے حق بطریق اکمل ادا فرمایا اور حق رسالت و دعوت وتبلیغ انجام کو پہنچا دیا اور جو امانت حضور کے پاس تھی وہ ادا فرما دی اور راہ خدا میں جہاد فرمایا۔ یہ سن کر حضور اقدس نے کلمے کی انگلی تین بار آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا اللھم اشھد اللھم اشھد اللھم اشھد اے میرے اللہ تو گواہ رہ اے میرے اللہ تو گواہ رہ اے میرے اللہ تو گواہ رہ۔ پھر ارشاد ہوا کہ تین چیزیں سینے کو پاک وصاف رکھتی ہیں۔ ایک اعمال میں اخلاص یعنی طاعت و عبادت محض رضائے خدا کے لئے کرنا اور ریا کو داخل نہ ہونے دینا۔ دوسرے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی۔ تیسرے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا۔ پھر ارشاد ہوا کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ ان کو جو یہاں موجود نہیں یہ سب ارشادات پہنچا دیں۔ اس کے بعد خطبہ تمام فرما دیا اور سواری مبارک سے نزول اجلال فرمایا۔ اور بعد فراغ ارکان و اعمال حج مدینہ پرُسکینہ کو قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا اور بدستور سابق ارشاد و ہدایت خلق و طاعت و عبادت خالق میں اوقات گرامی صرف ہونے لگے مگر چونکہ زمانۂ وفات شریف قریب آ چکا تھا، اکثر کلمات رخصت و وداع فرماتے رہتے۔ (مدارج وغیرہ)

اواخر صفر ۱۱ھ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مرض عارض ہوا اور پیر کے دن ربیع الاول شریف کے مہینے میں نصف النہار کے وقت ۱۱ھ بارہویں (☆ یہی قول جمہور ہے۔ یعنی باعتبار اہل مدینہ منورہ کہ بوجہ عدم رویت ہلال اس دن بارھویں ٹھہری، اگرچہ حقیقت باعتبار رویت مکہ معظمہ اس دن تیرھویں تھی۔ کما حققہ فی نطق الہلال) تاریخ مطابق نہم حزیراں ۹۴۳ رومی اسکندرانی ہشتم (☆ یعنی اس وقت جو شمار رائج تھا اس کے حساب سے ۸/ جون اور اصلی حساب سے ۱۲/ جون تھی کما فی نطق الہلال) جون ۶۳۲ء میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کاشانۂ مبارک میں مدینہ پرسکینہ میں وصال فرمایا۔ آخری وصیت جو ایام مرض میں اکثر فرماتے رہتے ممالیک یعنی لونڈی غلاموں سے احسان اچھے سلوک اور نماز کی تاکید تھی۔ یہاں تک

کہ نزدیکی وقت وفات شریف میں جب کہ زبان مبارک سے الفاظ ادا نہیں ہوتے تھے، مگر سینۂ مبارک میں اس وقت بھی اس وقت کے کلمات کا غرغرہ سنائی پڑتا تھا (مدارج ونطق وغیرہ)

بعد وفات شریف حسب وصیت حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام حضرت عباس و حضرت مولیٰ علی و دیگر اہلبیت کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مل کر غسل و تکفین و تجہیز کے کام انجام دیئے جن کی علیحدہ علیحدہ تفصیل بڑی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور نماز جنازہ کے بارے میں یہ قرار پایا کہ بدفعات لوگ حاضر ہوتے جائیں اور اکیلے اکیلے نماز پڑھتے جائیں، تاکہ اس شرف سے کوئی محروم نہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور چونکہ معلوم ہے کہ اجساد کریم حضرت انبیاء عظام علیہم الصلاۃ والسلام میں بعد وفات کوئی تغیر نہیں ہوتا، لہٰذا تاخیر دفن کا کچھ اندیشہ نہ کیا اور سب کو اس شرف نماز سے مشرف ہو لینے دیا۔ اول مردوں نے نماز پڑھی پھر عورتوں نے پھر بچوں نے جیسا کہ یہی صفوں کی ترتیب ہے۔ اول اہلبیت کرام مولیٰ علی و عباس و دیگر بنو ہاشم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نماز پڑھی۔ پھر مہاجرین، ان کے بعد انصار نے۔ لوگ فوج فوج گروہ گروہ آتے جاتے اور نماز پڑھ کر باہر نکلتے جاتے۔ بعد نماز حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ مبارکہ میں جس جگہ کہ وفات شریف ہوئی تھی، وہیں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغلی قبر کھودی اور چہارشنبہ کی رات میں بوقت سحر جانب پائیں سے جنازہ مبارک قبر شریف میں آیا، اور حضرت کرام مولیٰ علی و عباس و فضل و قثم رضی اللہ تعالیٰ عنہم قبر مبارک کے اندر لے کر اترے اور سب میں آخر میں قبر مباک میں روے مبارک میں نے دیکھا کہ لب ہائے مبارک جنبش میں تھے۔ میں نے جو کان لگا کر سنا تو فرما رہے تھے، ''ربِّ اُمّتی اُمّتی'' اے میرے رب میری اُمت میری اُمت۔ الغرض جنازہ مقدس قبر شریف میں اتارنے کے بعد اسے کچی اینٹوں سے بنایا گیا اور اس پر مٹی ڈالی گئی اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبر شریف پر مشک سے پانی چھڑکا اور اس پر سرخ و سفید سنگریزے بچھائے گئے اور قبر

شریف ایک بالشت بلند مثل کوہان شتر مسنم بنائی گئی۔ کما علیہ الاکثر (مدارج وغیرہ)

ازواجِ مطہرات:

حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی ازواج مطہرات کی تعداد اور ان کی ترتیب میں علمائے سیر وغیرہ نے اختلاف کیا ہے۔ جو بڑی کتابوں میں مذکور ہے، مگر گیارہ ازواج متفق علیہ ہیں۔ جن میں سے چھ قریشی ہیں۔ حضرت ام المومنین خدیجہ بنتِ خویلد وحضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ بنتِ صدیق اکبر وحضرت ام المومنین حفصہ بنت فاروق اعظم وحضرت ام المومنین ام حبیبہ بنت حضرت ابوسفیان وحضرت ام المومنین ام سلمہ بنت ابی امیہ اور حضرت ام المومنین سودہ بنت زمعہ اور چار غیر قرشی عربی حضرت ام المومنین زینب بنت جحش وحضرت ام المومنین میمونہ بنت الحارث ہلالیہ وحضرت ام المومنین زینب بنت خزیمہ ہلالیہ ام المساکین وحضرت ام المومنین جویریہ بنت الحارث اور ایک عربی نسل بنی اسرائیل سے حضرت ام المومنین صفیہ بنت حیی قبیلہ بنی النضیر سے تھیں۔ ان میں سے دو بیبیاں حضرت ام المومنین خدیجہ اور حضرت ام المومنین زینب ام المساکین حضور اقدس کے سامنے ہی وفات پاگئیں اور باقی نو ازواج مطہرات حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام بعد وفات بھی زندہ رہیں۔ سب میں پہلی بی بی جن سے حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے نکاح فرمایا، حضرت ام المومنین خدیجہ کبریٰ ہیں۔ ان کی زندگی بھر حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے اور کسی سے نکاح نہیں فرمایا۔ یہ حضور کی بہت ہی محبوب بی بی تھیں۔ اور سب سے پہلے شرفِ اسلام اور حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی نبوت کی تصدیق سے مشرف ہوئیں اور اپنے مال کو حضور اقدس کی رضا جوئی اور امداد واعانت دین الٰہی میں صرف فرمایا۔ کفار کی تکذیب سے جو غم وتکلیف حضور اقدس کو پہنچتی، اسے یہ اپنی خوش خلقی اور تسلی وتشفی کی باتوں سے دور فرمادیتیں۔ ان کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں۔ شیخ محقق مدارج میں فرماتے ہیں کہ یہی ایک فضیلت ان کی کافی ہے کہ حضرت سیدۃ نساء الجنۃ جگر پارۂ

رسول بی بی فاطمہ زہرا ان کے شکم مبارک سے تولد ہوئیں اور حضور اقدس کی سب ذکور واناث سوائے حضرت سیدنا ابراہیم کے حضرت ام المومنین خدیجہ ہی سے ہیں۔ چوبیس یا پچیس برس شرف زوجیت سے ممتاز رہ کر بعثت اقدس سے دسویں سال میں ماہ مبارک صیام میں ابوطالب کے انتقال سے تیسرے یا پانچویں دن ہجرت مقدسہ سے تین یا پانچ برس پہلے ٦۵ برس کی عمر میں رمضان المبارک کے مہینے میں مکۂ مکرمہ میں وفات پائی۔ خود حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام نے قبر مبارک کے اندر اتارا اور دعائے خیر فرمائی، اس لیے کہ نماز جنازہ اس وقت تک شروع نہ ہوئی تھی۔ ان کے وصال سے حضور اقدس کو بہت ہی رنج وملال ہوا، جس کے لحاظ سے اس سن کا نام عام الحزن غم کا سال ہوا۔ بوجہ کثرت غم کاشانۂ اقدس سے بہت کم باہر تشریف لاتے۔ حضرت ام المومنین مقبرہ حجون جنۃ المعلیٰ مکہ مکرمہ میں مدفون ہوئیں (مدارج النبوۃ وغیرہ) جہاں مزار مبارک اب تک موجود اور اہل ایمان کی زیارت گاہ تھا۔ یہاں تک کہ اس چودھویں صدی کے پانچویں عشرہ کے ابتدائی سالوں میں نجد کے وہابی شیاطین نے حجاز مقدس وحرمین مطہرین پر تسلط پاکر اپنی شیطانی خباثت اور نجدی شیطنت اور اسلام واکابر اسلام سے عداوت کے جوش میں جہاں اور مآثر ومشاہد ومساجد ومزارات مقدسہ حرمین مطہرین ودیگر بلاد حجاز مقدس سے سخت سخت گستاخیاں بے ادبیاں کیں، ان کو توڑا پھوڑا، ڈھایا، گرایا، اسی سلسلے میں ۴۳-۱۳۴۴ ہجری میں حضرت ام المومنین کے مزار مقدس کو بھی کھود کرا اور توڑ پھوڑ کرا اور اس کے ساتھ طرح طرح کی سخت نجس ناپاک گستاخیاں کر کے حضور سرکار رسالت مآب سے اپنے دلوں میں رچی ہوئی سخت اشد ترین عداوت کا ثبوت دیا۔ فخذلھم اللہ تعالیٰ وقاتلھم وکسر شوکتھم وخرب بلادھم انا للہ وانا الیہ راجعون ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

چونکہ حضرت ام المومنین نسباً اس فقیر ذرہ بے مقدار کی جدات عالی سے ہیں اس لیے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا۔ دوسری حضرات امہات المومنین کے فضائل

ومناقب اوران کے مفصل تذکرے بڑی کتابوں مدارج النبوۃ وغیرہ میں مسطور ہیں۔
لہٰذا بلحاظ طوالت فقیر نے یہاں درج نہیں کئے اوران ازواج مطہرات کے علاوہ حضور
اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کے لیے بعض سراری بھی تھیں جن سے حضور اقدس علیہ
الصلاۃ والسلام نے عقد نکاح نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ وہ بوجہ ملک یمین حضور کے پاس
سلسلہ زوجیت میں تھیں ایک حضرت ام المومنین ماریہ بنت شمعون قبطی جنہیں مقوقس
بادشاہ مصر نے حضور اقدس کو پیشکش بھیجا تھا۔ یہ شرف اسلام سے مشرف ہونے کے
بعد ام المومنین بنیں اور حضرت سیدنا ابراہیم حضور اقدس کے صاحبزادے انہیں کے
بطن مبارک سے تولد ہوئے اور خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ۱۶ھ میں وفات پائی
اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔ دوسری کا نام ریحانہ بنت زید بن عمرو وبقول بعض بنت
شمعون۔ تیسری کا نام جمیلہ اور چوتھی حضرت ام المومنین زینب بنت جحش حضور اقدس
کو دی تھیں (مدارج وشجرہ وغیرہ)

حضور اقدس کی اولاد امجاد کی تعداد وترتیب ولادت واسماء میں اقوال علمائے
انساب مختلف ہیں جو بڑی کتابوں میں مذکور ہیں۔ مگر دو صاحبزادے حضرت سیدنا
قاسم وحضرت سیدنا ابراہیم اور چار صاحبزادیاں حضرت بی بی زینب حضرت بی بی رقیہ
حضرت بی بی ام کلثوم اور ہماری جدۂ محترمہ حضرت بی بی فاطمہ علی ابیہم وعلیہم الصلاۃ و
السلام متفق علیہ ہیں۔ اور اصح یہ ہے کہ ان کے علاوہ ایک اور صاحبزادے حضرت
سیدنا عبداللہ بھی تھے جن کا لقب طیب وطاہر تھا۔ پس بقول اصح مجموع اولاد تین
صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ جن میں سے حضرت سیدنا ابراہیم کے
علاوہ باقی سب حضرت ام المومنین خدیجہ کے بطن مبارک سے ہی ہیں (مدارج وغیرہ)
ان سب کے حالات تفصیل سے بوجہ طوالت ہم نے ذکر نہیں کئے۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ - خاتم پیغمبراں

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں
قادری برکاتی قدس سرہٗ

اللہ عزوجل سچا اور اس کا کلام سچا، مسلمان پر جس طرح لا الٰہ الا اللہ ماننا اللہ
سبحانہ وتعالیٰ کو احد صمد لاشریک لہ جاننا فرض اول ومناط ایمان ہے یونہی محمد رسول اللہ صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خاتم النبیین ماننا ان کے زمانے میں خواہ ان کے بعد کسی نبی جدید کی
بعثت کو یقیناً محال وباطل جاننا فرض اجل وجزءِ ایقان ہے ولکن رسول الله و خاتم
النبیین (القرآن ۳۳/۴۰) (ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پہلے-ت)

نصوصِ ائمہ سے اہلِ ایمان کو زیادہ پر اعتبار واعتماد آئے گا معہذا ذکر محبوب
راحتِ قلوب ہے ان کی یاد سے مسلمانوں کا دل چین پائے گا۔

طبرانی معجم کبیر میں اور حاکم بافادۂ تصحیح اور بیہقی دلائل النبوۃ میں امیر المومنین
عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
جب آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لغزش واقع ہوئی عرض کی: یارب اسئلك بحق
محمد ان غفرت لی الٰہی! میں تجھے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر سوال
کرتا ہوں کہ میری مغفرت فرما۔ ارشاد ہوا: اے آدم! تو نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم) کو کیونکر پہچانا حالانکہ میں نے ابھی اسے پیدا نہ کیا؟ عرض کی: الٰہی جب تو نے
مجھے اپنی قدرت سے بنایا اور مجھ میں اپنی روح پھونکی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عرش

کے پایوں پر لکھا پایا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو میں نے جانا تو نے اسی کا نام اپنے نامِ پاک
کے ساتھ ملایا ہوگا جو تجھے تمام جہان سے زیادہ پیارا ہے۔ فرمایا:

اے آدم! تو نے سچ کہا بیشک وہ مجھے تمام جہان سے زیادہ پیارا ہے اور
جب تو نے مجھے اس کا واسطہ دے کر سوال کیا تو میں نے تیرے لیے مغفرت فرمائی،
اگر محمد نہ ہوتا تو میں تجھے نہ بناتا (المستدرک للحاکم ۲/ ۶۰۵) طبرانی نے یہ اضافہ کیا: وہ
تیری اولاد میں سب سے پچھلا نبی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (المعجم الاوسط لطبرانی
۷/ ۲۵۹)۔

ابونعیم ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
فرماتے ہیں: جب موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر توریت اتری اسے پڑھا تو اس میں اس
امت کا ذکر پایا۔ عرض کی: اے رب میرے! میں ان لوحوں میں ایک امت پاتا ہوں
کہ وہ زمانے میں سب سے پچھلی اور مرتبے میں سب سے اگلی، تو یہ میری امت کر،
فرمایا: یہ امت احمد کی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (دلائل النبوۃ - (۱/ ۱۴)

ابن عساکر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا کیا۔
انھیں ان کے بیٹوں پر مطلع فرمایا، وہ ان میں ایک دوسرے پر فضیلتیں دیکھیں تو ان
سب کے آخر میں بلند روشن نور دیکھا، عرض کی: الٰہی! یہ کون ہے؟ فرمایا: یہ تیرا بیٹا احمد
ہے۔ یہی اوّل ہے اور یہی آخر ہے اور یہی سب سے پہلا شفیع اور یہی سب سے پہلا
ہے جس کی شفاعت قبول ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (مختصر تاریخ دمشق ۲/ ۱۱۱) نیز
بطریق ابی الزبیر حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، فرمایا:

آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دونوں شانوں کے وسط میں قلم قدرت سے لکھا
ہوا ہے محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (ایضاً-۲/ ۱۳۷)

ابن ابی شیبہ مصنف میں بطریق مصعب بن سعد حضرت کعب احبار رضی
اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی: انھوں نے کہا سب سے پہلے جو دروازۂ جنت کی زنجیر پر ہاتھ

رکھے گا پس اس کے لیے دروازہ کھولا جائے گا وہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، پھر
توریت مقدس کی آیت پڑھی کہ سب سے پہلے مرتبہ میں سابق زمانے میں لاحق، یعنی
امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (مصنف ابن ابی شیبہ-۱۱/ ۴۳۴)

ابن سعد عامر شعبی سے راوی، سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صحیفوں
میں ارشاد ہوا: بیشک تیری اولاد میں قبائل در قبائل ہوں گے، یہاں تک کہ نبی امّی خاتم
الانبیاء جلوہ فرما ہو صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (الطبقات الکبریٰ-۱/ ۱۶۳)

محمد بن کعب قرظی سے راوی: اللہ عزوجل نے یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو
وحی بھیجی میں تیری اولاد سے سلاطین و انبیاء بھیجتا رہا کروں گا یہاں تک کہ ارسال
فرماؤں اس حرم محترم والے نبی کو جس کی امت بیت المقدس کی بلند تعمیر بنائے گی اور
اس کا نام احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے (ایضا، ایضا)

ابن ابی حاتم وہب بن منبہ سے راوی: اللہ عزوجل نے اشعیاء علیہ الصلوٰۃ
والسلام پر وحی بھیجی: میں نبی امی کو بھیجنے والا ہوں، اس کے سبب بہرے کان اور غافل
دل اور اندھی آنکھیں کھول دوں گا، اس کی پیدائش مکے میں ہے اور ہجرت گاہ مدینہ
اور اس کی تخت گاہ ملک شام میں۔ ضرور اس کی امت کو سب امتوں سے جو لوگوں کے
لیے ظاہر کی گئیں بہتر وافضل کروں گا، میں ان کی کتاب پر کتابوں کو ختم فرماؤں گا اور
ان کی شریعت پر شریعتوں اور ان کے دین پر سب دینوں کو تمام کروں گا۔ (الخصائص
الکبریٰ ۱/ ۳۳-۳۴)

ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی: نبی کریم صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اگلی کتابوں میں میرے یہ نام تھے: احمد، محمد، ماحی (کفر و شرک
کو مٹانے والے)، مقفی (سب پیغمبروں سے پیچھے تشریف لانے والے)، نبی الملاحم
(جہادوں کے پیغمبر)، حمطایا (حرمِ الٰہی کے حمایتی)، فارقلیطا (حق کو باطل سے جدا
کرنے والے)، ماذماذ (ستھرے پاکیزہ) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (الخصائص
الکبریٰ-۱/ ۱۹۲)

سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی:

جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حاضر ہوکر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کی: حضور کا رب فرماتا ہے بیشک میں نے تم پر انبیاء کو ختم کیا اور کوئی ایسا نہ بنایا جو تم سے زیادہ میرے نزدیک عزت والا ہو، تمھارا نام میں نے اپنے نام سے ملایا کہ کہیں میرا ذکر نہ ہو جب تک میرے ساتھ یاد نہ کیے جاؤ، بیشک میں نے دنیا واہل دنیا سب کو اس لیے بنایا کہ تمھاری عزت اور اپنی بارگاہ میں تمہارا مرتبہ ان پر ظاہر کروں، اور اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمان وزمین اور جو کچھ ان میں ہے اصلاً نہ بناتا، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (مختصر تاریخ دمشق الا ابن عساکر-۲/ ۱۳۷)

خطیب بغدادی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: شبِ اسریٰ مجھے میرے رب عزوجل نے نزدیک کیا یہاں تک کہ مجھ میں اور اس میں دو کمان بلکہ اس سے کم کا فاصلہ رہا اور مجھ سے فرمایا: اے محمد! کیا تجھے اس کا غم ہوا کہ میں نے تجھے سب پیغمبروں کے پیچھے بھیجا، میں نے عرض کی: نہ-فرمایا، کیا تیری امت کو اس کا رنج ہوا کہ میں نے انھیں سب امتوں کے پیچھے رکھا، میں نے عرض کی: نہ-فرمایا: اپنی امت کو خبر دے دے کہ میں نے انھیں سب سے پیچھے اس لیے کیا کہ اور امتوں کو ان کے سامنے رُسوا کروں اور انھیں اوروں کے سامنے رسوائی سے محفوظ رکھوں، والحمدللہ رب العالمین! (تاریخ البغد ادللنز لی-۵/ ۱۳۰)

ابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردویہ وبزار وابویعلیٰ وبیہقی بطریق ابوالعالیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث طویل اسرا میں راوی:

پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارواحِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ملے پیغمبروں نے اپنے رب عزوجل کی حمد کی، ابراہیم پھر موسیٰ پھر داؤد پھر سلیمان پھر عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ بہ ترتیب حمد الٰہی بجالائے اور اس کے ضمن میں اپنے فضائل وخصائص بیان فرمائے۔ سب کے بعد محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے رب جل جلالہٗ کی ثنا کی اور فرمایا تم سب اپنے رب کی تعریف کر چکے اور اب میں اپنے رب کی حمد کرتا ہوں۔

سب خوبیاں اللہ کو جس نے مجھے سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور تمام آدمیوں کی طرف بشارت دیتا اور ڈرسناتا مبعوث کیا اور مجھ پر قرآن اتارا جس میں شئے کا روشن بیان ہے اور میری امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی اور انھیں عدل و عدالت واعتدال والی امت کیا اور انھیں کو اوّل اور انھیں کو آخر رکھا اور میرے واسطے میرا ذکر بلند فرمایا اور مجھے فاتحۂ دیوان نبوت وخاتمہ دفتر رسالت بنایا، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا، ان وجوہ سے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تم سے افضل ہوئے، پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سدرہ تک پہنچے، اس وقت رب عزوجل نے ان سے کلام کیا اور فرمایا میں نے تجھے اپنا خالص پیارا بنایا اور تیرا نام توریت میں حبیب الرحمٰن لکھا ہے، میں نے تیرے لیے تیرا ذکر اونچا کیا کہ میرا ذکر نہ ہو جب تک میرے ساتھ تیری یاد نہ آئے اور میں نے تیری امت کو یہ فضل دیا کہ وہی سب سے اگلے اور وہی سب سے پچھلے اور میں نے تجھے سب پیغمبروں سے پہلے پیدا کیا اور سب کے بعد بھیجا اور تجھے فاتح وخاتم کیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (تفسیر ابن جریر-۱۵/ ۷تا۹)

ارشاداتَ انبیاء وملائکہ واقوال علماء کتبِ سابقہ:

امام احمد وابوداؤد وطیالسی مطولاً اور ابن ماجہ مختصراً اور ابویعلیٰ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث طویل شفاعت کبریٰ میں فرماتے ہیں: جب لوگ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حضور سے مایوس ہوکر پھریں گے تو سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس حاضر ہوکر شفاعت چاہیں گے، مسیح فرمائیں گے میں اس منصب کا نہیں مجھے لوگوں نے اللہ کے سوا خدا بنایا تھا مجھے آج اپنی فکر ہے مگر ہے یہ کہ جو چیز کسی سربمہر برتن میں رکھی ہو کیا بے مہر اٹھائے اسے پا سکتے ہیں، لوگ کہیں گے نہ، فرمائیں گے تو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور یہاں تشریف فرما ہیں، لوگ میرے حضور حاضر ہوکر شفاعت چاہیں گے میں فرماؤں گا میں ہوں شفاعت کے لیے، پھر جب اللہ عزوجل اپنی مخلوق میں فیصلہ کرنا چاہے گا، ایک منادی پکارے گا کہاں ہیں احمد اور ان کی امت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم،تو ہمیں پچھلے ہیں اور ہمیں اگلی سب امتوں سے پیچھے آئے اور سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا اور سب امتیں عرصات محشر میں ہمارے لیے راستہ دیں گی (مسند ابویعلیٰ -۳/۹)

احمد و بخاری ومسلم وترمذی حدیث طویل شفاعت میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اولین اور آخرین حضور خاتم النبیین افضل المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور آکر عرض کریں گے ۔حضور اللہ تعالیٰ کے رسول اور تمام انبیاء کے خاتم ہیں ہماری شفاعت فرمائیں۔(صحیح البخاری-۲/۶۸۵)

ابونعیم حلیۃ الاولیا اور ابن عساکر دونوں بطریق عطاء حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بہشت سے ہند میں اترے تو گھبرائے، جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اتر کر اذان دی، جب نامِ پاک آیا۔آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا: محمد کون ہیں، کہا: آپ کی اولاد میں سب سے پچھلے نبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)(حلیۃ الاولیا-۵/۱۰۷)

ابونعیم دلائل میں یونس بن میسرہ بن حلبس سے مرسلاً اور دارمی وابن عساکر بطریق یونس ھذا عن ابی ادریس الخولانی عبدالرحمٰن بن غنم اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موصولاً راوی وھذا لفظ المرسل۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: فرشتہ سونے کا طشت لے کر آیا اور میرا شکم مبارک چیر کر دل مقدس نکالا اور اسے دھو کر کچھ اس پر چھڑک دیا، پھر کہا: حضور محمد رسول اللہ ہیں سب انبیاء کے بعد تشریف لانے والے تمام عالم کو حشر دینے والے، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

حدیث متصل میں یوں ہے: جبریل نے اتر کر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شکم چاک کیا، پھر کہا: مضبوط ومحکم دل ہے۔اس میں دو کان ہیں شنوا اور دو آنکھیں ہیں بینا، محمد اللہ کے رسول ہیں۔انبیاء کے خاتم اور خلائق کو حشر دینے والے،

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الخصائص الکبریٰ-۱/۱۶۲)

ابونعیم بطریق شہر بن حوشب اور ابن عساکر بطریق مسیّب بن رافع وغیرہ حضرت کعب احبار سے راوی، انھوں نے فرمایا: میرے باپ اعلم علمائے توراۃ تھے ،اللہ عزوجل نے جو کچھ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اُتارا اس کا علم ان کے برابر کسی کو نہ تھا، وہ اپنے علم سے کوئی شے مجھ سے نہ چھپاتے، جب مرنے لگے مجھے بلا کر کہا: اے میرے بیٹے! تجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنے علم سے کوئی چیز تجھ سے نہیں چھپائی مگر ہاں دو ورق رکھے ہیں ان میں ایک نبی کا بیان ہے جس کی بعثت کا زمانہ قریب آپہنچا۔ میں نے اس اندیشے سے تجھے ان دو ورقوں کی خبر نہ دی کہ شاید کوئی جھوٹا مدعی نکل کھڑا ہوا تو اس کی پیروی کرلے۔ یہ طاق تیرے سامنے ہے میں نے اس میں وہ اوراق رکھ کر اوپر سے مٹی لگا دی ہے ابھی ان سے تعرض نہ کرنا، نہ انھیں دیکھنا جب وہ نبی جلوہ فرما ہوا گر اللہ تعالیٰ تیرا بھلا چاہے گا تو تو آپ ہی اس کا پیرو ہوجائے گا۔ یہ کہہ کر وہ مر گئے۔ ہم ان کے دفن سے فارغ ہوئے مجھے ان دونوں ورقوں کے دیکھنے کا شوق ہر چیز سے زیادہ تھا، میں نے طاق کھولا ورق نکالے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ان میں لکھا ہے: محمد اللہ کے رسول ہیں، سب انبیا کے خاتم، ان کے بعد کوئی نبی نہیں، ان کی پیدائش مکے میں اور ہجرت مدینے کو، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الخصائص الکبریٰ-۱/۶۳)

بیہقی وطبرانی وابونعیم اور خرائطی کتاب الہواتف میں خلیفہ بن عبدہ سے راوی، میں نے محمد بن عدی بن ربیعہ سے پوچھا جاہلیت میں کہ ابھی اسلام نہ آیا تھا تمھارے باپ نے تمھارا نام محمد کیونکر رکھا، کہا میں نے اپنے باپ سے اس کا سبب پوچھا، جواب دیا کہ بنی تمیم سے ہم چار آدمی سفر کو گئے تھے، ایک میں اور سفیان بن مجاشع بن دارم اور عمر بن ربیعہ اور اسامہ بن مالک، جب ملک شام میں پہنچے ایک تالاب پر اترے جس کے کنارے پیڑ تھے، ایک راہب نے اپنے دیر سے ہمیں جھانکا اور کہا تم کون ہو؟ ہم نے کہا اولادِ مضر سے کچھ لوگ ہیں۔ کہا: سنتے ہو عنقریب بہت جلد تم میں سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے تم اس کی طرف دوڑنا اور اس کی خدمت و

اطاعت سے بہرہ یاب ہونا کہ وہ سب میں پچھلا نبی ہے۔ ہم نے کہا اس کا نام پاک کیا ہوگا؟ کہا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ جب ہم اپنے گھروں کو واپس آئے سب کے ایک ایک لڑکا ہوا اس کا نام محمد رکھا (الخصائص الکبریٰ ۱/ ۵۷-۵۸)۔

زید بن عمرو بن نفیل کہ احد العشرۃ المبشرۃ سیدنا سعید بن زید کے والد ماجد ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہ، موحدان ومومنان عہد جاہلیت سے تھے۔ طلوعِ آفتاب عالمتاب اسلام سے پہلے انتقال کیا مگر اسی زمانے میں توحید الٰہی ورسالت حضرت ختم پناہی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شہادت دیتے ہوئے ابن سعد وابونعیم حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، میں زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا مکہ معظّمہ سے کوہِ حرا کو جاتے تھے، انھوں نے قریش کی مخالفت اور ان کے معبودانِ باطل سے جدائی کی تھی، اس پر آج ان سے اور قریش سے کچھ لڑائی رنجش ہو چکی تھی، مجھے دیکھ کر بولے اے عامر! میں اپنی قوم کا مخالف اور ملت ابراہیم کا پیرو ہوا۔ اسی کو معبود مانتا ہوں جسے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پوجتے تھے، میں ایک نبی کا منتظر ہوں جو بنی اسمٰعیل اور اولادِ عبدالمطلب سے ہوں گے ان کا نام پاک احمد ہے میرے خیال میں میں ان کا زمانہ پاؤں گا میں ابھی ان پر ایمان لاتا اور ان کی تصدیق کرتا ان کی نبوت کی گواہی دیتا ہوں، تمھیں اگر اتنی عمر ملے کہ انھیں پاؤ تو میرا اسلام انھیں پہنچانا، اے عامر! میں تم سے ان کی نعت وصفت بیان کیے دیتا ہوں کہ تم خوب پہچان لو، درمیانہ قد ہیں، سر کے بال کثرت وقلت میں معتدل، ان کی آنکھوں میں ہمیشہ سرخ ڈورے رہیں گے، ان کے شانوں کے بیچ میں مہر نبوت ہے، ان کا نام احمد اور یہ شہر ان کا مولد ہے، یہیں ان کی رسالت ظاہر ہوگی۔ ان کی قوم انھیں مکے میں رہنے نہ دے گی کہ ان کا دین اسے ناگوار ہوگا، وہ ہجرت فرما کر مدینے جائیں گے، وہاں سے ان کا دین ظاہر وغالب ہوگا، دیکھو تم کسی دھوکے فریب میں آکر ان کی اطاعت سے محروم نہ رہنا۔ کہ میں دین ابراہیمی کی تلاش میں شہروں شہروں پھرا۔ یہود ونصاریٰ مجوس جس سے پوچھا سب نے یہی جواب دیا کہ یہ دین تمھارے پیچھے آتا ہے اور اس نبی کی وہی صفت بیان کی

جو میں تم سے کہہ چکا اور سب کہتے تھے کہ ان کے سوا کوئی نبی باقی نہ رہا۔

عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب حضور خاتم الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی نبوت ظاہر ہوئی۔ میں نے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ باتیں حضور سے عرض کی، حضور نے ان کے حق میں دعائے رحمت فرمائی اور ارشاد کیا: میں نے اسے جنت میں دامن کشاں دیکھا۔ (الخصائص الکبریٰ ۱/ ۶۱-۶۲)

انکار ختم نبوت کے وجوہات:

اللہ اللہ اس زمانے کے یہود ونصاریٰ ومجوس نے تو بالاتفاق حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو جانے کی شہادتیں دیں اور آج کل کے کذاب بدلگام مدعیان اسلام یہ شاخسانے نکالیں مگر ہے یہ کہ اس وقت تک ان فرقوں کو نہ حضور پرنور ملے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بغض وحسد تھا، نہ اپنے کسی پیشوا مردود کا سخن مطرود بنانا مراد ومقصد، نہ اپنے کسی سگے بھائی کی بات رکھنی، نہ بعد ظہور نور خاتمیت اپنے باپ دادا کی نبوت گھڑنی، وہ کیوں جھوٹ بولتے جو کچھ علوم انبیاء واخبار احبار ورہبان وعلماء سے پہنچا تھا صاف کہتے تھے، بعد ظہور اسلام ان ملاعنہ کے دل میں حسد وعنا کا پھوڑا پھوٹا اور ان مدعیانِ اسلام پر قہر ٹوٹا کہ کسی خبیث کا پیشوا خبیث معاذ اللہ یہ آیۃ کریمہ و خاتم النبیین میں خدا کا جھوٹ ممکن لکھ گیا۔ و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون (اور اب جان جائیں گے ظالم کہ کس کروٹ پلٹا کھائیں گے۔ ت)۔

ذکر ولادت:

امام واقدی وابونعیم حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث طویل ملاقات مقوقس بادشاہ مصر میں راوی، جب ہم نے اس نصرانی بادشاہ سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدح وتصدیق سنی، اس کے پاس سے وہ کلام سن کر اٹھے جس نے ہمیں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ذلیل وخاضع کر دیا، ہم نے کہا سلاطین عجم ان کی تصدیق کرتے اور ان سے ڈرتے ہیں حالانکہ ان سے کچھ رشتہ علاقہ نہیں اور ہم تو

ان کے رشتہ داران کے ہمسائے ہیں۔ وہ ہمارے گھر ہمیں دین کی طرف بلانے آئے اور ہم ابھی ان کے پیرو نہ ہوئے، پھر میں اسکندریہ میں ٹھہرا۔ کوئی گرجا کوئی پادری قبطی خواہ رومی نہ چھوڑا جہاں جا کر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفت جو وہ اپنی کتاب میں پاتے ہیں نہ پوچھی ہو، ان میں ایک پادری قبطی سب سے بڑا مجتہد تھا۔ اس سے پوچھا: آیا پیغمبروں میں سے کوئی باقی رہا؟ وہ بولا: ہاں ایک نبی باقی ہیں وہ سب انبیاء سے پچھلے ہیں، ان کے اور عیسیٰ کے بیچ میں کوئی نبی نہیں، عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کی پیروی کا حکم ہوا ہے، وہ نبی اُمّی عربی ہیں ان کا نام پاک احمد ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ پھر اس نے حلیہ شریفہ و دیگر فضائل لطیفہ ذکر کیے، مغیرہ نے فرمایا، اور بیان کر۔ اس نے اور بتائے، از انجملہ کہا: انھیں وہ خصائص عطا ہوں گے جو کسی نبی کو نہ ملے، ہر نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا وہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ مغیرہ فرماتے ہیں: میں نے یہ سب باتیں خوب یاد رکھیں اور وہاں سے واپس آ کر اسلام لایا۔ (دلائل النبوۃ۔ص ۲۱-۲۲)

ابونعیم حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، میں سات برس کا تھا ایک دن پچھلی رات کو وہ سخت آواز آئی کہ ایسی جلد پہنچتی آواز میں نے کبھی نہ سنی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مدینے کے ایک بلند ٹیلے پر ایک یہودی ہاتھ میں آگ کا شعلہ لیے چیخ رہا ہے لوگ اس کی آواز پر جمع ہوئے وہ بولا: یہ احمد کے ستارے نے طلوع کیا، یہ ستارہ کسی نبی ہی کی پیدائش پر طلوع کرتا ہے اور اب انبیاء میں سوائے احمد کے کوئی باقی نہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

امام واقدی و ابونعیم حضرت حویصر بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی: میرے بچپن میں یہود ہم میں ایک نبی کا ذکر کرتے جو مکے میں مبعوث ہوں گے ان کا نام پاک احمد ہے اب ان کے سوا کوئی نبی باقی نہیں وہ ہماری کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ (دلائل النبوۃ۔ص ۱۷)

ابونعیم سعد بن ثابت سے راوی: یہود بنی قریظہ و بنی نضیر کے علماء حضور سید عالم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفت بیان کرتے۔ جب سرخ ستارہ چمکا تو انھوں نے خبر دی کہ وہ نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں ان کا نام پاک احمد ہے، ان کی ہجرت گاہ مدینہ، جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لا کر رونق افروز ہوئے یہود براہِ حسد و بغاوت منکر ہو گئے۔ (الخصائص الکبریٰ۔ (۱/ ۶۷)

زیاد بن لبید سے راوی، میں مدینہ طیبہ میں ایک ٹیلے پر تھا۔ ناگاہ ایک آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہتا ہے: اے اہل مدینہ! خدا کی قسم بنی اسرائیل کی نبوت گئی، ولادت احمد کا تارا چمکا، وہ سب سے پچھلے نبی ہیں، مدینے کی طرف ہجرت فرمائیں گے، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الخصائص الکبریٰ۔۱/ ۶۸)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی: میں نے مالک بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہتے سنا کہ میں ایک روز بنی عبدالاشہل میں بات چیت کرنے گیا، یوشع یہودی بولا اب وقت آ لگا ہے ایک نبی کے ظہور کا اس کا نام احمد ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ حرم سے تشریف لائیں گے ان کا حلیہ و وصف یہ ہوگا، میں اس کی باتوں سے تعجب کرتا اپنی قوم میں آیا وہاں بھی ایک شخص کو ایسا بیان کرتے پایا، میں بنی قریظہ میں گیا وہاں بھی ایک مجمع میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر پاک ہو رہا تھا ان میں سے زبیر بن باطا نے کہا: بیشک سرخ ستارہ طلوع ہو کر آیا۔ یہ تارا کسی نبی ہی کی ولادت وظہور پر چمکتا ہے اور اب میں کوئی نبی نہیں پاتا سوا احمد کے، اور یہ شہر ان کی ہجرت گاہ ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (دلائل النبوۃ۔ص ۸)

ابن سعد و حاکم و بیہقی و ابونعیم حضرت ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے راوی: مکہ معظّمہ میں ایک یہودی بغرض تجارت رہتا جس رات حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے قریش کی مجلس میں گیا اور پوچھا کیا آج تم میں کوئی لڑکا پیدا ہوا انھوں نے کہا ہمیں نہیں معلوم، کہا: جو تم سے کہہ رہا ہوں اسے حفظ کر رکھو آج کی رات اس پچھلی امت کا نبی پیدا ہوا اس کے شانوں کے درمیان علامت ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الخصائص الکبریٰ۔۱/۱۲۳)

ارشادات حضور ختم الانبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والثناء:

اجلّہ ائمہ بخاری ومسلم وترمذی ونسائی وامام مالک وامام احمد وابوداؤد طیالسی وابن سعد و طبرانی وحاکم وبیہقی وابونعیم وغیرہم حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

بیشک میرے متعدد نام ہیں، میں محمّد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے سبب سے کفر مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں میرے قدموں پر لوگوں کا حشر ہوگا، میں عاقب ہوں اور عاقب وہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (صحیح مسلم-۲/۲۶۱) سبعہ اخیرہ الا الطبرانی کی روایت میں والخاتم زائد ہے یعنی اور میں خاتم ہوں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (بیہقی-۲/۱۴۱)

امام احمد مسند اور مسلم صحیح اور طبرانی معجم کبیر میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں محمّد ہوں اور احمد اور سب انبیاء کے بعد آنے والا اور خلائق کو حشر دینے والا اور رحمت کا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (صحیح مسلم-۲/۲۶۱)

خصائصِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:

(۱) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہدایت سے عالم نے توبہ ورجوع الی اللہ کی دولتیں پائیں۔ حضور کی آواز پر متفرق جماعتیں، مختلف امتیں اللہ عزوجل کی طرف پلٹ آئیں (مطالع المسرات ۱۰۱)

(۲) ان کی برکت سے خلائق کو توبہ نصیب ہوئی الشیخ فی اللمعات والاشعۃ (اشعۃ اللمعات-۴/۲۸۲) اقول یہ چیز اول یعنی ہدایت سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ہدایت دعوت، راستہ دکھانے اور برکت سے وصول مقصود کی توفیق کا نام ہے۔ت)

(۳) ان کے ہاتھ پر جس قدر بندوں نے توبہ کی اور انبیائے کرام کے ہاتھوں پر

نہ ہوئی۔ شیخ نے لمعات میں اسے ذکر کیا اور اشعہ میں اس کی طرف اشارہ فرمایا جہاں انھوں نے پہلے دونوں کا ذکر کیا وہاں یہ ہے۔ تمام انبیاء میں یہ صفت مشترک ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات میں یہ سب سے زیادہ اور وافر اور کامل تر ہے۔ (ت) (اشعۃ اللمعات-۴/۴۸۲)

صحیح حدیثوں سے ثابت کہ روز قیامت یہ امت سب امتوں سے شمار میں زیادہ ہوگی، نہ فقط ہر ایک امت جدا گانہ بلکہ مجموع جمیع امم سے، اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں بحمد اللہ تعالیٰ اسّی ہماری ہوں گی اور چالیس میں باقی سب امتیں۔ والحمدللہ رب العالمین۔

(۴) وہ توبہ کا حکم لے کر آئے اسے امام نووی نے شرح مسلم، ملا علی قاری نے جمع الوسائل اور زرقانی نے شرح مواہب میں ذکر کیا۔ت (شرح مسلم-۲/۲۶۱)

(۵) اللہ عزوجل کے حضور سے قبول توبہ کی بشارت لائے (التیسیر شرح ابی مع الصغیر-۱/۳۷۶)۔

(۶) اقول بلکہ وہ توبہ عام لائے ہر نبی صرف اپنی قوم کے لیے توبہ لاتا ہے وہ تمام جہان سے توبہ لینے آئے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

(۷) بلکہ توبہ کا حکم وہی لے کے آئے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء سب ان کے نائب ہیں تو روز اول سے آج تک اور آج سے قیامت تک جو توبہ خلق سے طلب کی گئی یا کی جائے گی، واقع ہوئی یا وقوع پائے گی، سب کے نبی، ہمارے نبی توبہ ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، (مطالع المسرات ص-۱۰۲)

(۸) ان کی امت توابین ہیں، وصف توبہ میں سب امتوں سے ممتاز ہیں، قرآن کی ان کی صفت میں التائبون (جمع الوسائل-۲/۱۸۳) فرماتا ہے، جب گناہ کرتے ہیں توبہ لاتے ہیں۔ یہ امت کا فضل ہے اور امت کا ہر فضل اس کے نبی کی طرف راجع (مطالع المسرات-۱۰۱)

(۹) ان کی امت کی توبہ سب امتوں سے زائد مقبول ہوئی (حاشیۃ الحفنی علیٰ

الجامع الصغیر-۲/۶۳) ان کی توبہ میں مجرد ندامت وترک فی الحال وعزم
امتناع پر کفایت کی گئی۔ نبی الرحمۃ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے بوجھ
اتار لیے۔ اگلی امتوں کے سخت وشدید باران پر نہ آنے دیئے، اگلوں کی
توبہ سخت سخت شرائط سے مشروط کی جاتی تھی۔ گوسالہ پرستی سے بنی اسرائیل
کی توبہ اپنی جانوں کے قتل سے رکھی گئی کما نطق بہ القرآن العزیز جب ستّر
ہزار آپس میں کٹ چکے اس وقت توبہ قبول ہوئی، شرح الشفا للقاری

(۱۰) وہ خود کثیر التوبہ ہیں، صحیح بخاری میں ہے: میں روز اللہ سبحانہٗ سے سوبار
استغفار کرتا ہوں۔ (شرح الشفا للقاری علی نسیم الریاض-۲/۳۹۳) ہر ایک
کی توبہ اس کے لائق ہے حسنات الابرار سیات المقربین (نیکوں کی
خوبیاں مقربین کے گناہ ہیں۔ت) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر
آن ترقی مقامات قرب ومشاہدہ میں ہیں وللاخرۃ خیر لك من الاولی
(الضحیٰ-۹۳) (آپ کے لیے ہر پہلی ساعت سے دوسری افضل ہے۔ت)
جب ایک مقام اجل واعلیٰ پر ترقی فرماتے گذشتہ مقام کو بہ نسبت اس کے
ایک نوع تقصیر تصور فرما کر اپنے رب کے حضور توبہ واستغفار لاتے تو وہ ہمیشہ
ترقی اور ہمیشہ توبۂ بے تقصیر میں ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مطالع مع بعض
زیادات منی۔ (مطالع المسرات-ص۱۰۲)

(۱۱) انھیں کی امت کے آخر عہد میں باب توبہ بند ہوگا شرح الشفا للقاری
(۲/۳۹۳) اگلی نبوتوں میں اگر کوئی ایک نبی کے ہاتھ پر تائب نہ ہوتا کہ
دوسرا نبی آئے اس کے ہاتھ پر توبہ لائے، یہاں باب نبوت مسدود اور ختم
ملّت پر توبہ مفقود، تو جوان کے دستِ اقدس پر توبہ نہ لائے اس کے لیے
کہیں توبہ نہیں۔

(۱۲) وہ فاتح باب توبہ ہیں سب میں پہلے سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توبہ
کی وہ انھیں کے توسل سے تھی تو وہی اصل توبہ ہیں اور وہی وسیلۂ توبہ صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، مطالع۔

(۱۳) وہ توبہ قبول کرنیوالے ہیں ان کا دروازۂ کرم توبہ ومعذرت کرنے والوں
کے لیے ہمیشہ مفتوح ہے۔ جب سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کعب
بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں لکھا، ان کے حضور اُڑ کر آؤ جوان کے
سامنے توبہ کرتا حاضر ہو یہ اسے کبھی رد نہیں فرماتے (مطالع المسرات:۱۰۱)
اسی بناء پر کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب حاضر ہوئے، راہ میں قصیدہ نعتیہ
بانت سعاد نظم کیا جس میں عرض رسا ہیں ؎

انبئت ان رسول الله او علانی — والعفو عند رسول الله مامول

انی اتیت رسول الله معتذرا — والعذر عند رسو ل الله مقبول

مجھے خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرے لیے سزا کا حکم
فرمایا ہے اور رسول کے ہاں معافی کی امید کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم کے حضور معذرت کرتا حاضر ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں
عذر دولت قبول پاتا ہے۔

توراۃ مقدس میں ہے: احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بدی کا بدلہ بدی نہ دیں
گے بلکہ بخش دیں گے اور مغفرت فرمائیں گے۔ (بخاری شریف-۱/۲۸۵) ولہذا
حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسمائے طیبہ ہیں عفو غفور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

(۱۴) اقول وہ نبی توبہ ہیں، بندوں کو حکم ہے کہ ان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر توبہ و
استغفار کریں اللہ تو ہر جگہ سنتا ہے، اسکا علم اس کا سمع اس کا شہود سب جگہ
ایک سا ہے مگر حکم یہی فرمایا کہ میری طرف توبہ چاہو تو میرے محبوب کے
حضور حاضر ہو۔ قال تعالیٰ:

اگر وہ جو اپنی جانوں پر ظلم کریں تیرے پاس حاضر ہو کر خدا سے بخشش چاہیں اور رسول
ان کی مغفرت مانگے تو ضرور خدا کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔ (النساء ۴/۶۴)
حضور کے عالم حیات ظاہری میں حضور ظاہر تھا اب حضورِ مزار پر انوار ہے اور

جہاں یہ بھی میسر نہ ہوتو دل سے حضور پرنور کی طرف توجہ حضور سے توسل فریاد، استغاثہ، طلب شفاعت کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اب بھی ہر مسلمان کے گھر میں جلوہ فرما ہیں۔ مولانا علی قاری رحمۃ الباری شرح شفا شریف میں فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر مسلمان کے گھر میں جلوہ فرما ہیں۔ (شرح الشفا للقاری ۳/۴۶۴)

(۱۵) وہ مفیض توبہ ہیں توبہ لیتے بھی یہی ہیں اور دیتے بھی یہی، توبہ نہ دیں تو کوئی توبہ نہ کر سکے، توبہ ایک نعمتِ عظمٰی بلکہ اجل نعم ہے، اور نصوص متواترہ اولیائے کرام وعلمائے اعلام سے مبرہن ہو چکا کہ ہر نعمت قلیل یا کثیر، صغیر یا کبیر، جسمانی یا روحانی، دینی یا دنیوی، ظاہری یا باطنی، روزِ اول سے اب تک، اب سے قیامت تک، قیامت سے آخرت تک، آخرت سے ابد تک، مومن یا کافر، مطیع یا فاجر، ملک یا انسان، جن یا حیوان بلکہ تمام ماسوا اللہ میں جسے جو کچھ ملی یا ملتی ہے یا ملے گی، اس کی کلی انھیں کے صبائے کرم سے کھلی اور کھلتی ہے اور کھلے گی، انھیں کے ہاتھوں پر بٹی اور بٹتی ہے۔ یہ سر الوجود و اصل الوجود و خلیفۃ الاعظم و ولی نعمت عالم ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، یہ خود فرماتے ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:

میں ابو القاسم ہوں اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں (المستدرک:۲/۶۰۴)

ان کا رب اللہ عزوجل فرماتا ہے: ہم نے نہ بھیجا تمھیں مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (۲۱/ ۱۰۷)

(۱۶) اقول وہ نبی توبہ ہیں کہ گناہوں سے ان کی طرف توبہ کی جاتی ہے۔ توبہ میں ان کا نام پاک نام جلالت حضرت عزت جلالہٗ کے ساتھ لیا جاتا ہے کہ میں اللہ و رسول کی طرف توبہ کرتا ہوں جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم شریف میں ہے: ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف توبہ کرتی ہوں ان تمام خطاؤں سے جو مجھ سے ہوئیں۔ (صحیح البخاری-۲/ ۷۷۸)

معجم کبیر میں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے: ابوبکر صدیق وعمر فاروق وغیرہما چالیس اجلّہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کھڑے ہوکر ہاتھ پھیلا کر لرزتے کانپتے حضور سے عرض کی: ہم اللہ اور اس کے رسول کی طرف توبہ کرتے ہیں (المعجم الکبیر:۲/ ۹۵-۹۶)

اقول توبہ کے معنی ہیں نافرمانی سے باز آنا، جس کی معصیت کی ہے، اس سے عہد اطاعت کی تجدید کر کے اسے راضی کرنا اور نص قطعی قرآن سے ثابت کہ اللہ عزوجل کا ہر گنہگار حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا گنہگار ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (النساء:۸۰) اس کو عکس نقیض، من لم یطع اللہ لم یطع الرسول، لازم ہے اور ہمارے قول ''من عصی اللہ فقد عصی الرسول'' کا یہی معنی ہے (ت) اور قرآن عظیم حکم دیتا ہے کہ اللہ و رسول کو راضی کرو۔ قال اللہ تعالیٰ: سب سے زیادہ راضی کرنے کے مستحق اللہ و رسول ہیں۔ اگر یہ لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ (۹/ ۶۲)

یہ نفیس فوائد کہ استطراداً زبان پر آ گئے قابلِ حفظ ہیں کہ اس رسالے کو غیر میں نہ ملیں گے یوں تو ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگرست

مگر میں امید کرتا ہوں کہ فقیر کی یہ تین توجیہیں اخیر بحمد اللہ تعالیٰ چیزے دیگر ہیں وباللہ التوفیق۔

امام احمد وابن سعد وابن ابی شیبہ اور امام بخاری تاریخ اور ترمذی شمائل میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، مدینہ طیبہ کے ایک راستے میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجھے ملے اور ارشاد فرمایا: میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں رحمت کا نبی ہوں، میں توبہ کا نبی ہوں، میں سب میں آخری نبی ہوں، میں حشر دینے والا ہوں، میں جہادوں کا نبی ہوں، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (شمائل ترمذی ۲/ ۵۹۷)

طبرانی معجم کبیر اور سعید بن منصور سنن میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں محمد ہوں، میں
احمد ہوں، میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو اپنے قدموں پر میں حشر دوں گا، میں ماحی ہوں کہ
اللہ تعالیٰ میرے سبب سے کفر کو محو فرماتا ہے، قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ
میں ہوگا۔ میں سب پیغمبروں کا امام اور ان کی شفاعتوں کا مالک ہوں گا صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۲/۱۸۴)

اسمائے طیبہ خاتم و عاقب و مقفی تو معنیٔ ختم نبوت میں نص صریح ہیں۔ علماء
فرماتے ہیں اسم پاک حاشر بھی اسی طرف ناظر۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں
فرماتے ہیں: علماء نے فرمایا ان دونوں یعنی قدمی مفرد اور قدمی تثنیہ کا معنی یہ ہے کہ
لوگوں کا حشر میرے پیچھے میری رسالت نبوت کے زمانہ میں ہوگا، اور میرے بعد کوئی
نبی نہیں (شرح مسلم: ۲/۱۶۱)

تیسیر میں ہے: میری نبوت کے زمانہ کے بعد یعنی میرے بعد کوئی نبی
نہیں۔ (۱/۳۴۳)

جمع الوسائل میں ہے: جزری نے فرمایا: یعنی لوگوں کا حشر میری نبوت کے
زمانہ کے بعد ہوگا میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (۲/۱۸۲)

ابن مردویہ تفسیر اور ابونعیم دلائل میں اور ابن عدی و ابن عساکر و دیلمی حضرت
ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
میرے رب کے یہاں میرے دس نام ہیں: محمد و احمد و فاتح، عالم ایجاد و خاتم نبوت و
ابوالقاسم و حاشر و آخر الانبیاء و ماحی کفر و یٰس و طٰہٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (دلائل النبوۃ: ص۱۲)

ابن عدی کامل میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی میرے رب کے
پاس میرے لیے دس نام ہیں، از انجملہ محمد و احمد و ماحی و حاشر و عاقب یعنی خاتم الانبیاء و
رسول الرحمۃ و رسول التوبہ و رسول الملاحم ذکر کرکے فرمایا: میں مقفی ہوں کہ تمام پیغمبروں
کے بعد آیا اور میں کامل جامع ہوں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الکامل: ۷/۲۵۲۷)

تنبیہ:

یہ حدیث ابن عدی نے مولیٰ علی و ام المومنین صدیقہ و اسامہ بن زید و عبداللہ
بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی روایت کی۔ جیسا کہ مطالع المسرات میں ہے تو
اگر تمام میں عاقب یا مقفی وغیرہما ہوں تو پانچ احادیث ہوئیں (ت)

حاکم مستدرک میں بافادۂ تصحیح حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
راوی، سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کنیسہ یہود میں تشریف لے گئے، میں
ہمرکاب تھا، فرمایا: اے گروہ یہود: مجھے بارہ آدمی دکھاؤ جو گواہی دینے والے ہوں کہ
لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اللہ عزوجل
سب یہود سے اپنا غضب اٹھالے گا، یہود سن کر چپ رہے کسی نے جواب نہ دیا۔
حضور نے فرمایا: تم نے نہ مانا خدا کی قسم بیشک میں حاشر ہوں اور میں خاتم الانبیاء ہوں
اور میں نبی مصطفیٰ ہوں خواہ تم مانو یا نہ مانو۔ (المستدرک: ۲/۴۱۵)

ابن سعد مجاہد مکی سے مرسلاً راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے
ہیں: میں محمد و احمد ہوں، میں رسولِ رحمت ہوں، میں رسولِ جہاد ہوں، میں خاتم الانبیاء
ہوں، میں لوگوں کو حشر دینے والا ہوں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (الطبقات الکبریٰ
:۱/۱۵۰)

وہی ہیں اوّل وہی ہیں آخر وہی ہیں باطن وہی ہیں ظاہر
انھیں سے عالم کی ابتدا ہے وہی رسولوں کی انتہا ہیں

صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم فرماتے ہیں: ہم زمانے میں سب سے پچھلے اور قیامت میں سب سے اگلے
ہیں۔ (بخاری شریف: ۱/۱۲۰)

مسلم و ابن ماجہ ابو ہریرہ و حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ہم دنیا میں سب کے بعد آخرت میں سب پر سابق

ہیں، تمام جہان سے پہلے ہمارے لیے حکم ہوگا۔ (مسلم شریف:۱/۲۸۲)

دارمی ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بیشک اللہ نے مجھے مدّت اخیر وزمانہ انتظار پر پہنچایا اور مجھے چن کر پسند فرمایا تو ہمیں سب سے پچھلے اور ہمیں روز قیامت سب سے اگلے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (کنز العمال:۱۱/۴۴۲) اس حدیث میں نسخ مختلف ہیں بعض میں یوں ہے: مجھے اللہ عزو جل نے محض رحمت کے وقت پہنچایا اور میرے لیے کمال اختصار فرمایا۔ (دارمی:۱/۳۲)

اسحٰق بن راہویہ مسند اور ابوبکر بن ابی شیبہ استاذ بخاری ومسلم مصنف میں مکحول سے راوی، امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک یہودی پر کچھ آتا تھا لینے کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا: قسم اس کی جس نے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تمام آدمیوں سے برگزیدہ کیا میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ یہودی بولا واللہ خدا نے انھیں تمام بشر سے افضل نہ کیا، امیر المومنین نے اسے طمانچہ مارا، وہ بارگاہِ رسالت میں نالشی آیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! تم اس طمانچہ کے بدلے اسے راضی کردو (یعنی ذمی ہے) اور ہاں اے یہودی! آدم صفی اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، نوح نجی اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ ہیں وانا حبیب اللہ اور میں اللہ کا پیارا ہوں، ہاں اے یہودی! اللہ نے اپنے دونا موں پر میری امت کے نام رکھے۔ اللہ سلام ہے اور میری امت کا نام مسلمین رکھا اور اللہ مومن ہے اور میری امت کو مومنین کا لقب دیا، ہاں اے یہودی! تم زمانے میں پہلے ہو اور ہم زمانے میں بعد اور روزِ قیامت میں سب سے پہلے ہیں، ہاں ہاں جنت حرام ہے انبیاء پر جب تک میں اس میں جلوہ افروز نہ ہوؤں اور حرام ہے امتوں پر جب تک میری امت نہ داخل ہو، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔
(مصنف ابن ابی شیبہ:۱۱/۵۱۱)

بیہقی شعب الایمان میں ابوقلابہ سے مرسلاً راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں بھیجا گیا دریائے رحمت کھولتا اور نبوت ورسالت ختم کرتا ہوا۔
(بیہقی شعب الایمان:۴/۳۰۸)

ابن ابی حاتم وبغوی وثعلبی تفاسیر اور ابواسحٰق جوزجانی تاریخ اور ابونعیم دلائل میں بطریق عدیدہ عن قتادۃ عن الحسن عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسنداً اور ابن سعد طبقات اور ابن لال مکارم الاخلاق میں قتادہ سے مرسلاً راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آیۂ کریمہ واذ اخذنا من النبیین میثاقھم کی تفسیر میں فرمایا: میں سب نبیوں سے پہلے پیدا ہوا اور سب کے بعد بھیجا گیا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم:۹/۳۱۱۶) اسی لیے رب العزت تبارک وتعالیٰ نے آیہ کریمہ میں انبیائے سابقین سے پہلے حضور پر نور کا نام پاک لیا، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

ابوسہل قطان اپنے امالی میں سہل بن صالح ہمدانی سے راوی، میں نے حضرت سیدنا امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو سب انبیاء کے بعد مبعوث ہوئے حضور کو سب پر تقدم کیونکر ہوا، فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کی پیٹھوں سے ان کی اولادیں روزِ میثاق نکالیں اور انھیں خود ان پر گواہ بنانے کو فرمایا: کیا میں تمھارا رب نہیں، تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عرض کیا کہ ہاں کیوں نہیں، اس وجہ سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سب انبیاء پر تقدم ہوا حالانکہ حضور سب کے بعد مبعوث ہوئے، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (الخصائص الکبریٰ:۱/۹)

شفا شریف امام قاضی عیاض واحیاء العلوم امام حجۃ الاسلام ومدخل امام ابن الحاج واقتباس الانوار علامہ ابوعبداللہ محمد بن علی رشاطی وشرح البردہ ابوالعباس قصار و مواہب لدنیہ امام قسطلانی وغیرہا کتب معتمدین میں ہے: امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد وفات حضور سید الکائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات جو فضائل عالیہ حضور پُرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضور کو ندا وخطاب کر کے عرض کیے ہیں، انھیں میں گزارش کرتے ہیں: یارسول اللہ: میرے ماں باپ حضور پر قربان حضور کی فضیلت اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اس حد کو پہنچی کہ حضور کو تمام انبیاء کے بعد بھیجا اور ان سب سے پہلے ذکر فرمایا کہ فرماتا ہے اور یاد کر جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا اور تجھ سے اے محبوب اور نوح وابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ بن مریم سے علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

(المواہب اللدنیہ:۴/ ۵۵۵)

علامہ محمد بن احمد بن محمد بن محمد بن ابی بکر بن مرزوق تلسمانی شرح شفا شریف میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جبریل نے حاضر ہوکر مجھے یوں سلام کیا: السلام علیک یا ظاھر، السلام علیک یا باطن۔ میں نے فرمایا: اے جبریل! یہ صفات تو اللہ عزوجل کی ہیں کہ اسی کو لائق ہیں، مجھ سے مخلوق کی کیونکر ہوسکتی ہیں، جبریل نے عرض کی: اللہ تبارک تعالیٰ نے حضور کو ان صفات سے فضیلت دی اور تمام انبیاء ومرسلین پر ان سے خصوصیت بخشی، اپنے نام و وصف سے حضور کے نام و وصف مشتق فرمائے: حضور کا نام اول رکھا کہ حضور سب انبیاء سے آفرینش میں مقدم ہیں اور حضور کا نام آخر رکھا کہ حضور سب پیغمبروں سے زمانے میں مؤخر و خاتم الانبیاء و نبی امت آخریں ہیں۔ باطن نام رکھا کہ اس نے اپنے نام پاک کے ساتھ حضور کا نام نامی سنہرے نور سے ساقِ عرش پر آفرینش آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دو ہزار برس پہلے ابد تک لکھا پھر مجھے حضور پر درود بھیجنے کا حکم دیا۔ میں نے حضور پر ہزار سال درود بھیجی اور ہزار سال بھیجی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو مبعوث کیا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکتا سورج۔ حضور کو ظاہر نام عطا فرمایا کہ اس نے حضور کو تمام دینوں پر ظہور و غلبہ دیا اور حضور کی شریعت وفضیلت کو تمام اہل سماوات وارض پر ظاہر و آشکارا کیا تو کوئی ایسا نہ رہا جس نے حضور پُر نور پر درود نہ بھیجی ہو، اللہ حضور پر درود بھیجے، پس حضور کا رب محمود ہے اور حضور محمد حضور کا رب اول و آخر و ظاہر و باطن ہے اور حضور اول و آخر و ظاہر و باطن ہیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب خوبیاں اللہ عزوجل کو جس نے مجھے تمام انبیاء پر فضیلت دی یہاں تک میرے نام وصفت میں (شرح الشفا للقاری:۲/ ۴۲۵)۔

صحیح مسلم شریف میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے: مجھے تمام انبیاء پر چھ وجہ سے فضیلت دی گئی، مجھے جامع باتیں عطا ہوئیں اور مخالفوں کے دل میں میرا

رعب ڈالنے سے میری مدد کی گئی اور میرے لیے غنیمتیں حلال ہوئیں اور میرے لیے زمین پاک کرنے والی اور نماز کی جگہ قرار دی گئی اور میں تمام جہان سب ماسوی اللہ کا رسول ہوا اور مجھ سے انبیاء ختم کیے گئے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (صحیح مسلم:۱/ ۹۹)

دارمی اپنی سنن میں بسند صحیح اور بخاری تاریخ اور طبرانی اوسط اور بیہقی سنن میں اور ابونعیم حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں تمام پیغمبروں کا خاتم ہوں اور بطور فخر نہیں کہتا اور میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا اور سب سے پہلا شفاعت قبول کیا گیا ہوں اور بروجہ فخر ارشاد نہیں کرتا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (دارمی:۱/ ۳۱)

احمد و حاکم وبیہقی وابن حبان عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

بیشک بالیقین میں اللہ کے حضور لوحِ محفوظ میں خاتم النبیین لکھا تھا اور ہنوز آدم اپنی مٹی میں پڑے تھے (کنز العمال:۱۱/ ۴۴۹)

مواہب لدنیہ ومطالع المسرات میں ہے: صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ عزوجل نے زمین وآسمان کی آفرینش سے پچاس ہزار برس پہلے خلق کی تقدیر لکھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ منجملہ ان تحریرات کے لوحِ محفوظ میں لکھا بیشک محمد خاتم النبیین ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

احمد و بخاری ومسلم وترمذی حضرت جابر بن عبداللہ اور احمد وشیخین حضرت ابوہریرہ اور احمد ومسلم حضرت ابوسعید خدری اور احمد وترمذی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بالفاظ متناسبہ ومعانی متقاربہ راوی، حضور خاتم المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری اور تمام انبیاء کی کہاوت ایسی ہے جیسے ایک محل نہایت عمدہ بنایا گیا اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہی، دیکھنے والے اس کے آس پاس پھرتے اور اس کی خوبی تعمیر سے تعجب کرتے مگر وہی ایک اینٹ کی جگہ نگاہوں میں کھٹکتی

، میں نے تشریف لاکر وہ جگہ بند کی، مجھ سے یہ عمارت پوری کی گئی، مجھ سے رسولوں کی انتہاء ہوئی، میں عمارت نبوت کی وہ پچھلی اینٹ ہوں، میں تمام انبیاء کا خاتم ہوں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (مشکوٰۃ: ص ۵۱۱)

امام ترمذی حکیم عارف باللہ محمد بن علی نوادر الاصول میں سیدنا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں سب رسولوں میں پہلے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اور سب میں پچھلے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

طبرانی معجم اوسط و معجم صغیر اور ابن عدی کامل اور حاکم کتاب المعجزات اور بیہقی و ابونعیم کتاب دلائل النبوۃ اور ابن عساکر تاریخ میں امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجمعِ اصحاب میں تشریف فرما تھے کہ ایک بادیہ نشین قبیلۂ بنی سلیم کا آیا سوسمار شکار کرکے لایا تھا۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا اور بولا قسم ہے لات وعزّٰی کی: وہ شخص آپ پر ایمان نہ لائے گا جب تک یہ سوسمار ایمان نہ لائے، حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جانور کو پکارا وہ فصیح زبان روشن بیان عربی میں بولا جسے سب حاضرین نے خوب سنا اور سمجھا: میں خدمت و بندگی میں حاضر ہوں اے تمام حاضرین مجمع محشر کی زینت۔ حضور نے فرمایا: تیرا معبود کون ہے؟ عرض کی: وہ جس کا عرش آسمان اور سلطنت زمین میں اور راہ سمندر میں اور رحمت جنت میں اور عذاب نار میں۔ فرمایا: بھلا میں کون ہوں؟ عرض کی: حضور پروردگار عالم کے رسول ہیں اور رسولوں کے خاتم، جس نے حضور کی تصدیق کی وہ مراد کو پہنچا اور جس نے نہ مانا نامراد رہا۔

اعرابی نے کہا: اب آنکھوں دیکھے کے بعد کیا شبہ ہے، خدا کی قسم میں جس وقت حاضر ہوا حضور سے زیادہ اس شخص کو دشمن کوئی نہ تھا اور اب حضور مجھے اپنے باپ اور اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں اشھد ان لا الہ الا اللہ وانّك رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ت) یہ مختصر

ہے اور حدیث میں اس سے زیادہ کلام اطیب واکثر۔ (دلائل النبوۃ: ۲/ ۱۳۴)

یہ حدیث امیر المومنین مولیٰ علی وام المومنین عائشہ صدیقہ وحضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایات سے بھی آئی۔ جیسا کہ جامع کبیر اور خصائص کبریٰ میں ہے میں نے ان کے الفاظ نہ پائے اگر ان سب کے الفاظ خاتم النبیین کے لفظ پر مشتمل ہوں تو یہ چار احادیث ہوئیں (ت)

ترمذی حدیث طویل حلیۂ اقدس میں امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے راوی کہ انھوں نے فرمایا: حضور کے دونوں شانوں کے بیچ میں مہر نبوت ہے اور حضور خاتم النبیین ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (ترمذی: ۲/ ۲۰۵)

طبرانی معجم اور ابونعیم عوالی سعید بن منصور میں امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے درود شریف کا ایک صیغہ بلیغہ راوی جس میں فرماتے ہیں: الٰہی! اپنی بزرگ درودیں اور بڑھتی برکتیں اور رحمت کی مہر نازل کر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کہ تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں۔ گزروں کے خاتم اور مشکلوں کے کھولنے والے، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (المعجم الاوسط: ۱۰/ ۳۶)

نبوت گئی، نبوت منقطع ہوئی، جب سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبوت ملی کسی دوسرے کو نہیں مل سکتی۔ صحیح بخاری شریف میں مروی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: انبیاء بنی اسرائیل کی سیاست فرماتے، جب ایک نبی تشریف لے جاتا دوسرا اس کے بعد آتا، میرے بعد کوئی نبی نہیں، صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری-۱/ ۴۹۱)

احمد وترمذی وحاکم بسند صحیح برشرط صحیح مسلم (جیسے حاکم نے کہا ہے اور محققین نے اسے ثابت رکھا ہے) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بیشک رسالت ونبوت ختم ہوگئی۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول نہ نبی، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (ترمذی: ۲/ ۵۱)

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: نبوت سے کچھ باقی نہ رہا صرف بشارتیں باقی

ہیں اچھی خوابیں ۔ (بخاری: ۲/ ۱۰۳۵)

طبرانی معجم کبیر میں حضرت حذیفہ بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بسند صحیح راوی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: نبوت گئی اب میرے بعد نبوت نہیں مگر بشارتیں ہیں اچھا خواب کہ انسان آپ دیکھے یا اس کے لیے دیکھا جائے (المعجم الکبیر-۳/ ۱۷۹)

احمد وابنائے ماجہ وخزیمہ وحبان حضرت ام کرز رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بسند حسن راوی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: نبوت ہوگئی اور بشارتیں باقی ہیں ۔ (ابن ماجہ-ص ۲۸۶)

صحیح مسلم وسنن ابی داؤد وسنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے مرض مبارک میں جس میں وصال اقدس واقع ہوا، پردہ اٹھایا سرِ انور پر پٹی بندھی تھی ۔ لوگ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے صف بستہ تھے حضور نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! نبوت کی بشارتوں سے کچھ نہ رہا مگر اچھا خواب کہ مسلمان دیکھے یا اس کے لیے دوسرے کو دکھایا جائے ۔ (ابن ماجہ-ص ۲۸۷)

احمد وترمذی وحاکم بتصحیح وروَیانی وطبرانی وابویعلیٰ حضرت عقبہ بن عامر اور طبرانی وابن عساکر اور خطیب کتاب رواۃ مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر اور طبرانی حضرت عصمہ بن مالک وحضرت ابوسعید خدوی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ترمذی: ۲/ ۲۹۰)

صحیح بخاری شریف میں اسمٰعیل بن ابی خالد سے ہے: میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا: آپ نے حضرت ابراہیم صاحبزادۂ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، فرمایا ان کا بچپن میں انتقال ہوا اور اگر مقدر ہوتا کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوتو حضور کے صاحبزادے ابراہیم زندہ

رہتے مگر حضور کے بعد نبی نہیں ۔

امام احمد کی روایت انھی سے یوں ہے کہ میں نے حضرت ابن ابی اوفیٰ کو فرماتے سنا: اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوتا حضور کے صاحبزادے انتقال نہ فرماتے ۔

امام ابوعمر ابن عبدالبر بطریق اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، انھوں نے فرمایا: حضرت ابراہیم اتنے ہوگئے تھے کہ ان کا جسم مبارک گہوارے کو بھر دیتا، اگر زندہ رہتے نبی ہوتے مگر زندہ نہ رہ سکتے تھے کہ تمھارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آخر الانبیاء ہیں (زرقانی-۳/ ۲۱۵)

فائدہ:

اس کی اصل متعدد احادیث مرفوعہ سے ہے، ماوردی حضرت انس اور ابن عساکر حضرات جابر بن عبداللہ وعبداللہ بن عباس وعبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اگر ابراہیم زندہ رہتا تو صدیق پیغمبر ہوتا ۔ (کنز العمال: ۱۱/ ۴۶۹)

بعد طلوعِ آفتاب عالم تاب خاتمیت صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلی آلہ الکرام جو کسی کے لیے ادعائے نبوت کرے، دجّال کذّاب مستحق لعنت وعذاب ہے ۔

امام بخاری حضرت ابوہریرہ اور احمد ومسلم وابوداؤد وترمذی وابن ماجہ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، وھذا حدیث ثوبان، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: عنقریب اس امت میں قریب تیس دجّال کذاب نکلیں گے ۔ ہر ایک ادعا کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۔ (ابوداؤد: ۲/ ۲۲۸)

امام احمد وطبرانی وضیاء حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری امتِ دعوت میں (کہ مومن وکافر سب کو شامل ہے)

ستائیس کذاب دجال ہوں گے ان میں چار عورتیں ہیں حالانکہ میں خاتم الانبیاء ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔(مسند امام-۵/۳۹۶)

ابن عساکر علاء بن زیاد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مرسلاً راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تیس دجال کذاب مدعی نبوت نکلیں گے۔(تہذیب تاریخ ابن عساکر:۳/۴۴۵)

ابویعلیٰ مسند میں بسند حسن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قیامت نہ آئے گی جب تک کہ تیس کذاب نکلیں ان میں سے مسلیمہ اور اسود عنسی ومختار ثقفی ہے، اخذہم اللہ تعالیٰ۔(مسند ابویعلیٰ:۶/۱۹۹)

الحمدللہ بفضلہ تعالیٰ یہ تینوں خبیث کتے شیران اسلام کے ہاتھ سے مارے گئے، اسود مردود خود زمانۂ اقدس اور مسلیمہ ملعون زمانۂ خلافت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں، وللہ الحمد۔ مسلیمہ خبیث کے قاتل وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جنھوں نے زمانۂ کفر میں سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا۔فرمایا کرتے میں نے بہتر شخص کو شہید کیا پھر سب سے بدتر کو مارا۔

نوع آخر خاص امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے بارے میں متواتر حدیثیں ہیں کہ نبوت ختم ہوئی نبوت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔

امام احمد مسند اور بخاری ومسلم وترمذی ونسائی وابن ماجہ صحاح، ابن ابی شیبہ سنن، ابن جریر تہذیب الآثار میں بطریق عدیدہ کثیرہ سیدنا سعد بن ابی وقاص، اور حاکم بتصحیح اسناد مستدرک، اور طبرانی معجم کبیر واوسط، اور ابوبکر عاقولی فوائد میں، اور ابن مردویہ مطولاً، اور بزار بطریق عبداللہ بن ابی بکر عن حکیم بن جبر عن الحسن بن سعد مولیٰ علی، اور ابن عساکر بطریق عبداللہ بن محمد بن عقیل عن ابیہ عن جدہ عقیل امیر المومنین مولیٰ علی اور احمد وحاکم وطبرانی وعقیلی حضرت عبداللہ بن عباس، اور احمد حضرت امیر معاویہ، اور احمد وبزار وابوجعفر بن محمد طبری وابوبکر مطیری حضرت ابوسعید خدری، اور

ترمذی بافادۂ تحسین حضرت جابر بن عبداللہ سے مسنداً اور حضرت ابوہریرہ سے تعلیقاً اور طبرانی اور خطیب کتاب المتفق والمتفرق میں حضرت عبداللہ بن عمر، اور ابونعیم فضائل الصحابہ میں حضرت سعید بن زید، اور طبرانی کبیر میں حضرات براء بن عازب وزید بن ارقم وحبیش بن جنادہ وجابر بن سمرہ ومالک بن حویرث وحضرت ام المومنین ام سلمہ زوجہ امیر المومنین علی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین سے راوی حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کو تشریف لے جاتے وقت امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو مدینے میں چھوڑا اور امیر المومنین نے عرض کی: یا رسول اللہ! حضور مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جاتے ہیں، فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم یہاں میری نیابت میں ایسے رہو جیسے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب اپنے رب سے کلام کے لیے حاضر ہوئے ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی نیابت میں چھوڑ گئے تھے۔ ہاں یہ فرق ہے کہ ہارون نبی تھے، میں جب سے نبی ہوا دوسرے کے لیے نبوت نہیں(بخاری شریف:۱/۵۲۶)

مسند ومستدرک میں حدیث ابن عباس یوں ہے: کیا تم راضی نہیں کہ بمنزلہ ہارون کے موسیٰ سے مگر یہ کہ تم نبی نہیں۔(مستدرک:۳/۱۰۹)

حضرت اسماء کی حدیث اس طرح ہے: جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حاضر ہوکر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کی: حضور کا رب حضور کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے علی (رضی اللہ عنہ) تمہاری نیابت میں ایسا ہے جیسا موسیٰ کے لیے ہارون، مگر تمھارے بعد کوئی نبی نہیں، صلی اللہ علیک وبارک وسلم(المعجم الکبیر:۲۴/۱۴۷)

فضائل صحابہ امام احمد میں حدیث امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں ہے: کسی نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا، فرمایا: مولا علی سے پوچھو وہ اعلم ہیں۔ سائل نے کہا: یا امیر المومنین! مجھے آپ کا جواب ان کے جواب سے زیادہ محبوب ہے، فرمایا: تو نے سخت بری بات کہی ایسے کو ناپسند کیا جس کے علم کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم عزت فرماتے تھے اور بیشک حضور نے ان سے کہا تجھے مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہما الصلوٰۃ سے

مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ کو جب کسی بات میں شبہ پڑتا تو ان سے حاصل کرتے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ (فضائل الصحابۃ لاحمد:۲/۶۷۵)

ابونعیم حلیۃ الاولیاء میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! میں مناسب جلیلہ و خصائص کثیرہ جزئیلۂ نبوت میں تجھ پر غالب ہوں اور میرے بعد نبوت اصلاً نہیں۔ (حلیۃ الاولیا:۱/۶۵)

ابن ابی عاصم اور ابن جریر بافادۂ تصحیح اور طبرانی اوسط اور ابن شاہین کتاب السنہ میں امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے راوی، میں بیمار تھا خدمتِ اقدس حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوا۔ حضور نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کیا اور خود نماز میں مشغول ہوئے، ردائے مبارک کا آنچل مجھ پر ڈال لیا، پھر بعد نماز فرمایا: اے ابن ابی طالب! تم اچھے ہوگئے تم پر کچھ تکلیف نہیں، میں نے اللہ عزوجل سے جو کچھ اپنے لیے مانگا، تمہارے لیے بھی اس کی مانند سوال کیا اور میں نے جو کچھ چاہا رب عزوجل نے مجھے عطا فرمایا مگر مجھ سے یہ فرمایا گیا کہ تمھارے بعد کوئی نبی نہیں مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں اسی وقت ایسا تندرست ہوگیا گویا بیمار ہی نہ تھا۔ (کنزل اعمال:۱۳/۱۷۰)

تنبیہ:

اقول وباللہ التوفیق۔ یہ حدیث حضرت امیر المومنین کے لیے مرتبۂ صدیقیت کا حصول بتاتی ہے، صدیقیت ایک مرتبہ تلو نبوت ہے کہ اس کے اور نبوت کے بیچ میں کوئی مرتبہ نہیں مگر ایک مقام ادق واخفی کہ نصیبۂ حضرت صدیق اکبر اکرم واتقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے تو اجناس وانواع واصناف فضائل وکمالات و بلندی درجات میں خصائص وملزومات نبوت کے سوا صدیقین ہر عطیۂ بہیہ کے لائق واہل ہیں اگرچہ باہم ان میں تفاوت وتفاضل کثیر ووافر ہو۔ آخر نہ دیکھا کہ محمد رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کے ابن جمیل و نائب جلیل حضور پر نور سید الاسیاد فرد الافراد غوث اعظم غیث اکرم غیاث عالم محبوب سبحانی مطلوب ربانی سیدنا ومولانا ابو محمد محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہر ولی ایک نبی کے قدم پر ہوتا ہے اور میں اپنے جدّ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدمِ پاک پر ہوں۔ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہاں سے قدم اٹھایا میں نے اسی جگہ قدم رکھا، مگر نبوت کے قدم کے کہ ان کی طرف غیر نبی کو اصلاً راہ نہیں۔ (بہجۃ الاسرار: ص۲۲)

بالجملہ مادون نبوت پر فائز ہونا نہ تفرد کی دلیل نہ حجت تفضیل کہ وہ صدہا میں مشترک اور فی نفسہٖ مشکک، ہر غوث وصدیق اس میں شریک اور ان پر بشدّت مقول بالتشکیک، بلکہ خود حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس کے پاس ملک الموت آئیں اور وہ طلب علم میں ہو، اس میں اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں صرف ایک درجے کا فرق ہے کہ درجۂ نبوت ہے (اسے ابن النجار نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔) (کنز العمال:۱۰/۱۶۰)

دوسری حدیث میں ہے: قریب ہے حاملان قرآن انبیاء ہوں مگر یہ کہ ان کی طرف وحی نہیں آتی۔ (اسے دیلمی نے ایک حدیث میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا۔ ت) تو اس کے امثال سے حضرات خلفائے ثلٰثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی تفضیل کا وہم نہیں ہوسکتا۔ علماء فرماتے ہیں: ابوبکر صدیق صدیقِ اکبر ہیں اور علی مرتضیٰ صدیقِ اصغر، صدیق اکبر کا مقام اعلیٰ صدیقیت سے بلند و بالا ہے۔ نسیم الریاض شرح شفائے امام قاضی عیاض میں ہے: لیکن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تخصیص اس لیے کہ وہ صدیق اکبر ہیں جو تمام لوگوں میں آگے ہیں کیونکہ انھوں نے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق کی وہ کسی کو حاصل نہیں اور یونہی علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کا نام صدیق اصغر ہے جو ہرگز کفر سے ملتبس نہ ہوئے اور نہ ہی انھوں نے غیر اللہ کو سجدہ کیا باوجودیکہ وہ نابالغ تھے اور ان کے والد ملت اسلامیہ پر نہ تھے، اسی وجہ سے انھوں نے علی کرم اللہ وجہہ کے قول کو خاص طور

پر روایت لیا (ت) (نسیم الریاض:۱/۱۴۲)
لیکن خاص مقصود کی بیس حدیثوں کا اضافہ ہی مناسب نظر آیا کہ خود اصل مرام پر سو حدیثوں کا عدد کامل اور اصل مرویات ایک سو بیس ہو کر تین چہل حدیث کا فضل حاصل ہو۔

ارشاداتِ انبیاء وعلمائے کتب سابقہ:

حاکم صحیح مستدرک میں وہب بن منبہ سے وہ حضرت عبداللہ بن عباس اور سات دیگر صحابۂ کرام سے کہ سب اہلِ بدر تھے رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بیشک اللہ عزوجل روزِ قیامت اوروں سے پہلے نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی قوم کو بلا کر فرمائے گا تم نے نوح کو کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے نوح نے نہ ہمیں تیری طرف بلایا، نہ تیرا کوئی حکم پہنچایا، نہ کچھ نصیحت کی، نہ ہاں یا نہ کا کوئی حکم سنایا، نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کریں گے: الٰہی میں نے انھیں ایسی دعوت کی جس کی خبر یکے بعد دیگرے سب اگلوں پچھلوں میں پھیل گئی یہاں تک کہ سب سے پچھلے نبی احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچی انھوں نے اسے لکھا اور پڑھا اور اس پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق فرمائی، حق سبحانہٗ وتعالیٰ فرمائے گا احمد وامت احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بلاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضور کی امت حاضر آئیں گے یوں کہ ان کے نور ان کے آگے جولاں کرتے ہوں گے اور نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے شہادت ادا کریں گے (المستدرک-۲/۵۴۷)

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نضلہ بن عمرو انصاری کو تین سو مہاجرین وانصار کے ساتھ تاراج حلوان عراق کے لیے بھیجا، یہ قیدی اور غنیمتیں لیے آتے تھے، ایک پہاڑ کے دامن میں شام ہوئی، نضلہ نے اذان کہی، جب کہا اللہ اکبر اللہ اکبر پہاڑ سے آواز آئی اور صورت نہ دکھائی دی کہ کوئی کہتا ہے تم نے کبیر کی بڑائی کی اے نضلہ! تم نے خالص توحید کی، جب کہا اشھد ان محمد رسول اللہ۔ آواز آئی یہ نبی

ہیں کہ مبعوث ہوئے ان کے بعد کوئی نبی نہیں یہی ڈر سنانے والے ہیں، یہی ہیں جن کی بشارت ہمیں عیسیٰ بن مریم علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی انھیں کی امت کے سر پر قیامت قائم ہوگی۔ جب کہا حی علی الصلوٰۃ جواب آیا نماز ایک فرض ہے کہ بندوں پر رکھا گیا۔ خوبی وشادمانی اس کے لیے جو اسکی طرف چلے اور اس کی پابندی رکھے، جب کہا حی علی الفلاح آواز آئی مراد کو پہنچا جو نماز کے لیے آیا اور اس پر مداومت کی، مراد کو پہنچا جس نے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت کی، جب کہا قد قامت الصلوٰۃ جواب آیا بقا ہے امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے اور انھیں کے سروں پر قیامت ہوگی۔ جب کہا اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ آواز آئی اے نضلہ! تم نے پورا اخلاص کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے سبب تمھارا بدن دوزخ پر حرام فرمادیا)۔ نماز کے بعد نضلہ کھڑے ہوئے اور کہا اے اچھے پاکیزہ خوب کلام والے! ہم نے تمھاری بات سنی تم فرشتے ہو یا کوئی سیّاح یا جن، ظاہر ہو کر ہم سے بات کرو ہم اللہ عزوجل اور اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امیر المومنین عمر کے سفیر ہیں، اس کہنے پر پہاڑ سے ایک بوڑھے شخص نمودار ہوئے، سپید مو، دراز ریش، سر ایک چکّی کے برابر، سپید اون کی ایک چادر اوڑھے ایک باندھے، اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، حاضرین نے جواب دیا، اور نضلہ نے پوچھا اللہ تم پر رحم کرے تم کون ہو؟ میں ذریب بن برثملا ہوں، بندۂ صالح عیسیٰ بن مریم علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وصی ہوں انھوں نے میرے لیے دعا فرمائی تھی کہ میں ان کے نزول تک باقی رہوں (دوسرے طریقہ میں یہ زائد ہے۔ ت) پھر ان سے پوچھا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ کہا انتقال فرمایا۔ اس پر وہ پیر بزرگ بشدت روئے، پھر کہا ان کے بعد کون ہوا؟ کہا ابوبکر۔ وہ کہاں ہیں؟ کہا انتقال ہوا۔ کہا پھر کون بیٹھا؟ کہا عمر۔ کہا امیر المومنین عمر سے میرا اسلام کہو، اور کہنا کہ ثبات وسداد و آسانی پر عمل رکھئے کہ وقت قریب آلگا ہے۔ پھر علاماتِ قربِ قیامت اور بہت کلماتِ وعظ وحکمت کہے اور غائب ہوگئے۔ جب امیر المومنین کو خبر پہنچی، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام فرمان جاری فرمایا کہ خود اس پہاڑ کے نیچے جائیں اور وہ ملیں

تو ہمارا سلام کہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی تھی کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک وصی عراق کے اس پہاڑ میں منزل گزین ہے۔ سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ چار ہزار مہاجرین وانصار کے ساتھ اس پہاڑ کو گئے۔ چالیس دن ٹھہرے۔ پنجگانہ اذانیں کہیں مگر جواب نہ ملا، آخر واپس آئے۔ (دلائل النبوۃ:۱/ ۲۵ تا ۲۸)

طبرانی معجم کبیر میں سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، میں زمانہ جاہلیت میں ملک شام کو تجارت کے لیے گیا تھا۔ ملک کے اسی کنارے پر اہل کتاب سے ایک شخص مجھے ملا پوچھا: کیا تمھارے یہاں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ ہم نے کہا ہاں، کہا تم ان کی صورت دیکھو تو پہچان لوگے؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ ہمیں ایک مکان میں لے گیا جس میں تصاویر تھیں، وہاں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صورت کریمہ مجھے نظر نہ آئی، اتنے میں ایک اور کتابی آکر بولا، کس شغل میں ہو؟ ہم نے حال کہا، وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا وہاں جاتے ہی حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصویر منیر مجھے نظر آئی اور دیکھا کہ ایک شخص حضور کے پیچھے حضور کے قدم مبارک کو پکڑے ہوئے ہے، میں نے کہا یہ دوسرا کون ہے؟ وہ کتابی بولا: بیشک کوئی نبی ایسا نہ ہوا جس کے بعد نبی نہ ہو سوا اس نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں اور یہ دوسرا ان کے بعد خلیفہ ہے۔ اُسے میں نے جو دیکھا تو وہ ابوبکر صدیق کی تصویر تھی۔ (المعجم الکبیر:۲/ ۱۲۵)

ابن عساکر بطریق قاضی معافی بن زکریا حضرت عبادہ بن صامت، اور بیہقی وابونعیم بطریق حضرت ابوامامہ باہلی حضرت ہشام بن عاص سے راوی، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ہمیں بادشاہِ روم ہرقل کے پاس بھیجا اور ہم اس کے شہ نشین کے نزدیک پہنچے، وہاں سواریاں بٹھائیں اور کہا ”لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر“ اللہ جانتا ہے یہ کہتے ہی اس کا شہ نشین ایسا ہلنے لگا جیسے ہوا کے جھونکے میں کھجور، اس نے کہلا بھیجا یہ تمھیں حق نہیں پہنچتا کہ شہروں میں اپنے دین کا اعلان کرو، پھر ہمیں بلایا۔ ہم گئے وہ سرخ کپڑے پہنے سرخ مسند پر بیٹھا تھا۔ آس

پاس ہر چیز سرخ تھی۔ اس کے اراکینِ دربار اس کے ساتھ تھے، ہم نے سلام نہ کیا اور ایک گوشے میں بیٹھ گئے وہ ہنس کر بولا تم آپس میں جیسا ایک دوسرے کو سلام کرتے ہو مجھے کیوں نہ کیا؟ ہم نے کہا ہم تجھے اس سلام کے قابل نہیں سمجھتے اور جس مُجرے پر تو راضی ہوتا ہے وہ ہمیں روا نہیں کہ کسی کے لیے بجالائیں، پھر اس نے پوچھا سب سے بڑا کلمہ تمھارے یہاں کیا ہے؟ ہم نے کہا لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ، خدا گواہ ہے یہ کہتے ہی بادشاہ کے بدن پر لرزہ پڑ گیا پھر آنکھیں کھول کر غور سے ہمیں دیکھا اور کہا یہی وہ کلمہ ہے جو تم نے میرے شہ نشین کے نیچے اترتے وقت کہا تھا، ہم نے کہا: ہاں، کہا جب اپنے گھروں میں اسے کہتے ہو تو کیا تمہاری چھتیں بھی اسی طرح کانپنے لگتی ہیں؟ ہم نے کہا خدا کی قسم یہ تو ہم نے نہیں دیکھا اور اس میں خدا کی کوئی حکمت ہے، بولا سچی بات خوب ہوتی ہے سن لو خدا کی قسم مجھے آرزو تھی کہ کاش میرا آدھا ملک نکل جاتا اور تم یہ کلمہ جس چیز کے پاس کہتے وہ لرزنے لگتی، ہم نے کہا یہ کیوں؟ کہا یوں ہوتا تو کام آسان تھا اور اس وقت لائق تھا کہ یہ زلزلہ شانِ نبوت سے نہ ہو بلکہ کوئی انسانی شعبدہ ہو (یعنی اللہ تعالیٰ ایسے معجزات ہر وقت ظاہر نہیں فرماتا بلکہ عالمِ اسباب میں شانِ نبوت کو بھی غالبًا مجرائے عادت کے مطابق رکھتا ہے)

اگر ہم فرشتے کو نبی بناتے تو مرد ہی بناتے اور اس کو وہی لباس پہناتے جو مرد لوگ پہنتے ہیں۔ (ت) [القرآن: ۶/۹] ولہٰذا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جہادوں میں بھی جنگ دوسرداروں کا مضمون رہتا ہے، ہمارے اور ان کے درمیان جنگ میں کبھی وہ کامیاب اور کبھی ہم کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کو شیخین نے ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ (بخاری شریف:۱/۴)

لہٰذا جب ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہرقل کو خبر دی کہ لڑائی میں کبھی ہم بھی ان پر غالب آتے ہیں ہرقل نے کہا: ھذہ ایۃ النبوۃ۔ یہ نبوت کی نشانی ہے (اسے بزار اور ابونعیم نے دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ ت)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بعض جہّال ضعیف الایمان اس پر شک کرنے

لگتے ہیں، اور اسی قبیل سے ہے جاہل وہابیوں کا اعتراض کہ اولیاء اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ قدرت رکھتے تو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیوں ایسی مظلومی کے ساتھ شہید ہوجاتے، ایک اشارے میں یزید پلید کے لشکر کو کیوں نہ غارت فرمادیا۔ مگر یہ سفہاء نہیں جانتے کہ ان کی قدرت جو انھیں ان کے رب نے عطا فرمائی رضا وتسلیم و عبدیت کے ساتھ ہے نہ کہ معاذ اللہ جباری وسرکشی وخودسری کے ساتھ مقوقش بادشاہِ مصر نے حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امتحاناً پوچھا کہ جب تم انھیں نبی کہتے ہو تو انھوں نے دعا کر کے اپنی قوم کو کیوں نہ ہلاک فرمادیا جب انھوں نے ان کا شہر مکہ چھڑایا تھا، حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کیا تو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسول اللہ نہیں مانتا۔ انھوں نے دعا کر کے اپنی قوم کو کیوں نہ ہلاک کردیا جب انھوں نے انھیں پکڑا اور سولی دینے کا ارادہ کیا تھا؟ مقوقس بولا: انت حکیمٌ جاء من عند حکیم تم حکیم ہو کہ حکیم کامل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس سے آئے، رواہ البیہقی عن حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (دلائل النبوۃ للبیہقی -۴/۳۹۶) خیر یہ تو فائدہ زائدہ تھا، حدیث سابق کی طرف عود کریں۔

پھر ہرقل نے ہمیں باعزاز واکرام ایک مکان میں اتارا، دونوں وقت عزت کی مہمانیاں بھیجتا، ایک رات ہمیں پھر بلا بھیجا، ہم گئے اس وقت اکیلا تنہا بیٹھا تھا۔ ایک بڑا صندوقچہ زرنگار منگا کر کھولا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے خانے تھے ہر خانے پر دروازہ لگا تھا، اس نے ایک خانہ کھول کر سیاہ ریشم کا کپڑا تہہ کیا ہوا نکالا۔ اُسے کھولا تو اس میں ایک سرخ تصویر تھی، مرد فراخ چشم بزرگ سرین کہ ایسے خوبصورت بدن میں ایسی لمبی گردن کبھی نہ دیکھی تھی، سر کے بال نہایت کثیر (بے ریش دوگیسو غایت حسن وجمال میں) ہرقل بولا: انھیں پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہ۔ کہا: یہ آدم ہیں علیہ السلام۔ پھر وہ تصویر رکھ کر دوسرا خانہ کھولا، اس میں سے ایک سیاہ ریشم کا کپڑا نکالا، اس میں خوب گورے رنگ کی تصویر تھی، مرد بسیار موئے سر مانند موئے قبطیاں، فراخ چشم، کشادہ سینہ، بزرگ سر (آنکھیں سرخ، داڑھی خوبصورت) پوچھا: انھیں جانتے ہو؟

ہم نے کہا: نہ۔ کہا: یہ نوح ہیں علیہ السلام۔ پھر اسے رکھ کر اور خانہ کھولا۔ اس میں سے حریر سبز کا ٹکڑا نکالا، اس میں نہایت گورے رنگ کی ایک تصویر تھی، مرد خوب چہرہ، خوش چشم، ، دراز بینی، (کشادہ پیشانی)، رخسارے ستے ہوئے، سر پر نشانِ پیری، ریش مبارک سپید نورانی، تصویر کی یہ حالت ہے کہ گویا جان رکھتی ہے، سانس لے رہی ہے (مسکرا رہی ہے) کہا: ان سے واقف ہو؟ ہم نے کہا: نہ۔ کہا: یہ ابراہیم ہیں علیہ السلام۔ پھر اسے رکھ کر ایک اور خانہ کھولا، اس میں سے سبز ریشم کا پارچہ نکالا، اسے جو ہم نظر کریں تو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصویر منیر تھی، بولا: انھیں پہچانتے ہو؟ ہم رونے لگے اور کہا: یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، وہ بولا: تمھیں اپنے دین کی قسم یہ محمد ہیں؟ ہم نے کہا: ہاں ہمیں اپنے دین کی قسم یہ حضور اکرم کی تصویر پاک ہے، گویا ہم حضور کو حالت حیات دنیوی میں دیکھ رہے ہیں۔ اسے سنتے ہی وہ اچھل پڑا بے حواس ہوگیا سیدھا کھڑا ہوا پھر بیٹھ گیا دیر تک دم بخود رہا پھر ہماری طرف نظر اٹھا کر بولا: سنتے ہو یہ خانہ سب خانوں کے بعد تھا مگر میں نے جلدی کر کے دکھایا کہ دیکھوں تمھارے پاس اس باب میں کیا ہے، یعنی اگر ترتیب وار دکھاتا آتا تو احتمال تھا کہ تصویر حضرت مسیح کے بعد دکھانے پر تم خواہ مخواہ کہہ دو کہ یہ ہمارے نبی کی تصویر ہے، اس لیے میں نے ترتیب قطع کر کے اسے پیش کیا کہ اگر یہ وہی نبی موعود ہیں تو ضرور پہچان لوگے، بحمد اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوا اور یہی دیکھ کر اس حرماں نصیب کے دل میں درد اٹھا کہ حواس جاتے رہے، اٹھا بیٹھا دم بخود رہا، اللہ تعالیٰ اپنے نور کو تام فرمائے گا اگرچہ کافر ناپسند کریں، والحمد للہ رب العالمین (ت)

ہمارا مطلب تو بحمد اللہ یہیں پورا ہوگیا کہ یہ خانہ سب خانوں کے بعد ہے، اس کے بعد حدیث میں اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تصاویر کریمہ کا ذکر ہے، حلیہ ہائے منورہ پر اطلاع مسلمین کے لیے اس کا خلاصہ بھی مناسب، یہاں تک کہ دونوں حدیثیں متفق تھیں، ترجمہ مختصراً حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی، جو لفظ حدیث ہشام رضی اللہ عنہ سے بڑھائے خطوط ہلال میں تھے، اب حدیثِ ہشام

اتم وازید ہے کہ اس میں پانچ انبیاء لوط واسحٰق ویعقوب واسمٰعیل ویوسف علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر شریف زائد ہے لہٰذا اسی سے اخذ کریں، اور جو مضمون حدیث عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں زائد ہوا سے خطوط بلالی میں بڑھائیں۔

فرماتے ہیں پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا، حریر سیاہ پر ایک تصویر گندمی رنگ سانولی نکالی (مگر حدیث عبادہ میں گورا رنگ ہے) مرد مرغول مو، سخت گھونگر والے بال، آنکھیں جانب باطن مائل، تیز نظر، ترش رو دانت، باہم چڑھے ہونٹ، سمٹا جیسے کوئی حالت غضب میں ہو۔ ہم سے کہا: انھیں پہچانتے ہو؟ یہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور ان کے پہلو میں ایک اور تصویر تھی، صورت ان سے ملتی مگر سر میں خوب تیل پڑا ہوا، پیشانی کشادہ، پتلیاں جانب بینی مائل (سر مبارک مدوّر گول)، کہا: انھیں جانتے ہو؟ یہ ہارون علیہ السلام ہیں۔ پھر اور خانہ کھول کر حریر سپید پر ایک تصویر نکالی، مرد گندم گوں، سر کے بال سیدھے، قد میانہ، چہرے سے آثارِ غضب نمایاں، کہا: یہ لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، پھر حریر سپید پر ایک تصویر نکالی، گورا رنگ جس میں سرخی جھلکتی، ناک اونچی، رخسارے اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر حریر سپید ایک تصویر نکالی۔ صورت صورتِ اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مشابہ تھی مگر لبِ زیریں پر ایک تل تھا، کہا: یہ یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر حریر سیاہ پر ایک تصویر نکالی، رنگ گورا، چہرہ حسین، ناک بلند قامت خوبصورت، چہرے پر نور درخشاں اور اس میں آثارِ خشوع نمایاں، رنگ میں سرخی کی جھلک تاباں، کہا: یہ تمھارے نبی کریم اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، پھر حریر سپید پر ایک تصویر نکالی کہ صورتِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مشابہ تھی، چہرہ گویا آفتاب تھا، کہا: یہ یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر حریر سپید پر ایک تصویر نکالی سرخ رنگ، باریک ساقیں، آنکھیں کم کھلی ہوئیں (یہ اس سالہا سال کے گریۂ خوف الٰہی کا اثر تھا جس کے باعث رخسارۂ انور پر دو خطِ سیاہ بن گئے تھے۔) جیسے کسی کو روشنی میں چوندھ لگے، پیٹ ابھرا ہوا، قد میانہ، تلوار حمائل کیے، مگر حدیث عبادہ میں اس کے عوض یوں ہے: حریر سبز پر گوری تصویر جس کے عضو عضو سے نزاکت

ودلکشی ٹپکتی، ساق وسرین خوب گول، کہا: یہ داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر حریر سپید پر ایک تصویر نکالی، فربہ سرین، پاؤں میں طول، گھوڑے پر سوار (جس کے ہر طرف پر لگے تھے، گردن دبی ہوئی، پشت کوتاہ، گورا رنگ) کہا: یہ سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں (اور یہ پردار گھوڑا جس کے ہر جانب پر میں ہوا ہے کہ انھیں اٹھائے ہوئے ہے) پھر حریر سیاہ پر ایک گوری تصویر نکالی، مرد جوان، داڑھی نہایت سیاہ، سر کے بال کثیر، چہرہ خوبصورت (آنکھیں حسین، اعضا متناسب)، کہا: یہ عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ ہم نے کہا: یہ تصویریں تیرے پاس کہاں سے آئیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ ضرور سچی تصاویر ہیں کہ ہم نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصویر کریم کے مطابق پائی۔ کہا: آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب عزوجل سے عرض کی تھی کہ میری اولاد کے انبیاء مجھے دکھادے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ان پر تصاویر انبیاء اتاریں کہ مغرب شمس کے پاس خزانۂ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تھیں، ذوالقرنین نے وہاں سے نکال کر دانیال علیہ السلام کو دیں (انھوں نے پارچہ ہائے حریر پر اتاریں کہ یہ بعینہا وہی چلی آتی ہیں) سن لو خدا کی قسم مجھے آرزو تھی کہ کاش میرا نفس ترک سلطنت کو گوارہ کرتا اور میں مرتے دم تک تم میں کسی ایسے کا بندہ بنتا جو غلاموں کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ رکھتا (مگر کیا کروں نفس راضی نہیں ہوتا) پھر ہمیں عمدہ انعامات دے کر رخصت کیا (اور ہمارے ساتھ آدمی کر کے سرحدِ اسلام تک پہنچادیا) ہم نے آکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حال عرض کیا، صدیق روئے اور فرمایا، مسکین اگر اللہ اس کا بھلا چاہتا وہ ایسا ہی کرتا، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خبر دی کہ یہ اور یہودی اپنے یہاں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت پاتے ہیں۔ (دلائل النبوۃ: ۱/ ۳۸۸ تا ۳۹۰)

امام واقدی اور ابوالقاسم بن عبدالحکم فتوحِ مصر میں بطریق ایان بن صالح راوی: جب حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمانِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لے کر مقوقس نصرانی بادشاہ مصر واسکندریہ کے پاس تشریف لے گئے، اس نے ان سے دریافت کیا کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کس بات کی طرف بلاتے ہیں؟ انھوں نے

فرمایا: توحید ونماز پنجگانہ وروزۂ رمضان وحج ووفائے عہد۔ پھراس نے حضور کا حلیہ پوچھا، انھوں باختصار بیان کیا، وہ بولا: ابھی اور باتیں باقی رہیں کہ تم نے نہ بیان کیں۔ ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں کہ کم کسی وقت جدا ہوتے ہوں اور ان کے دونوں شانوں کے بیچ مہر نبوت ہے۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اور صفاتِ کریمہ بیان کر کے بولا: مجھے یقیناً معلوم تھا کہ ایک نبی باقی ہے اور مجھے گمان تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوگا کہ اگلے انبیاء نے وہاں ظہور فرمایا، محنت میں، مشقت کی زمین میں، اور قبطی ان کی پیروی میں میری نہ مانیں گے عنقریب وہ ان شہروں پر غلبہ پالیں گے۔ (زرقانی:۳/۳۵۰)

ابوالقاسم نے بطریق ہشام بن اسحٰق وغیرہ اور ابن سعد نے طبقات میں بطریق محمد بن عمر بن واقد ان کے شیوخ سے روایت کیا کہ مقوقس نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اسی مضمون کی عرضی لکھی کہ: مجھے یقین تھا کہ ایک نبی باقی ہے اور میرے گمان میں وہ شام سے ظہور کرتا اور میں نے حضور کے قاصد کا اعزاز کیا اور حضور کے لیے نذر حاضر کرتا ہوں (الطبقات الکبریٰ:۱/۲۶۰)

بیہقی دلائل میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا چرچا سنا اور حضور کے صفات ونام وہیئات اور جن جن باتوں کی ہم حضور کے لیے توقع کر رہے تھے، سب پہچان لیں تو میں نے خاموشی کے ساتھ اسے دل میں رکھا یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ مجھے خبر رونق افروز پہنچی۔ میں نے تکبیر کہی۔ میری پھوپی بولی: اگر تم موسیٰ بن عمران علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آنا سنتے تو اس سے زیادہ کیا کرتے؟ میں نے کہا: اے پھوپھی! خدا کی قسم وہ موسیٰ بن عمران کے بھائی ہیں۔ جس بات پر موسیٰ بھیجے گئے تھے اسی پر یہ بھی مبعوث ہوئے ہیں، وہ بولی: اے میرے بھتیجے! کیا یہ وہ نبی ہیں جن کی ہمیں خبر دی جاتی تھی کہ وہ قیامت کے ساتھ مبعوث ہوں گے؟ میں نے کہا: ہاں (دلائل النبوۃ ۲/۵۳۰)

خطیب وابن عساکر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں احمد ہوں اور محمد، اور تمام جہان کو حشر دینے والا، اور سب انبیاء کے پیچھے آنے والا، اور نبوت ختم فرمانے والا، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (تاریخ بغداد:۵/۹۹)

ابویعلیٰ وطبرانی وشاشی وابونعیم فضائل الصحابہ میں اور ابن عساکر وابن النجار حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موصولاً اور رویانی وابن عساکر محمد بن شہاب زہری سے مرسلاً راوی حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما عم نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں (مکہ معظمہ سے) عرضی حاضر کی کہ مجھے اذن عطا ہو تو ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوں۔ اس کے جواب میں حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمان نافذ فرمایا: اے چچا! اطمینان سے رہو کہ تم ہجرت میں خاتم المہاجرین ہونے والے ہو، جس طرح میں نبوت میں خاتم النبیین ہوں، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (تاریخ دمشق:۷/۳۵)

امام اجل فقیہ محدث ابواللیث سمرقندی تنبیہ الغافلین میں فرماتے ہیں: ہمیں ابوبکر محمد بن احمد ان کو ابوعمران ان کو عبدالرحمٰن ان کو داؤد ان کو عباد بن کثیر ان کو عبد خیر سے انھوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کیا جب سورۃ اذا جاء نصر اللہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرض وصال شریف میں نازل ہوئی حضور فوراً برآمد ہوئے، پنجشنبہ کا دن تھا، منبر پر جلوس فرمایا، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ مدینے میں ندا کر دو "لوگو! رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وصیت سننے چلو۔" یہ آواز سنتے ہی سب چھوٹے بڑے جمع ہوئے، گھروں کے دروازے ویسے ہی کھلے چھوڑ دیئے یہاں تک کہ کنواریاں پردوں سے باہر نکل آئیں، حدیہ کہ مسجد شریف حاضرین پر تنگ ہوئی، اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرمارہے تھے اپنے پچھلوں کے لیے جگہ وسیع کرو، اپنے پچھلوں کے لیے جگہ وسیع کرو۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر قیام فرما کے حمد وثنائے الٰہی بجالائے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر درود

بھیجی، پھر ارشاد ہوا: میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم عربی صاحب حرمِ محترم ومکہ معظّمہ ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں [تنبیہ الغافلین -ص ۴۳۷]۔

اللہ اللہ ایک وہ دن تھا کہ مدینہ طیبہ میں حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دھوم۔ زمین وآسمان میں خیر مقدم کی صدائیں گونج رہی، خوشی و شادمانی ہے کہ درودیوار سے ٹپکی پڑتی، مدینے کے ایک ایک بچے کا دمکتا چہرہ انار دانہ ہو رہا، باچھیں کھلی، دل ہیں کہ سینوں میں نہیں سماتے، سینوں پر جامے تنگ، جاموں میں قبائے گل کا رنگ، نور ہے کہ جھما جھم برس رہا ہے، فرش سے عرش تک نور کا بُقعہ بنا ہے، پردہ نشین کنواریاں شوقِ دیدارِ محبوب کردگار میں گاتی ہوئی باہر آئیں ہیں کہ:

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

(ہم پر چاند نکل آیا وداع کی گھاٹیوں سے، ہم پر خدا کا شکر واجب ہے جب تک دعا مانگنے والا دعا مانگے)

بنی النجار کی لڑکیاں کوچے کوچے میں محوِ نغمہ سرائی ہیں کہ:

نحن جوادٍ من بنی النجار

یا حبذا محمد من جار

(ہم بنونجار کی لڑکیاں ہیں، اے نجاریو! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسا اچھا ہمسایہ ہے۔ت)

ایک دن آج ہے کہ اس محبوب کی رخصت ہے، مجلسِ آخری وصیت ہے، مجمع تو آج بھی وہی ہے، بچوں سے بوڑھوں تک، مردوں سے پردہ نشینوں تک سب کا ہجوم ہے، ندائے بلال سنتے ہی چھوٹے بڑے سینوں سے دل کی طرح بے تابانہ نکلے ہیں، شہر بھر نے مکانوں کے دروازے کھلے چھوڑ دیئے ہیں، دل کملائے، چہرے مرجھائے، دن کی روشنی دھیمی پڑ گئی کہ آفتاب جہاں تاب کی وداع نزدیک ہے۔ آسمان پژمردہ، زمین افسردہ، جدھر دیکھو سناٹے کا عالم، اتنا ازدحام اور ہُو کا مقام،

آخری نگاہیں اس محبوب کے روئے حق نما تک کس حسرت و یاس کے ساتھ جاتی اور ضعفِ نومیدی سے ہلکان ہو کر بجنو دانہ قدموں پر گر جاتی ہیں، فرطِ ادب سے لب بند مگر دل کے دھوئیں سے یہ صدا بلند:

کنت السواد ناظری فعمی علیك الناظر

من شاء بعدك فلیمت فعلیك کنت احاذر

اللہ کا محبوب، امت کا راعی کس پیار کی نظر سے اپنی پالی ہوئی بکریوں کو دیکھتا اور محبت بھرے دل سے انھیں حافظ حقیقی کے سپرد کر رہا ہے۔ شانِ رحمت کو ان کی جدائی کا غم بھی ہے اور فوج درفوج امنڈتے ہوئے آنے کی خوشی بھی کہ محنت ٹھکانے لگی، جس خدمت کو ملک العرش نے بھیجا تھا باحسن الوجوہ انجام کو پہنچی۔

نوح کی ساڑھے نوسو برس وہ سخت مشقت اور صرف پچاس شخصوں کو ہدایت۔ یہاں بائیس تیئیس سال ہی میں بحمد اللہ یہ روز افزوں کثرت۔ کنیز وغلام جوق در جوق آرہے ہیں، جگہ بار بار تنگ ہو جاتی ہے، بار بار ارشاد ہوتا ہے، آنے والوں کو جگہ دو، آنے والوں کو جگہ دو۔ اس عام دعوت پر جب یہ مجمع ہولیا ہے۔ سلطانِ عالم نے منبر اکرم پر قیام کیا ہے، بعد حمد وصلوٰۃ اپنے نسب ونام وقوم ومقام وفضائل عظام کا بیان ارشاد ہوا ہے۔ مسلمانو! خدارا پھر مجلس میلاد اور کیا ہے، وہی دعوت عام، وہی مجمع تام، وہی منبر وقیام، وہی بیان فضائل سیدالانام علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام، مجلس میلاد اور کس شے کا نام، مگر نجدی صاحبوں کو ذکر محبوب مٹانے سے کام وربنا الرحمن المستعان و بہ الاعتصام وعلیہ التکلان۔

ابن حبان وابن عساکر حضرت ابومنظور اور ابونعیم بروجہ آخر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، جب خیبر فتح ہوا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دراز گوش سیاہ رنگ دیکھا، اس سے کلام فرمایا، وہ جانور بھی تکلم میں آیا، ارشاد ہوا، تیرا نام کیا ہے؟ عرض کی: یزید بیٹا شہاب کا، اللہ تعالیٰ نے میرے دادا کی نسل سے ساٹھ دراز گوش پیدا کئے، ان سب پر انبیاء سوار ہوا کئے۔ مجھے یقینی توقع تھی کہ حضور

مجھے اپنی سواری سے مشرف فرمائیں گے کہ اب اس نسل میں سوا میرے اور انبیاء میں سوا حضور کے کوئی باقی نہیں، میں پہلے ایک یہودی کے پاس تھا۔ اسے قصداً گرادیا کرتا، وہ مجھے بھوکا رکھتا اور مارتا، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا نام یعفور رکھا، جسے بلانا چاہتے اسے بھیج دیتے، چوکھٹ پر سر مارتا۔ جب صاحب خانہ باہر آتا اسے اشارے سے بتاتا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یاد فرماتے ہیں، جب حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا، وہ مفارقت کی تاب نہ لایا: ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کنویں میں گر کر مر گیا۔ (المواہب اللدنیۃ: ۲/۵۵۴)

سعید بن ابی منصور و امام احمد ابن مردویہ حضرت ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میرے بعد نبوت نہیں مگر بشارتیں ہیں اچھے خواب (مسند امام احمد: ۵/۴۵۴)

احمد و خطیب اور بیہقی شعب الایمان میں اس کے قریب ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میرے بعد نبوت سے کچھ باقی نہ رہے گا مگر بشارتیں، اچھا خواب کہ بندہ آپ دیکھے یا اس کے لیے دوسرے کو دکھایا جائے (مسند امام احمد: ۶/۱۲۹)

ابو بکر ابن ابی شیبہ مصنف میں عبید بن عمر ولیثی اور طبرانی کبیر میں نعیم بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ اس سے پہلے تیس کذاب نکلیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو نبی کہتا ہو۔ عبید نے اس پر "قبل یوم القیٰمہ" کو زائد کیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۵/۱۷۰)

خطیب حضرت امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: علی مجھ سے ایسا ہے جیسا موسیٰ سے ہارون (کہ بھائی بھی اور نائب بھی) مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں (تاریخ بغداد: ۷/۴۵۳)

امام احمد مناقب امیر المومنین علی میں مختصراً ور بغوی و طبرانی اپنی معاجیم،

ماوردی معرفت، ابن عدی کامل، ابواحمد حاکم کنیٰ میں بطریق امام بخاری، ابن عساکر تاریخ میں، سب زید بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث طویل میں راوی وھذا حدیث احمد جب حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باہم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بھائی چارہ کیا، امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے عرض کی: میری جان نکل گئی اور پیٹھ ٹوٹ گئی، یہ دیکھ کر کہ حضور نے اصحاب کے ساتھ وہ کیا جو میرے ساتھ نہ کیا۔ یہ اگر مجھ سے کسی ناراضی کے سبب ہے تو حضور ہی کے لیے منانا اور عزت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اس کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا میں نے تمھیں خاص اپنے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ تم مجھ سے ایسے ہو جیسے ہارون موسیٰ سے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں تم میرے بھائی اور وارث ہو۔ (تاریخ دمشق: ۶/۲۲۳) امیر المومنین نے عرض کی: مجھے حضور سے کیا میراث ملے گی؟ فرمایا: جو اگلے انبیاء کو ملی۔ عرض کی: اُنھیں کیا ملی تھی؟ فرمایا: خدا کی کتاب اور نبی کی سنت اور تم میرے ساتھ جنت میں میری صاحبزادی کے ساتھ میرے محل میں ہوگے اور تم میرے بھائی اور رفیق ہو۔

ابن عساکر بطریق عبداللہ بن محمد بن عقیل عن ابیہ عن جدہ عقیل بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: خدا کی قسم میں تمھیں دو جہت سے دوست رکھتا ہوں، ایک تو قرابت، دوسرے یہ کہ ابو طالب کو تم سے بہت محبت تھی، اے جعفر! تمھارے اخلاق میرے اخلاقِ کریمہ سے مشابہ ہیں۔ تم اے علی! مجھ سے ایسے ہو جیسے موسیٰ سے ہارون مگر یہ کہ میرے بعد نبی نہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، آمین! (کنز العمال: ۱۱/۷۳۹)

الحمدللہ تین چہل حدیث کا عدد تو کامل ہوا جن میں چوراسی حدیثیں مرفوع تھیں اور سترہ تذییلات پہلے گزری تھیں سات اس تکمیل میں بڑھیں، ان سترہ میں پانچ مرفوع تھیں تو جملہ مرفوعات یعنی وہ حدیثیں جو خود حضور پُر نور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی حضور کے ارشاد و تقریر کی طرف منتہیٰ ہیں نواسی، ہوئیں۔ لہٰذا

چاہا کہ ایک حدیث مرفوع اور شامل ہو کہ نوّے احادیث مرفوعہ کا عدد کامل ہو نیز ان اللہ وتر یحب الوتر (اللہ واحد ہے اور واحد کو پسند کرتا ہے۔ت) کا فضل حاصل ہوا۔

بیہقی سنن میں حضرت ابن زمل جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث طویل روایا میں راوی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعد نماز صبح پاؤں بدلنے سے پہلے ستّر بار سبحان اللہ وبحمدہ واستغفر اللہ ان اللہ کان توابا پڑھتے پھر فرماتے: یہ ستّر سات سو کے برابر ہیں۔ نرا بے خیر ہے وہ جو ایک دن میں سات سو سے زیادہ گناہ کرے (یعنی ہر نیکی کم از کم دس ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا، تو یہ ستر کلمے سات سو نیکیاں ہوئے اور ہر نیکی کو کم سے کم ایک بدی کو محو کرتی ہے۔ ان الحسنات یذھبن السیات، تو اس کے پڑھنے والے کے لیے نیکیاں ہی غالب رہیں گی مگر وہ کہ دن میں سات سو گناہ سے زیادہ کرے اور ایسا سخت ہی بے خیر ہوگا و حسبنا اللہ ونعم الوکیل)

پھر لوگوں کی طرف منہ کر کے تشریف رکھتے اور اچھا خواب حضور کو خوش آتا دریافت فرماتے: کسی نے کچھ دیکھا ہے؟ ابن زمل نے عرض کی: یارسول اللہ! میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ فرمایا، بھلائی پاؤ اور برائی سے بچو۔ ہمیں اچھا اور ہمارے دشمنوں پر برا، رب العالمین کے لیے ساری خوبیاں ہیں خواب بیان کرو۔ انھوں نے عرض کی! میں نے دیکھا کہ سب لوگ ایک وسیع نرم بے نہایت راستے پر پیچ شارع عام میں چل رہے ہیں۔ ناگہاں اس راہ کے لبوں پر خوبصورت سبزہ زار نظر آیا کہ ایسا کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا لہلہاتا سبزہ چمک رہا ہے، شادابی کا پانی ٹپک رہا ہے، اس میں ہر قسم کی گھاس ہے، پہلا ہجوم آیا، جب اس سبزہ زار پر پہنچے تکبیر کہی اور سواریاں سیدھے راستے پر ڈالے چلے گئے ادھر اُدھر اصلاً نہ پھرے، پھر اس مرغزار کی طرف کچھ التفات نہ کیا، پھر دوسرا ہلّہ آیا کہ پہلوں سے کئی گنا زائد تھا، جب سبزہ زار پر پہنچے تکبیر کہی راہ پر چلے مگر کوئی کوئی اس چراگاہ میں چرانے بھی لگا اور کسی نے چلتے میں ایک مُٹھا لے لیا، پھر روانہ ہوئے، پھر عام ازدحام آیا، جب یہ سبزہ زار پر پہنچے تکبیر کہی اور

بولے یہ منزل سب سے اچھی ہے یہ ادھر اُدھر پڑ گئے، میں ماجرا دیکھ کر سیدھا راہ پڑ لیا، جب سبزہ زار سے گزر گیا تو دیکھا کہ سات زینے کا ایک منبر ہے اور حضور اس کے سب سے اونچے درجے پر جلوہ فرما ہیں، حضور کے آگے ایک سال خوردلاغر ناقہ ہے حضور اس کے پیچھے تشریف لئے جاتے ہیں۔ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا وہ راہ نرم ووسیع وہ ہدایت ہے جس پر میں تمھیں لایا اور تم اس پر قائم ہو اور وہ سبزہ زار دنیا اور اس کے عیش کی تازگی ہے۔ میں اور میرے تمام صحابہ تو چلے گئے کہ دنیا سے اصلاً علاقہ نہ رکھا، نہ اسے ہم سے تعلق ہوا، نہ ہم نے اسے چاہا، نہ اس نے ہمیں چاہا۔ پھر دوسرا ہجوم ہمارے بعد آیا وہ ہم سے کئی گنا زیادہ ہے، ان میں سے کسی نے چرایا کسی نے گھاس کا مٹھا لیا اور نجات پا گئے پھر بڑا ہجوم آیا وہ سبزہ زار میں دہنے بائیں پڑ گئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون اور اے ابن زمل! تم اچھی راہ پر چلتے رہو گے یہاں تک کہ مجھ سے ملو اور وہ سات زینے کا منبر جس کے درجۂ اعلیٰ پر مجھے دیکھا، یہ جہان ہے۔ اس کی عمر سات ہزار برس کی ہے اور میں اخیر ہزار میں ہوں اور وہ ناقہ جس کے پیچھے مجھے جاتا دیکھا قیامت ہے۔ ہمارے ہی زمانے میں آئے گی، نہ میرے بعد کوئی نبی نہ میری امت کے بعد کوئی امت، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ امتک اجمعین وبارک وسلم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بحمد اللہ بیس احادیث علویہ کے علاوہ خاص مقصود محمود ختم نبوت پر یہ ایک سو ایک حدیثیں ہیں اور مع تذییلات ایک سو اٹھارہ جن میں نوّے مرفوع ہیں اور ان کے رواۃ واصحاب اکہتّر۔

گیارہ تابعی: صحابہ و تابعین جن میں صرف گیارہ تابعی:

(۱) امام اجل محمد باقر (۲) سعد بن ثابت (۳) ابن شہاب زہری (۴) عامر شعبی (۵) عبداللہ بن ابی الہذیل (۶) علاء بن زیاد (۷) ابو قلابہ (۸) کعب احبار (۹) مجاہد مکّی (۱۰) محمد بن کعب قرظی (۱۱) وہب بن منبہ

اکاون صحابہ: باقی ساٹھ صحابی ازاں جملہ اکاون صحابہ خاص اصول مرویات

ہیں: (۱۲)ابی بن کعب (۱۳)ابوامامہ باہلی (۱۴)انس بن مالک (۱۵)اسماء بنت عمیس (۱۶)براء بن عازب (۱۷)بلال مؤذن (۱۸)ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (۱۹)جابر بن سمرہ (۲۰)جابر بن عبداللہ (۲۱)جبیر بن مطعم (۲۲)حبیش بن جنادہ (۲۳)حذیفہ بن اُسید (۲۴)حذیفہ بن الیمان (۲۵)حسان بن ثابت (۲۶)حویصہ بن مسعود (۲۷)ابوذر (۲۸)ابن زمل (۲۹)زیاد بن لبید (۳۰)زید بن ارقم (۳۱)زید بن ابی اوفیٰ (۳۲)سعد بن ابی وقاص (۳۳)سعید بن زید (۳۴)ابوسعید خدری (۳۵)سلمان فارسی (۳۶)سہل بن سعد (۳۷)ام المومنین ام سلمہ (۳۸)ابوالطفیل عامر بن ربیعہ (۳۹)عامر بن ربیعہ (۴۰)عبداللہ بن عباس (۴۱)عبداللہ بن عمر (۴۲)عبدالرحمٰن بن غنم (۴۳)عدی بن ربیعہ (۴۴)عرباض بن ساریہ (۴۵)عصمہ بن مالک (۴۶)عقبہ بن عامر (۴۷)عقیل بن ابی طالب (۴۸)امیر المومنین علی (۴۹)امیر المومنین عمر (۵۰)عوف بن مالک اشجعی (۵۱)ام المومنین صدیقہ (۵۲)ام کرز (۵۳)مالک بن حویرث (۵۴)مالک بن سنان والد ابی سعید خدری (۵۵)محمد بن عدی بن ربیعہ (۵۶)معاذ بن جبل (۵۷)امیر معاویہ (۵۸)مغیرہ بن شعبہ (۵۹)ابن ام مکتوم (۶۰)ابومنظور (۶۱)ابو موسیٰ اشعری (۶۲)ابوہریرہ۔

اور نو صحابی: تذییلات میں: (۶۳)حاطب بن ابی بلتعہ (۶۴)عبداللہ بن ابی اوفی (۶۵)عبداللہ بن زبیر (۶۶)عبداللہ بن سلام (۶۷)عبداللہ بن عمرو بن عاص (۶۸)عبادہ بن صامت (۶۹)عبید بن عمرو لیثی (۷۰)نعیم بن مسعود (۷۱)ہشام بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

ختم نبوت پر دیوبندی عقیدہ:

ان احادیث کثیرہ وافرہ شہیرہ متواترہ میں صرف گیارہ حدیثیں وہ ہیں جن میں فقط نبوت کا انھیں الفاظ موجودہ قرآن عظیم سے ذکر ہے، جن میں آج کل کے بعض ضُلّال قاسمان کفر وضلال نے تحریف معنوی کی اور معاذ اللہ حضور کے بعد اور نبوتوں کی

نیو جمانے کو خاتمیت بمعنی نبوت بالذات لی۔ یعنی معنی خاتم النبیین صرف اس قدر ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی بالذات ہیں اور انبیاء نبی بالعرض، باقی زمانے میں تمام انبیاء کے بعد ہونا حضور کے بعد اور کسی کو نبوت ملنی ممتنع ہونا۔ یہ معنی ختم نبوت نہیں اور صاف لکھ دیا کہ حضور کے بعد بھی کسی کو نبوت مل جائے تو ختم نبوت کے اصلاً منافی نہیں۔ اس کے رسالۂ ضلالت مقالہ کا خلاصہ عبارت یہ ہے:

عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنیٰ ہے کہ آپ سب میں آخری نبی ہیں مگر اہلِ فہم پر روشن کہ تقدم یا تاخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر مقام مدح میں ولکن رسول الله و خاتم النبيين فرمانا کیونکر صحیح ہوسکتا بلکہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر ختم ہو جاتا ہے، اسی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کو تصور فرمایئے۔ آپ موصوف بوصفِ نبوت بالذات ہیں اور نبی موصوف بالعرض ایں معنی جو میں نے عرض کیا آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے بلکہ اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو تو خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا چہ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔ (تحذیر الناس ص ۱۸-۲۱)

مسلمانو! دیکھا اس ملعون ناپاک شیطانی قول نے ختم نبوت کی کیسی جڑ کاٹ دی، خاتمیت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کہ وہ تاویل گڑھی کہ خاتمیت خود ہی ختم کر دی۔ صاف لکھ دیا کہ اگر حضور خاتم الانبیاء علیہ وعلیہم افضل الصلوٰۃ والثنا کے زمانے میں بلکہ حضور کے بعد بھی کوئی نبی پیدا ہو تو ختم نبوت کے کچھ منافی نہیں، اللہ اللہ جس کفر ملعون کے موجد کو خود قرآن عظیم کا و خاتم النبيين فرمانا نافع نہ ہوا کما قال تعالیٰ: اتارتے ہیں ہم اس قرآن سے وہ چیز کہ مسلمانوں کے لیے شفاء و رحمت ہے اور ظالموں کو اس سے کچھ نہیں بڑھتا سوا زیاں کے۔ (القرآن: ۸۲/۱۷) اسے احادیث میں خاتم النبیین فرمانا کیا کام دے سکتا ہے فبای حدیث بعدہ یومنون (۱۸۵/۷) قرآن کے بعد اور کون سی حدیث پر ایمان لائیں گے۔

فقیر غفرلہ المولی القدیر نے ان احادیث کثیرہ میں صرف گیارہ حدیثیں ایسی لکھیں جن میں تنہا ختم نبوت کا ذکر ہے۔ باقی نوّے احادیث اور اکثر تذییلات، ان پر علاوہ سو سے زائد حدیثیں وہی جمع کیں کہ بالتصریح حضور کا اسی معنے پر خاتم ہونا بتا رہی ہیں جسے وہ گمراہ ضال عوام کا خیال جانتا ہے اور اس میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے کوئی تعریف نہیں مانتا، صحابہ کرام و تابعین عظام کے ارشادات کہ تذییلوں میں گزرے، مثلاً:

۱- امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو سب انبیاء کے بعد بھیجا۔

۲- انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول تمھارے نبی آخر الانبیاء ہیں۔

۳- عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔

۴- امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول کہ وہ سب انبیاء کے بعد بھیجے گئے۔

انھیں تو یہ گمراہ کب سنے گا کہ وہ اسی وسوسۃ الخناس میں صاف یہ خود بھی بتایا گیا ہے کہ وہ سلف صالح کے خلاف چلا ہے اور اس کا عذر یوں پیش کیا کہ:

''اگر بوجہ کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو ان کی شان میں کیا نقصان آ گیا اور کسی طفل ناداں نے کوئی ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا وہ عظیم الشان ہو گیا۔''

مگر آنکھیں کھول کر خود محمد صلی رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی متواتر حدیثیں دیکھئے کہ:

۱- میں عاقب ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔

۲- میں سب انبیاء میں آخر نبی ہوں۔

۳- میں تمام انبیاء کے بعد آیا۔

۴- ہمیں پچھلے ہیں۔

۵- میں سب پیغمبروں کے بعد بھیجا گیا۔

۶- قصرِ نبوت میں جو ایک اینٹ کی جگہ تھی مجھ سے کامل کی گئی۔

۷- میں آخر الانبیاء ہوں۔

۸- میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۹- رسالت و نبوت منقطع ہو گئی اب نہ کوئی رسول ہوگا نہ نبی۔

۱۰- نبوت میں سے اب کچھ نہ رہا سوا اچھے خواب کے۔

۱۱- میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔

۱۲- میرے بعد دجّال کذّاب ادعائے نبوت کریں گے۔

۱۳- میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۱۴- نہ میری اُمت کے بعد کوئی امت۔

ادھر علمائے کتب سابقہ اللہ و رسل جل جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہم وسلم کے ارشادات سن سن کر شہادات ادا کریں گے کہ:

۱- احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاتم النبیین ہوں گے ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔

۲- ان کے سوا کوئی نبی باقی نہیں۔

۳- وہ آخر الانبیاء ہیں۔

ادھر ملائکہ و انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صدائیں آ رہی ہیں کہ:

۴- وہ پسین پیغمبراں ہیں۔

۵- وہ آخر مرسلاں ہیں۔

خود حضرت عزت عَزَّتْ عِزَّتُهٗ سے ارشادات جانفزا و دلنواز آ رہے ہیں کہ:

۶- محمد ہی اول و آخر ہے۔

۷- اس کی امت مرتبے میں سب سے اگلی اور زمانے میں سب سے پچھلی۔

۸- وہ سب انبیاء کے پیچھے آیا۔

۹- اے محبوب! میں نے تجھے آخر النبیین کیا۔

۱۰- اے محبوب! میں نے تجھے سب انبیاء سے پہلے بنایا اور سب کے بعد بھیجا۔

۱۱- محمد آخرالانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

مگر یہ ضال مضل محرفِ قرآن مغیر ایمان ہے کہ نہ ملائکہ کی سنے نہ انبیاء کی، نہ مصطفیٰ کی مانے نہ ان کے خدا کی۔ سب کی طرف سے ایک کان گونگا ایک بہرا، ایک دیدہ اندھا ایک پھوٹا۔ اپنی ہی ہانک لگائے جاتا ہے کہ یہ سب نافہمی کے اوہام، خیالات عوام ہیں۔ آخرالانبیاء ہونے میں فضیلت ہی کیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ یونہی مہر کر دیتا ہے متکبر سرکش کے دل پر۔ اے رب ہمارے! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر بیشک تو ہی بڑا دینے والا۔

ہاں ان نوّے حدیثوں میں تین حدیثیں صرف بلفظ خاتمیت بھی ہیں، دو حدیث سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہ اے چچا! جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نبوت ختم کی تم پر ہجرت کو ختم فرمائے گا، جیسے میں خاتم النبیین ہوں تم خاتم المہاجرین ہوگے۔

شاید وہ گمراہ یہاں بھی کہہ دے کہ تمام مہاجرین کرام بالعرض تھے، حضرت عباس مہاجر بالذات ہوئے۔ ایک اور حدیث الٰہی جل وعلا کہ میں ان کی کتاب پر کتابوں کو ختم کروں گا اور ان کے دین شریعت پر ادیان شرائع کو۔

او گمراہ! اب یہاں بھی کہہ دے کہ اور دین دین بالعرض تھے۔ یہ دین دین بالذات ہے، توریت و انجیل و زبور اللہ تعالیٰ کے کلام بالعرض تھے قرآن کلام بالذات ہے مگر ہے یہ کہ:

جس کے لیے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں [القرآن: ۸/۳]۔

الحمدللہ کہ بیان اپنے منتہیٰ کو پہنچا اور حق کا وضوح ذروۂ اعلیٰ کو۔ احادیث متواترہ سے اصل مقصد یعنی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاتم النبیین اور اہل بیت کرام کا نبوت ورسالت سے بے علاقہ ہونا تو بروجہ تواتر قطعی خود ہی روشن و آشکارا ہوا اور اس کے ساتھ طائفہ تالفہ وہابیہ قاسمیہ کو خاتم النبیین کو بمعنے آخرالنبیین نہ ماننا اور

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اور نبی ہونے سے ختم نبوت میں نقصان نہ جاننا اس کے کفر خفی و نفاقِ جلی کا بھی بفضلہ تعالیٰ خوب اظہار ہوا اور ساتھ لگے رافضیوں کے چھوٹے بھائی حضرات تفضیلیہ کی بھی شامت آئی، اسدالغالب کی بارگاہ سے اسّی کوڑوں کی سزا پائی، ان چھوٹے مبتدعوں کا ردّ یہاں محض تبعاً واستطراداً مذکور، ورنہ ان کے ابطال مشربِ ضلال سے قرآنِ حکیم و احادیث مرفوعہ و اقوال اہلبیت و صحابہ و ارشادات امیر المومنین علی مرتضیٰ و اولیائے کرام و علمائے اعلام و دلائل شرعیہ اصلیہ و فرعیہ کے دفتر معمور جس کی تفصیل جلیل و تحقیقِ جزیل فقیر غفر اللہ تعالیٰ لہ کی کتاب مطلع القمرین فی ابانة سبقة العمرین میں مسطور ہے۔

منکرانِ ختم نبوت پر علمائے اسلام کی گرفت:

اب بتوفیقہ تعالیٰ تکفیر منکرانِ ختم نبوت میں بعض نصوص ائمہ کرام لکھ کر بقیہ سوال کی طرف عنان گردانی منظور۔

امام علامہ شہاب الدین فضل اللہ بن حسین توریشتی حنفی معتمد فی المعتمد میں فرماتے ہیں: بحمد للہ تعالیٰ یہ مسئلہ مسلمانوں میں روشن تر ہے کہ اسے بیان و وضاحت کی حاجت کیا ہے لیکن قرآن سے کچھ اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ کسی زندیق کے لیے کسی جاہل کو شبہ میں مبتلا کرنے کا خطرہ نہ رہے۔ بسا اوقات کھلی بات کی بجائے یوں فریب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، کوئی اس کی قدرت کا انکار نہیں کرسکتا لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے متعلق خبر دے دے کہ ایسے ہوگی یا نہ ہوگی، تو اس کا خلاف نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی سے خبر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس کے بعد دوسرا نبی نہ ہوگا۔ اس بات کا منکر وہی ہوسکتا ہے جو سرے سے نبوت کا منکر ہوگا جو شخص آپ کی رسالت کا معترف ہوگا وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان کردہ ہر خبر کو سچ جانے گا۔ جن دلائل سے آپ کی رسالت کا ثبوت بطریق تواتر ہمارے لیے درست ہے، اسی طرح یہ بھی درست و ثابت ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ

کے زمانہ میں اور قیامت تک آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ جو آپ کی اس بات میں شک کرے گا وہ آپ کی رسالت میں شک کرے گا، جو شخص کہے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد دوسرا نبی تھا یا ہے یا ہوگا اور جو شخص کہے کسی نبی کے آنے کا امکان ہے وہ کافر ہے یہی خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر صحیح ایمان کی شرط ہے۔ (المعتمد فی المعتقد فارسی)

امام ابن حجر مکّی شافعی خیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان میں فرماتے ہیں: امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک مدعی نبوت نے کہا مجھے مہلت دو کہ کوئی نشانی دکھاؤں۔ امام ہمام نے فرمایا جو اس سے نشانی مانگے گا کافر ہوجائے گا کہ وہ اس مانگنے کے سبب مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد قطعی ومتواتر ضروردینی کی تکذیب کرتا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (الخیرات الحسان ص۱۱۹)

فتاویٰ خلاصہ وفصول عمادیہ جامع الفصولین وفتاویٰ ہندیہ وغیرہا میں ہے:

اگر کوئی شخص کہے میں اللہ کا رسول ہوں یا فارسی میں کہے میں پیغمبر ہوں، کافر ہوجائے گا اگرچہ مراد یہ لے کہ میں کسی کا پیغام پہنچانے والا ایلچی ہوں، اور اگر اس کہنے والے سے کوئی معجزہ مانگے تو کہا گیا یہ بھی مطلقاً کافر ہے اور مشائخ متأخرین نے فرمایا اگر اسے عاجز ورسوا کرنے کی غرض سے معجزہ طلب کیا تو کافر نہ ہوگا ورنہ ختم نبوت میں شک لانے کے سبب یہ بھی کافر ہوجائے گا۔ (فتاویٰ ہندیہ:۲/۲۶۳)

اعلام بقواطع الاسلام میں ہے: مدعی نبوت کی تکفیر تو خود ہی روشن ہے اور جو اس سے معجزہ مانگے اس کا بھی کفر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مانگنے میں اس مدعی کا صدق محتمل مان رہا ہے حالانکہ دین متین سے بالضرورۃ (بدیہی طور پر) معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد دوسرا نبی ممکن نہیں، ہاں اگر اس طلب سے اسے احمق بنانا، اس کا جھوٹ ظاہر کرنا مقصود ہو تو کفر نہیں۔ (ص۳۷۶)

اُسی میں ہے: انھیں باتوں میں جو معاذ اللہ آدمی کو کافر کردیتی ہیں کسی نبی کو جھٹلانا یا اس کی طرف قصداً جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا یا نبی سے لڑنا یا اسے برا کہنا اس

کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہونا اور بتصریح امام حلیمی انھیں کفریات کی مثل ہے ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں یا حضور کے بعد کسی شخص کا تمنا کرنا کہ کسی طرح سے نبی ہوجاتا، ان صورتوں میں کافر ہوجائے گا اور ظاہر یہ ہے کہ اس میں کچھ فرق نہیں وہ تمنا زبان سے یا صرف دل میں کرے اھ مختصراً (ص۳۵۲)

سبحان اللہ! جب مجرد تمنا پر کافر ہوتا ہے تو کسی کی نسبت ادعائے نبوت کس درجہ کا کفر خبیث ہوگا والعیاذ باللہ رب العلمین۔

تیمیۃ الدہر پھر ہندیہ میں بعض ائمہ حنفیہ سے اور اشباہ والنظائر وغیرہا میں ہے:

جب نہ پہچانے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے پچھلے نبی ہیں تو مسلمان نہیں کہ یہ ضروریاتِ دین سے ہے۔ (الاشباہ والنظائر-۱/۲۹۶)

تاتارخانیہ پھر عالمگیریہ میں ہے:

ایک نے دوسرے سے کہا میں تیرا فرشتہ ہوں فلاں جگہ تیرے کام میں مدد کروں گا اس پر تو بعض نے بیشک کہا کافر نہ ہوگا، یوں ہی اگر مطلقاً کہا میں فرشتہ ہوں بخلاف دعویٰ نبوت کہ بالاجماع کفر ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ:۴/۲۶۶) یہ حکم عام ہے کہ مدعی زمانۂ اقدس میں ہو مثل ابن صیاد و اسود خواہ بعد کما تقدم و سیأتی۔

شفاء شریف امام قاضی عیاض مالکی اور اس کی شرح نسیم الریاض للعلامۃ الشہاب الخفاجی میں ہے:

اسی طرح وہ بھی کافر ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی کی نبوت کا ادعا کرے جیسے مسیلمہ کذاب و اسود عنسی یا حضور کے بعد کسی کی نبوت مانے اس لیے کہ قرآن وحدیث میں حضور کے خاتم النبیین ہونے کی تصریح ہے تو یہ شخص اللہ ورسول کو جھٹلاتا ہے جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ جیسے یہود کا ایک طائفہ عیسویہ کہ عیسیٰ ابن اسحٰق یہودی کی طرف منسوب ہے، اس نے مروان احمار کے زمانے میں ادعائے نبوت کیا تھا اور بہت یہود اس کے تابع ہوگئے، اس کا مذہب تھا کہ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نئی نبوت ممکن ہے اور جیسے بہت رافضی کہ

مولیٰ علی کو رسالت میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شریک اور حضور کے بعد انھیں نبی کہتے ہیں اور جیسے رافضیوں کے دو فرقے بزیغیہ و بیانیہ، ان لوگوں کا کفر نصاریٰ سے بڑھ کر ہے اور ان سے زائد ان کا ضرر کہ یہ صورت میں مسلمان ہیں ان سے عوام دھوکے میں پڑ جاتے ہیں یہ سب کے سب کفار ہیں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والے، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خبر دی کہ حضور خاتم النبیین ہیں اور خبر دی کہ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں اور اپنے رب عزوجل سے خبر دی کہ وہ حضور کو خاتم النبیین اور تمام جہاں کی طرف بتاتا ہے اور امت نے اجماع کیا کہ یہ آیات و احادیث اپنے معنی ظاہر پر ہیں جو کچھ ان سے مفہوم ہوتا ہے خدا اور رسول کی یہی مراد ہے نہ ان میں کچھ تاویل ہے نہ تخصیص، تو کچھ شک نہیں کہ یہ سب طائفے بحکم اجماع امت و بحکم حدیث و آیت بالیقین کافر ہیں۔ (الشفا: ۲/۲۷۲)

الحمد للہ اس کلام رشید نے ولید پلید و روافض بلید و قاسمیہ جدید و امیریہ طرید کسی مردود و عنید کا تسمہ نہ لگا و للہ الحجۃ السامیہ۔ اسی طرح طائفہ مرزائیہ متبعان غلام احمد قادیانی کہ سب سے تازہ ہے، یہ بھی مرزا کو مرسل من اللہ کہتا ہے اور خود مرزا اپنے اوپر وحی اترنے کا مدعی ہے اپنے کلام کو کلامِ الٰہی و منزل من اللہ بتاتا ہے اور اس کے رسالہ ''ایک غلطی کا ازالہ'' سے منقول کہ اس میں صراحۃً اپنے آپ کو نبی بلکہ بہت انبیاء سے افضل لکھا ہے اس بارے میں ابھی چند روز ہوئے امرتسر سے سوال آیا تھا جس پر حضرت مصنف علامہ نے مدلّل و مفصل فتوی تحریر فرمایا جس کا حسن بیان دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس کا نام السوء والعقاب ہے، وللہ الحمد، عفی عنہ۔ یہ فقرے آبِ زر سے لکھنے کے ہیں کہ ان خبیثوں کا کفر یہود و نصاریٰ سے بدتر اور کھلے کافروں سے ان کا زائد ضرر، والعیاذ باللہ العزیز الاکبر۔

وجیز امام کردری و مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: ہمارے مولا ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یوں ایمان لانا فرض ہے کہ حضور اب بھی ہمارے رسول ہیں (نہ یہ کہ معاذ اللہ بعد وصال شریف حضور رسول نہ رہے یا حضور کے بعد اب اور

کوئی ہمارا رسول ہو گیا) اور ایمان لانا فرض ہے کہ حضور تمام انبیاء و مرسلین کے خاتم ہیں، اگر حضور کے رسول ہونے پر ایمان لایا اور خاتم الانبیاء ہونے پر ایمان نہ لایا تو مسلمان نہ ہوگا۔ (مجمع الانہر: ۱/۶۹۱)

یہاں رسالت پر ایمان مجازاً بنظر صورت بحسب ادعائے قائل بولا گیا ورنہ جو ختم نبوت پر ایمان نہ لایا، قطعاً حضور کی رسالت ہی پر ایمان نہ لایا کہ رسول جانتا تو حضور جو کچھ اپنے رب جل جلالہ کے پاس سے لائے سب پر ایمان لاتا۔ جیسا کہ امام تورپشتی کے کلام میں پہلے گزر چکا ہے۔

امام علامہ یوسف اردبیلی شافعی کتاب الانوار میں فرماتے ہیں: جو ہمارے زمانے میں نبوت کا مدعی ہو یا دوسرے کسی مدعی کی تصدیق کرے یا حضور کے زمانے میں کسی کو نبی مانے یا حضور سے پہلے کسی غیر کو نبی جانے کافر ہو جائے اھ ملخصاً (الانوار لاعمال الابرار)

امام حجۃ الاسلام محمد غزالی کتاب الاقتصاد میں فرماتے ہیں: تمام امت محمدیہ صاحبہا وعلیہا الصلوٰۃ والتحیۃ نے لفظ خاتم النبیین سے یہی سمجھا کہ وہ بتاتا ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کبھی کوئی نبی نہ ہوگا۔ حضور کے بعد کبھی کوئی رسول نہ ہوگا اور تمام امت نے یہی مانا کہ اس لفظ میں نہ کوئی تاویل ہے کہ آخر النبیین کے سوا خاتم النبیین کے کچھ اور معنی گھڑیئے، نہ اس عموم میں کچھ تخصیص ہے کہ حضور کے ختم نبوت کو کسی زمانے یا زمین کے کسی طبقے سے خاص کیجیے اور جو اس میں تاویل و تخصیص کو راہ دے اس کی بات جنون یا نشے یا سرسام میں بہکنے بترانے بکنے کے قبیل سے ہے، اسے کافر کہنے سے کچھ ممانعت نہیں کہ وہ آیت قرآن کی تکذیب کر رہا ہے جس میں اصلا تاویل و تخصیص نہ ہونے پر امت مرحومہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ (الاقتصاد فی الاعتقاد)

بحمد اللہ یہ عبارت بھی مثل عبارت شفاء و نسیم تمام طوائف جدیدہ قاسمیہ و امیریہ خذلہم اللہ تعالیٰ کے ہذیانات کا رد جلیل و جلی ہے۔ آٹھ آٹھ سو برس بعد آنے والے کافروں کا رد فرما گئے، یہ ائمۂ دین کی کرامت منجلی ہے۔

غنیۃ الطالبین شریف میں عقائد ملعونہ غلاۃ روافض کے بیان میں فرمایا: غالی رافضیوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ مولا علی نبی ہیں۔ اللہ اور اس کے فرشتے اور تمام مخلوق قیامت تک ان رافضیوں پر لعنت کریں، اللہ ان کے درخت کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے، تباہ کر دے زمین پر ان میں کوئی بسنے والا نہ رکھے کہ انھوں نے اپنا غلو حد سے گزار دیا کفر پر جم گئے اسلام چھوڑ بیٹھے، ایمان سے جدا ہوئے اللہ و رسول و قرآن سب کے منکر ہو گئے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس سے جو ایسا مذہب رکھے (غنیۃ الطالبین: ۱/ ۸۸)

الحمد للہ، اللہ عزّ وجل نے یہ دعائے کریم مستجاب فرمائی۔ غرابیہ وغیرہا ملعون طوائف کا نشان نہ رہا۔ اب جو اس دار الفتن ہند پُرمحن کی زمین میں فتنوں کی بوچھار کی گندہ بہار میں دو ایک حشرات الارض کہیں کہیں تازہ نکل پڑے، وہ بھی بحمد اللہ تعالیٰ جلد جلد اپنے مقر سقر کو پہنچیں گے ایک آدھ کہیں باقی ہو تو وہ بھی قہر الٰہی الـم تهـلك الاولیـن۔ ثم نتبعهم الأخرين ۔ كذٰلك نفعل بالمجومين (۷۷/ ۱۶ تا ۱۸) (کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہ فرمایا پھر پچھلوں کو ان کے پیچھے پہنچائیں گے مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ت) کا منتظر ہے۔

تحفہ شرح منہاج میں ہے: کافر ہے جو کسی نبی کی تکذیب کرے یا کسی طرح اس کی شان گھٹائے، مثلاً بہ نیتِ توہین اس کا نام چھوٹا کر کے لے یا ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے نبی ہو چکے ان سے اعتراض وارد نہ ہوگا۔ (المعتقد المنتقد ص ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وفضل، احسان ونعمت ہمیں عطا فرمائے بوسیلہ اولیاء اللہ، صلوٰۃ وسلام نازل فرمائے خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اور ان کی آل واصحاب سب پر۔ آمین!

مصطفٰے جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان

احسن العلما سید شاہ مصطفٰے حیدر حسن
قادری برکاتی قدس سرہٗ

نحمده و نصلی و نسلم علیٰ رسوله الكريم و اله و اصحابه الفضل العميم۔ امابعد: فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم: وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ (سورۂ الم نشرح) صدق الله مولانا العظيم و بلغنا رسوله مولانا النبی الكريم و نحن علیٰ ذلك من الشاهدين و الشاغلين و العابدين و المطمئنين و الموقنين و به نستعين و صلى الله علیٰ خير الانبياء سيدنا و مولانا محمد واله و اصحابه اجمعين۔

آیۂ کریمہ جو تلاوت کی گئی "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" اس کا لفظی ترجمہ ہے: ہم نے تمہارے لیے اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، تمہارے ذکر کو بلند کر دیا، اونچا کر دیا۔ ترجمہ اس (آیت) کا ختم ہوا۔ یہاں سوچنے کی بات مختصر طور پر یہ ہے کہ کسی چیز کے بلند کرنے اور کسی چیز کو اونچا کرنے کے سلسلے میں بلند کرنے والے اور اونچا کرنے والے کی طاقت کا اندازہ کیا جائے۔ مثال میں ہم آپ کے سامنے بتائیں۔ آپ ایک چھوٹے بچے کے ہاتھ میں غلیل دے دیں (اور کہیں) تو چلا۔ وہ غریب ربڑ کھینچنے کے بعد چھوڑ دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک فٹ پر جا کر غلّہ جا پڑے گا، اس لیے کہ اس میں اتنی ہی طاقت ہے۔ اب آپ ایک لڑکے کے ہاتھ میں (غلیل) دے

کر دیکھیں پھر اندازلگایئے۔ یہ تو نوجوان لڑکے کی بات ہوئی۔ اب اس کے بعد آپ
ائرگن میں اس کا چھرّا رکھ کر داغیں تو اس (غلیل کے غلّے) سے آگے جائے گا۔ اس
کی جو velocity ہے اس کی جو پھینک ہے اس میں مشین کا دخل ہے تو جب آپ اس
کا ٹریگر دبائیں گے، لبلبی دبائیں گے تو اس کی velocity کے ذریعہ سے اس کا چھرّا
دور تک جائے گا۔ اب آپ ٹویلو بور چلایئے اس کی velocity ائرگن سے زیادہ
ہے۔ اس کے بعد آپ رائفل چلائیں اس کی پھینک اس سے زیادہ ہے۔ اور اس دور
جدید میں نہ جانے کتنے آلات ایسے ہیں کہ بین البراعظم، ایک براعظم سے دوسرے
براعظم تک مار کرتے ہیں۔ پانچ مشہور براعظم ہیں اور سنا ہے سائنسدانوں نے دعویٰ
کیا ہے کہ چھٹا براعظم ابھر رہا ہے۔ اللہ جانے ابھر رہا ہے کہ نہیں۔ بہرحال ان کا دعویٰ
ہے کہ چھٹا براعظم ابھر رہا ہے، اور آ رہا ہے۔ بہر حال پانچ براعظم موجود ہیں۔
براعظم ایشیاء، براعظم آسٹریلیا، براعظم یورپ، براعظم امریکہ اور براعظم افریقہ۔
ایسے ایسے آلات (حرب) موجود ہیں کہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک
مار کرتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ اونچا کرنے اور بلند کرنے میں بلند کرنے والے کی
طاقت کا سوال ہے۔ جتنی جس میں اونچا کرنے کی طاقت ہے اتنا ہی وہ چیز کو
اونچا کرے گا۔ اب اللہ جل جلالہ عم نوالہ فرماتا ہے: '' وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ '' اے
محبوب صلی اللہ علیہ وسلم۔ تمہارے ذکر کو کسی اور نے نہیں بلند کیا بلکہ ہم نے بلند کیا
ہے۔ مثال چسپاں ہوئی کہ نہیں؟ ہم نے تمہارے لیے تمہارے ذکر کو بلند فرمادیا ہے۔
ظاہر ہے اللہ کی بلندیوں کا کیا ٹھکانا۔ نہ اس کی کوئی انتہاء ہے نہ اس کی کوئی
ابتداء ہے نہ اس کا کوئی وزن ہے، نہ اس کی کوئی تول ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں آپ
تخت پر کھڑا کر کے تولیں تو ہمارا وزن کچھ اور ہوگا، ہمارے محمد بھائی جو بیٹھے ہیں ان کا
کچھ اور ہوگا اور آپ کا وزن کچھ اور ہوگا۔ یہ ہم میں تو ہے کہ کسی کا وزن کچھ، کسی کا اتنا۔
لیکن وہاں تو اتنے جتنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اتنا جتنا تو ہمارے آپ کے لیے ہے
کیونکہ ہم محدود ہیں۔ ہم محدود ہیں مخلوق ہونے کی حیثیت سے۔ وہ تو خالق حقیقی ہے۔

'' وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ '' (سورۂ اخلاص) (اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی) نہ اس کا
کوئی جوڑ ہے، نہ اس کا کوئی ساتھی ہے، نہ اس کا کوئی سا جھے دار ہے، نہ اس کا کوئی
حصہ دار ہے، نہ اس کا کوئی بھاگی دار ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے، نہ اس کا کوئی سہیم
ہے، نہ کسی کا باپ ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا ہے، نہ پوتا ہے، نہ جاگتا ہے، نہ کھاتا ہے، نہ پیتا
ہے، نہ مرتا ہے، نہ اونگھتا ہے۔ اللہ اکبر۔ فرماتا ہے: ''اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ''
(سورۂ بقرۃ: ۲۵۵) (اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اوروں کا
قائم رکھنے والا) وہ ایسا حی قیوم ہے، وہ ایسا زندہ ہے کہ آگے فرمایا: '' لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ
وَّلَا نَوْمٌ '' (سورہ بقرہ: ۲۵۵) (اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند) نوم یعنی نیند کے متعلق
عربی کی کہاوت ہے کہ '' النوم اخ الموت '' اور یہاں اُردو میں کہاوت ہے ضرب
المثل ہے کہ میاں سوتا اور مرا برابر ہے۔ تو فرماتے ہیں وہ ایسا حی و قیوم ہے جل جلالہ عم
نوالہ کہ موت تو الگ رہی اسے نید بھی نہیں آتی۔ اور پھر فرمایا یہی نہیں کہ نیند ہی نہیں
آتی بلکہ '' لَاتَاْ خُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ '' یعنی اسے اونگھ بھی نہیں آتی، نیند تو الگ رہی، نیند
کا مرتبہ تو بعد میں ہوتا ہے۔ ابتداء جب نیند کی ہوتی ہے تو آدمی اونگھتا ہے۔ آپ کہتے
ہیں کہ گھینگ میں ہے، بیٹھے بیٹھے غوطہ کھا رہا ہے، جھٹکے کھا رہا ہے۔ تو فرماتے ہیں نہ
اسے موت ہے نہ اسے نیند ہے اور نہ اسے اونگھ ہے۔ '' لَهٗ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَ مَافِي
الْاَرْضِ '' (سورۂ بقرہ: ۲۵۵) (اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ
زمین میں) مالک حقیقی ہر اس چیز کا جو زمین و آسمان میں ہے وہ اللہ ہے جل جلالہ عم
نوالہ تب وہ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے کسی اور سے نہیں بلند کرایا۔ جبریل سے ہم نے
تمہاری رفعتوں کو نہیں بلند کرایا، ہم نے میکائیل سے تمہاری رفعتوں کو نہیں بلند کرایا
بلکہ ہم جو خالق بساط ہیں، جو بلندیوں کے خالق و مالک ہیں، جنہوں نے بلندیوں کو
پیدا فرمایا ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہے جس کو چاہے اونچا کرے اور جس کو
چاہے نیچا کرے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، جس کو چاہے
اٹھائے اور جس کو چاہے گرائے۔ اس کی بارگاہ میں کوئی مجال دم زدن نہیں۔ اس کے

حکم کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی، کوئی مرافعہ نہیں کیا جاسکتا۔

میاں! اپیل تو اوپر کے کورٹ میں ہوتی ہے نا؟ ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی ہے؟ (سامعین: جی ہاں) مجسٹریٹ کی اپیل آپ ہائی کورٹ میں کرتے ہو، ہائی کورٹ کی اپیل کے لیے سپریم کورٹ جاتے ہو۔ کوئی سپریم ہے ہی نہیں اس کا تو اس کی اپیل ہوگی کہاں سے۔ کوئی سپریم ہے اللہ سے جل جلالہ وعم نوالہ؟ تو فرماتے ہیں اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم نے آپ کے ذکر کو آپ کے لیے بلند کردیا۔

بہت اچھا صاحب! جب اللہ نے یہ خوشخبری انہیں سنائی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا ان کے قلب پاک میں تو وہ پوچھ بیٹھے کہ ''کیف رفعت ذکری'' اب آپ ذرا یہ بھی تو فرمادیجئے کہ جب آپ نے ہمارا ذکر بلند کیا تو کیسے ذکر کیا بلند آپ نے ہمارا۔ اس کی کوئی نشانی تو بتادیں۔ فرمایا سنو جہاں ہم ہیں، جہاں ہمارا ذکر ہے وہاں تمہارا ذکر ضرور ہے۔ اذان ہو، نماز ہو مولانا حسن میاں رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ حضرت کے منجھلے بھائی فرماتے ہیں۔

اذاں کیا جہاں دیکھو ایمان والو
پسِ ذکر حق ذکر ہے مصطفیٰ کا

اور بڑی خوبصورت توجیہہ بیان کرتے ہیں۔ ''پس ذکر حق'' پہلے دعویٰ کیا نا کہ اللہ کے ذکر کے بعد ''پس'' کہتے ہیں فارسی میں، 'بعد کو' ''پس ذکرِ حق ذکر ہے مصطفیٰ کا'' تو کیوں ہے پسِ ذکرِ حق۔ اللہ کے ذکر کے بعد ہی کیوں ذکر ہے؟ تو فرماتے ہیں۔

کہ پہلے زبان حمد سے پاک ہولے
تو پھر نام لے وہ حبیبِ خدا کا
(صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین)

''خدا کرنا ہوتا...'' بڑا نازک مسئلہ ہے، بڑا نازک معاملہ ہے۔ مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ اس شعر کو لکھنے سے پہلے اپنے برادر محترم کے حضور میں گئے۔

میں گھر کی بات بتارہا ہوں۔ اللہ اکبر۔ اور اپنے بھائی صاحب یعنی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ سے انہوں نے کہا ''حضور مضمون یہ ذہن میں آرہا ہے کہ۔

خدا کرنا ہوتا جو تحت مشیت
خدا ہوکر آتا یہ بندہ خدا کا

کہا، حضور کیا ایسا مضمون میں لکھ دوں۔ (اعلیٰ حضرت نے) فرمایا ہاں، بالکل لکھ دیجئے۔ اس لیے کہ آپ یہی تو کہہ رہے ہیں نا کہ ''خدا کرنا ہوتا جو تحت مشیت''۔ اللہ کو اگر انہیں خدا بنا کر بھیجنا ہوتا تو خدا ہوکر یہ بندہ خدا کا دنیا میں تشریف لاتا لیکن کیونکہ اللہ کو انہیں بندہ بنا کر بھیجنا تھا لہٰذا دنیا میں خدا بن کر نہیں آئے ہیں بلکہ بندۂ خدا بن کر آئے ہیں۔

تم ذاتِ خدا سے نہ جدا ہو نہ خدا ہو
اللہ کو معلوم ہے کیا جانیے کیا ہو

ہم تو اپنے بیانوں میں سامنے والوں سے کہتے ہیں کہ تم نے یہ جو کہا کہ صاحب ''بریلوی'' تو جہاں بیٹھتے ہیں تو بس صاحب اللہ کے برابر کردیتے ہیں۔ تو پہلے وہ ماپ تو بتادو وہ میٹر ہمیں بتادو، وہ انچی ٹیپ ہمیں بتادو جس سے خدا کو ناپا ہو تم نے۔ دیکھئے نا! آپ کہیں گے میرا ہاتھ بڑا، تمہارا چھوٹا۔ تو دونوں ہاتھ نپیں گے تب تو پتا چلے گا، جب آپ دونوں کو compare کریں گے تب ہی تو پتا چلے گا کہ کس کا ہاتھ بڑا ہے، کس کا چھوٹا ہے۔ تو وہ measurement، وہ گز، وہ انچی ٹیپ، وہ ناپ تو ہمیں بتادو، وہ پیمانہ تو ہمیں بتادو جس سے خدا کو ناپا ہو کہ اللہ مثلاً ایک گز ہے کہ دو گز ہے یا چار گز ہے۔ جی! یا ایک میٹر، دو میٹر، چار میٹر لمبا چوڑا ہے، تب تو کہنے کی گنجائش ہوسکے گی کہ صاحب تم نے ان کو بھی چار میٹر کردیا، چار میٹر ناپ تو اللہ کا تھا جل جلالہ وعم نوالہ۔ بولو بھائی، اللہ ناپنے میں آسکتا ہے؟ (سامعین کہتے ہیں نہیں) اللہ کو ناپوگے؟ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ۔ اللہ اکبر۔ اس کی عظمتوں کا، میں طالب علم ہوں میں کیا بیان کرسکتا ہوں۔ حضرات صوفیائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے

پوچھویااعلیٰ حضرت سے پوچھو۔اللہ اکبر۔ (اعلیٰ حضرت) فرماتے ہیں ؎

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھ والوں کی ہمت پہ لاکھو سلام

اللہ اکبر۔ایک تجلی پڑی تھی۔ " فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ ، لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا" (سورہ اعراف : ۱۴۳) (پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کردیا اور موسیٰ گرا بے ہوش) کوہِ طور پر ایک ہلکی سی جھلک پڑی تھی۔اللہ اکبر۔ " فَلَمَّا تَجَلّٰی رُبُّهٗ ، لِلْجَبَلِ" پہلے تو کہا "لَنْ تَرٰنِی "(سورہ اعراف : ۱۴۳) تم ہمیں ہرگزنہیں دیکھ سکو گے۔اللہ اکبر۔لیکن صاحب وہ تو عاشقِ باخدا تھے اور ہر عاشق یہ چاہتا ہے کہ گو کہ چلمن کی اوٹ ہی سے سہی، پردے کے پیچھے ہی سے سہی، اس کا محبوب ایک جھلک دکھادے۔سارے عشق کی اور ساری محبت کی منتہی اور آخری منزل یہی ہوتی ہے کہ ہمیں دید محبوب ہوجائے، محبوب کا دیدار ہوجائے، بھلے وہ آدھے سیکنڈ کے لیے سہی، چلمن کے پیچھے ہی سے سہی، پردے کے پیچھے ہی سہی ،جالی کے پیچھے ہی لیکن ہمیں دیدار ہوجائے۔ اور وہاں فرمایا جارہا ہے" لن ترٰنی " تم ہمیں ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔جب ادھر سے اشتیاق، اصرار بڑھا تب پھر فرمایا کہ اچھا تو موسیٰ ایسا ہے" انظر الی الجبل "(سورۂ اعراف: ۱۴۳، اس پہاڑ کی طرف دیکھ) ہمیں دیکھنا چاہتے ہو؟ ایسا ہے اس پہاڑ کی طرف دیکھو۔اس پہاڑ پر نظر جماؤ" فان استقر مکانه فسوف ترنی " (سورۂ اعراف : ۱۴۳) اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پڑٹکا رہا، یہ پہاڑ اپنی جگہ پر جمارہا تو ہمیں دیکھ لوگے" فلما تجلی ربه للجبل " جب موسیٰ کے رب نے اس پہاڑ پر تجلی فرمائی" فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا و خرموسیٰ صعقا " تو وہ پہاڑ پس کر بالکل سرمے جیسا ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام باعظمت شان کہ قرآن فرماتا ہے" و کان عند الله و جیها "(سورۂ احزاب : ۶۹، اور موسیٰ اللہ کے یہاں آبرو والا ہے) ان کی وجاہت اور ان کی عظمت کی گواہی قرآن دے رہا ہے لیکن اس ساری عظمت کے باجود بے ہوش ہوکے گر گئے۔

(مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی کلام سے ماخوذ ایک نعتیہ شعر کو پڑھ کر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا) شیخ محقق فرماتے ہیں میرے مولیٰ، اے میرے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، موسیٰ تمام عظمتوں اور شانوں کے ساتھ ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہوگئے۔صفتوں میں سے، اللہ کی صفات کریمہ میں سے ایک صفت کی تاب نہ لا سکے، بے ہوش ہوگئے اور آپ نے معراج کی رات میں صفات الٰہیہ نہیں بلکہ ذات الٰہی کو دیکھا اور آپ مسکراتے رہے۔اللہ اکبر۔

سرورِکائنات محمد مصطفےٰ صلی الله تعالیٰ علیه وعلیٰ آله و اصحابه و بارك وسلم مظہرِ ذات بن کر تشریف لائے تھے اپنے رب جل جلالہ و عم نوالہ کے۔تب تو فرمایا:" من رأ نی فقد رای الحق "(بخاری) یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے رب کو دیکھا۔اور اسی لیے ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پکار اٹھے تھے:" أنارأیت ربی فی طرق المدینة "میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا ہے۔کیا رب آ گیا تھا مدینہ کی گلیوں میں؟ کیا رب چلتا پھرتا تھا، کیا خدا چلتا پھرتا تھا مدینہ کی گلیوں میں؟ کیا خدا چلتا پھرتا؟ جی! نہیں۔(سامعین بھی کہتے ہیں نہیں) فرماتے ہیں (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) میں نے مدینہ کی گلیوں میں اسے دیکھا جو مظہرِ ذاتِ خدا بن کر تشریف لایا ہے۔صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ و اصحابہ اجمعین۔

خدا کے علم کا اندازہ لگانا ہو، حالانکہ ہم اس کے علم کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میاں اندازہ تو اس چیز کا لگایا جاتا ہے جو محدود ہو۔اللہ اکبر۔بہت زبان سنبھال کر بات کرنا پڑتی ہے، بڑی لگا میں لگی ہوئی ہیں زبان کے اوپر۔اللہ کے علم کو دیکھنا ہو تو علم دیکھو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا، جمال الٰہی دیکھنا ہو تو جمال مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین و بارک وسلم... بڑا خوبصورت شعر کہا ہے مفتی لطف اللہ بدایونی نے۔میں تو یہ کہتا ہوں، میں نے تو یہ تجزیہ کیا ہے اللہ اکبر۔کہ پورے قرآن کا نچوڑ اس شعر میں ہے۔اُردو داں حضرات کو میں خاص طور پر متوجہ کروں گا، زبان کا

شعر ہے ؂

رخ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کے بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

کہتے ہیں مفتی لطف اللہ بدایونی رحمۃ اللہ علیہ بہت سے آئینے بھیجے اللہ نے جل جلالہ وعم نوالہ۔ آدم علیہ الصلوٰۃ ولسلام تشریف لائے۔ نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ دشمن کی گود میں انہیں پروان چڑھایا۔ اللہ اکبر۔ اللہ نے فرعون جیسے دشمن کی گود میں انہیں پروان چڑھایا۔ بغیر باپ کے، ہمارا عقیدہ ہے، اسلامی عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ مسیح بغیر باپ کے محض قدرت الٰہی سے اپنی والدۂ ماجدہ مریم بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پیدا ہوئے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں ؂

وہ کنواری پاک مریم وہ نفختُ فیہ کا دم
ہے عجب نشان اعظم مگر آمنہ کا جایا، وہی سب سے افضل آیا

جب ہی تو ایک مسلمان نے ایک عیسائی پادری سے کہہ دیا تھا جب اس عیسائی نے کہا تھا کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے رسول، ہمارے رسول ہمارے نبی سے بہتر ہیں تو بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رسول زمین میں ہیں اور ہمارا رسول تو آسمان میں ہے۔ آسمان اونچا ہے اور زمین نیچی ہے۔ تو تمہارے رسول کیسے اونچے ہوگئے؟ کہا (مسلمان نے) ارے بے وقوف، یہ بھی میرے قرآن سے سیکھ کر تو کہہ رہا ہے کہ تیرے رسول آسمان میں ہیں۔ یہ میرے قرآن نے کہا ہے، انجیل نے تو نہیں بتایا۔ انجیل (تحریف شدہ) نے تو یہودیوں پر یہ الزام رکھا تھا کہ انہیں قتل کردیا گیا، انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اس کو جب صاف کرنے کے لیے جماعت بیٹھی تو اور گوڑ کر رکھ دیا اس معاملہ کو۔ لیکن جب قرآن آیا تو اس نے اعلان کیا: ''وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم'' (سورۂ نساء: ۱۵۷) (اور ہے یہ کہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی دی بلکہ ان کے لیے ان کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا۔) وہ یہودی، وہ دشمن

نہ قتل کرسکے عیسیٰ کو اور نہ انہیں سولی پر لٹکا سکے۔ اللہ نے ان ہی میں سے ایک کی شکل عیسیٰ جیسی بنادی اور انہوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو سولی پر چڑھایا۔ آگے اور اس سے زیادہ صاف اور واضح طور پر فرمایا: ''وماقتلوہ یقینا . بل رفعہ اللہ الیہ'' (سورۂ نساء: ۱۵۷-۱۵۸) (اور بے شک انہوں نے اس کو قتل نہ کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا) وہ عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کرسکے بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا، اللہ نے اوپر انہیں اٹھالیا۔ وہ آسمانوں میں تشریف فرما ہیں۔

تو کہا (اس مسلمان نے) بے وقوف، یہ جو کہہ رہا ہے کہ وہ آسمانوں میں ہیں، ان کا مقام آسمانوں میں ہے، یہ تو میرے قرآن سے سیکھ کر کہہ رہا ہے۔ تو اپنی انجیل میں تو بتادے مجھے، اسی جگہ۔ تو تو میرے قرآن سے سیکھ کر کہہ رہا ہے۔'' وما قتلوہ یقینا. بل رفعہ اللہ الیہ'' وہ صاحب (مسلمان) زیادہ پڑھے لکھے تو تھے نہیں، مجھ جیسے کم پڑھے لکھے تھے۔ گھر میں گئے ترازو لے آئے اور اس پادری کے سامنے انہوں نے اس ترازو کو رکھا۔ کہا، بھائی گھر میں میرے یہ ایک چھوٹی موٹی ترازو ہے جس میں میں گھر کا اناج تولتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے صاحب ایک سیر رکھا ایک پلے میں اور چھٹنکی رکھی ایک پلے میں۔ اب وہ اٹھادیا تو سیر نیچے آگیا، ظاہر ہے ۱۶ چھٹانک تھا اور چھٹنکی اوپر اٹھ گئی۔ کہا، اب بتا ان دونوں میں کون بڑا ہے۔ تو پادری حیران تھا۔ کیسے کہہ دے کہ چھٹنکی بڑی ہے۔ چھٹنکی ایک چھٹانک ہے۔ آپ خود سوچیے نا کہ سو گرام کہاں اور ہزار گرام کہاں۔ ایک کلو ایک پلے میں ہو، کلو کا باٹ ایک پلے میں رکھا ہو اور سو گرام کا باٹ ایک پلے میں رکھا ہو اور اب آپ مجھ جیسے کم پڑھے لکھے سے پوچھیں کہ بتا کون سا بھاری ہے تو میں کیا کہوں گا۔ یہ کہوں گا کہ سو گرام بھاری ہے ؟ سو گرام بڑا ہے؟ نہیں، سو گرام کا تو دس گنا ہے وہ، وہ ہزار گرام تو دس گنا ہوا اس کا۔ لیکن اگر آپ پلے میں رکھیں گے تو کیونکہ اس میں لوہا زیادہ ہے، وزن زیادہ ہے، وہ پلہ ترازو کا نیچے آجائے گا۔ اور جس میں ۱۰۰ گرام رکھا ہے وہ اوپر چلا جائے گا۔ تو اس نے (مسلمان نے) کہا تیری منطق کے مطابق تو یہ چھٹنکی بڑی ہونا چاہئے۔ وہ پادری

عجیب کیفیت میں پڑ گیا اور کہا سن۔ اب تنقیدی جواب اس (پادری) کا یہ ہے۔ میں
تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے نبی اگر بڑے ہیں اور میرے نبی ان سے نہیں بڑے
ہیں تب تمہارے نبی پر اترنے والے قرآن میں ایک پوری سورت میرے نبی کی ماں
کے نام پر اتری ہے۔ اور تمہارے نبی پر اترنے والے قرآن میں، پورے قرآن میں
تمہارے نبی کی ماں کا نام ہی سرے سے نہیں آیا ہے۔ بولو کیا جواب ہے اس کا۔ وہ
مردِ مسلمان چونکہ علماء کی صحبت میں بیٹھتا تھا، علماء کے پاس آتا جاتا تھا، علماء سے بحث
کرتا تھا، ان سے فیض حاصل کرتا تھا، قرآن کو پڑھتا تھا، تلاوت کرتا تھا۔ سوچا اس
نے تھوڑی دیر کے لیے کہ یہ بات تو کچھ لگتی سی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آمنہ خاتون رضی
اللہ تعالیٰ عنہا کا نام تو تیسوں پاروں میں کہیں بھی نہیں ہے۔ چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ
(٦٦٦٦) آیتیں قرآن کی لیکن آمنۂ پاک کا ان میں کہیں نام نہیں ہے۔ اور یہ بات
بالکل صحیح ہے، بالکل حق ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس بارے میں کوئی دورائے
نہیں ہوسکتیں کہ پوری سورہ مریم شریف موجود ہے سولہویں پارے میں۔ سورت کا نام
ہی سورہ مریم ہے۔ فوراً ذہن میں روشنی پیدا ہوئی۔ فوراً ذہن میں جلا پیدا ہوئی۔ کہا اس
مردِ مسلمان نے، سنو پادری جی، بات ایسی ہے کہ تمہارے نبی کی ماں کے نام پر
میرے نبی پر اترنے والی اللہ کی کتاب قرآن میں جو سورت آئی ہے وہ اس لیے کہ دنیا
میں جتنے اب تک پیدا ہوئے ہیں چار ہی شکلیں ہیں، چار ہی صورتیں ہیں، پانچویں
صورت اب تک سامنے نہیں آئی۔ نہ مرد ہو نہ عورت ہو نہ باپ ہو نہ ماں ہو اور کوئی پیدا
ہوا ایک ہیں وہ۔ کون ہیں؟ ابوالبشر آدم علیہ السلام۔ یہ وہ ہمارے باپ ہیں کہ جنہیں
مانو تو باپ اور نہ مانو تو باپ۔ ابوالبشر، ہمارے باپوں کے باپ۔ دیکھو میاں، آدمی چچا
تو کسی کو کہہ سکتا ہے، ماموں کہہ سکتا ہے، خالو کہہ سکتا ہے، بھائی کہہ سکتا ہے۔ لیکن
باپ؟ کسی غیر کو باپ بنائے گا؟ اپنی ماں پر حرام چڑھائے گا کوئی؟ اللہ اکبر۔ تو اس
لیے حضرت سیدنا آدم علیہ السلام وہ باپ ہیں کہ انکار بھی کردے ان کے باپ ہونے
سے۔ لیکن وہ جائے کہاں وہ باپ ہیں، ابوالبشر ہیں۔ پہلے آدمی ہیں۔ اللہ اکبر۔ اس

لیے عربی کی کہاوت ہے" اول الناس اول الناسیین "ہم نے بچپن میں پڑھی تھی"
اول الناس اول الناسیین "پہلا آدمی سب سے پہلا بھولنے والا ہے۔ یعنی بھول کر
ہی تو وہ خوشۂ گندم (حضرت آدم علیہ السلام نے) کھایا۔ وہ شجر ممنوعہ تھا۔ تو پہلے آدمی،
پہلے بھولنے والے آدمی۔ تو ہماری جو بھول چوک ہے وہ ہمیں کاہے میں ملی ہے، وہ ہم
کو وراثت میں ملی ہے۔ اگر ہم میں بھول چوک نہ ہو تو پھر ہم آدمی نہ رہیں، انسان نہ
رہیں، فرشتے بن جائیں۔ لہٰذا جو بھول چوک ہے یہ ہمارے حلالی ہونے کی پہچان
ہے۔ ہم سے بھول چوک ہوتی ہے اس لیے کہ ہم آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے
ہیں۔ تو اب ایک مثال دنیا والوں کے سامنے ہے کہ نہ باپ، نہ ماں، وجود ہی نہیں تھا
آدمی کا، آدمی تھا ہی نہیں سرے سے۔ پہلا پتلا خمیر کیا گیا مٹی اور پانی کے درمیان اور
اس کے بعد روح اس میں داخل کی گئی اور چھینک لے کر انہوں نے آنکھ کھولی۔ تو
دیکھا ساتویں عرش پر لکھا تھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ نگاہیں اٹھیں تو فرشتوں کے
بازوؤں پر لکھا تھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ نگاہیں چڑھیں، نظریں اٹھیں تو دیکھا
حوروں کی پیشانی پر لکھا تھا۔ طوبیٰ وسدرہ کی ایک ایک پتی پر لکھا تھا لا الٰہ الا اللہ محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پوچھ بیٹھے اپنے رب سے الٰہی بادشاہا، یہ کون ہے جس کا
نام نامی آپ نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ ارشاد فرمایا: آدم، یہ تمہاری
اولاد میں سب سے آخری نبی ہوں گے اور سنو آدم یہ وہ ہیں لولاك ماخلقت۔ اگر
ان کا پیدا فرمانا ہمیں منظور نہ ہوتا تو اے آدم ہم تمہیں بھی پیدا نہ فرماتے۔ اور آج سے
تم اپنی کنیت، ابومحمد رکھو۔ اللہ اکبر۔ تو آدم علیہ السلام بغیر ماں اور بغیر باپ کے، نہ مرد
ہے، نہ عورت ہے، آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ایک مثال۔

دوسری مثال دنیا والوں کے سامنے ہے کہ مرد کا وجود تو ہے لیکن عورت کا
وجود نہیں ہے۔ تو کون پیدا ہوا؟ ہماری تمہاری سب کی ماں، ماں حوا رضی اللہ تعالیٰ
عنہا۔ آدم علیہ السلام کی بائیں طرف کی پسلی چاک کر کے پیدا فرمائی گئیں۔ اللہ اکبر۔
اسی لیے میرے آقا و مولیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

عورت naturally فطری طور پر ٹیڑھی ہے۔ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے؟ پسلی ٹیڑھی دیکھی ہے کبھی کسی بکرے بکری کی؟ پسلی سیدھی نہیں ہوتی ہے، ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اب آپ ٹیڑھی چیز کو کیسے سیدھا کرتے ہیں؟ ٹیڑھی سریا لوہے کی ہو اگر تو کیا طاقت سے سیدھا کرتے ہو؟ نہیں، بھٹی میں ڈالتے ہو، تپاتے ہو، تپانے کے بعد گرم کرتے ہو اور تب اس میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے سیدھے ہونے کی۔ تو پھر آہستہ سے جو موڑتے ہو تو وہ سیدھی ہوجاتی ہے۔ ارشاد فرمایا: یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے، میری مائیں، بہنیں مجھے معاف فرمائیں، ٹیڑھی ہیں۔ ایسی ٹیڑھی ہیں کہ ہم بچپن میں اُردو کی کتاب میں پڑھتے تھے، اس میں ایک لطیفہ لکھا ہوا تھا کہ میاں بیوی میں ہوگئی لڑائی، میاں بیوی کی لڑائی دودھ پر کی ملائی۔ ہماری یہاں یہ کہاوت ہے میاں بیوی کی لڑائی کیا ہوتی ہے دودھ پر کی ملائی یعنی بالائی۔ خیر صاحب، میاں جی روٹھ کر گھر سے چلے گئے۔ بیوی رہ گئیں گھر میں۔ بہت اچھا۔ کافی دنوں کے بعد میاں ایک دن آ گئے۔ کہا، ارے کہاں رہے؟ آپ بولے، کیا پوچھتی ہو کہ میں کہاں رہا۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں شاید مر گیا۔ میں گیا اور میں ایک ایسے شہر میں گیا اور ایک ایسے گھر میں رہا کہ بس وہاں ایک سے ایک اللہ کا مقبول بندہ موجود تھا۔ کہا، اچھا تو تمہاری ملاقات ہوئی مقبولان بارگاہِ الٰہی سے۔ کہا، ہاں بالکل ملاقات ہوئی۔ کہا، تو انہوں نے تمہیں کوئی فیض دیا۔ کہا، ہاں دیا۔ تو کہا، بس مجھے انھوں نے یہ عطا فرمایا کہ جس وقت میں چاہتا تھا زمین پر رہتا تھا اور جس وقت میں چاہتا تھا آسمان پر ہوتا۔ کہا، اچھا، یہ فیض ملا تمہیں۔ تو تم آدمی کے روپ میں اڑتے تھے یا کسی کے روپ میں اڑتے تھے۔ کہا، میں آدمی کے روپ میں بھی اڑتا تھا اور چڑیا کے روپ میں بھی اڑتا تھا۔ کہا، تو کبھی اڑنے میں اپنے اس گھر پر سے بھی گزرے ہوگے۔ اب عورت تو صاحب ٹھہری۔ اس نے جو جرح کرنا شروع کی۔ کہا، تو کبھی اس پر سے بھی گزرے ہوگے۔ کہا، ہاں ہاں، ہر دوسرے تیسرے دن گزرا تھا۔ کہا، تو اس کی کوئی خاص پہچان تھی کہ یہ تم تھے، ہم کیسے مان لیں کہ یہ تم تھے۔ کہا، دیکھو جب ہم اڑا کرتے تھے اور اپنے گھر پر سے گزرا کرتے تھے تو ہمارے اڑنے

سے اور گھر پر گزرنے سے پہلے ایک خاص ہوا چلا کرتی تھی اور اس کے بعد ہم اڑ جایا کرتے تھے اور ہم تمہیں دیکھا کرتے تھے۔ کبھی تم مسالا پیس رہی ہو، کبھی تم ہانڈی بگھار رہی ہو، کبھی تم کچھ کھا رہی ہو، کبھی تم کچھ پی رہی ہو۔ ہم ذرا کے ذرا ٹھٹکتے تھے اور پھر اڑ جایا کرتے تھے۔ کہا، اچھا تو وہ ہوا چلنے کے بعد جو کوئی اڑتا تھا... وہ؟ دیکھا تو میں نے بھی کہ کبھی... تو کیا وہ تم تھے؟ تو کہا، ہاں وہ ہم تھے۔ تو کہا، جبھی ٹیڑھے ٹیڑھے اڑتے تھے۔ دیکھا آپ نے ٹیڑھی پسلی؟ وہ تو سیدھا سیدھا اڑتا تھا لیکن چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، کہا تو اچھا وہ تم تھے۔ ناراضگی ہوئی تھی نا۔ آپس میں منھ مچائی ہوگئی تھی ہماری چالو اُردو میں کہتے ہیں تو وہ تم تھے ٹیڑھے ٹیڑھے اڑا کرتے تھے۔

پھر ایک میاں بیوی سے لڑائی ہورہی تھی۔ پڑوسی نے کہلایا کہ حضور ذرا یہ سوچیں کہ آپ کے پڑوس میں کوئی بھلا آدمی بھی رہتا ہے، یہ کیا طریقہ ہے آپ روز لڑتے ہیں۔ کہا، میں تو نہیں لڑتا، یہ لڑتی ہیں۔ کہا، میں تو نہیں لڑتی، میں کیوں لڑنے لگی۔ مرد نے کہا اچھا اگر میں لڑتا ہوں تو مجھے موت آئے۔ تو یہ کہتی ہے، کہ تو نہیں لڑتی، تو نہیں شروع کرتی، میں شروع کرتا ہوں۔ اگر تیری بات سچی ہے تو خدا کرے مجھے موت آجائے۔ کہا، اللہ نہ کرے جو تمہیں موت آئے۔ بھلا بتایئے تمہیں موت آئے گی تو میں ویران ہوجاؤں گی، بچے ویران ہوجائیں گے۔ یہ کس کی جان کو روئیں گے، میں کس کی جان کو روؤں گی۔ اچھا اگر تم جو یہ کہتے ہو کہ میں شروع کرتی ہوں تو یا اللہ میں تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ اگر میں نے شروع کی ہو لڑائی تو یا اللہ میں بیوہ ہوجاؤں۔ آپ نے دیکھا اور آپ نے ملاحظہ کیا، پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ ارے بیوہ جبھی تو ہوگی جب شوہر مرے گا۔

تو میرے آقا و مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں عورت کی فطرت میں ٹیڑھ ہے، وہ naturally ٹیڑھی ہے کیونکہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ لہٰذا اگر تم سوچو کہ قرآن نے تو ہمارے ہاتھ میں ہتھیار دیا ہے کہ "الرجال قوامون علی النساء" (سورۃ نساء: ۳۴) (مرد افسر ہیں عورتوں پر) اللہ اکبر۔ یعنی ہم تو

عورت کو طاقت کے ذریعہ، by force سیدھا کرلیں گے۔ جی نہیں۔ آپ سیدھا نہیں کرسکیں گے۔ اللہ کے رسول نے ایک بہترین طریقہ عطا فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں، اپنی محبت کی بھٹی میں ڈال کر اسے تپاؤ تپانے کے بعد پھر وہ سیدھی ہوجائے گی۔ وہ خود بہ خود سیدھی ہوجائے گی۔ تم پر اس کے کچھ حقوق ہیں، اس کے تمہارے اوپر کچھ حقوق ہیں۔ دونوں اگر اپنے اپنے حقوق کو ادا کرتے رہے، تب ہمارے سارے گھر۔

میرے پاس تو بھائی۔ اللہ اکبر۔ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں، میں آپ کو کیا تفصیلات بتاؤں اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں کے میرے پاس جو مراسلے آتے ہیں اور جو cases آتے ہیں، تعویذ و گنڈے اور ڈورے اور نمک اور لوبان کے سلسلے میں اس میں لگ بھگ اسی فی صدی۔ بڑے شرم کے ساتھ میری گردن جھک جاتی ہے۔ اسی فی صدی میرے بھائیوں اور بہنوں کے case آتے ہیں کہ شادی ہوئی دو گھنٹے ہوئے ہیں، ابھی ایک نے دوسرے کا منھ نہیں دیکھا ہے اور صاحب وہاں طلاق بھی ہوگئی۔ معاذ اللہ رب العالمین، استغفر اللہ۔ جیسے گویا کہ کھانا کھالیا، صبح کا ناشتہ کھالیا، دوپہر کا کھانا کھالیا، رات کا کھانا کھالیا، شام کی چائے پی لی۔ ایسے آج مسلمانوں میں طلاق ہوگئی۔ اس طرح سے آج ہمارے گھروں کی معاشرتی زندگی خراب ہوگئی ہے۔ ہمارے گھروں میں ۸۰ فیصدی، میں یہاں (پاکستان) کا حال نہیں بتارہا ہوں، میں یہاں کی بات نہیں کررہا، یہاں تو میں پردیسی ہوں، میں اپنے دیس کی بات کررہا ہوں ۸۰؍ فیصدی معاذ اللہ میرے پاس تعویذ اور گنڈے کے لیے یا تو عورت کے نمائندے آئیں گے یا مرد کے نمائندے آئیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ماں باپ میں تفرقہ ہوتا ہے، جب ماں باپ میں لڑائی ہوتی ہے تو سب سے بڑی خرابی اولاد کی ہوتی ہے اولاد یہ سوچتی ہے کہ اگر ہم باپ کا favour کرتے ہیں تو ماں بات نہیں کرے گی اور ماں کا favour کرتے ہیں تو باپ بات نہیں کرے گا۔ اس لیے سچی بات کہہ دیں گے، جس کے لیے بھی کہیں گے تو پٹائی ہوگی۔

چنانچہ ایک بچہ نے اپنی ماں سے کہا، روتا ہوا گیا گھر میں۔ ماں نے کہا بیٹا کیا

ہوا۔ بچے نے کہا پڑوسی نے ہمیں ماردیا۔ کہا، بیٹا تو نے اس سے بدتمیزی کی ہوگی۔ کہنے لگا، میں نے تو کچھ نہیں کی، میں تو سیدھا چلا آرہا تھا۔ کہا، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خواہ مخواہ تجھے کوئی مارے۔ کہا، نہیں اماں، ایسا تھا کہ ایک سچی بات منھ سے نکل گئی۔ کہنے لگیں کہ بیٹا سچی بات کہنے پر کوئی کسی کو نہیں مارتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوگی، تجھ سے کوئی بدتمیزی ہوئی ہوگی، تجھ نے اسے کچھ برا بھلا کہا ہوگا، کوئی کام ایسا کیا ہوگا کہ اس نے چانٹا مارا۔ اس نے کہا نہیں اماں، سچی بات پر ہی ہوتا ہے کہ لوگ مارتے پیٹتے ہیں۔ کہا بیٹا اچھا اگر تجھے یقین نہیں آتا ہے تو سچی بات کہہ کر دیکھ، دیکھ میں تجھے نہیں ماروں گی، میں تجھے پیار کروں گی۔ کہا، دیکھو ماں اچھی طرح سوچ لو اس بات کو۔ کہا، ہاں تو کہہ کر دیکھ۔ کہا، تو میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ میرے ابا کو مرے ہوئے تو اتنا زمانہ ہوگیا، اب یہ آپ کس کے لیے لپ اسٹک پاؤڈر لگایا کرتی ہیں۔ اس کا جواب دیجئے آپ مجھے۔ ایک چانٹا مارا۔ خبیث تیری یہ مجال۔ ہمارے پیٹ سے نکلا ہے ہماری لپ اسٹک پاؤڈر پر اعتراض کرتا ہے۔ کہا، دیکھا اماں یہی میں نے سچی بات وہاں کہہ دی تھی تو پٹا اور یہی سچی بات آپ سے کہہ دی تو پٹا۔ سچی بات میں نے وہاں بھی کہی تو مارا گیا اور سچی بات آپ سے کہی...میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا سہاگ تو میرے باپ سے بندھا ہوا تھا۔ بیاہی ہوئی عورت کا سہاگ اس کے شوہر سے، بن بیاہی عورت کا سہاگ اس کے باپ بھائی سے ہوا کرتا ہے۔ تو میرے والد کا تو انتقال ہوگیا تب یہ لپ اسٹک پاؤڈر... یہ جو آپ الٹرا ماڈرن بنی پھرتی ہیں تو کس بل بوتے پر بنی پھرتی ہیں۔ ایک چانٹا دیا کس کر۔ کہا، خبیث، تیری یہ مجال، ہمارے پیٹ سے نکلا۔ ہم نے دن کو رات کو ایک نہ دیکھ کر تجھے پالا پوسا اور ہمارے لپ اسٹک پاؤڈر پر اعتراض کرتا ہے۔

تب ہمارے سامنے دوسری مثال ہے کہ ماں کا نہیں ہے، مرد کا وجود ہے۔ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پسلی کو چاک کرکے ماں حوا پیدا کی گئیں۔ چنانچہ ایک روز حضور والا سو رہے تھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ان کے سینے کو ٹٹول رہا ہے۔ آنکھ

کھلی تو دیکھا کہ ان کی پسلیاں ٹٹول رہی تھیں ماں حوا بیٹھی ہوئی۔ کہا، ارے حوا یہ کیا کر رہی ہو۔ کہا، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ میں پسلی چاک کر کے آپ سے پیدا کی گئی ہوں لہٰذا انہیں گن رہی تھی، ٹٹول رہی تھی کہ کوئی اور پسلی چاک کر کے کوئی اور دوسری حوا تو نہیں پیدا کی گئی۔ آج کل آپ زیادہ زمین پر جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری حوا پیدا کی گئی ہے جسے آپ مجھ سے چھپا کر زمین پر رکھ آئے ہیں، اس سے آپ ملنے کے لیے آیا جایا کرتے ہیں۔ کہا، ارے حوا تم میری اول و آخر بیوی تو آپ نے دیکھا عورت کی فطرت ہے سوتیا ڈاہ۔ ہر چیز برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے شوہر کی محبت کو تقسیم ہوتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتی۔

اللہ اکبر۔ ہماری مائیں ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن ... پوری سورۂ تحریم: ''یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِی مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ'' (سورۂ تحریم: ۱۔ اے غیب بتانے والے (نبی) تم اپنے اوپر کیوں حرام کیے لیتے ہو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی اپنی بیبیوں کی مرضی چاہتے ہو...) آپ اسے اٹھا کر دیکھیں۔ اس کا شان نزول ہی سارے کا سارا اسی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ میرے رب جل جلالہ وعم نوالہ نے فرما دیا تھا: ''عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجاً خَيْراً مِّنكُنَّ مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قَانِتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَاراً'' (سورۂ تحریم: ۵)، ان کا رب قریب ہے اگر وہ تمہیں طلاق دے دیں کہ انہیں تم سے بہتر بیبیاں بدل دے اطاعت والیاں ایمان والیاں، ادب والیاں توبہ والیاں بندگی والیاں روزہ والیاں بیاہیاں اور کنواریاں) اے پیارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، قریب ہے آپ کا رب اگر آپ نے ان سب کو طلاق دے دی تو ان کے بدلے میں آپ کو ان سے بہتر ازواج مطہرات عطا فرمائے گا۔ وہ مسلمات ہوں گی، مومنات ہوں گی، قانتات ہوں گی، تائبات ہوں گی، عابدات ہوں گی، سائحات ہوں گی، ثیبت ہوں گی اور ابکار۔

آپ نے دیکھا اور ملاحظہ کیا تو دوسری مثال یہ ہے (کہ مرد کا وجود تو ہے

لیکن عورت کا وجود نہیں ہے۔ تو پیدا ہوئیں ہماری سب کی ماں، ماں حواء رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔)

تیسری مثال یہ ہے دنیا کے سامنے کہ مرد موجود نہیں ہے، عورت موجود ہے۔ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا موجود ہیں۔ تب عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن پیدائش کی تین صورتیں جو میں نے آپ کے سامنے ذکر کیں دنیا والوں نے ان کو ذرا اسے unnatural سمجھا۔ کہا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ مرد ہے، نہ عورت ہے آدم پیدا ہوئے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اور خالی آدم سے ماں حوا پیدا ہوگئیں اور خالی مریم سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوگئے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ ہماری sense میں یہ نہیں گھستا۔ ہماری کھوپڑی میں نہیں گھستا۔ لہٰذا انہوں نے اعتراض کر دیا ان تینوں پیدائشوں کے سلسلے پر۔ لیکن میرے آقا و مولیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین وبارک وسلم... تو کیونکہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلے میں یہودیوں نے معاذ اللہ الزام لگایا تھا حضرت مریم بتول کی عفت وعصمت پر اور یوسف نجار کا لڑکا بتایا تھا معاذ اللہ حضرت عیسیٰ کو علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ لہٰذا جب مریم بتول کی صفائی پیش کرنے کے لیے، ان کے دامن عفت وعصمت کا بیان فرمانے کے لیے قرآن میں سورۂ مریم نازل ہوئی لیکن میری آمنہ خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا، وہ والدہ ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عبداللہ والد ماجد ہیں میرے آقا و مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے۔ دونوں سے مل کر پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی عین فطرت کے مطابق سرکار کی پیدائش ہوئی ہے۔ بالکل natural پیدائش ہے۔ کسی کو انگلی اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں، کسی کو زبان کھولنے کا کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوا کہ کسی نے ان کی پیدائش کے سلسلے میں اعتراض کیا ہو اور ان کی ماں کے دامن عفت وعصمت پر کوئی دھبہ لگایا ہو۔ لہٰذا کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ ان پر کوئی سورت نازل کی جاتی۔ وہاں تو سوال پیدا ہو گیا تھا مریم کی عصمت بیان کرنا تھی لہٰذا سورۂ مریم نازل ہوئی۔ سورۂ آمنہ کے نازل ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا

ہوااس لیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فطرت کے مطابق پیدا ہوئے۔

تب یہاں وہ پادری دم دبا کر بھاگ گئے وہاں سے۔کوئی جواب نہیں تھا۔

میرے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں ؎

وہ کنواری پاک مریم وہ نفخت فیہ کا دم
ہے عجب نشان اعظم مگر آمنہ کا جایا، وہی سب سے افضل آیا

فرماتے ہیں ؎

ارے اے خدا کے بندو! کوئی میرے دل کو ڈھونڈو
مرے پاس تھا ابھی تو ابھی کیا ہوا خدایا نہ کوئی گیا نہ آیا

فرماتے ہیں، نہ کوئی گیا نہ آیا۔کیا بات؟ کتنا حسین ٹکڑا ہے؟ اگر کوئی آتا جاتا ہوتو یہ سوال ہو کہ کوئی چرالے گیا ہو۔کوئی آیا گیا ہوتو کوئی چرالے جائے، کوئی آیا بھی نہیں، کوئی گیا بھی نہیں تو چوری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔دل گیا کہاں آخر؟ فرماتے ہیں ؎

ہمیں اے رضا ترے دل کا پتا چلا بمشکل
درِ روضہ کے مقابل وہ ہمیں نظر تو آیا، یہ نہ پوچھ کیسا پایا

اللہ اکبر۔تو بات یہاں سے اٹھی تھی اور معاملہ یہاں سے چلا تھا کہ ہر رفعت اور بلندی کے لیے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کو بلند کرنے والا، اس کو رفع کرنے والا، اس میں کتنی طاقت ہے، اس کے بازوؤں میں کتنی طاقت ہے، اس کی قوت پھینک یعنی اس کی velocity اس کی قوت مار کتنی ہے۔اللہ اکبر۔میں نے جب ریوالور purchase کیا تو اس کی بیرل پر لکھا ہے تھری ٹن۔میں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ صاحب یہ لوہا زیادہ سے زیادہ آدھا کلو کا ہوگا۔یہ تھری ٹن اس پر کیسے لکھا ہوا ہے۔۲۷ من کا سنا ہے ایک ٹن ہوتا ہے۔میں تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں، آپ لوگ بتائیں ۲۷ من کا سنا ہے ایک ٹن ہوتا ہے۔ چلیے مان لیجئے، بیس کا ہی رکھ لیجئے تو بیس تیائیں ساٹھ۔ساٹھ من! اور یہ تو زیادہ سے زیادہ پانچ سوگرام ہوگا۔حد سے حد ایک کلو

ہوگا۔کہا، یہ مطلب نہیں، یہ اس ریوالور کا وزن نہیں ہے بلکہ اس کی گولی کی velocity، جو وہ دھکا مارتی ہے، وہ جو shock دیتی ہے، وہ جو جھٹکا لگاتی ہے وہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ کسی کے اوپر پانچ من کا وزن ڈال دیا جائے اس سے جو جھٹکا اور دھکا لگے گا وہ اس گولی سے لگتا ہے۔آپ نے دیکھا، آپ نے ملاحظہ کیا۔اللہ اکبر۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں اے محبوب! ہم نے تمہارے لیے تمہارے ذکر کو بلند کیا۔پھر پوچھ بیٹھے کہ ذرا ارشاد تو فرمائیں۔ہمیں تفصیل وتشریح تو بتادیں کہ آپ نے کیسے ہمارے ذکر کو بلند کیا؟ تب فرماتے ہیں: کوئی ایسی جگہ نہیں ہے...اللہ اکبر...نماز ہے تو ان کا ذکر ہورہا ہے، روزہ ہے تو ان کا ذکر ہورہا ہے، دنیا میں ہم آئے ہیں تو ہمارے کانوں میں اذان دی جارہی ہے۔مسلمانوں کے یہاں قاعدہ...اللہ اکبر... ہندوستان کے رہنے والے ہوں یا پاکستان کے رہنے والے ہوں یا ایران وتوران کے (رہنے والے ہوں یا اور کہیں کے بھی رہنے اور بسنے والے ہوں، بچہ پیدا ہوتا ہے، حکم ہے، حکم شرعی ہے، حکم شریعت ہے کہ نہلانے دھلانے کے بعد کوئی آواز اس کے کان میں نہ جائے بلکہ پہلے اذان اس کے کان میں ہونا چاہئے۔اللہ کا ذکر اس کے کان میں ہونا چاہیے۔اذان مکمل نہیں ہوتی اگر اشھدان الا الٰہ لا اللہ کے ساتھ اشھدان محمداً رسول اللہ نہ کہا جائے، صلی اللہ علیہ وسلم۔بہت اچھا۔یہی بچہ بچپن کی منزلیں طے کر کے ادھیڑ ہوا، ادھیڑ سے بوڑھا ہوا۔پھر ایک وقت آیا کہ اس کی موت واقع ہوئی۔اب یہی بچہ قبر میں اتارا جارہا ہے۔پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں بسم اللہ وعلیٰ ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول کا نام لیا جارہا ہے، اذان ہورہی ہے تو محمد رسول اللہ موجود ہیں، کلمہ پڑھا جارہا ہے تو محمد رسول اللہ موجود ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔اذان امت کے لیے ان کی ایک ادا ہے۔نماز بھی ایک ادا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔انہی کی ایک ادا کا نام ہے جسے روزہ کہتے ہیں، ان ہی کی ایک ادا کا نام ہے جسے حج کہتے ہیں، ان ہی کی ایک ادا کا نام ہے جسے زکوٰۃ کہتے ہیں، ان کی کوئی ادا فرض کر دی گئی امت کے اوپر۔

ان کی کوئی ادا امت کے حق میں واجب کر دی گئی۔ ان کی کوئی ادا امت کے حق میں سنت بنا دی گئی۔ اللہ اکبر۔

کیا سمجھا ہے ابھی کسی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اور جس نے ان کی قدر نہیں پہچانی واللہ، واللہ اس میں کوئی دو رائے نہیں دین والوں کے لیے کہ اس نے ان کے رب کی عظمت وقدرت کو نہیں پہچانا، جل جلالہ وعم نوالہ۔ اس لیے کہ ساری عظمتیں اور ساری رفعتیں اور ساری بلندیاں ان کو دینے والا تو ان کا رب ہے جل جلالہ وعم نوالہ۔

دیکھو میاں، جہاں لین دین کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ دینا اور کچھ روک رکھنا۔ یہ جب ہوتا ہے کہ جس کو دیا جائے، دینے والے کو اس سے بھی زیادہ کوئی محبوب اس کے یہاں موجود ہو کہ اس کے لیے بچا کر رکھ چھوڑا ہو۔ یا دینے والے کے خزانے محدود ہوں مثلاً ہمارے اور آپ کے خزانے محدود ہیں۔ بھائی! تو سوچنا پڑتا ہے کہ ایک دم سے خرچ کر دیا تو پھر کہاں سے آئے گا۔ لہٰذا کچھ دیا اور کچھ باقی رکھ لیا۔ یا یہ کہ لینے والے میں صلاحیت نہ ہو۔ اس کا دامن تنگ ہو۔ اللہ اکبر۔ دینے والا تو زیادہ دینا چاہتا ہے لیکن لینے والے کے پاس کپڑا ہی نہیں تو لے گا کاہے میں؟ لیکن یہاں تینوں صورتیں نہیں ہیں۔ دینے والا اللہ ہے جل جلالہ وعم نوالہ جس کے خزانے لامحدود ہیں۔ اس کی ذات لامحدود ہے، اس کی ساری صفات لامحدود ہیں اور ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں ہے جس کے لیے بچا کر رکھے۔ بولو بھائی آ گئی بات سمجھ میں۔ اور پھر ان کے قلب کی وسعت کا کیا کہنا۔ ان کے ظرف کی وسعت کا کیا کہنا کہ اپنے رب کو... موسیٰ علیہ السلام دنیا کے پہاڑ پر ایک چھوٹی سی تجلی دیکھتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور یہ۔ اللہ اکبر۔ عاشق وراء الوراء اپنے عالم سے ماوراء جہاں ہماری عقلیں نہیں پہنچ سکتیں ؎

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں
روح قدس سے پوچھئے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں

تو عرش سے وراء الوراء جا کر اپنے رب کو معراج کی رات میں ان چشمانِ سر سے، ہم اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ آنکھوں سے، پیشانی کی آنکھوں سے، ماتھے کی آنکھوں سے، ایک مرتبہ نہیں بلکہ کرات ومرات دیکھتے ہیں اپنے پیارے رب جل جلالہ وعم نوالہ کو۔ اور حضرت شیخ محقق پکار اٹھتے ہیں ؎

(اس جگہ ٹیپ ٹھیک سے نہیں سنا گیا)

تب فرمایا: و رفعنا لك ذکرك۔ اے پیارے ہم نے تمہارے لیے تمہارے ذکر کو بلند کر دیا۔ اب ہم چند اشعار نعت شریف کے پڑھیں اور اس کے بعد مضمون کو ختم کریں۔ فرماتے ہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی ؎

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا — نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
اغنیا پلتے ہیں در سے وہ ہے باڑا تیرا — اصفیا چلتے ہیں سر سے وہ ہے رستا تیرا
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب — یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا
و رفعنا لك ذکرك کا ہے سایہ تجھ پر — بول بالا ہے ترا ذکر ہے اونچا تیرا
مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے دشمن تیرے — نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا
عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے — یہ گھٹائیں، اسے منظور بڑھانا تیرا
فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں — خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا
تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اس کو شفیع — جو مرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی ہجرت

تاج الشریعہ علامہ اختر رضا خاں
قادری ازہری (بریلی شریف)

جب حضور سرور عالم نبی مکرم ﷺ اہل مدینہ سے اپنی نصرت وحمایت پر بیعت تمام فرما چکے اور حضور علیہ السلام کے مکی اصحاب کو مکہ میں رہنا اور مشرکین کی ایذائے بیکراں کو سہنا دشوار ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی زبان فیض ترجمان پر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی رخصت عطا فرمائی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں: جب مشرکین مکہ کی اذیت مسلمانوں کے لیے بڑھی تو مسلمان نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور شاکی ہوکر اذن ہجرت کے طالب ہوئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''مجھے تمہاری ہجرت گاہ دکھائی گئی وہ نرم سرزمین کھجور کے درختوں والی دو سنگستانوں کے درمیان واقع ہے۔''

پھر چند دن توقف فرمانے کے بعد اپنے صحابہ میں خوش وخرم رونق افروز ہوئے اور فرمایا: ''مجھے تمہاری جائے ہجرت بتادی گئی، سنو وہ یثرب ہے (''یثرب'' مدینہ طیبہ کا بعثت نبوی سے پہلے کا نام ہے جس کا معنی ہے ''بیماریوں کی جگہ'' حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے ''طیبہ'' کا نام عطا فرمایا اور یثرب کہنے سے ممانعت فرمائی۔

لہٰذا اب مدینہ منورہ کو یثرب کہنا جائز نہیں،۱۲منہ) جو مکہ سے نکلنا چاہے نکل جائے۔''

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد لوگ مکہ سے ٹکڑیوں میں خفیہ طور پر نکلے اور مدینہ کو چل پڑے مگر سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلانیہ ہجرت کی اور کفار مکہ سے کوئی انہیں نہ روک سکا، نہ انہیں ایذا دینے کی کسی کو مجال ہوئی۔ آپ کے ساتھ آپ کے بھائی زید بن الخطاب نے بھی ہجرت فرمائی: مگر زرقانی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے حضرت زہیر کی بابت فرمایا: انہوں نے دو نیکیوں میں مجھ سے سبقت کی، مجھ سے پہلے ہجرت کی اور مجھ سے پہلے شہید ہوئے۔ (ذکر فی شرح الموطا۱۲منہ)

اب مکہ میں حضور علیہ السلام کے ساتھ ابوبکر صدیق اور علی مرتضیٰ ہی رہ گئے پھر جب قریش نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مدینہ والوں کی حمایت مل گئی اور ساتھی مل گئے جن کے شہر کا حضور قصد فرمارہے ہیں اور حضور علیہ السلام کے اصحاب مہاجرین مکہ سے نکل کر ان سے جاملتے ہیں تو انہیں حضور علیہ السلام کے مکہ کے باہر جانے سے اندیشہ ہوا۔ قریش ''دارالندوہ'' میں جو قصی بن کلاب کا گھر تھا مشورہ کو اکھٹے ہوئے اور قریش ہر کام اسی دارالندوہ میں کرتے اور اسی میں مشورہ کرتے تھے اور مشورہ کو بیٹھنے والوں نے دوسروں کو اس گھر میں قدم نہ رکھنے دیا کہ کہیں کوئی ہاشمی ''دارالندوہ'' میں نہ آجائے کہ ان کی سازش سے واقف ہو۔

یہ لوگ بہ قول ابن درید پندرہ تھے اور ابن دحیہ کے بقول سو تھے اور جب یہ لوگ مشورہ کو بیٹھ چکے تو شیطان ان میں بڑے بوڑھے نجدی کے بھیس میں نمودار ہوا۔ ہاتھ میں ٹیڑھی لاٹھی جس کے بل جھک کے کھڑا ہوا۔ اونی جبہ پہنے سر پہ ہری ٹوپی، سبز چادر اوڑھے دارالندوہ کے دروازہ پر کھڑا ہوا۔ لوگوں نے جب اسے دیکھا تو بولے، آپ کون بزرگ ہیں؟ وہ بولا نجد کے ایک بوڑھے نے تمہاری بات جس کے لیے تم جمع ہو، سنی تو تمہارے ساتھ تمہاری بات سننے کو حاضر ہوگیا اور توقع ہے کہ تم اس کی رائے اور خلوص سے محروم نہ رہوگے اور اگر میرے ساتھ بیٹھنا ناپسند کرو تو تم لوگوں

میں نہ بیٹھوں؟ قریش باہم ایک دوسرے سے بولے: یہ آدمی نجد کا ہے، مکہ کا نہیں تو اس کی حاضری تمہارا کچھ نہ بگاڑے گی۔

اب اپنی بات کرنے لگے تو قریش باہم بولے: اس شخص یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو معاملہ ہوا وہ ہوا اور ہم خدا کی قسم اس کے پیروکاروں کی معیت میں اس کے حملہ سے بے خوف نہیں تو ان کے بارے میں کوئی رائے پختہ کرو۔ ابوالبختری ابن ہشام (اور ایک روایت میں ہے کہ ہشام بن عمرو) بولا میری رائے یہ ہے کہ انہیں ایک گھر میں بند کر دو اور خوب کس کر باندھو اور گھر کو ہر چہار جانب سے بند کر دو بس ایک روشندان کھلا رکھو جس سے کھانا پانی ڈالتے رہو اور ان کے موت کا انتظار کرو تو یہ اپنے پیش رو شعراء زہیر و نابغہ کی طرح معاذ اللہ ہلاک ہو جائیں گے۔

اس پر وہ دشمن خدا شیخ نجدی چیخا اور بولا: یہ تمہاری بہت بری رائے ہے۔ خدا کی قسم اگر تم نے انہیں مقید کر دیا تو ان کی خبر ان کے اصحاب کو ہو جائے گی۔ وہ حملہ کر کے انھیں تم سے چھڑا لیں گے۔ قریش بولے بڈھے نے سچ کہا اور ہشام (اور ایک روایت میں ہے کہ) ابوالبختری نے کہا کہ میری رائے ہے کہ انہیں اونٹ پر سوار کرو اور اپنے شہر سے نکال دو تو ان کے کام سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا اور تم چین سے ہو جاؤ گے تو نجدی بڈھا بولا: خدا کی قسم یہ تمہارے نفع کی بات نہیں۔ کیا تم ان کی بات کے حسن اور بولی کی مٹھاس اور لوگوں کے دلوں کو اپنے کلام کے ذریعہ قابو میں کر لینے سے بے خبر ہو۔ خدا کی قسم اگر تم نے ایسا کیا تو اس سے بے غم نہ ہو گے کہ وہ عرب کے کسی قبیلہ پر اپنی باتوں سے اثر انداز ہوا اور وہ اس سے بیعت کر لیں پھر وہ انہیں لے کر چلا آئے اور وہ تمہیں روند ڈالیں۔

بولے بڈھا خدا کی قسم سچ بولا تو ابوجہل بولا میری ایک رائے ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم اب تک اس کو پہنچے ہو۔ بولے وہ رائے کیا ہے؟

ابوالحکم [یہ ابوجہل کی کنیت تھی جسے بدل کر حضور علیہ السلام نے ابوجہل یعنی جاہلوں کا باپ فرما دیا ۱۲ منہ] وہ بولا میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلہ سے تندرست جو

ان صبر آزما نسب وفضیلت والا لیں پھر ہر جوان کو شمشیر آبدار دیدیں پھر وہ سب اس کی جانب بڑھیں۔ وہ سب ایک ہو کر اس پر وار کریں اور اسے قتل کر دیں تو ہم اس سے نجات پا جائیں اس لیے کہ وہ جوان جب یہ کام کر گزریں گے تو ان کا خون قبائل میں پھیل جائے گا۔ ہاشمی سب سے جنگ نہ کر سکیں گے اور ہم سے دیت پر راضی ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ملعون بولا: بات تو اس جوان نے کہی اور تم میں اسی کی رائے اچھی ہے اور تمہارے لیے اس سے بہتر میں نہیں جانتا۔ سب ابوجہل کی رائے پر متفق دلوں میں حضور علیہ السلام کے قتل کا ارادہ پختہ کئے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ سید ناجبریل علی نبینا وعلیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان باتوں سے خبر دار کیا اور عرض کی: حضور آج رات اپنے بستر پر استراحت نہ فرمائیں اور اب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مکہ سے باہر تشریف لے جانے کا اذن دے دیا۔ حضور علیہ السلام نے سیدنا علی کو حکم فرمایا کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بستر اقدس پر سو جائیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ السلام کی خواب گاہ میں سوئے اور حضور علیہ السلام نے فرمایا: میری چادر اوڑھ لو، تمہیں ہرگز کوئی ناپسند یدہ بات نہ پہنچے گی۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کاشانۂ اقدس سے باہر آئے اور دست اقدس میں مٹھی بھر خاک لی اور کافروں کی آنکھوں کو حضور علیہ السلام کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا اور حضور علیہ السلام ان کے سروں پر خاک ڈالتے جاتے اور یہ آیتیں پڑھتے جاتے:

یٰسٓ o وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ o اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ o عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ o تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ o لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ o لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِھِمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ o اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ اَغْلٰلًا فَھِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ o وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ o (سورۂ یٰس پارہ ۲۲/۲۳، آیت ۱ تا ۹)

ان آیتوں کا سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے یوں ترجمہ فرمایا:

""حکمت والے قرآن کی قسم بیشک تم سیدھی راہ پر بھیجے گئے ہو، عزت والے مہربان کا اتارا ہوا تا کہ تم اس قوم کو ڈر سناؤ جس کے باپ دادا ڈرائے گئے، وہ بے خبر ہیں بے شک ان میں اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے تو وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق کر دیئے ہیں کہ وہ ٹھوڑیوں تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے دیوار بنادی اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور انہیں اوپر سے ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا'' (کنزالایمان)

یہ آیتیں کفار مکہ کی اس وقت کی حیرت و پریشانی، خشیت و بے سروسامانی باآں ساز وسامان ظاہری کا منظر دکھارہی ہیں اور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس موقعہ پر ان آیات مذکور تلاوت کرنے سے بعید نہیں کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ آیات اسی موقعہ اور انہیں کافروں کے سبب نازل ہوئیں اگرچہ عموم لفظ ہر کافر کو شامل:

فان العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب کما صرحوا قاطبة.

یہاں سے ظاہر ہوا کہ بزرگان دین سے جو نسبت رکھتے ہیں، وہ بطور تبرک ہے اور اس سے دفع بلا وحصول برکت ہوتا ہے۔ نیز یہاں سے یہ بھی واضح ہوا کہ دفع بلا کے لیے قرآن عظیم کی آیات کی تلاوت جائز ہے اور حضرت ابن ابی اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ''یس'' شریف کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''اگر ڈرنے والا یہ آیات پڑھے، بے خوف ہو اور اگر بھوکا پڑھے تو سیر ہو جائے''۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی ہجرت کی خبر دی اور انہیں حکم فرمایا کہ وہ مکہ میں حضور علیہ السلام کی ہجرت کے بعد ٹھہریں کہ لوگوں کی امانتیں جو حضور علیہ السلام کے پاس تھیں ادا کریں، حضور علیہ السلام کے پاس امانتیں آپ کی سچائی اور دیانتداری کی وجہ سے رکھی جاتی تھیں۔

مشرکین نے رات یوں کاٹی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بستر اقدس

پر سوئے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چوکسی کرتے رہے اور انہیں گمان یہ تھا کہ وہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اسی حال میں ان کے پاس کوئی شخص جو اُن کے ساتھ نہ تھا آن کر بولا: یہاں کیا انتظار کر رہے ہو؟ وہ بولے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی راہ دیکھتے ہیں، اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہیں نا امید کیا۔ خدا کی قسم وہ تو تمہارے سامنے سے گئے اور تم میں کسی کو نہ چھوڑا جس کے سر پر خاک نہ ڈالی ہو۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جس کو اس دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کنکری مل گئی، وہ جنگ بدر میں حالت کفر میں مارا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن عظیم کی اس آیت کریمہ میں ہے:

"وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ. (سورۂ انفعال پارہ۹/آیت۳۰)

میرے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے ان آیات کا ترجمہ یوں فرمایا:

''اور اے محبوب یاد کرو جب کافر تمہارے ساتھ مکر کرتے تھے کہ تمہیں بند کرلیں یا شہید کر دیں یا نکال دیں اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے بہتر'' (کنزالایمان)

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلا ناغہ صبح یا شام کو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لاتے تھے۔ جب وہ دن آیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہجرت کا اذن فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے پاس دوپہر کے وقت تشریف لائے ایسی ساعت میں جس میں تشریف آوری کی عادت نہ تھی۔ جب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا تو سوچا ضرور کوئی بات ہوئی ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وقت تشریف لائے ہیں۔ جب حضور علیہ السلام داخل ہوئے، حضرت ابوبکر حضور علیہ السلام کے لیے اپنے پلنگ سے اٹھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تشریف رکھی اور حضرت ابوبکر کے

پاس میرے اور میری بہن اسماء کے سوا کوئی نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے پاس سے ان کو نکال دو جو تمہارے پاس ہیں تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی اے اللہ کے نبی یہ تو میری بیٹیاں ہیں''

اور بخاری کی روایت میں ہے:

یہ حضور علیہ السلام کے اہل ہی تو ہیں اور ماجرا کیا ہے میرے ماں باپ حضور پر قربان (صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور علیہ السلام کو اسی کلمہ سے مخاطب فرماتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غایت درجہ تعظیم فرماتے تھے، ۱۲ منہ،) حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے مکہ سے باہر جانے اور ہجرت کرنے کا حکم دیا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی میں بھی ساتھ چلوں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ہاں'' (اذن ہجرت میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا یعنی اور یوں عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے سچی طرح داخل کر (مدینہ میں) اور سچی طرح باہر لے جا (مکہ سے) اور مجھے اپنی طرف سے مددگار غلبہ دے، ۱۲ منہ)

حاشیہ ''جمل ہجریہ'' میں ہے: ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تو حضور علیہ السلام میری ایک اونٹی لے لیں اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت سے چھ ماہ پہلے دو اونٹنیاں خریدی تھیں، انھیں چارہ دیتے رہے اس انتظار میں کہ ہجرت کی ساعت آئے تو ان دونوں پر سوار ہو کر مکہ سے باہر تشریف لے چلیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے بقیمت لینا منظور فرمایا اور چار درسو درہم پر اسے خرید لیا، یہ اونٹنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس رہی۔ اس کی موت حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں ہوئی۔

پھر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر سے ہر دو عازمان ہجرت سامان سفر لے کر شب جمعہ کو باہر تشریف لائے اور راتوں رات غار ثور پہنچے۔ اس میں باقی شب

گزاری اور ہفتہ کی شب اور اتوار کی شب اسی میں رہے اور دوشنبہ کی شب کو اس غار سے باہر آئے اور مدینہ میں دوشنبہ کے دن پہنچے۔ یوں ان کی مدت سفر آٹھ دن ہوئی اور قریش جب حضور علیہ السلام کی جستجو میں لگے تو مکہ کا ہر بلند و پست مقام چھان مارا اور ہر جانب میں لوگ حضور علیہ السلام کے پیچھے بھیج دیئے۔ جو ثور کی جانب گیا تھا، اس نے حضور علیہ السلام کا نشان قدم وہاں پایا تو وہ اسی پر چلتا رہا یہاں تک وہ نشان غار ثور تک ختم ہو گیا اور کفار کو حضور علیہ السلام کا مکہ کے باہر تشریف لے آنا بہت ناگوار ہوا، وہ اس سے بہت گھبرائے اور انہوں نے حضور علیہ السلام کے پھیر لانے والے کے لیے سو اونٹ کا انعام رکھا۔

حضور علیہ السلام جب غار میں جلوہ افروز ہوئے، اللہ نے اس پر ببول کا پیڑ اگا دیا جس نے لوگوں کی نظروں کو غار سے روک لیا اور اللہ تعالیٰ نے دو جنگلی کبوتر بھیجے جو وہاں پر آ کے ٹھہر گئے اور روایت میں آیا ہے کہ ان دونوں نے وہاں انڈے دیئے اور کہتے ہیں کہ حرم مکہ کے سب کبوتر ان ہی دو کبوتروں کی نسل ہیں اور مکڑی نے اللہ کے حکم سے غار کے بالائی حصہ پر جالا بن دیا اور قریش کے جوان اپنے ہتھیار لیے پہنچے اور ان میں سے کچھ وہاں غار میں دیکھنے لگے تو انہیں دو کبوتر ہی دکھائی دیئے۔ انہیں علم ہو گیا کہ کہ اس غار میں کوئی نہیں ہے اور کسی نے کہا اس غار میں گھس جاؤ تو امیہ بن خلف لعنۃ اللہ علیہ بولا: اس غار میں تمہارا کیا دھرا ہے؟ اس میں تو ایک مکڑی ہے جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کی ہے۔

بخاری و مسلم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ''میں نے غار سے مشرکین مکہ کے پیر دیکھے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! انہیں کا کوئی اگر اپنے پیروں کی طرف نظر کرے تو ہم کو ضرور دیکھ لے گا حضور علیہ السلام نے فرمایا! ابوبکر تم ان کے بابت کیا گمان کرتے ہو جس کا تیسرا اللہ ہے'' یعنی مطلب یہ کہ گھبراؤ مت اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔

ایک دوسری روایت میں یوں آیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''اے اللہ

ان کی آنکھ اندھی کردے تو ان کی آنکھیں غار میں داخل ہونے سے اندھی ہوگئیں''

امام علامہ بوصیری نے قصیدہ بردہ شریف کے ذیل کے اشعار میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وما حوی الغار من خیر و من کرم
و کل طرف من الکفار عنه عمی
فالصدق وفی الغار والصدیق لم یرما
وھم یقولون ما بالغار من ارم
ظنوا الحمام وظنوا العنبکوت علی
خیر البریة لم تنسج ولم تحم
وقایة الله اغنت عن مضاعفة
من الدروع وعن عال من الاطم

''یعنی غار ثور کیسی خیر و کرامت کو لیے ہوئے تھا اور کافروں کی ہر نظر ان سے اندھی تھی تو رسول صدق اور صدیق غار ہی میں رہے اور کافر یہ کہہ کر رہ گئے کہ غار میں کوئی نہیں، انہیں گمان ہوا کہ کبوتری حضور جیسے بہترین خلائق علیہ السلام پر نہ منڈلاتی، نہ مکڑی نے ان کی جلوہ گاہ پر جالا بنا۔ یہ اللہ کا بچاؤ تھا جس نے سپاہیوں کی کثرت اور بلند قلعوں سے بے نیاز رکھا''۔

عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی کمسنی کے باوجود رات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس قریش کی خبریں لاتے پھر پچھلی شب میں ان کے پاس سے چلے جاتے اور مکہ میں یوں صبح کرتے جیسے مکہ ہی میں رات گزارتے ہوں اور عامر بن فہیرہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام ان دونوں کے پاس ہر دن دودھ لاتے اور مدینہ طیبہ کا راستہ بتانے کے لیے دونوں حضرات نے عبداللہ بن ارقط کو مزدوری پہ رکھا (عبداللہ بن ارقط کا اسلام لانا معلوم نہ ہوا) اور دونوں نے اپنی اونٹنیاں اس کو دیں اور تین راتوں کے بعد غار ثور پر اسے ملنے

کا وعدہ فرمایا۔

عبداللہ بن ارقط وہاں ان کے پاس آیا اور دونوں حضرات غار سے باہر آئے اور چل دیئے اور عامر بن فہیرہ اور ان لوگوں نے سمندر کا راستہ لیا، ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ انھیں گرفتار کرنے کی غرض سے سراقہ بن مالک آگئے، حضور علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا کہ ان کو پکڑ لے تو ان کے گھوڑے کے دونوں پیر گھٹنوں تک زمین میں پھنس گئے حالانکہ زمین سخت تھی۔ سراقہ نے حضور علیہ السلام سے امان مانگی تو گھوڑا اس آفت سے چھوٹا۔ اب سراقہ حاضر خدمت ہوئے اور رخت سفر اور سامان پیش کیا جو قبول نہ ہوا، حضور علیہ السلام اور اصحاب نے سراقہ سے کہا: ہمارے معاملے کو مخفی رکھنا۔ اس کے بعد سراقہ وہاں سے لوٹے راستے میں جو بھی ملتا، اسے پھیر دیتے اور کہہ دیتے کہ میں نے تمام راستے چھان ڈالے مگر کسی کو نہ پایا۔

امام بوصیری علیہ الرحمہ نے قصیدہ ہمزیہ کے اشعار ذیل میں اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے :

و نحا المصطفیٰ المدینة و اشتاقت
الیه من مکة الانحاء
و تغنت بمدحه الجن حتی
اطرب الانس منسه ذاك الغناء
و اقتفی اثره سراقة فاستھوته
فی الارض صافن جرداء
ثم ناداه بعد ما سمیت الخسف
وقد ینجد الغریق السنداء

''یعنی مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو چلے اور مکہ کے اطراف مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشتاق ہوئے اور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت کے ترانے جنوں نے اس قدر گائے کہ اس سے انسان مست ہوگئے اور سراقہ رضی اللہ عنہ نے ان کا پیچھا کیا تو زمین میں ان کے تیز

رفتار گھوڑے نے انہیں پھنسا دیا پھر سراقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور کو پکارا، بعد اس کے
کہ گھوڑا زمین میں دھنسنے کے قریب تھا اور بے شک غریق کو پکارنا بچا لیتا ہے''۔

''مواھب اللدنیہ''میں ہے: حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما
فرماتی ہیں کہ: ہمارے پاس قریش کے کچھ لوگ آئے ان میں ابوجہل بھی تھا۔ اس نے
مجھ سے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں ہیں؟ میں بولی خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ
میرے باپ کہاں ہیں؟ بے شرم ابوجہل نے ہاتھ اٹھایا اور میرے چہرے پر طمانچہ مارا
جس سے میرا بندگر پڑا، جب یہ لوگ چلے گئے اور ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اللہ صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہاں ہیں تو ہمارے پاس جنوں میں سے ایک جن آیا جو ہمیں نظر نہ
آتا تھا، صرف آواز آتی تھی۔ وہ یہ اشعار پڑھتا تھا:

جزى الله رب الناس خير جزائه
رفيقين حلا خيمتي ام معبد
هما نزلا بالبر ثم ترحلا
فافلح من أمسى رفيق محمد
فيا لقصي مازوى الله عنكم
به من فعال لا تجازى و سودد
ليهن بني كعب مكان فتاتهم
و مقعد هما للمؤ منين بمرصد
سلوا أختكم عن شاتها و انا ئها
فا نكم ا ن تسأ لو ا لشاة تشهد
دعا ها بشاة حائل فتحلبت
له بصريح صرة ا لشا ة مزبد
فغادر هار هنا لديها لحالب
يردد ها في مصدر ثم مورد

''یعنی اللہ لوگوں کا رب بہترین جزاء دے، ان دو ساتھیوں کو جو ام معبد کے
خیمے میں مہمان ہوئے، وہ نیکی کے ساتھ نازل ہوئے، پھر وہاں سے رخصت ہوئے تو
کامیاب ہوا وہ جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دوست ہو گیا۔ قریش تم پر تعجب ہے اللہ
نے کیسا کرم بے نظیر اور کیسی شرافت تم سے دور کر دی (یعنی تمہارے شہر مکہ سے کرم
والے نبی بے مثل محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی) بنو کعب کو ان کا مرتبہ اور
اس کا مسلمانوں کے مکان کی نگہبانی کو بیٹھنا مبارک ہو، اپنی بہن سے اس کی بکری اور
اس کے برتن کا قصہ پوچھو۔ تم اگر اس بکری سے پوچھو گے تو وہ گواہی دے گی، حضور صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس عورت کی بکری جو حاملہ نہ تھی بلائی اور اسے دوہا تو خالص
جھاگ والے دودھ کی دھار اس کے تھن سے نکل پڑی، پھر اس بکری کو حضور صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم نے دوہنے والے کے لیے چھوڑ دیا جو اسے بار بار دوہتا رہا''۔

راہ ہجرت میں بہت سے عجیب و غریب واقعات ہوئے۔ ازاں جملہ یہ ہے
کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا گزر اپنے رفیقوں کے ساتھ ام معبد خزاعیہ کے خیمہ
سے ہوا اور ان کی عادت یہ تھی کہ مسافروں کو کھلاتی پلاتی تھیں اور اس سال قحط تھا۔
رفقائے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے گوشت یا دودھ مول لینے کا ارادہ کیا تو
انھیں کچھ نہ ملا۔

اچانک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر مبارک ایک بکری پر پڑی جسے
کمزوری لاغری نے بکریوں کے ساتھ چرنے کے قابل نہ رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے ام معبد سے پوچھا کیا اس بکری کے دودھ ہے؟ وہ بولیں، یہ بکری دودھ
دینے کے قابل کہاں! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اسے دوہنے کی مجھے
اجازت دیتی ہے، عرض کیا! جی ہاں تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بکری اور برتن
طلب فرمایا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے باندھا اور اس کے تھن پر بسم اللہ
پڑھ کر دست اقدس پھیرا تو وہ دودھاری ہو گئی۔ اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
اسے دوہا اور لوگوں کو دودھ پلایا اتنا کہ سیر ہو گئے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب

کے بعد خود نوش فرمایا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے دوبارہ دوہا اور چھوڑ دیا، یہ بکری صبح وشام ان لوگوں کو دودھ دیتی رہی یہاں تک کہ خلافت فاروقی میں مرگئی۔

زمخشری نے ’’ربیع الابرار‘‘ میں حضرت ہند بنت الجون سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی خالہ ام معبد کے خیمہ میں مہمان ہوئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پانی طلب فرمایا اور دست اقدس دھوئے۔ دہن اقدس میں پانی لے کر جھڑبیری کے پیڑ میں جو خیمہ کی جانب میں تھا، کلی فرمادی۔ صبح کو کیا دیکھتے ہیں وہ پیڑ بہت بڑا ہو گیا اور بڑا پھل لایا جس میں کسم کی رنگت اور عنبر کی خوشبو اور شہد کا ذائقہ تھا۔ جو بھوکا اسے کھاتا سیر ہو جاتا اور جو پیاسا کھاتا سیراب ہو جاتا اور جو مریض کھاتا اچھا ہو جاتا اور جو اونٹ یا بکری اس کے پتے کھاتے ان کا دودھ چھلکنے لگتا تو ہم نے اس کا نام ’’مبارکہ‘‘ یعنی برکت والا پیڑ رکھ دیا، دیہات سے لوگ اس سے شفا لینے کو آتے اور اس کے پھل پتے ہمراہ لے جاتے۔

پھر ہم نے ایک دن صبح کو دیکھا کہ اس کے پھل جھڑ گئے اور پتے چھوٹے ہو گئے۔ ہم گھبرا گئے تو ہمیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خبر وفات ہی نے چونکا دیا پھر تیس برس بعد اوپر سے نیچے تک ایک خاردار درخت ہو گیا اور اس کے پھل بالکل جھڑ گئے اور تازگی رخصت ہو گئی تو ہمیں امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی پھر اس میں پھل نہ آئے اور ہم اس کی پتیوں سے سودمند ہوتے تھے پھر ایک صبح کو کیا دیکھا کہ اس کے تنے سے گاڑھا خون جاری ہے اور پتیاں مرجھا گئی ہیں۔ ابھی ہم وحشت زدہ ورنجیدہ ہی تھے کہ ہمیں حضرت حسین بن علی کی شہادت کی خبر ملی اور وہ پیڑ اس واقعہ کے بعد خشک ہو کر ختم ہو گیا (مگر عجیب بات ہے کہ یہ قصہ بکری کے قصے کی طرح مشہور نہ ہوا تو ظاہر ہے جب زمخشری نے اس حدیث کو روایت کیا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی انہیں پر عائد ہوتی ہے، ۱۲/منہ،)

’’مواھب لدنیہ‘‘ میں ہے کہ: جب ام معبد کے شوہر ابو معبد نے دودھ دیکھا تو انھیں تعجب ہوا، بولے اے ام معبد! یہ کیا ہے اور یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ وہ

بولیں خدا کی قسم! اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک مبارک شخص ہمارے گھر آیا۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے، ان کے شوہر بولے ان کا حلیہ بیان کروائے ام معبد! وہ بولیں میں نے ایک حسین اور چمکدار چہرے والا، خوش اخلاق، نہ اس میں لاغری کا عیب، نہ کوتاہی سر کا نقص، جمیل وخوبرو، ان کی آنکھیں خوب سیاہ، سرگیں بھویں دراز و باریک ملی ہوئیں، پلکوں کے بال گھنے، گردن درازی و بلندی لیے ہوئے، ریش مبارک معتدل اور گھنی، لہجہ نرم مٹھاس لیے ہوئے، جب بولیں تو اپنے ہم نشینوں پر بلند ہوں، چہرہ نمایاں پر رونق و رعب دار ہو، کلام فیصل نہ قلیل کہ مخل ہو، نہ کثیر کہ اکتا دے، نہ دراز قد کہ دیکھنے والا انھیں برا جانے، نہ پستہ قد کہ کوئی ان سے نظر پھیر لے (بلکہ میانہ قد) لوگوں کے مخدوم، جاں نثاروں کے جم گھٹ والے، نہ تیور چڑھائے ہوئے، تو وہ بولے خدا کی قسم یہ تو قریش کے نبی تھے، اگر میں انہیں دیکھتا تو ان کے پیچھے چل دیتا۔

’’سیرۃ حلبی‘‘ میں ہے کہ ام معبد نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اسلام لائیں اور انھیں کی طرح ان کے شوہر اور ان کے بھائی نے بھی ہجرت کی اور اسلام لائے، ام معبد کا گھرانہ تاریخوں کا شمار حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ورود مسعود سے کرتا تھا۔

ادھر مدینہ کے نادیدہ عاشقان حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ کی آمد آمد کی خبر سن کر ایسے مشتاق دیدار ہوئے کہ ہر روز مدینہ سے کچھ دور نکل کر دو پہر تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی راہ دیکھتے تو ایک دن انتظار کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے کہ اچانک ایک یہودی جو کسی بلند جگہ پر چڑھا ہوا تھا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آتے دیکھ رہا تھا پکارا اٹھا، یہ تمہارا نصیب ہے اے بنی قیلہ (یعنی اوس و خزرج) تو فوراً وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے استقبال کو ہتھیار لیے نکل پڑے [مذاہب لدنیہ]

حضور علیہ السلام نے مقام قباء میں نزول فرمایا۔ اس دن دوشنبہ تھا ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ اور ایک قول پر ۱۲/ویں تاریخ تھی، قباء میں حضرت علی اور ان کے

رفقاء ضعفائے مسلمین حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے آ ملے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت نبویہ کے بعد مکہ میں تین دن ہی ٹھہرے تھے۔

پھر حضور ﷺ نے اسلامی ماہ وسال کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا اس کے بعد ہجرت سے تاریخ لکھی گئی اس سے پہلے ''عام فیل'' سے تاریخ لگاتے تھے۔[مذاہب لدنیہ]۔

حضور ﷺ قباء میں بائیس دن ٹھہرے اور مسجد قباء تعمیر فرمائی پھر جمعہ کو دن چڑھے سرور دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قباء سے روانہ ہوئے۔ محلّہ بنی سالم بن عوف میں جمعہ کا وقت ہوگیا۔ وہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمراہ مسلمانوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی۔ ان کی تعداد سو تھی اور نماز وادی رانوناء کے بطن میں پڑھی گئی۔

پھر حضور علیہ السلام ناقہ پر سوار ہوکر چلے۔ آپ جس گھر سے گزرتے اس کے لوگ درخواست کرتے کہ حضور ہم میں نزول فرماتے، آپ فرماتے اس کا راستہ چھوڑ دو کہ یہ ناقہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ اونٹنی چلتے چلتے مسجد نبوی شریف کے دروازہ کی جگہ پر بیٹھ گئی پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو لیے اٹھی اور ابوایوب انصاری کے دروازہ پر جا بیٹھی پھر اٹھ کر پہلی جگہ بیٹھ کر آواز نکالی گویا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اترنے کو عرض کرتی ہو۔ حضور اس سے اٹھے اور زمین پر تشریف لائے اور فرمایا ان شاء اللہ یہی اپنی منزل ہے اور مسلمانوں کی فرط وخوشی کا کیا عالم تھا اور مدینہ میں کیسی رونق تھی، یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھئے۔ وہ فرماتے ہیں: جب وہ دن آیا جس دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے اور مدینہ کی ہر شئے جگمگا اٹھی اور آپ کی آمد پر کمسن لڑکیاں چھتوں پر چڑھ گئیں اور یہ ترانہ گاتی تھیں:

طلع البدر علینا ☆ من ثنیات الوداع

ثنیہ الوداع سے ہمارے اوپر چاند طلوع ہوا

وجب الشکر علینا ☆ مادعا للہ داع

ہم پر شکر خدا واجب ہے جب تک اللہ کی عبادت ہو

ایہا المبعوث فینا ☆ جیت بالامر المطلاع

اے وہ نبی جو ہم میں بھیجے گئے، آپ وہ فرمان لائے جس کی اطاعت لازم ہے

انھی حضرت انس سے مروی کہ جب حضور علیہ السلام کی اونٹنی ابوایوب کے دروازہ پر بیٹھی بنونجار کی ننھی سی بچیاں یہ گاتی ہوئی باہر آئیں۔

نحن جوار من بنی النجار

ہم بنو نجار کی لڑکیاں ہیں

یا حبذا محمد ﷺ من جار

محمد ﷺ کیا ہی بہترین ہمسائے ہیں

اونٹنی کی جائے نزول مدینہ کے دو یتیموں کی زمین تھی جہاں وہ کھجوریں سکھاتے تھے اور وہ اسعد بن زراہ کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جگہ کا سودا ان دونوں سے کیا۔ وہ بولے ہم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہبہ کرتے ہیں تو حضور علیہ السلام نے اسے بہ طور ہبہ قبول نہ فرمایا اور ان دونوں سے دس دینار میں اس زمین کو خرید لیا اور قیمت حضور علیہ السلام نے ابوبکر کے مال سے ادا کی پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس میں اپنی مسجد شریف بنائی۔ مسجد کی چھت شاخہائے کھجور کی رکھی اور ستون پیڑوں کے تنوں کے رکھے اور مسجد کی بلندی قد آدم رکھی اور بیت المقدس کی طرف قبلہ مسجد رکھا پھر جب کعبہ قبلہ ہوا تو حضور علیہ السلام نے قبلۂ مسجد کو کعبہ کی طرف پھیر دیا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لوگوں کی کثرت کے سبب اس میں توسیع فرمادی۔

پھر سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مسجد میں لے کر اسے بڑھایا اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت

عباس سے وہ گھر مول مانگا تھا۔سیدنا عباس نے اسے مسلمانوں کے لیے مفت دیدیا پھر سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کو بڑھایا اور اسے پتھروں سے تعمیر فرمایا اور اس کے ستون پتھر کے رکھے اور چھت کو ساج (ساگون کی لکڑی) سے بنایا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جگہ میں جوان یتیموں سے خریدی تھی، اپنی دونوں بیویوں حضرت عائشہ وحضرت سودہ کے لیے حجرے بھی تعمیر فرمائے اور باقی ازواج کے حجرے حسب ضرورت بعد میں تعمیر ہوئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں سات ماہ قیام فرمایا۔اس مدت میں دونوں حجروں اور مسجد کی تعمیر انجام پا گئی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ صحابہ نے فرمایا: ہم لوگ ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما دو دو اینٹیں اٹھاتے تو حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمار علیہ الرحمہ کو دیکھا اور اپنے دست اقدس سے عمار رضی اللہ عنہ کے بدن سے مٹی جھاڑنے لگے اور یہ فرماتے جاتے افسوس کہ عمار کو باغی جماعت قتل کرے گی۔ یہ انہیں جنت کی طرف بلائیں گے اور وہ لوگ انہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہوں گے اور عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہتے جاتے کہ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں فتنوں سے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ پتھر کی چٹانیں شانۂ اقدس پر اٹھاتے اور یہ شعر پڑھتے۔ ع

اللھم لا خیر الاخیر الآخرہ
اے اللہ خیر نہیں مگر آخرت کی خیر
فانصر الانصار والمھاجرہ
تو انصار و مہاجرین کی مدد فرما

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس پیشن گوئی کا مصداق ''جنگ صفین'' میں ظاہر ہوا جب سیدنا عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔یہ معرکہ حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہما کے مابین ہوا، حدیث مذکور سے حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ہمنواؤں کا برحق اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ساتھی صحابہ کا خاطی ہونا ظاہر ہے مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء صحابہ کرام کی خطا اجتہادی تھی اور مجتہد اپنی خطا پر بھی اجر کا مستحق ہے، اس پر طعن و تشنیع جائز نہیں۔یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے اور بکثرت آیات و آحادیث اس عقیدے کی مؤید ہیں۔

روایت آئی کہ مدینہ کی آب و ہوا ناساز گار تھی اور بخار کی وباء کے لیے یہ شہر مشہور تھا، تو جب کوئی اجنبی مدینہ میں آتا، اس سے کہا جاتا اگر بخار سے عافیت چاہو تو گدھے کی سی آواز نکالو، وہ گدھے کی آواز نکالتا تو بخار سے محفوظ رہتا۔مہاجرین کو بھی ہوائے مدینہ راس نہ آئی اور بہت سے بیمار ہوئے اور کمزور پڑ گئے۔ان میں حضرت ابوبکر و بلال و عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی تھے۔ان کا ضعف اس درجہ بڑھا کہ مسلمان کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے قابل نہ رہے تو مشرکین ومنافقین خوش ہوتے اور یہ کہتے کہ ''یثرب'' کے بخار نے انھیں کمزور کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ: جب یہ عالم ہوا تو میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور آئی اور حضور کو ساری حالت بتائی۔حضور علیہ السلام نے دعا فرمائی:

اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ کو اتنا ہی محبوب کر دے جتنا ہمیں مکہ محبوب ہے بلکہ اس سے زیادہ محبوب فرما دے اور اس کو صحت بخش فرما دے اور اس کے پیمانے میں ہمارے لیے برکت فرما اور اس کے بخار کو منتقل فرما اور اسے مقام ''جعفہ'' میں رکھ دے''۔

''امام قسطلانی'' نے فرمایا: جعفہ اس وقت یہود کا مسکن تھا اور اب مصریوں کا میقات ہے جہاں احرام باندھتے ہیں، حضور علیہ السلام کی اس دعا سے کافروں کے لیے بیماری اور ہلاکت کی دعاء کا جواز ثابت ہوا اور یہ جو مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے کافروں کے لیے بھی بددعا نہ فرمائی، غلط اور بیدینوں، گمراہوں کا فریب ہے۔اس دعا سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عظیم معجزہ ظاہر ہوا۔

چنانچہ مدینہ کی ہوا صحت بخش ہوگئی اور مدینہ طیبہ مسلمانوں کو ہر زمانے میں اپنے وطن سے زیادہ محبوب ہوگیا۔اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت اور اپنے رسول علیہ السلام کے شہر میں موت نصیب فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں، چنانچہ فیروز نصرانی کے ہاتھوں آپ مدینہ میں شہید ہوئے اور جحفہ اس دن سے ایسا ہوگیا کہ کوئی اس کا پانی پی لے تو بخار آجائے اور اس کی فضا سے چڑیا گزرے تو بخار میں مبتلا ہوکر گر پڑے۔

پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی آمد کے ۸؍ ماہ بعد مہاجرین وانصار کے عقد مواخات فرمایا جس کے سبب نصرت حق اور ہمدردی ومساوات میں اور ایک دوسرے سے میراث پانے کے حق میں مہاجرین وانصار آپس میں بھائی بھائی قرار پائے۔یہی وجہ تھی کہ مہاجرین کرام سے انصار کرام نے غایت درجہ ہمدردی و نہایت درجہ مساوات کا سلوک کیا یہاں تک کہ حضرت سعد بن الربیع انصاری نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنے نصف مال کی پیشکش کی اور ان کی دو بیویاں تھیں تو انہوں نے اپنے مہاجر بھائی عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ آپ ان میں سے کوئی اختیار کرلیں کہ میں اسے طلاق دیدوں اور آپ اس سے شادی کرلیں۔

زرقانی نے کعب، ابوداؤد وترمذی نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ ہم نے اپنا یہ حال دیکھا کہ مسلمان آدمی اپنے دینار کا اپنے مہاجر بھائی سے زیادہ حقدار نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس عقد مبارک کو اس درجہ مؤید فرمایا کہ مہاجرین وانصار کو ایک دوسرے کے قرابت داروں کے ہوتے ہوئے وارث ٹھہرایا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (سورۂ انفال پارہ ۱۰؍ آیت ۷۲)

یعنی بیشک جو ایمان لائے اور اللہ کے لیے گھر بار چھوڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے لڑے اور وہ جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔“ (کنزالایمان)

یہ حکم توارث جاری رہا، یہاں تک کہ جنگ بدر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے اس آیت کریمہ: ”وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. (سورۂ انفال پارہ ۱۰؍ آیت ۷۵) یعنی اور رشتہ والے ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ کی کتاب میں بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے۔“ سے منسوخ فرمادیا۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہیں وصال فرمایا، اس میں کون سی حکمت الٰہی پوشیدہ ہے؟ اس کا جواب علامہ قسطلانی نے ”مواھب لدنیہ“ میں یوں تحریر فرمایا:

حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہ ہوا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے امکنہ مشرف ہوں، نہ کہ حضور علیہ السلام ان سے مشرف ہوں تو اگر حضور علیہ السلام اپنی حیات ظاہری میں مکہ میں رہتے تو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ حضور علیہ السلام کو مکہ سے شرف ملا کہ شرف مکہ تو ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کے سبب ثابت ہو ہی چکا تھا، منشاء ایزدی ہوا کہ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شرف ظاہر فرمائے انہیں حکم دیا کہ مدینہ کی طرف ہجرت فرمائیں“۔

اسی لیے شام کی مقدس زمین کی طرف ہجرت واقع نہ ہوئی حالانکہ وہ زمین حشر ونشر کی اور اکثر انبیاء کرام کی جلوہ گاہ ہے کہ یہاں بھی وہم ہوتا تو جب حضور علیہ السلام نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مدینہ کو حضور علیہ السلام سے شرف ملا، یہاں تک کہ

اس امر پر اجماع واقع ہوا کہ تمام مواضع میں افضل وہ قطعہ زمین ہے جہاں حضور علیہ السلام کا جسد اطہر ہے''۔

زرقانی نے مزید یہ فرمایا کہ

وہ جگہ کعبہ سے بھی افضل ہے بلکہ عرش سے بھی افضل ہے اور علامہ فاکہانی نے تمام آسمانوں پر اس کی فضلیت کی صراحت کی ہے اور برماوی نے کہا: حق یہ ہے کہ اجساد انبیاء اور ان کی ارواح کی جگہ زمین وآسمان اور جو کچھ بھی اس کے علاوہ ہے، سب سے افضل واشرف ہے۔''

جب مدینہ منورہ کی یہ خصوصیت ہے تو اس کے لحاظ سے مدینہ منورہ کو مکہ معظّمہ پر فضیلت ثابت ہوئی۔ (واللہ اعلم)

طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے اخلاق کریمانہ

علامہ محمد عبدالمبین نعمانی

دارالعلوم قادریہ، چریاکوٹ، مئو

اللہ تعالی نے انسانوں کو ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے خوبیوں کا مالک بنایا ہے لیکن خوبیاں یکساں نہیں۔ جس طرح اس نے صورتوں میں اختلاف رکھا ہے یوں ہی سیرتوں میں بھی سب کو متفاوت بنایا۔ اللہ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ظاہری و باطنی ساری خوبیوں سے نوازا۔ حسن ظاہر میں سب سے بلند وبالا بنایا، حسن باطن سے بھی آراستہ فرمایا، اور اس میں بھی سب سے افضل بنایا جیسا کہ ارشاد ہے

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ (القلم: ۶۸/۳)

بے شک تمہاری خو، بو بڑی شان کی ہے (کنز الایمان)

امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انسان کا کمال علم اور عمل دونوں طرح سے ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کمالات کو عظیم فرمایا، علمی کمال کے لیے فرمایا۔

عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ (النساء: ۴/۱۱۲)

اور تمہیں سکھادیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا افضل ہے۔ (کنز الایمان)

اور عملی کمال کو یوں ظاہر فرمایا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ (القلم: ۶۸/۳)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم بھی عظیم

اور خلق بھی عظیم، اور جسے رب عز و جل عظیم فرما دے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔
تمام انبیائے سابقین علیہم الصلاۃ والسلام جس قدر محاسن کے حامل تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کے مالک تھے۔ ایک نکتہ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ ''علی'' استعلا کے لیے آتا ہے گویا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خلقِ عظیم پر مستعلی (یعنی غالب) تھے اور خلق عظیم کے ساتھ آپ کی نسبت ایسی تھی جیسے غلام کی نسبت آقا کے ساتھ یا مامور کی نسبت امیر کی طرف، یعنی جس طرح غلام آقا کے تابع ہوتا ہے ویسے ہی اخلاق وفضائل آپ کے تابع تھے۔
(تفسیر کبیر امام رازی ج۸/۱۸۵-۱۸۶ دار الفکر بیروت)

لکل نبی فی الانام فضیلة　　　و جملتها مجموعة لمحمد

گویا مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا احسن وخوبی کی حامل ہے۔ آپ نے جن خصائل کو اختیار فرما لیا، وہی حمیدہ وپسندیدہ ہو گئے یعنی آپ کی ذات معیار حسن ہے۔

آپ کے خلق عظیم کے بارے میں حضرت عامر کے پوتے سعد بن ہشام نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا۔ مجھے حضور کے خلق کے بارے میں بتائیے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے-؟- میں نے عرض کیا کیوں نہیں-؟-فرمایا: رسول اللہ صلی تعالیٰ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ (صحیح مسلم حدیث ۱۶۱۳۵ کتاب صلوٰۃ المسافرین)
علامہ راغب اصفہانی خلق کی تشریح میں فرماتے ہیں:
خَلق خاص ہے ظاہری بناوٹ اور شکل وصورت کے ساتھ جو آنکھ سے دیکھی جا سکے اور خُلق خاص ہے باطنی قوت اور ان خصائل وعادات کے ساتھ جس میں باطنی آنکھ یعنی بصیرت سے جانا جا سکے۔ (المفردات للراغب الاصفہانی ص۱۶۴، دار المعرفۃ بیروت)
علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں:

خُلق انسانی طبیعت اور باطنی صورت اور اس کے اوصاف کو کہتے ہیں جو اس سے مختص ہیں جیسا کہ خَلق ظاہری اوصاف ومعانی سے خاص ہے۔ (نہایہ ج۲ ص۷۰)
علامہ طاہر پٹنی اور علامہ ابن منظور نے بھی یہی معنی بیان کیے ہیں اور یہ دونوں ہی لغت کے امام مانے جاتے ہیں۔
چوں کہ اخلاق کا تعلق محبت اور جبلت سے ہے تو جو اخلاق فاضلہ سے مرصع ہوتا ہے اس کی طبیعت ہی حسن خلق بن جاتی ہے۔ تکلفاً اگر حسن سلوک کیا جائے تو یہ بظاہر اگرچہ اخلاق کہا جا سکتا ہے مگر حقیقۃً اخلاق نہیں، اسی لیے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان قرآن پاک یہ بیان کرتا ہے
قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْراً وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (ص:۳۸/۸۶)
ترجمہ! تم فرماؤ میں اس قرآن پر تم سے کچھ اجر نہیں مانگتا اور میں بناوٹ والوں میں نہیں۔
صاحب تفسیر روح البیان علامہ اسمٰعیل حقی فرماتے ہیں:
یعنی جو کچھ تمہارے سامنے میرے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں ان میں تکلف نہیں کرتا اس لیے کہ تکلف کرنے والے کا معاملہ زیادہ دیر تک نہیں رہتا بلکہ جلد ہی وہ اپنی اصل حالت پر آ جاتا ہے۔ (روح البیان ج۱۰/۱۰۵، دار احیاء التراث بیروت)
حضور مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ سے متعلق حضرت عائشہ کی متعدد روایتیں ہیں۔ ہر ایک میں مختلف الفاظ سے یہی فرمایا کہ سرکار کا اخلاق قرآن تھا۔ بنوسواد کے ایک شخص نے جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کا اخلاق کیا تھا تو یہی فرمایا (یعنی آپ کا خلق قرآن تھا) اور یہ آیت تلاوت کی اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بے شک آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں، اس شخص نے کہا کہ کوئی ایک واقعہ تو بیان کیجیے (جس میں سرکار کے اخلاق کریمانہ کی جھلک ہو) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: سنو! ایک مرتبہ میں نے بھی آپ کے لیے کھانا پکایا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی۔ میں نے اپنی لونڈی سے کہا

کہ دیکھا اگر میرے کھانے سے پہلے حفصہ کے یہاں کا کھانا آجائے تو گرادینا چنانچہ اس نے یہی کیا اور برتن بھی ٹوٹ گیا۔ حضور اقدس کھڑے ہوئے کھانے کو سمیٹنے لگے اور فرمایا اس برتن کے بدلے ثابت برتن تم دو۔ واللہ کچھ اور ڈانٹا ڈپٹا نہیں۔ (ابن کثیر زیرآیت اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ بحوالہ مسند احمد)

یہ موقع غصہ اتارنے اور ڈانٹنے کا تھا مگر حضور نے مکمل ضبط کا ثبوت دیا اور مطلق غصہ نہیں فرمایا: عام انسانوں میں ایسے موقع پر ضبط نفس تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی ایک حدیث میں یہ ہے کہ انہوں نے سائل سے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے اور اس کے بعد قد افلح المومنون کی تلاوت کی۔ گویا ان کا اشارہ یہ تھا کہ سورۂ مومنون میں جو اخلاق بیان دیے ہیں حضور ان کے پیکر تھے۔ لہٰذا ذیل میں اس سورہ کے ابتدائی حصے کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو دس آیتوں پر مشتمل ہے۔

☆ بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے

☆ جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں

☆ اور وہ جو کسی بے ہودہ بات کی طرف التفات (توجہ) نہیں کرتے یعنی فضول بات اور کھیل تماشوں سے بچتے ہیں)

☆ اور وہ کہ زکوٰۃ دینے کا کام کرتے ہیں۔

☆ اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

☆ مگر اپنی بیویوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں (یعنی مملوکہ) ان پر کوئی ملامت نہیں۔

☆ تو جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے (یعنی ناجائز طریقے سے قضائے شہوت کرے) وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

☆ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرتے ہیں۔

☆ اور وہ جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

☆ یہی لوگ وارث ہیں کہ فردوس کی میراث پائیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (المومنون: ۲۳/۱-۱۱)

یعنی یہ ساری صفتیں جو ان آیات میں مذکورہ ہیں سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے پیکر تھے اور یہ تمام خصائل سرکار سے بسہولت صادر ہوتے تھے، اس کے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہ تھی۔

یوں ہی پورے قرآن حکیم میں جو کچھ اوامر ونواہی ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان سب پر بدرجۂ اتم کاربند تھے۔ جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے۔ بس قرآن پڑھتے جایئے اور سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کو دیکھتے جایئے۔ آپ کی ایک ایک ادا قرآن کی ترجمان نظر آئے گی۔

اس حقیقت سے بھی دنیا میں بسنے والا کوئی صاحب عقل انکار نہیں کرسکتا کہ ایک آدمی کا معاشرتی زندگی کا سب سے زیادہ علم اس کے گھر والوں کو ہوتا ہے۔ باہر تو بہت سے لوگ پارسا بنتے ہیں لیکن گھریلو زندگی میں ان کا انداز معاشرت بدلا ہوا ہوتا ہے۔ گھر کے ذمہ دار کے سامنے افراد خانہ چوں کہ ایک طرح سے محکوم ہوتے ہیں، اس لیے بالعموم ذمہ داروں کے مظالم اور بدخوئی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کسی کے حسن اخلاق کا صحیح اندازہ گھر والوں ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے بھی جب ہم سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معاشرتی واخلاقی زندگی کا جائزہ لیتے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ازواج مطہرات، حضور کے اخلاق کریمانہ سے سب سے زیادہ متاثر تھیں۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ سے متعلق ازواج مطہرات کی روایات کا استقصا کیا جائے تو ایک مستقل اور ضخیم کتاب تیار ہوجائے، ذیل میں صرف ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔

۱- حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

ما کان احد احسن خلقا من رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

و سلم ما دعاه احد من اصحابه و لا من اهل بيته الا قال لبيك فلذلك انزل الله تعالىٰ "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (الدرالمنثور للسیوطی دارالکتب العلمیۃ بیروت ج۳۸۹/۶)۔

کوئی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ با اخلاق نہ تھا (سرکار کا حال یہ تھا کہ) آپ کے اصحاب یا اہل بیت سے جس نے بھی کبھی پکارا آپ نے لبیک کہا، اسی سبب سے تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (اور آپ بڑے عظیم خلق پر فائز ہیں)

۲- سعد بن ہشام (بن عامر) کہتے ہیں میں حضرت عائشہ کے پاس آیا اور عرض کیا:

اے مومنین کی ماں! مجھے سرکار کے خلق کے بارے میں بتایئے تو فرمایا آپ کا خلق قرآن تھا، کیا تو قرآن نہیں پڑھتا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ (الدرالمنثور ایضا)۔

۳- ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی۔ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور کے خلق کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:

آپ کا خلق قرآن تھا۔ قرآن جسے پسند کرتا آپ بھی اسے پسند کرتے اور قرآن جسے ناپسند رکھتا آپ بھی اسے ناپسند کرتے۔ (ایضا)

۴- ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے علاوہ کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا نہیں، نہ کسی عورت کو، نہ خادم کو، نہ کسی تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ لیا۔ ہاں اگر کوئی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا مرتکب ہوتا تو ضرور اس سے اللہ کے لیے بدلہ لیتے۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ ص۵۱۹)

۵- حضرت اسود رضی اللہ عنہ کہتے: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

سوال کیا، گھر میں سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عمل تھا؟ فرمایا: گھر والوں کی خدمت میں لگے رہا کرتے تھے یعنی مل جل کر کام کرتے پھر جب نماز کا وقت ہوتا، نماز کے لیے نکل جاتے (مشکوٰۃ ص۵۱۹)

۶- ابوعبداللہ جدلی کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیسا تھا۔ فرمایا:

لم يكن فاحشا و لا متفحشا و لا سخابا في الاسواق و لا يجزى بالسيئة السيئة و لكن يعفو و يصفح (شمائل ترمذی ص۲۵ الدرالمنثور ر۳۸۹/۶)

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ طبعا بدگو تھے، نہ تکلفا فحش گو، نہ بازاروں میں شور مچانے والے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے، لیکن آپ کا طریقہ معاف کر دینا اور درگزر کرنا تھا۔

۷- زینب بنت یزید بن وسق کہتی ہیں: میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھی کہ شام کی چند عورتیں آئیں اور انہوں نے کہا اے ام المومنین! ہمیں سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلق کے بارے میں کچھ بتایئے، فرمایا!

حضور کا خلق قرآن تھا اور آپ لوگوں میں جوان پردہ نشیں عورتوں سے زیادہ حیا والے تھے۔ [شمائل ترمذی-ص۲۶]

۸- حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں کا اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتا، اسے اختیار فرماتے جب تک کہ وہ گناہ نہ ہوتا اور اگر گناہ ہوتا تو لوگوں میں سب سے زیادہ آپ اس سے بچتے، اور حضور نے کبھی اپنے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ہاں اگر اللہ کی حرمت پامال کی جاتی تو ضرور اس کا بدلہ لیتے اللہ کے لیے (مشکوٰۃ ص۵۱۹)

اب بعض دوسری روایات ملاحظہ ہوں۔

۹- ثابت بن قیس روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے گیارہ سال تک سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی لیکن اس درمیان کبھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام نہیں کیا؟ (یا فرمایا) یہ کام کیوں کیا؟ (ثابت نے کہا) تو میں نے کہا، جبھی تو اللہ تعالی نے فرمایا ہے "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (الدرالمنثور ۶/۳۹۰)

بعض روایات میں نو اور بعض روایات میں دس سال ہے۔

۱۱- حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم میرے پاس سے نکلے (یعنی میری باری کے وقت) تو میں نے نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ حضور آ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگے، میں نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تو اس پر سرکار نے مجھے قسم دلائی کہ کھول دوں۔ میں نے عرض کیا: حضور میری باری میں اپنی دوسری بیویوں کی طرف تشریف لے جا رہے تھے؟ تو فرمایا: میں نے ایسا نہیں کیا ہے، ہاں مجھے پیشاب کی شدت محسوس ہوئی۔ (الدرالمنثور للسیوطی: ۶/۳۹۰)

یعنی حضرت میمونہ کی اس جرأت پر سرکار نے کوئی تنبیہ نہیں فرمائی اور اصل حقیقت بیان کر دی کہ میں اور ازواج کے پاس نہیں گیا تھا، پیشاب کی غرض سے گیا تھا بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے مگر اس میں اخلاق کریمانہ کا جو درس ہے وہ قابل توجہ ہے۔ غور کیجیے کہ آج اگر کوئی بیوی اپنے شوہر پر دروازہ بند کر کے کہے کہ میں نہیں کھولوں گی تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

۱۲- ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجۂ اولیٰ ہیں ان کی بھی شہادت ملاحظہ کریں۔ جب غار حرا میں وحی کا آغاز ہوا تو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم بار نبوت سے گھبرا سے گئے۔ جب آپ کی یہ کیفیت حضرت خدیجہ نے دیکھی تو تسلی دی اور آپ کے اخلاق کریمانہ کو یوں شمار کرایا:

آپ کو خوشخبری ہو (یعنی آپ گھبرائیں نہیں) خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں، ضعیفوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہ حق میں پیش آنے والے مصائب پر مدد کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری ۱/۳)

اس حدیث میں اعلان نبوت سے پہلے کے اوصاف کا ذکر ہے جنھیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بطور خاص ملاحظہ فرمایا اور ان کو یاد دلا کر سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تسلی دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ سے سب سے زیادہ ازواج مطہرات متاثر تھیں۔ کیوں کہ ان کا تعلق بھی آپ سے گہرا اور سب سے زیادہ تھا، جہاں دو بیویاں ہوں ان کے ساتھ عدل اور حسن سلوک میں یکسانیت مشکل ہوتی ہے۔ یہاں نو نو ازواج پاک میں پورا پورا عدل اور سب کے ساتھ حسن معاشرت کی مثال قائم کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے جب کہ ظاہری زندگی نہایت عسرت کی گزرتی دو دو ماہ تک کبھی چولہے میں آگ نہیں جلتی صرف پانی اور کھجور پر اکتفا کیا جاتا، زہد اور ترک دنیا کی اس عظیم الشان مثال کے باوجود ازواج مطہرات سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی اور خدمت گزاری میں کمی نہیں کرتیں۔ اسی زمانے میں اللہ کی طرف ان پاک باز بیویوں کی آزمائش ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا کیوں کہ بعض ازواج نے کشادگی کی خواہش کی تھی تو انھیں اختیار دیا گیا کہ دنیا اختیار کرو یا نبی کی رفاقت کو:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا O وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ لِلْمُحْصَنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا O (احزاب: ۳۳/۲۸-۲۹)

ترجمہ! اے غیب بتانے والے (نبی) بیویوں سے فرما دے اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی آزمائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں مال دوں اور اچھی طرح چھوڑ دوں

اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر چاہتی ہو تو بے شک اللہ نے تمہاری نیکی والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ (کنزالایمان)

جب یہ آیت پاک نازل ہوئی، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیبیاں تھیں۔ پانچ قریشیہ حضرت عائشہ بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت حفصہ بنت فاروق اعظم، ام حبیبہ بنت ابوسفیان، ام سلمٰی بنت ابوامیہ، سودہ بنت زمعہ اور چار غیر قریشیہ زینب بنت جحش اسدیہ، میمونہ بنت حارث ہلالیہ، صفیہ بنت حیی ابن اخطب خیبریہ، جویریہ بنت حارث مصطلقیہ رضی اللہ عنہن۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا۔ آیت سنا کر اختیار دیا اور فرمایا: جلدی نہ کرو، اپنے والدین سے مشورہ کر کے جو رائے ہو اس پر عمل کرو۔ صدیقہ نے عرض کیا: حضور کے معاملے میں مشورہ کیا، میں اللہ اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو چاہتی ہوں اور باقی ازواج نے بھی یہی جواب دیا۔ (خزائن العرفان)

مقام غور ہے کہ سب ازواج مطہرات نے رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رفاقت کو بدل و جان قبول فرمایا۔ اگر سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے حسن سلوک میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی ہوتی تو شاید ازواج مطہرات آزادی کو پسند کرتیں جس میں دنیاوی عیش وعشرت کے سامان تھے۔ اس سے ازواج پاک کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کی ایک جھلک آل عمران کی ایک آیت میں اس طرح دکھائی گئی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ O (آل عمران:۳/۱۵۹)

تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے، اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان (منتشر)

ہو جاتے تو تم انھیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو، اور جو کسی بات کا ارادہ پکّا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو، بے شک توکل والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنزالایمان)

نبی گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بیان قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر ہے۔ سب کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ یہاں ان میں چند کا بیان کیا جاتا ہے جب کہ دو کا ذکر آ چکا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:۲۱/۱۰۷)

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہاں کے لیے۔ (کنزالایمان)

اس آیت پاک میں اجمالاً تمام اخلاق کریمانہ کا بیان ہے کیوں کہ جب تک آپ پورے طور پر اخلاق عالیہ اور صفات جمیلہ سے آراستہ نہ ہوں گے، آپ کی ایک ایک ادا عالم کے ہر فرد کے لیے رحمت نہ ہو سکے گی۔

دوسری جامع آیت ملاحظہ ہو:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:۳۳/۲۱)

ترجمہ! بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔ (کنزالایمان)

اس آیت پاک میں سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بہترین نمونہ اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ اخلاق عظیمہ کا پیکر اور جملہ خوبیوں کا مظہر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کی زندگی کو نمونہ نہ قرار دیا جاتا۔ اوپر مذکورہ آیات اجمالی انداز لیے ہوئے ہیں اب چند وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں تفصیلاً احکام بیان کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ ط قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام:۶/۹۰)

ترجمہ! یہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تو تم انھیں کی راہ چلو۔ تم فرماؤ میں قرآن

پرتم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا وہ تو نہیں مگر نصیحت سارے جہان کو۔(کنزالایمان)

اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام انبیا سے افضل ہیں۔ کیوں کہ وہ کمالات واوصاف جو جدا جدا تمام انبیا کو عطا فرمائے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب کو جمع فرما دیا اور حکم دیا فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ط (تم انھیں کی راہ چلو) تو جب آپ تمام انبیا کے اوصافِ کمالیہ کے جامع ہیں تو بے شک سب سے افضل بھی ہیں۔ اسی لیے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مسند احمد ۲/۳۸۱)

ترجمہ: میں اسی لیے مبعوث ہوا کہ تمام اخلاقی خوبیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں، (یعنی سب کی تعلیم دے دوں اور سب پر عمل کر کے دکھا دوں)

تو اس مکارم اخلاق میں یقیناً انبیاے سابقین علیہم السلام کے جملہ اوصاف واخلاق بھی آ گئے، اور آپ سب کے جامع قرار پائے، اسی لیے کہا گیا ہے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

واضح رہے کہ یہاں گزشتہ انبیا کے صرف اوصاف وکمالات کو اختیار کرنے کا حکم ہے، ان کے شرائع واحکام مراد نہیں۔ اور اگر مراد لیے جائیں گے تو اس حد تک کہ جب تک آپ کے لیے خاص کوئی حکم نہ نازل ہوا تھا تو آپ اس وقت انبیاے سابقین کے شرائع پر عمل کر سکتے تھے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (وہ قرآن نصیحت ہے سارے جہان کو) سے ثابت ہوا کہ قرآن قیامت تک کے لیے کتاب ہدایت ہے اور تمام قوموں اور ملکوں کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد اب نہ کسی کتاب کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی، اس سے سرکار مدینہ کا خاتم النبین ہونا بھی ثابت ہوتا ہے (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

ذیل کی آیت میں صبر کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد باری ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف:

۴۶/۳۵)۔

ترجمہ: تو تم صبر کرو جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا، اور ان کے لیے (طلب عذاب کی) جلدی نہ کرو۔(کنزالایمان)

اس آیت میں صبر کا جو اخلاق کا بہت اعلیٰ درجہ ہے، حکم دیا گیا ہے، اور اس میں رسولوں کا ذکر بطور تسلی کے ہے کہ انبیائے سابقین بھی تبلیغ دین کی راہ میں مصائب برداشت کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی اس سلسلے میں ان کی اقتدا کریں اور عذاب کی جلدی نہ کریں، اس لیے کہ جو منکرین اور سرکش ہیں ان پر تو عذاب آنے ہی والا ہے۔

اس میں اور اس سے پہلے والی آیت میں انبیائے سابقین کی اقتدا کا جو حکم ہے اس میں اقتدا حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ رب عزوجل نے اپنے رسولوں اور نبیوں کو جن محاسن اور اخلاق عظیم کا حکم دیا تھا، آپ ان سب پر کار بند ہو جائیں۔ کسی معاملے میں ان سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں کہ آپ تو ان سب سے افضل واعلیٰ مقام کے مالک ہیں۔ جاہلوں سے منہ پھیرنے اور عفو ودرگزر اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۔(الاعراف:۷/۱۹۹)

ترجمہ: اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیر لو۔(کنزالایمان)

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا قرآن میں اخلاق حسنہ کے متعلق یہ جامع ترین آیت ہے جس میں تین باتوں کا خاص طور سے حکم دیا گیا ہے:

۱۔ عفو ودرگزر
۲۔ نیک اور مفید باتوں کا حکم
۳۔ جاہل اور ناسمجھ لوگوں سے علیحدگی

ہر مومن کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے خصوصا جو افراد میدان دعوت وتبلیغ میں قدم رکھ چکے ہوں، انھیں خصوصی طور پر ان خصائل حمیدہ سے اپنے کو مزین و

آراستہ کرنا ضروری ہے۔

اسی مضمون کو ذرا تفصیل سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں بیان فرمایا ہے۔

مجھے میرے رب نے نو باتوں کا حکم دیا ہے:

۱- ظاہر و باطن میں اخلاص کو اپنا شعار بناؤں۔
۲- خوشی اور ناراضگی ہر حال میں عدل و انصاف کو اختیار کروں۔
۳- خوش حالی اور تنگ دستی ہر حال میں میانہ روی اختیار کروں۔
۴- جو مجھ پر ظلم کرے اس کو معاف کر دوں۔
۵- جو مجھ سے قطع تعلق کرے اس سے صلہ رحمی کروں۔
۶- جو مجھے محروم رکھے اس کو نوازوں۔
۷- میری زبان گویا ہو تو ذکر الٰہی میں۔
۸- خاموش رہوں تو فکر کروں (آفاق و انفس یا اللہ کی آیات میں)
۹- نظر اٹھا کر دیکھوں تو عبرت حاصل کروں۔

طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے کلام فرمایا تو اس میں بھی یہی نو باتیں تھیں، فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں اخلاص کی جگہ خشیۃ کا لفظ ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن للقرطبی ۷/۳۰۳ دار الکتاب العربی بیروت)

اور طبرانی کی ایک روایت یوں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نے حضرت جبرئیل سے فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ تو عرض کیا اپنے رب سے پوچھ کر بتاتا ہوں، کچھ دیر کے بعد تشریف لائے اور عرض کیا ''بے شک اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ جو آپ پر زیادتی کرے اس کو معاف فرما دیں، جو آپ کو محروم رکھے اس کو نوازیں اور جو قطع تعلق کرے اس سے رشتہ جوڑیں۔ (ایضاً، ص۳۰۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو جن چیزوں کا حکم دیا ہے اور دیگر

وہ احکام جو قرآن میں وارد ہیں، سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سب پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ یہی آپ کا اخلاق تھا۔ آیات کہاں تک نقل کی جائیں یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ اوامر و نواہی قرآن پاک میں ہیں، سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سب پر عامل تھے۔ یہی معنی ہے کان خلقه القرآن کا۔

اب ذیل میں احادیث کریمہ اور کتب سیرت سے چند ایسے واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن سے سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان واقعات کو پڑھیں، ان سے سبق لیں اور اپنی زندگیوں میں انقلاب لائیں۔ ان واقعات سے دوسرا مسئلہ یہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اسلام زور و زبردستی سے نہیں پھیلا ہے بلکہ اخلاق کی تلوار سے پھیلا ہے اور اکیلا آدمی بھلا زور زبردستی کر بھی کیا سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فاران کی چوٹی پر چڑھ کر سرکار محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اکیلے ہی اعلان توحید و رسالت کیا تھا۔ نہ ان کے ساتھ فوج تھی، نہ اسلحے، نہ مال و دولت کی فراوانی، لہٰذا معاندین اسلام کی پھیلائی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ حقیقت کی نگاہوں سے تاریخ و سیرت کا مطالعہ کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔ سنی سنائی باتوں اور بے دلیل دعووں کا ظاہر ہے کوئی اعتبار نہیں ہوتا، آیئے اب واقعات کی سیر کرتے چلیں۔

۱- ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدو آیا اور مسجد کے صحن میں بیٹھ کر استنجا کرنے لگا۔ صحابہ کرام نے دیکھ کر اس کو منع کرنا چاہا اور دوڑے ہی تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو روکا اور فرمایا تم سختی نہیں نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو، پھر جب وہ پیشاب کر چکا تو اس کو بلا کر سمجھایا کہ مسجدیں عبادت کے گھر ہیں، یہاں نجاست مناسب نہیں، یہ تو محض خدا کی یاد، نماز اور تلاوت قرآن کے لیے ہیں۔ پھر صحابہ میں سے کسی کو فرمایا: اس پر پانی بہا دو تو وہ ایک ڈول پانی لایا اور بہا دیا۔ (بخاری کتاب الحدود ج۲/۱۰۰۳، ترمذی ۱/۲۱، مشکوٰۃ ص۵۲ باب تطہیر النجاسات)

اس واقعہ میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں، اولا مسجد کا ادب کہ اس کو نجاستوں سے دور رکھا جائے، دوسرے یہ کہ اگر کوئی نادان غلطی سے مسجد میں پیشاب کرنے لگے یا اور کوئی نامناسب حرکت کا ارتکاب کرلے تو اس کے ساتھ سختی نہ کی جائے نرمی سے سمجھایا جائے اور اس کو مسجد کی عظمت وحرمت بتائی جائے۔ نیز اس کے پیشاب کو کاٹا نہ جائے کہ یہ صحت کے لیے مضر ہے اور مسجد کے مزید آلودہ ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ آج کل ذرا ذرا سی باتوں پر جو لوگ مسجدوں میں ہنگامہ کرتے پھرتے ہیں، وہ اس واقعہ سے سبق لیں خصوصا بچوں کو جھڑکنے ڈانٹنے کا رواج تو بالکل عام ہوگیا ہے، جب کہ بچے سخت تنبیہ کے نہیں نرمی اور تعلیم کے مستحق ہیں۔

۲- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے خادم خاص روایت کرتے ہیں: میں دس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں رہا۔ آپ نے مجھے کبھی مارا، نہ گالی دی، نہ ڈانٹ پلائی اور نہ کبھی ناراض ہوئے۔ اگر میں آپ کے کسی حکم کی تعمیل میں (بچپنے کی وجہ سے) کوتاہی کرتا تو کبھی نہ جھڑکتے، نہ یہ کہتے کہ کیوں کیا یا نہ کیا۔ اگر آپ کے گھر والوں میں کوئی مجھے جھڑکتا تو اس سے فرماتے اسے چھوڑو، اگر یہ کام تقدیر میں ہوتا تو ضرور ہوکر رہتا، حضرت انس کہتے ہیں آٹھ سال کی عمر سے میں نے حضور کی خدمت کی ہے۔ (مشکوٰۃ، ص۵۱۹ھ)

۳- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی، اگر کوئی چیز میرے ہاتھ سے ضائع ہوگئی تو سرکار نے کبھی مجھے اس پر ملامت نہیں کی اور اگر گھر والوں میں کسی نے ملامت کی تو فرمایا اس کو چھوڑ دو۔ اگر کچھ ہونے والا مقدر تھا تو ہوتا۔ (مشکوٰۃ ص۵۱۹)

۴- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ با اخلاق تھے۔ ایک روز

مجھے کسی کام سے بھیجا تو میں نے (بچپنے کی وجہ سے) کہہ دیا میں واللہ نہیں جاؤں گا۔ حالانکہ میرے دل میں یہ بات تھی کہ جس کام کے لیے حضور بھیج رہے ہیں میں جاؤں گا۔ تو میں بچوں کے پاس نکل کر چلا گیا جو بازار میں کھیل رہے تھے۔ اچانک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آئے اور پیچھے سے میری گُدی پکڑی، جب پلٹ کر میں نے دیکھا تو سرکار مسکرا رہے تھے۔ پھر فرمایا: اے اُنیس میں نے جہاں حکم دیا تھا، گئے؟ میں نے عرض کیا ہاں میں ابھی جا رہا ہوں یا رسول اللہ! (مسلم، ۲/۲۵۳، مشکوٰۃ، ص۵۱۸،)

بچوں کے ساتھ سرکار یہ حسن سلوک بھی ہمارے لیے درس عبرت ہے۔

۵- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ میرے سرکار حضور پر موٹے نجرانی کنارے والی چادر تھی۔ حضور کو ایک بدو نے پکڑ لیا اور چادر کے ساتھ اس زور سے کھینچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس اعرابی کے سینے میں پہنچ گئے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اس کھینچنے کی وجہ سے حضور کی گردن کے کنارے چادر کی کناری نے نشان ڈال دیا تھا، پھر اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے، اس میں سے میرے لیے بھی حکم دیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھا پھر مسکرائے پھر اس کو دینے کا حکم فرمایا۔ (مشکوٰۃ ص۵۱۸، بخاری ومسلم)

اس واقعہ سے کس درجہ صبر وضبط اور تحمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ اہل علم پر خوب روشن ہے۔ یہ اخلاق کا وہ اعلیٰ نمونہ ہے کہ عام لوگوں سے اس کی قطعا امید نہیں کی جاسکتی۔

۶- یہی انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور سے دو پہاڑوں کے بیچ میں بھری بکریوں کا سوال کیا تو حضور نے اسے عطا فرمادیں۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس آیا تو کہا اسلام لے آؤ۔ خدا کی قسم بلاشبہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسی داد ودہش فرماتے ہیں کہ فقیری کا خوف

نہیں کرتے، (یاایسا نوازتے ہیں کہ آدمی کواس کے بعد فقیری کا خوف نہیں رہتا) (مسلم،۲/ ۲۵۳-مشکوٰۃ ص ۵۱۹)

۷- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو مدینے کے خدام (لونڈی غلام) اپنے برتن لے کر آجاتے جن میں پانی ہوتا۔ وہ جو برتن لے کر آتے، حضور اس میں اپنا دست پاک ڈال دیتے۔ کبھی وہ سخت سردی کے موسم میں صبح کو آتے پھر بھی سرکار ان کے برتنوں میں اپنا ہاتھ ڈال دیتے (اور وہ تبرک بنا کرلے جاتے) (مسلم مشکوٰۃ ص ۵۱۹)

اس حدیث پاک سے سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تواضع پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ کہ آپ صحابہ کی دل جوئی حتی کہ بچوں خادموں کی بھی دل جوئی ملحوظ رکھا کرتے تھے، اگرچہ سخت ٹھنڈک میں ٹھنڈے پانیوں میں ہاتھ ڈالنا پڑتا۔

۸- جُبیر بن مُطعِم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں جب کہ وہ حُنین سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے، تو اعرابی لوگ حضور سے لپٹ کر مانگنے لگے، یہاں تک وہ حضور کو ایک خاردار درخت کی طرف لے گئے جس سے حضور کی چادر مبارک الجھ کر رہ گئی۔ سرکار ٹھہرے اور فرمایا مجھے میری چادر تو دیدو، اگر میرے پاس ان درختوں کے برابر جانور ہوتے تو میں تم میں تقسیم کر دیتا پھر تم مجھے نہ بخیل پاتے، نہ جھوٹ بولنے والا، نہ بزدل۔ (مشکوٰۃ ص ۵۱۹، بخاری ۱/۴۴۶)

اس واقعے میں صبر وضبط کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ سرکار کے وصف سخاوت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

۹- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں (مشرکین کی ایذارسانی پر) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ مشرکین پر دعا کر دیں۔ فرمایا: میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو رحمت بنا کر بھیجا

گیا ہوں۔ (مشکوٰۃ ص ۵۱۹)۔

۱۰- حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عالم کا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر چند دینار قرض تھا۔ اس نے حضور سے (وقت سے پہلے ہی) تقاضا کر ڈالا۔ حضور نے اس سے فرمایا میرے پاس نہیں کہ میں تم کو دوں۔ اس نے کہا کہ میں آپ کے پاس سے نہیں ہٹوں گا اے محمد، جب تک آپ مجھے قرض نہ ادا کر دیں گے۔ تو سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں اور حضور اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اور وہیں ظہر عصر مغرب عشا کی نمازیں پڑھیں پھر فجر بھی وہیں ادا کی۔ تب حضور کے صحابہ کرام اس کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو جان لیا۔ پوچھا یہ لوگ اس یہودی کے ساتھ کیا کر رہے ہیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایک یہودی کی مجال کہ آپ کو روک رکھے تو سرکار نے ارشاد فرمایا: میرے رب نے مجھے منع فرمایا ہے کہ میں کسی عہد والے کو یا اس کے علاوہ کسی کو ستاؤں۔ پھر جب دن چڑھ گیا تو یہودی نے کہا۔ ''اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد انک رسول اللہ'' میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں'' (اور کہا) میرا آدھا مال اللہ کی راہ میں قربان ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کیا کہ دیکھوں آپ میں وہ صفات ہیں کہ نہیں جو میں نے توارت میں دیکھی ہیں کہ محمد، عبد اللہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی جائے ولادت مکہ ہے اور جائے ہجرت مدینہ طیبہ، ان کی سلطنت شام تک ہے نہ تو سخت دل ہیں، نہ سخت زبان اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے، نہ بری باتوں سے متصف ہیں، نہ سخت اور بیہودہ بات سے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ میرا مال ہے۔ آپ اس میں اللہ کی مرضی سے

جو چاہیں کریں۔ وہ یہودی بہت مالدار تھا، اس کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا۔ (مشکوٰۃ ص۵۲۰-۵۲۱)

☆ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا۔ ایک بار وہ کہنے لگی: یارسول اللہ! مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ آپ نے فرمایا: فلاں شخص کی ماں تو مجھے جہاں لے جانا چاہے لے جا۔ تیرے ساتھ چلوں گا۔ وہ آپ کو ایک طرف لے گئی تھوڑی دیر بات کرتی رہی۔ جب وہ بات کر چکی تب آپ واپس تشریف لائے۔ (دلائل النبوۃ اصبہانی باب۱۲)

گویا سرکار نے پاگل عورت کا بھی دل نہیں توڑا، دھتکارنے کے بجائے اس سے بات کی اور اس کی بات ختم ہونے پر واپس تشریف لائے۔

☆ حضرت ابوطفیل صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے حضور کو مقام جعرّانہ میں گوشت تقسیم کرتے دیکھا۔ اسی وقت ایک خاتون آئیں جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قریب ہوگئیں حضور نے ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھادی تو وہ اس پر بیٹھ گئیں، میں نے دریافت کیا کہ وہ کون خاتون تھیں تو صحابہ کرام نے بتایا کہ وہ حضور کی رضاعی ماں تھیں۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ ص۴۲۰ باب البر)

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے حضور ان کے لیے کھڑے ہوگئے، اور یہ کہ وہ حضور کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ تھیں۔

☆ معاویہ بن حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ لوگوں میں ایک آدمی نے چھینکا، تو میں نے یرحمك الله کہہ کر اس کی چھینک کا جواب دیا، لوگ مجھے گھورنے لگے، میں نے کہا تمہاری ماں تم پر روئے تم لوگ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ تو وہ لوگ یہ سن کر اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارنے لگے یعنی مجھ کو اور

خاموش کرنے لگے، تو میں خاموش ہوگیا، پھر جب رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز پوری کی۔ ''آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ میں نے حضور سے اچھا کوئی معلم نہ پہلے دیکھا، نہ آپ کے بعد'' تو اللہ کی قسم مجھے نہ جھڑکا، نہ مجھے مارا اور نہ مجھے برا بھلا کہا۔ فرمایا: اس نماز میں لوگوں کا کلام کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ تو محض تسبیح تکبیر اور قرآن کی تلاوت کا نام ہے یا اور کچھ فرمایا (مشکوٰۃ ص۹۰، کتاب الصلوٰۃ)

اس واقعے میں ان لوگوں کے لیے درس ہے جو مسجدوں میں ہر وقت ڈانٹنے ڈپٹنے کا ماحول بنائے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم ہی نماز اور مسجد کے آداب و احکام سے واقف ہیں۔

☆ عبداللہ بن ابی الحمساء کہتے ہیں کہ اعلان نبوت سے قبل میں نے حضور سے کوئی سامان خریدا تھا۔ کچھ قیمت باقی رہ گئی تھی۔ میں نے کہا: یہیں ٹھہریے میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ حضور اس جگہ ٹھہرے رہے۔ تین روز کے بعد مجھے یاد آیا دوڑا ہوا گیا تو دیکھا کہ حضور اسی جگہ تشریف فرما ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: تو نے مجھ پر مشقت ڈال دی، تین دن سے یہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ (مشکوٰۃ ص۴۱۶، باب الوعد)

اعلان نبوت سے پہلے بھی سرکار اس قدر وعدے کے پکے تھے کہ تین روز تک ایک ہی جگہ انتظار کرتے رہے اور وعدہ کر کے بھول جانے والے پر کوئی سختی نہیں کی، نہ جھڑکا۔ صرف اتنا ہی کہا کہ تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، یہ اخلاق کا بہت بڑا اور عظیم واقعہ ہے۔

☆ نبوت کے دسویں سال قبیلۂ ثقیف کو دعوت اسلام دینے کے لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے کفار نے ہدایت قبول کرنے کے بجائے آپ کو اس قدر اذیت پہنچائی کہ آپ کے نعلین مبارک خون سے آلودہ ہوگئے۔ جب آپ وہاں سے واپس ہوئے تو

پہاڑوں کے فرشتے نے عرض کی: حضور آپ چاہیں تو ان پہاڑوں کو ان پر الٹ دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نہیں۔ چاہتا کہ وہ ہلاک ہوں۔ امید ہے کہ خدا ان کی نسل سے ایسے بچے پیدا کرے گا جو ایک خدا کی عبادت کریں گے۔(مشکوٰۃ ص۵۲۳)

اس قدر اذیت کے بعد بھی بددعا اور ہلاکت سے کفار کو بچانا انتہائی اخلاق کی بات ہے جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جاسکتا۔ درحقیقت اسلام کے فروغ اور اشاعت کے یہی اسباب ہیں۔

☆ مکہ کی سرزمین پر جب مسلمانوں کو ستایا گیا اور خوب خوب ان پر مظالم ڈھائے گئے تو ایک روز حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسول میں آئے، اور عرض کی: آپ مشرکین کے لیے بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ کعبے کے سایہ میں چادر رکھ کر سوئے تھے اٹھ بیٹھے، چہرہ مبارک سرخ ہوگیا، فرمایا تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتیں جس سے گوشت پوست علیحدہ ہوجاتے، ان کے سروں پر آرے رکھے جاتے اور چیر کر دو ٹکڑے کردیے جاتے مگر یہ اذیتیں ان کو دین حق سے برگشتہ نہیں کرسکتی تھیں۔(گھبراؤ نہیں) اللہ تعالیٰ دین اسلام کو کمال تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ ایک سوار ''صنعا سے حضرموت'' تک سفر کرے گا اور اسے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔(بخاری، سیرت رسول عربی ص۲۷۵)

☆ حضور، رحمۃ للعالمین تھے۔ سب کے لیے رحمت تھے۔ دشمن نے بھی امان مانگی تو اس کو امان دی ہاں جو برسر پیکار رہا، تلوار سونتے رہا، جان کا دشمن بنا ہوا تھا، اس کے لیے یقیناً شمشیر برہنہ بھی تھے۔ ذیل کا واقعہ دیکھیں اور سبق لیں کہ اسلام کیسے پھیلا۔

صفوان بن امیہ جاہلیت کے دور میں اشرافِ قریش سے تھے اور اسلام کے سخت دشمن، فتح مکہ کے دن بھاگ گئے تھے۔ صحابی رسول عمیر بن وہب نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: صفوان میری قوم کے سردار ہیں، وہ بھاگ گئے ہیں تاکہ اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیں (یعنی انھیں اپنی جان کھپانا پسند ہے، مسلمان ہونا پسند نہیں) احمر واسود (ہر گورے کالے) کو آپ نے پناہ دی ہے، ان کو بھی امان دیدیجیے۔ آپ نے فرمایا، تو اپنے چچیرے بھائی (صفوان) کو لے آ، اسے میری طرف سے امان ہے۔ حضرت عمیر نے عرض کیا، امان کی کوئی نشانی چاہیے جو میں اسے دکھا سکوں، آپ نے اپنا عمامہ جو فتح مکہ کے دن پہنے ہوئے تھے، عطا فرمایا۔ صفوان جدہ میں جہاز پر سوار ہونے ہی والے تھے کہ عمیر جاپہنچے اور ان کو امان کا مژدہ سنایا، صفوان نے کہا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ عمیر نے اطمینان دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم وکرم اس سے برتر ہے۔ غرض حاضر ہوئے اور کہا۔ یہ عمیر کہتا ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے۔ آپ نے فرمایا عمیر سچ کہتا ہے۔ یقیناً میں نے تم کو امان دی ہے، یہ سن کر صفوان نے کہا حضور! دو ماہ کی مہلت دیجیے۔ حضور نے فرمایا تجھے چار ماہ کی مہلت ہے۔ پھر صفوان غزوۂ طائف کے بعد برضا ورغبت ایمان لے آئے۔(سیرت حلبیہ، سیرت رسول عربی ص۲۸۶)

☆ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی اسلام بہت تاکید فرماتا ہے۔ مولیٰ جو کھائے پیئے غلام کو بھی وہی کھلائے پلائے، جو خود پہنے اس کو پہنائے، طاقت سے زیادہ کام نہ لے۔ ایک روایت میں یہ بھی فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے قابو میں کردیا ہے۔ غرض کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تاکید کی ہے اور ان کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان کی ہے۔ جب کہ جاہلیت کے زمانے میں غلاموں اور عورتوں کے ساتھ بھی بہت برا سلوک ہوتا تھا، عرب کی تاریخ گواہ ہے۔ مگر اسلام نے عورتوں کو بھی عزت دی اور غلاموں کو بھی وقار فرمایا۔ اس سلسلے کے دو ایک واقعہ ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ اپنے پیچھے سے یہ آواز سنی۔ ''ابو مسعود! جان لو کہ تم کو جس قدر اس غلام

پر قابو ہے، اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے"، میں نے مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اسے رضائے الٰہی کے لیے آزاد کیا۔ آپ نے فرمایا: دیکھو اگر تم ایسا نہ کرتے تو ضرور دوزخ کی آگ تم کو جلاتی۔ (مشکوٰۃ: ۲۹۱)

☆ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جو شخص اپنے غلام کے منہ پر تھپڑ مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔ (مشکوٰۃ: ۲۹۱)

حضور کو غلاموں کی طرف سے اس قدر فکر تھی کہ مرض وصال شریف میں فرمایا: نماز اور تمہارے غلام یعنی ان کا خیال کرنا۔ (ایضا) چنانچہ حضرت سُوید بن مُقرِن بیان کرتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے۔ ہمارے یہاں صرف ایک خادمہ تھی۔ ہم میں سے ایک نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اسے آزاد کر دو، اس نے کہا: ہمارے یہاں صرف یہی ایک خادمہ ہے۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے وہ خدمت کرتی رہے یہاں تک کہ جب سب بے نیاز ہو جائیں اور ضرورت نہ رہے تو اسے آزاد کر دیں، یعنی آئندہ اس میں وراثت نہ چلے (سیرت رسول عربی ص ۳۱۵)۔

اخلاق رسول سے متعلق سیرت کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں اختصار کے پیش نظر ان ہی چند واقعات پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ذیل میں نواسہ رسول جگر گوشئہ بتول شہزادہ علی مرتضٰی حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت سے سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ پر مشتمل ایک جامع بیان پیش کیا جا رہا ہے۔

اخلاق رسول پر ایک جامع حدیث:

حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر کیا تو فرمایا:

☆ بخدا سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دروازے لوگوں پر بند نہیں کیے جاتے تھے (بلکہ سب کے لیے کھلے رہتے تھے)

☆ آپ کے دروازے پر دربان نہیں ہوتا تھا۔

☆ اور نہ صبح و شام کے کھانے میں یکے بعد دیگرے برتن رکھے اٹھائے جاتے یعنی بیک وقت کئی قسم کے کھانے نہیں تناول فرماتے تھے۔

☆ آپ کھلی جگہ تشریف رکھتے جہاں ہر ایک بہ سہولت حاضری دے سکے۔

☆ آپ زمین پر تشریف فرما ہوتے اور کھانا بھی زمین ہی پر رکھا جاتا۔

☆ موٹے اور کھردرے کپڑے زیب تن فرماتے۔

☆ آپ دراز گوش پر بھی سواری فرما لیتے اور اپنے پیچھے نیاز مندوں کو بھی سوار فرما لیتے۔

☆ آپ کھانا کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹتے اور بخدا اسے اپنی شان کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔ (سید الانبیاء ترجمہ الوفا ابن جوزی، ص ۴۹)

اخلاق وخصائل نبوی کا اجمالی بیان:

حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے چند واقعات پیش کرنے کے بعد آپ کے اخلاق وخصائل کا اجمالی نقشہ بھی پیش کیا جاتا ہے تا کہ ایک نظر میں بہت سارے وسباق سیرت سامنے آجائیں۔

۱- حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خادموں سے اف بھی نہیں فرماتے۔ (انس، بخاری ومسلم)

۲- حضور لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ بہادر۔ (انس، بخاری ومسلم)

۳- حضور سے جب بھی سوال ہوتا انکار نہیں فرماتے۔ (جابر، بخاری ومسلم)

۴- حضور بخیل اور بزدل نہ تھے۔ (جبیر، بخاری)

۵- حضور غلاموں اور بچوں کا بھی لحاظ فرماتے۔ (دانش، مسلم)

۶- حضور کو جو جہاں لے جاتا تشریف لے جاتے (انس، بخاری)

۷- راستہ چلتے بھی اگر کوئی حاجت پیش کرتا، اس کی حاجت پوری فرماتے۔ (انس، مسلم)

۸- حضور نہ تو فحش گو تھے، نہ لعنت کرنے والے، نہ برا کہنے والے۔ (انس، بخاری)

۹- حضور کسی پر عتاب فرماتے تو کہتے: اس کی جبین خاک آلود ہو۔ (انس، بخاری)

۱۰- حضور کنواری پردہ نشین سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ (ابوسعید، بخاری و مسلم)

۱۱- حضور کوئی ناپسند چیز دیکھتے تو چہرے پر اس کے آثار ظاہر ہوجاتے۔ (ابوسعید، بخاری و مسلم)

۱۲- حضور کھلکھلا کر نہیں ہنستے، ہاں تبسم فرماتے تھے۔ (عائشہ بخاری)

۱۳- حضور جلدی جلدی بات نہیں کرتے، آہستہ اور صاف بولتے کہ شمار کرنے والا چاہے تو شمار کرلے۔ (بخاری و مسلم)

۱۴- حضور گھر والوں کے ساتھ مل کر گھر کا کام کرتے۔ (عائشہ، بخاری)

۱۵- حضور آسان کام اختیار فرماتے۔ (عائشہ، بخاری، مسلم)

۱۶- حضور نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو مارا نہیں۔ سوائے جنگ کے۔ (عائشہ، مسلم)

۱۷- حضور نے اپنے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ (عائشہ، بخاری و مسلم)

۱۸- حضور بازاروں میں شور نہیں مچاتے تھے۔ (عائشہ، ترمذی)

۱۹- حضور برائی کا بدلہ برائی کر کے نہیں دیتے بلکہ معاف فرمادیا کرتے تھے۔ (عائشہ، ترمذی)

۲۰- حضور مریض کی عیادت کرتے اور جنازے کے پیچھے چلتے تھے۔ (انس، ابن ماجہ بیہقی)

۲۱- حضور غلاموں کی دعوت بھی قبول فرمالیتے تھے۔ (انس، ابن ماجہ بیہقی)

۲۲- حضور دراز گوش پر بھی سواری فرمالیتے تھے۔ (انس، ابن ماجہ بیہقی)

۲۳- حضور اپنے نعلین درست فرمالیتے تھے۔ (عائشہ، ترمذی)

۲۴- حضور اپنے کپڑے سل لیا کرتے تھے۔ (عائشہ، ترمذی)

۲۵- حضور اپنی بکری دوہ لیا کرتے تھے۔ (عائشہ، ترمذی)

۲۶- حضور جب کسی سے مصافحہ کرتے تو جب تک خود وہ ہاتھ نہ چھوڑتا آپ نہ چھوڑتے۔ (انس، ترمذی)

۲۷- حضور صحابہ کے ساتھ دنیا کی گفتگو بھی فرماتے اور آخرت کی بھی اور کھانے پینے کا بھی ذکر کرتے تھے۔ (خارجہ، ترمذی)

۲۸- حضور گفتگو کے درمیان اپنا چہرہ نہیں پھیرتے تھے یہاں تک کہ گفتگو کرنے والا منھ پھیر لے۔ (انس، ترمذی)

۲۹- حضور کسی کے سامنے اپنا پاؤں نہیں پھیلاتے تھے۔ (انس، ترمذی)

۳۰- حضور کل کے لیے کچھ جمع نہیں کرتے تھے۔ (انس، ترمذی)

۳۱- حضور زیادہ خاموش رہتے، ضرورت سے زیادہ نہیں بولتے تھے۔ (جابر، شرح السنۃ)

۳۲- حضور ٹھہر ٹھہر کر اور صاف باتیں کرتے۔ (جابر، ابوداؤد)

۳۳- حضور ایسی صاف گفتگو فرماتے کہ یاد کرنے والا یاد کرلیتا۔ (عائشہ، ترمذی)

۳۴- حضور سے زیادہ تبسم فرمانے والا نہیں دیکھا۔ (عبداللہ بن حارث، ترمذی)

۳۵- حضور اپنے عیال پر سب سے زیادہ مہربان تھے۔ (انس، مسلم)

۳۶- حضور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ (عبداللہ بن ابی اوفیٰ، نسائی، دارمی)

۳۷- نماز لمبی پڑھتے اور خطبہ مختصر فرماتے تھے۔ (ابن ابی اوفیٰ -نسائی، دارمی)

۳۸- مسکین اور بیواؤں کی حاجت کے لیے ان کے ساتھ چلنے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ (عبداللہ بن ابی اوفیٰ، نسائی، دارمی)

۳۹- حضور ٹیک لگا کر نہیں کھاتے۔ (عائشہ، شرح السنۃ)

۴۰- حضور فرماتے جیسے غلام کھاتا ہے میں بھی ویسے ہی کھاتا ہوں۔ (عائشہ، شرح السنۃ)

۴۱- حضور نے فرمایا: جیسے غلام بیٹھتا ہے ویسے ہی میں بھی بیٹھتا ہوں۔ (عائشہ، شرح السنۃ)

یہ اکتالیس اخلاق وہ ہیں جو مشکوٰۃ شریف کے صرف ایک باب، باب الاخلاق والشمائل ص ۵۱۸ تا ۲۱۵، کے تین صفحات کی تلخیص کے طور پر پیش کیے گئے، سیرت کے دیگر ابواب سے بھی ان سے زیادہ اخلاق وشمائل کا شمار پیش کیا جاسکتا ہے۔ عبرت اور عمل کے لیے یہ اکتالیس اخلاق بھی بہت ہیں۔

مصطفٰے جانِ رحمت ﷺ کا منافقوں کے ساتھ رویہ

رئیس احمد جعفری (سیتاپور)

کھلے ہوئے دوست اور کھلے ہوئے دشمن کے ساتھ طرزِ عمل متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ یہ دوست ہے، وہ دشمن ہے۔ دوست اس لیے ہے کہ موردِ لطف وکرم بنے اور دشمن اس لیے ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ لیکن دشمن کی ایک قسم اور ہوتی ہے: یہ قسم ہے منافقوں کی۔ یہ اپنے تئیں دوست ظاہر کرتے ہیں، دوستی کا عوامی دعویٰ کرتے ہیں۔ پیمانِ رفاقت بڑے زور وشور سے استوار کرتے ہیں۔ لیکن در پردہ دشمن ہوتے ہیں، دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں، ہر وقت تخریب کے درپے رہتے ہیں، سازش کرتے ہیں، نقصان پہنچاتے ہیں، تباہ وبرباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ یہ دشمن کی سب سے بدترین، خطرناک اور ناقابل برداشت قسم ہے۔ ایسے لوگ جب برافگندہ نقاب ہوجائیں، تو انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا، ان پر لطف وکرم کی بارش نہیں کی جاسکتی، انہیں موردِ مہر وکرم نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ صرف اس قابل ہوتے ہیں کہ جہاں ملیں کچل دیئے جائیں۔ جہاں ان کا سراغ لگے، پامال کر دیئے جائیں۔ جب یہ ہاتھ آئیں، ان کے جسم وجان کا رشتہ بے تامل منقطع کر دیا جائے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی یہی ہوتا تھا، دورِ تاریخ کے آغاز میں بھی ایسا ہی ہوا اور اب کہ دنیا عمرانیت اور حضارت کے اوجِ کمال پر ہے، یہی اصول کارفرما ہے، سچ تو یہ ہے کہ بغیر اس تطہیر کے کام بھی نہیں چل سکتا۔ نہ نظم قائم ہوسکتا ہے، نہ امن بحال ہوسکتا ہے، نہ دوستوں کی شناخت ہوسکتی ہے، نہ دشمنوں سے نجات مل سکتی ہے، اب

ہمیں دیکھنا ہے کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ ان کا کس طرح قلع قمع کیا؟ ان سے کیونکر نجات حاصل کی؟ انہیں کیسی عبرت انگیز اور لرزہ خیز سزائیں دیں۔

اس سلسلے میں چند واقعات خاص طور پر اس قابل ہیں کہ پیشِ نظر رہیں تاکہ عہدِ رسالت کی صحیح تصویر آپ کے سامنے آجائے اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار و اخلاق اور صفات و سیرت کا واضح خاکہ متعین ہو جائے۔

غزوۂ احد تاریخ اسلام میں اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی فیصلہ کن جنگ ہے۔ کفار قریش نے اس لڑائی کا بڑی تیاریوں کے ساتھ انتظام کیا۔ بدر میں انہیں جو شکست فاش ہوئی تھی، اس کا بدلہ لینے کے لیے وہ بے چین تھے۔ سردارانِ قریش، جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے تھے، ان کے متعلقین ایک خوفناک جنگ کے لیے سربکف ہو چکے تھے۔ قریش کے کاروان تجارت کا جو نفع جمع ہو رہا تھا، طے ہوا کہ اسے جنگی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے اور یہ تجویز بڑی گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ منظور کر لی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اگر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر میدان جنگ آپ کا مرغوب ترین مقام بن جاتا تھا۔ جب آپ کو قریش کی تیاریوں کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جتنی اور جیسی کچھ تیاریاں ممکن تھیں، شروع کر دیں۔ لیکن یہ تیاریاں ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں، کہ یک بیک قریش کا لشکر نمودار ہو گیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر اس نے احد پر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ تعداد لشکر کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا بہت زیادہ ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہیں قریش کا لشکر بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہر طرف چوکی پہرے کا انتظام کیا۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر دو صحابی رات بھر مسلح کھڑے پہرہ دیتے رہے۔ دوسرے دن صبح مشورہ ہوا۔ کچھ لوگوں نے یہ رائے دی کہ شہر میں قلعہ بند ہو کر لڑا جائے۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ پہلی رائے دینے والوں میں عبداللہ بن ابی بھی

تھا۔ یہ بہت بڑا تھا اور منافقوں کا سردار بھی۔ بحث و مباحثہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری رائے قبول فرمائی اور بعد نماز جمعہ ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ بارادہ جنگ شہر سے باہر نکلے۔ ان ایک ہزار لوگوں میں تین سو عبداللہ کے آدمی تھے۔ وہ تھوڑی دور ساتھ چلنے کے بعد اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس نے کہا: جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میری رائے نہ مانی، تو میں ان کا ساتھ کیوں دوں۔

غور کر لیجیے یہ کتنا بروقت نفسیاتی وار تھا، جو اس منافق نے لشکر اسلام پر کیا تھا۔ مسلمان ایک ہزار سے سات سو رہ گئے۔ ان باقی ماندہ سات سو نفوس پر تین سو کے یک بیک الگ ہو جانے کا کیا اثر پڑنا چاہیے تھا، لیکن آپ کو خدا پر بھروسہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی پروانہ کی۔ یہی سات سو جاں نثار لے کر ایک بڑے لشکر کے مقابلہ کو نکلے اور بالآخر خدا نے فتح عطا فرمائی۔ عبداللہ کو اس حرکت کی سزا یہ سات سو آدمی، وہیں ''قضیہ زمین برسر زمین'' کے مطابق دے سکتے تھے۔ اور جنگ احد کے خاتمے کے بعد تو بڑی آسانی سے ایک نازک وقت میں دھوکہ دے کر الگ ہو جانے والے تین سو آدمیوں کو نہیں، تو ان کے سردار کو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کچھ نہ ہوا۔ نہ منافقین کو کوئی سزا دی گئی، نہ ان کے سردار عبداللہ کے ساتھ کسی طرح کا منتقمانہ رویہ اختیار کیا گیا۔

یہودیوں کا اسلام اور داعی اسلام کے ساتھ جو مفسدانہ، باغیانہ اور سرکشانہ رویہ تھا، اسے تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔ وہ صلح و اسلام کے ہر عہد نامے کو ردّی کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ کسی موقع پر لچک اور نرمی کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ یہودیوں کے ایک قبیلہ بنونضیر کی سرکشی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعوں میں پناہ گزیں تھے، وہاں ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مدینہ کے منافق ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے معاہدہ صلح کر لینے کی خواہش فرمائی

تو وہ لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس موقع پر بھی عبداللہ بن ابی نے حسب معمول انہیں شہ دی اور اطمینان دلایا کہ جب تم لڑنے نکلو گے تو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ میں بھی تمہاری مدد کو آؤں گا (ابو داؤد) عبداللہ کی اس حرکت کی اطلاع وحی الٰہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی کہ یہ منافقین کافروں (یہودیوں) سے کہہ رہے ہیں: اگر تم مقابلہ کے لیے نکلے، تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

کیا اس سے بڑا جرم بھی کوئی ہوسکتا ہے، جس کا ان منافقوں نے ارتکاب کیا تھا؟ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کسی طرح کی کوئی باز پرس نہ فرمائی، اپنی تیاریوں میں لگے رہے۔ نہ منافقین کی پروا کی، نہ یہودیوں کی طاقت سے مرعوب ہوئے۔ انصار اور مہاجرین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اخوات پیدا کردی تھیں کہ اس بھائی چارہ کے آگے صلب اور رحم کے رشتے ہیچ تھے۔ کوئی انصاری اگر مرتا تھا تو مہاجر بھائی اس کی وراثت میں حصہ پاتا تھا۔ ایسی مواخات دنیا میں پہلی بار قائم ہوئی تھی پھر اس کے بعد دنیا یہ دل آویز منظر نہ دیکھ سکی۔

منافقین اس کوشش میں رہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار میں غلط فہمی پیدا کر کے جنگ و پیکار کرادیں تاکہ عجیب وغریب بھائی چارہ بھی ختم ہو، اور ان دونوں کے اتحاد نے کفار و مشرکین کے لیے جو ایک خطرہ پیدا کردیا ہے، وہ بھی دور ہوجائے مگر ان کی کوششیں کبھی بار آور نہیں ہوئیں بلکہ ایک مرتبہ قریب تھا کہ یہ کوشش کامیاب ہوجائے۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کے ذاتی جھگڑے کو عبداللہ نے قومی اور طبقاتی جھگڑا بنادینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ دونوں نے اپنے اپنے طبقہ (مہاجرین اور انصار) کو مدد کے لیے پکارا۔ تلواریں کھنچ گئیں اور لڑائی کا میدان تیار ہوگیا۔ لیکن چند معاملہ فہم لوگوں نے مداخلت کی۔ بات بڑھنے نہ پائی، بغیر کسی خونریزی کے وہیں کی وہیں ختم ہوگئی۔

ایسا زریں موقعہ جب ہاتھ سے نکلتا دیکھا، تو عبداللہ تلملا اٹھا۔ اس نے انصار سے مخاطب ہوکر کہا:

تم نے خود ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔ مہاجرین کو تم نے اتنا بڑھایا کہ اب وہ برابری کا دعویٰ کر کے تمہارے منہ آنے لگے ہیں۔ اب بھی موقع ہے، اپنا دستِ اعانت کھینچ لو، تو یہ (مہاجرین) فوراً (بے یار و مددگار ہونے کے باعث) بھاگ کھڑے ہوں گے۔

عبداللہ کی یہ باتیں ایسی نہ تھیں، جو نظر انداز کردی جاتیں، معاملہ دربارِ رسالت میں پہنچا، حضرت عمر بھی موجود تھے انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''کسی کو حکم دیجئے وہ اس منافق کی گردن اڑادے!'' اور کون کہہ سکتا ہے، حضرت عمر کی یہ رائے قرین صواب نہ تھی؟ لیکن کیا رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے اس مشورہ کو قبول کرلیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

''کیا تم اسے پسند کرو گے کہ لوگ کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کردیتے ہیں؟''

حضرت عمر کچھ جواب نہ دے سکے اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو تمام نے ایک بہت بڑے منافق کی جان بچالی۔

یہی نہیں اس رئیس المنافقین کے ساتھ ایک اس سے بھی بڑا اور حیرت انگریز واقعہ پیش آتا ہے۔ جب عبداللہ بن ابی کی منافقانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں، ان میں کسی طرح کی کمی واقع نہ ہوئی، بلکہ اضافہ ہونے لگا، تو مسلمانوں میں اس کے قتل کا چرچا ہونے لگا۔ یہ افواہ پھیلنے لگی اب وہ بچ نہیں سکتا۔ ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قتل کا حکم امروز فردا میں صادر فرمادیں گے۔

بات قرین قیاس تھی۔ شدہ شدہ عبداللہ بن ابی منافق اعظم کے بیٹے عبداللہ کو یہ خبر پہنچی۔ یہ عبداللہ بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ اسلام کے شیفتہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اور باپ کے خدمت گزار، یہ خبر سن کر سیدھے، دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''جو کچھ میں نے سنا ہے (عبداللہ بن ابی کے حکم قتل کے متعلق) اگر وہ صحیح ہے تو صرف اتنی استدعا کرنا چاہتا ہوں، مجھے حکم دیا جائے: میں اپنے باپ کا سر بھی

کاٹ کر قدموں پر لا کر پھینک دوں گا۔"

آپ نے یہ سنا اور جانتے ہو کیا جواب دیا: "نہیں! ہم اس کے قتل کا حکم نہیں دیں گے، اس سے لطف و کرم کا برتاؤ کریں گے۔" عبداللہ باپ کی جاں بخشی کی نوید سن کر چلے گئے۔ باپ بھی اپنی جان کے بچ جانے پر خوش ہوا لیکن اس کی منافقانہ سرشت جوں کی توں قائم رہی، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لڑائی پر صلح کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے یہودیوں اور مشرکوں سے معاہدے کیے اور ان پر سختی سے عمل کیا۔ لیکن مشرکین اور یہود کے معاہدے صرف اس لیے تھے کہ جب مناسب سمجھیں، انہیں چاک کر دیں۔ جنگ خندق (۵ھ) انہی عہد شکن یہودیوں اور قریش نے بغیر کسی وجہ کے برپا کی تھی۔ بنو نضیر تو خیر عہد شکنی میں ممتاز تھے ہی، بنو قریظہ بھی جو ابھی تک پاس عہد کرتے چلے آ رہے تھے، بنو نضیر کے بہکاوے میں آ گئے اور معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان کے ساتھی بن گئے۔ آپ نے معاہدے کی یاد دہانی اور اتمامِ حجت کے لیے دو صحابیوں کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا: "نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہے؟ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے؟" یوں بھی کفار و مشرکین کا لشکر بہت بڑا تھا۔ اب بنو قریظہ نے اس کی تعداد دس ہزار تک پہنچا دی (فتح الباری) اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس توکل اور نصرت الٰہی پر بھروسہ کے سوا کیا تھا۔ کفار و مشرکین کی اس متحدہ یلغار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ کر دی جائے، تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ ایک یہودی سردار حی بن اخطب نے اپنے خیال میں سچ ہی کہا تھا: "اب اسلام کا خاتمہ ہے۔"

اس دس ہزار کے لشکر جرار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی، پھر بے مائیگی مستزاد۔ حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ خندق کھود کر جنگ لڑی جائے۔ خندق کھودنے میں آپ نے برابر کا حصہ لیا۔ کفار و مشرکین نے تین طرف سے محاصرہ کر لیا تھا، حالات سخت نازک تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم

تھی، وسائل بھی ناپید تھے، روپیہ اور اناج بھی نہیں تھا لیکن کفر و شرک کی یورش سے گھبرانا اور پیٹھ پھیرنا مسلمان کا شعار نہیں۔ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد اور نازک ہوں، مسلمان کلمۂ الٰہی کی سربلندی کے لیے جان کو قربان کر دینا ایک کھیل سمجھتا ہے۔ ہاں تو تاریخ کا یہ عجیب و غریب کھیل جاری تھا۔ ایسا کھیل جسکی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

ایک مہینہ تک یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس محاصرہ نے مسلمانوں کی حالت اور زیادہ زار و زبوں کر دی۔ بار بار فاقے کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ صحابہ پر مسلسل تین فاقے گزر گئے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے دکھائے (عربوں کا معمول تھا کہ شدت گرسنگی کے عالم میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے تاکہ کمر سیدھی رہے) یہ منظر دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اخفائے حال مناسب نہ سمجھا، شکم مبارک کھولا، تو دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر میں منافقین کی کی خاصی تعداد تھی۔ شروع شروع میں تو اپنے انفاق کو چھپاتے رہے۔ لیکن جب شدائد کا دور سخت ہوا تو نفاق چھپائے نہ چھپ سکا۔ عذر ہائے لنگ پیش کر کے واپس جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ قرآن مجید میں جنگ خندق (جسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں، کیونکہ بہت سی جماعتوں نے متحد یلغار کی تھی) کے متعلق جو سورہ (احزاب) ہے، اس میں ان کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے عذرات کا مقصد راہ فرار تلاش کرنا ہے: ان لوگوں (منافقوں) کا ارادہ صرف یہ ہے کہ بھاگ کھڑے ہوں۔

لیکن راہ فرار تلاش کرنے والے ان منافقوں کے ساتھ نہ صرف وہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا، جو میدان جنگ سے بھاگنے والے سپاہی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ انہیں کسی طرح کی سزا نہیں دی۔ ایک طرف ان کا یہ حال تھا، دوسری طرف کھرے اور سچے مسلمان تھے، جو اس جنگ کی ہر حالت میں ہر سختی اور ہر مصیبت کے موقع پر جان ہتھیلی پر لیے قربان ہونے کو تیار تھے، وہ جانتے تھے، جان خدا کی دی ہوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ خدا کی راہ میں کام آ جائے: ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مدینہ سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد خیبر ان کا مستحکم ترین اور ناقابلِ تسخیر قلعہ بن گیا تھا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اسلام اور داعی اسلام اور مسلمانوں کے تخریب کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ سازشیں کیا کرتے اور جنگی منصوبے بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگ خیبر سے کچھ قبل یہودیوں نے بنوغطفان کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی طرح ڈالنا چاہی۔ مدینہ کے منافقین برابر یہودیوں کو خبریں پہنچارہے تھے اور شہ دے رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ جنگ نہ ہو بلکہ معاہدۂ صلح ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ایک صحابی کو بھی بھیجا، لیکن وہ جنگ فتح کر لینے کے نشہ میں تھے۔ صلح کی باتیں کیا سنتے؟ پھر جب کہ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے انہیں یقین دلا رکھا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کر سکتے تھے، مٹھی بھر آدمیوں کے سوا ان کے پاس ہتھیار تک نہیں، وہ کیا لڑیں گے؟ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غطفان، جواب تک شرکت یہود کے بارے میں تذبذب میں تھے، ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

منافقین کی یہ دراندازیاں اس لیے تھیں کہ وہ جانتے تھے، انہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ انہیں جماعت سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ اس کا اسلام زیر بحث نہیں لایا جائے گا، اس لیے اسلام کا یہ اصول ہے کہ کسی ایسے شخص کی جان نہیں لیتا، جو اسلام کا مدعی ہو۔ اگر چہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ بول رہا ہو۔

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ منافقین کی سب سے بڑی اور دیرینہ تمنا یہ تھی کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو۔ وہ ایک دوسرے سے الجھ پڑیں، ان میں جو اخوت محبت، ہمدردی اور ملاطفت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، وہ سرد پڑ جائے تا کہ اسلام پنپ نہ سکے اور یہ ملت خود آپس کے نزاع میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ چنانچہ مسجد قبا کے توڑ پر انہوں نے ایک جداگانہ مسجد بنائی تا کہ مسلمانوں میں آسانی سے تفرقہ پیدا کیا جا سکے۔ وجہ یہ بتائی کہ معذور اور اپاہج لوگ، جو مسجد قبا میں نہیں جا سکتے، وہ یہاں آ کر نماز پڑھ لیا کریں۔

آنحصرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الٰہی نے بتایا کہ دراصل مقصد کیا ہے۔ چنانچہ

سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے: اور ان لوگوں نے مسجد ضرار کفر کے لیے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں آگ لگوادی اور اسے مسجد کے طور پر نہیں استعمال ہونے دیا۔ لیکن منافقوں کو ہر سزا سے محفوظ رکھا۔

فتح مکہ سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی۔ رومیوں کا ایک لشکر گراں مسلمانوں سے برسر پیکار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ سن کر آپ نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اگر چہ موسم نہایت گرم تھا (گرمی اور وہ بھی عرب کی) اور قحط کی شدت نے حالات کو حد درجہ نامساعد بنا دیا تھا۔ لیکن آپ کی تیاریاں جاری تھیں اور جو مخلص مسلمان تھے وہ ان شدائد کے باوجود راہ خدا میں اپنی جان قربان کر دینے کو تیار اور آمادہ تھے لیکن منافقین؟ نہ صرف یہ کہ بہانہ بازی اور عذر تراشی کر کے وہ ان کی سرگرمیوں سے الگ رہے، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو بھی بھڑکانا شروع کیا کہ اس قحط اور اس گرمی میں وہ کیوں گھر کی عافیت چھوڑ کر جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں: اس گرم موسم میں باہر نہ نکلو۔

یہ تھا دعوت رسالت کے جواب میں ان کا وہ خفیہ پیغام، جو مسلمانوں کے کانوں تک صرف اس لئے پہنچایا جا رہا تھا کہ وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جائیں۔ ان فتنہ طرازیوں کے باوجود نہ ان کی جان کو کوئی گزند پہنچا، نہ مال کو۔

ایک بدری صحابی نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر بلایا، وہاں تشریف لے گئے، تو کھانے کے لیے اصرار ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے، محلّہ کے تمام لوگ اس موقع پر موجود تھے کسی نے کہا: آج مالک بن دخیش نظر نہیں آتے۔ ''ایک شخص نے یہ سن کر کہا: وہ منافق ہے۔'' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نہ کہو وہ ''لا الہ الا اللہ'' کہتے ہیں۔'' سب خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سے ''لا الہ لا اللہ'' کہہ دینا ایک منافق کے لیے بھی سپر بن جاتا ہے۔

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جو تہمت لگائی گئی تھی، وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ حضرت عائشہ کی طہارت و تقدس کی خود قرآن مجید

نے توثیق فرمائی۔لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ام المومنین کی ذات گرامی پر ایسا رکیک اتہام! قدرتاً اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی۔حضرت ابوبکر کو بھی حد درجہ صدمہ ہوا اور خود حضرت عائشہ کے قلب و دماغ پر جو کچھ گزری، اس کا اندازہ ہر حساس شخص بآسانی کرسکتا ہے لیکن اتنے بڑے واقعہ کے سلسلے میں ہوا کیا؟ اس سلسلہ میں تین خاص اہم شخصیتوں کا ذکر لازمی ہے، تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی یعنی درّے لگائے گئے۔ان سزا یافتگان میں حضرت حسان بن ثابت بھی تھے، جو صحابی رسول اور شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔لیکن منافقین کے بہکاوے میں آگئے اور تہمت لگانے والوں میں شریک ہوگئے۔

ایک دوسرے صاحب مسطح بن اثاثہ تھے۔یہ بھی تہمت لگانے والوں میں (منافقین کے بہکاوے میں آکر) شریک تھے۔انہیں بھی شرعی سزا ملی لیکن مزید سزا یہ ملی کہ حضرت ابوبکر نے جو ان کے کفیل معاش تھے، اپنی مالی امداد بند کردی اور قسم کھالی کہ ایسے شخص کی مدد اب کبھی نہیں کریں گے۔یہ بات خدا کو بری لگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: تمہیں عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہاری مغفرت فرمائے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔(النور:۲۲)

لیکن اس واقعہ کا اصل ہیرو منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا اور آپ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا ہوا ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں، راسخ العقیدہ اور صالح مسلمانوں کو حد شرعی برداشت کرنا پڑی۔اس لیے کہ ان پر جرم ثابت تھا اور عبداللہ بن ابی صاف بچ گیا۔اس لیے کہ اسے خود اقرار نہیں تھا کہ اس نے تہمت لگائی اور شواہد و قرائن خواہ کتنے ہی قوی موجود ہوں، لیکن کوئی ایسی شرعی شہادت موجود نہیں تھی جس کی بنا پر اسے سزا دی جاسکتی۔کیا یہ معمولی واقعہ ہے؟ کیا اس عفو و درگزر اور لطف و مرحمت اور احسان و نعمت کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے؟ [بشکریہ نقوش لاہور رسول نمبر]

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ - رسولِ غیب داں

پروفیسر محمد مسعود احمد علیہ الرحمہ (پاکستان)

علم ایک عظیم قوت ہے، دورِ جدید میں علم کی اہمیت وقوت اور نمایاں ہوکر سامنے آگئی ہے، قرآنِ کریم نے انسان کو لکھنے پڑھنے (علق: ۴-۵) اور تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا (طٰہٰ: ۱۱۴) اور انسان کو وہ رازہائے سربستہ بتائے کہ اس کا دماغ روشن ہوگیا...... قرآنِ کریم علم و دانش کا عظیم خزانہ ہے اس میں علم اور مشتقات علم کا ۸۰۰ سے زیادہ مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اور کتاب و کتابت کا ۶۰۰ سے زیادہ مقامات پر ذکر کیا گیا ہے...... اس سے قرآنِ کریم کی نظر میں علم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے...... حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (ابن عبدالبر: جامع بیان العلم و فضلہ، ص ۴۷)...... آپ نے تحصیل علم کی تاکید شدید فرمائی اور علم کی فضیلت کو آشکارا فرمایا (ایضاً، ص ۴۹)...... حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ ''فضیلت تو صرف اہل علم کو ہے (ایضاً، ص ۴۶)، خود قرآنِ کریم میں حضرت طالوت علیہ السلام کو علم ہی کی وجہ سے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا (بقرہ: ۲۴۷)...... اور علم ہی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں پر فضیلت پائی (بقرہ: ۳۱)...... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت اور قیادت و بادشاہت کے لیے علم کتنا اہم ہے......

علم دو قسم کا ہے ...... ایک وہ جو ہم مدرسوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں ...... ہم اسی کو علم سمجھتے ہیں اور اسی پر یقین رکھتے ہیں لیکن ایک علم وہ ہے جو براہِ راست پڑھایا جاتا ہے...... اس کے لیے نہ کسی مدرسے کی ضرورت، نہ اسکول کی ضرورت، نہ کالج کی ضرورت، نہ یونیورسٹی کی

ضرورت...... یہ ایک پوشیدہ علم ہے جس کو قرآن حکیم نے ''علم غیب'' سے تعبیر فرمایا ہے (کہف:۶۵)۔ اور اس پر ایمان لانا ہر مسلمان کی نشانی قرار دیا (بقرہ:۳)...... یہ علم وہ ہے جس کو نہ انسانی عقل پاسکتی ہے اور نہ اس کے ظاہری و باطنی حواس...... یہ علم سارے علوم پر غالب ہے اور تحصیل وکسب سے اس کا کوئی تعلق نہیں...... یہ محض اللہ کے فضل وکرم سے بارش کی طرح برستا ہے، چشمے کی طرح اُبلتا ہے۔

قرآن حکیم نے بہت سی آیات میں ''علم غیب'' کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ علم اللہ اور صرف اللہ ہی کے لیے ثابت ہے......مثلاً یہ آیات ملاحظہ ہوں:

۱- اور اُسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی، انھیں وہی جانتا ہے۔[انعام:۵۹]

۲- میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں کی سب چھپی چیزیں۔[بقرہ:۳۳]

۳- تم فرماؤ، غیب تو اللہ کے لیے ہے۔[یونس:۲۰]

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا کہ آپ بھی اعلان فرمادیجئے:

۴- تم فرمادو، تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں کہ میں آپ غیب جان لیتا ہوں۔[انعام:۵/ ہود:۳۱]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ''غیب'' اللہ ہی کے لیے ہے......کوئی از خود ''غیب'' نہیں جانتا اور نہ بغیر عطائے الٰہی کسی کے پاس اللہ کے خزانے ہیں......ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے کہیں یہ نہ فرمایا کہ یہ ''علم غیب'' ہم کسی کو عطا نہیں فرماتے اور یہ خزانے ہم کسی کو نہیں دیتے......یہی سب سے اہم نکتہ ہے جس پر مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے......اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا:

۱- غیب کا جاننے والا وہی ہے، سووہ اپنے غیوب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں، مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو۔(جن:۲۶)

۲- اور اللہ تعالیٰ ایسے امور غیبیہ پر تم کو مطلع نہیں کرتے لیکن ہاں جس کو خود چاہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، اُن کو منتخب فرمالیتے ہیں۔(آل عمران: ۱۷۹-ترجمۂ اشرفعلی)۔

پھر یہی نہیں کہ صرف یہ بات کہی گئی ہو اور ''علم غیب'' عطا نہ کیا گیا ہو، نہیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو یہ علم عطا بھی فرمایا جس کا قرآن حکیم میں تفصیل سے ذکر ہے۔ مثلاً یہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱- اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رُوبرو کردیں۔(بقرہ:۳۱)

۲- حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے فرمایا: اور جو بھی منظور ہوا اُن کو تعلیم فرمایا۔ (بقرہ:۲۵۱)

۳- حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس ''علم غیب'' کا یوں ذکر فرمایا: اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی کی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو ہر قسم کی چیزیں دی گئی ہیں۔(نمل:۱۶)

۴- حضرت لوط علیہ السلام کے لیے فرمایا: اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا فرمایا۔(انبیاء:۷۴)

۵- حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے فرمایا: اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے اُن کو علم دیا تھا لیکن اکثر اس کا علم نہیں رکھتے۔ (یوسف:۶۸-ترجمۂ اشرفعلی)

۶- حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود بھی اپنے بیٹوں کے سامنے اس عطائے ربانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: کیوں، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے؟(یوسف:۹۶)

۷- حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے فرمایا: اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے ہم نے اُن کو حکمت اور علم عطا فرمایا(یوسف:۲۲)

۸- اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا: اور جب اپنی بھری جوانی کو پہنچے اور درست ہوگئے، ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا۔(قصص:۱۴)

۹- اور حضرت خضر علیہ السلام کے لیے فرمایا: انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی اور ہم نے اُن

کو اپنے پاس سے خاص طور کا علم سکھایا تھا۔ (کہف:۶۵)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبیوں کو ''علم غیب'' عطا فرمایا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے......ان حضرات قدسیہ نے کبھی کبھی اس علم کا اظہار بھی فرمایا جیسا کہ قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیروکاروں سے یہ ارشاد فرمارہے ہیں:

۱۰- اور میں تم کو بتلادیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو رکھ آتے ہو۔ (آل عمران:۴۹)

یعنی جس جس نے جو کچھ اپنے گھر میں کھایا اور جو کچھ گھر میں رکھا، سب آپ کی نظر میں تھا......حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے میں قیدیوں کو خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے فرمارہے ہیں:

۱۱- جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لیے ملتا ہے، میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتادیتا ہوں۔ یہ بتلادینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا۔ [یوسف:۳۷-ترجمۂ اشرفعلی]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں کو علم غیب عطا فرمایا ہے، اس عطائے خاص سے انکار، قرآن سے انکار ہے......یہ علم کوئی معمولی علم نہیں......بڑے اہتمام اور تیاری کے بعد عطا فرمایا جاتا ہے اور جس کو عطا فرمایا جاتا ہے، اُس کے آگے اور پیچھے فرشتوں کے پہرے لگادیے جاتے ہیں......ارشاد فرماتا ہے:

سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ہاں، مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو، تو اس (پیغمبر) کے آگے اور پیچھے محافظ (فرشتے) بھیج دیتا ہے۔ (جن:۲۶)

بے شک جس کو یہ عطا کیا گیا اُس کو بہت کچھ عطا کیا گیا......تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو یکساں ''علم غیب'' حاصل نہیں بلکہ جس طرح انبیاء و رسل میں درجات (بقرہ: ۲۵۳) ہیں، اس طرح ''علم غیب'' بھی درجہ بدرجہ عطا کیا گیا ہے......قرآن حکیم سے اس کی تصدیق ہوتی ہے......حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ ''علم غیب'' سیکھنے کی درخواست کی جو اللہ نے اُن کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے درخواست منظور کی مگر یہ ہدایت فرمائی کہ ''دیکھتے جانا، بولنا نہیں، جب تک میں نہ بولوں'' (کہف: ۷۰)......حضرت خضر علیہ السلام جو کچھ کرتے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھ سکے، آخر رہا نہ گیا، پوچھ لیا، حضرت خضر علیہ السلام نے راز سے پردہ اٹھادیا مگر پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ نہ رکھا......یہ پوری تفصیل قرآن حکیم میں موجود ہے (کہف: ۶۵-۸۲)......اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کو یکساں ''علم غیب''، نہیں دیا گیا۔

''علم غیب'' حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطا فرمایا گیا......یہ ''علم غیب'' ہی آپ کا بڑا معجزہ تھا، مختلف انبیاء کو مختلف معجزات دیئے گئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ عطا فرمایا......کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو جو ''علم غیب'' دیا گیا وہ سب آپ کو دیا گیا اور اس کے سوا جو کچھ دیا وہ سوائے اللہ کے کسی کو نہیں معلوم......حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کی صفاتِ حسنہ کے جامع تھے اور اُن کے علوم و معارف کے بھی جامع تھے......حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ دیا گیا اس کے متعلق ارشاد ہے:

اور تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔ (نسآء:۱۱۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اب کوئی چیز ایسی نہ رہی جو آپ نہ جانتے ہوں، اس لیے اس نعمت کو اللہ نے ''فضل عظیم'' کہا ہے......حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ پڑھایا اللہ نے پڑھایا (اعلیٰ:۶)......اگر استاد، شاگرد سے یہ بات کہے ''میں نے تم کو پڑھایا ہے، تم تو کچھ نہ جانتے تھے'' تو یہ حق ہے، گستاخی و بے ادبی نہیں......لیکن اگر کوئی شاگرد، اپنے استاد سے یہ کہے ''تم تو کچھ نہ جانتے تھے، تمہارے استاد نے تم کو پڑھایا'' تو یہ سراسر بے ادبی اور گستاخی ہوگی......تاریخ انسانیت میں ایسا بے ادب شاگرد نظر نہیں آتا......اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھایا، جو کچھ عطا فرمایا، اللہ ہی نے عطا فرمایا تو اگر اس نے قرآنِ کریم میں عطا سے پہلے کی کیفیت

کو یوں بیان فرمایا......ماتدری ما الکتب و لا الایمان (شوریٰ:۵۲) تو یہ اللہ کی شان کے لائق ہے، ہمیں زیب نہیں دیتا کہ بے ادب و گستاخ شاگرد کی طرح آپ کے حضور وہ بات کہیں جو حق جلّ مجدہٗ نے آپ سے فرمائی...... بے شک اللہ نے آپ کو ''علم غیب'' عطا فرمایا...... جو شخص اس فضل الٰہی کا انکار کرتا ہے یا اس کی تخفیف کرتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتا ہے اور اللہ کے فضل کی تخفیف کرتا ہے جو ایسا کرتا ہے اُس کو کون مسلمان کہہ سکتا ہے...... موحد کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے ہر ہر حکم کا احترام کرتا ہے، اس پر خود عمل کرتا ہے اور دوسروں کو عمل کرواتا ہے...... حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار، بڑا دربار ہے، اُن کے حضور بلند آواز سے بولنے والے کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں...... اُن کی محفل مبارک سے بلا اجازت اٹھنے والے کو دردناک عذاب کی وعید سنائی جارہی ہے...... آپ بھی سنیے...... ارشاد ہوتا ہے:

تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جانتا ہے جو آڑ میں ہو کر تم میں کھسک جاتے ہیں، سو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اُن کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ اُن پر کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے۔ (نور:۶۳، ترجمۂ اشرفعلی)

آپ خود اندازہ لگائیں جس محفل مبارک کا یہ اَدب ہو اس میں رونقِ محفل سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ادب ہوگا؟ ......صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس محفل پاک میں سر جھکائے دم بخود بیٹھے رہتے تھے...... بات بات پر کہتے ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان''!...... ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا، ''اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ جانتے ہیں''......

بے شک حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے پروردگار نے ''علم غیب'' عطا فرمایا۔

اس حقیقت کو تین جہتوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

۱- آپ کو براہِ راست ''علم غیب'' عطا کیا۔

۲- آپ کو قرآن عطا فرمایا گیا جو ''علم غیب'' کا خزانہ ہے۔

۳- آپ کو ''شاہد'' بنا کر بھیجا گیا اور شاہد وہی ہوتا ہے جو واقعہ کے وقت موجود بھی ہو اور دیکھ بھی رہا ہو یعنی اس کو ہر بات کا عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔

(۱) حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے ''علم غیب'' کو پہلی جہت سے دیکھا جائے تو یہ آیات آپ کے ''علم غیب'' کی تصدیق کرتی ہیں:

۱- یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف (ہود:۴۹)

۲- یہ خبریں ہیں غیب کی کہ ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس (یوسف:۱۰۲)

۳- اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں (تکویر:۲۴ تراجم محمود حسن)

(۲) حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے ''علم غیب'' کو دوسری جہت سے دیکھا جائے تو یہ آیات ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں:

۱- ہم نے آپ پر یہ قرآن اُتارا ہے جو کہ تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے (نحل:۸۹)

۲- (یہ قرآن) کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا (یوسف:۱۱۱)

۳- ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا (انعام:۳۸)

۴- بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب (مآئدہ:۱۵)

۵- اور کوئی چیز نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے، کھلی کتاب میں (نمل:۷۵)

۶- اور کوئی دانہ زمین کے اندھیروں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز مگر وہ سب کتاب مبین میں ہے (انعام:۵۹)

آپ نے ملاحظہ فرمایا، ان آیات میں پہلے ''کتاب مبین'' قرآن حکیم کا ذکر فرمایا پھر یہ فرمایا کہ اس روشن کتاب میں کیا کیا کچھ ہے......غور فرمائیں، یہ روشن کتاب جس میں زمین و آسمان کی ہر شے کا بیان ہے جس ذات قدسی پر اُتری، اُس

کے علم و دانش کا کیا عالم ہوگا!

(۳) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے "علم غیب" کو تیسری جہت سے دیکھا جائے تو یہ آیاتِ کریمہ ہم کو ایک نئے جہان میں لے جاتی ہیں جہاں ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں، مگر جو کچھ کہا گیا اُس پر دل و جان سے ایمان لاتے ہیں کہ اگر ایمان نہ لائیں تو کہیں کے نہ رہیں، ان آیات پر خوب غور فرمائیں اور علم مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وسعت و پہنائی کا اندازہ لگائیں، اللہ اکبر! ہم کیا اندازہ لگا سکتے ہیں، ان کا رب کریم ہی جانے کہ اُس نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر "علم غیب" عطا فرمایا:...... اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

۱- ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے (فتح:۸)

۲- اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے حاضر لائیں گے (نسآء:۴۱)

۳- بے شک ہم نے تمہارے پاس ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہی دے گا (مزمل:۱۵)

۴- اور جس دن ہم ہر ہر اُمت سے ایک ایک گواہ جو انھیں میں سے ہوگا ان کے مقابلے میں قائم کریں گے اور ان لوگوں کے مقابلے میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (نحل:۸۹)

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اپنی اُمت بلکہ دوسرے انبیاء کی اُمتوں کے اعمال کی بھی گواہی دیں گے اور گواہی وہی دیتا ہے جس کے سامنے کوئی کام یا کوئی بات ہوئی ہو...... ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ ملاحظہ فرمارہے ہیں، وہ ہمارے احوال و اعمال سے بے خبر نہیں...... اس پس منظر میں یہ احادیث کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

۱- ایک حدیث پاک میں فرمایا: جس طرح میں آگے دیکھتا ہوں اُسی طرح

پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ (مسلم شریف، ۲/۱۱۶)

۲- دوسری حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ جاتے ہوئے وادیٔ ازرق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلند آواز سے تلبیہ پڑھتے ہوئے دیکھا پھر وادیٔ ہرشیٰ میں حضرت یونس علیہ السلام کو اُونی جبہ پہنے سرخ اونٹنی پر سوار دیکھا (ابن ماجہ، ص۲۰، ۲۰۸)۔

۳- تیسری حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جنت و دوزخ ملاحظہ فرمارہے ہیں (مسلم شریف، ۲/۱۸۰)

۴- چوتھی حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جنت و دوزخ میں جانے والے ہر فرد کو نام بنام جانتے ہیں (مشکوٰۃ شریف، ص۱۹)

۵- پانچویں حدیث پاک سے معلوم ہوتا کہ جب ایک شخص نے محفل پاک میں یہ دریافت کیا کہ وہ جنت میں جائے گا یا دوزخ میں تو آپ نے برملا ارشاد فرمایا، تو دوزخ میں جائے گا۔ (بخاری شریف، ۳/۸۵۵)

۶- چھٹی حدیث پاک میں فرمایا: میری ساری اُمت اپنے سب اعمال نیک و بد کے ساتھ میرے حضور پیش کی گئی۔ (مسلم شریف، ۱/۲۰۷)

۷- ساتویں حدیث پاک میں فرمایا: رات میری سب اُمت میرے اس حجرے کے پاس پیش کی گئی، یہاں تک کہ بے شک اُن کے ہر شخص کو اس سے زیادہ پہچانتا ہوں جیسا تم میں کوئی اپنے ساتھی کو پہچانے۔ (انباء المصطفیٰ، ص۹ بحوالہ طبرانی)

قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہوا......

کیا اُس شخص کے پاس علم غیب ہے کہ اُس کو دیکھ رہا ہے؟ (نجم:۳۵)

اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم غیب اُسی کے پاس ہوتا ہے جو دیکھ بھی رہا ہے...... قرآن کریم میں متعدد مقامات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ دید کو بیان کیا گیا ہے۔ (مجادلہ:۷؛ ابراہیم:۱۹؛ بقرہ:۲۴۳، ۲۵۸؛ حج:۸۱؛ نور:۴۱؛ فیل:۱)

سچی بات یہ ہے کہ جس نے اللہ کو دیکھ لیا، اس کے آگے کوئی چیز چھپی نہ رہی،

سب ظاہر ہوگئی......حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم خود فرمارہے ہیں:

میں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا، اُس نے اپنا دستِ قدرت میری پشت پر رکھا کہ میرے سینے میں اُس کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اُسی وقت ہر چیز مجھ پر روشن ہوگئی اور میں نے سب کچھ پہچان لیا۔

اب تک تو حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی وسعتوں اور آپ کے دیکھنے کی باتیں ہورہی تھیں......لیکن جو ''علم غیب'' آپ کو عطا کیا گیا اور جو کچھ آپ کو دکھایا گیا، کیا اس نعمتِ عظمٰی کی خیرات اپنے غلاموں کو بھی آپ نے تقسیم فرمائی؟ ......بہت سی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے عطا فرمایا اور خوب عطا فرمایا، اور کیوں عطا نہ فرماتے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمانے ہی کے لیے بھیجا ہے......مشہور و محبوب صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

۱- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس حال پر چھوڑا کہ ہوا میں کوئی پرندہ پر مارنے والا ایسا نہیں جس کا علم حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے بیان نہ فرمادیا ہو۔ (انباء المصطفٰے ص ۸ بحوالہ مسند احمد و طبقات ابن سعد)

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ہم میں کھڑے ہوکر جب سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا سب بیان فرمادیا، کوئی چیز نہ چھوڑی......جسے یاد رہا، یاد رہا......جو بھول گیا، بھول گیا۔ (انباء المصطفٰے، ص ۷، بحوالہ بخاری شریف و مسلم شریف و مسند احمد)

۳- نہیں چھوڑا حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فتنے چلانے والے کو دنیا کے ختم ہونے تک......مگر ہم کو اس کا نام، اس کے باپ کا نام اور اس کے قبیلے کا نام بتادیا۔ (مشکوٰۃ شریف باب الفتن)

۴- ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ/۶۲۴ء میں غزوۂ بدر پیش آیا، جہاد شروع ہونے سے قبل میدان جہاد میں اپنا دستِ مبارک رکھ رکھ کر دشمنانِ اسلام

کے مقتولین کی نشاندہی فرمائی کہ فلاں فلاں شخص اس اس جگہ قتل کیا جائے گا......جب جہاد ختم ہوا تو جس شخص کے لیے اپنے دستِ مبارک سے جس جگہ کی نشاندہی فرمائی تھی، وہ وہیں پڑا ہوا ملا۔ ایک انچ آگے نہ پیچھے۔ (مسلم شریف، ج ۲، کتاب الجہاد)

بخاری شریف میں ایک طویل حدیث آتی ہے جو ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے......حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

۵- سورج ڈھلنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، پھر ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی، جب سلام پھیر دیا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا، نیز ان بڑے بڑے امور کا جو اس سے پہلے کے ہیں......پھر فرمایا ''اگر کوئی مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے تو پوچھ لے۔ کیوں کہ خدا کی قسم تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھو گے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بتادوں گا، جب تک کہ میں اس جگہ ہوں......حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ لوگ زاروقطار رونے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے رہے کہ ''مجھ سے پوچھ لو'' - ''مجھ سے پوچھ لو''! (بخاری شریف، کتاب الاعتصام، ج ۳، ص ۸۵۵)

اس حدیث پاک پر یہ آیت کریمہ گواہ ہے: اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں۔ (تکویر: ۲۴)

یعنی جو پوچھو گے، بتایا جائے گا......جو مانگو گے، دیا جائے گا......

حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم کا قسم کھا کر یہ فرمانا کہ جو پوچھو گے بتایا جائے گا......اور پھر بار بار فرمانا، مجھ سے پوچھ لو، مجھ سے پوچھ لو!......اس حقیقت پر گواہ ہے کہ حضورانورصلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے فضل و کرم سے ''غیب'' حاصل تھا۔ ایک عرب عالم شیخ احمد بن محمد بن الصدیق الغماری الحسنی نے ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے ''مطابقۃ الاختراعات العصریہ لما اخبر بہ سید البریہ''۔ (مفتی احمد میاں برکاتی نے ''اسلام اور عصری ایجادات'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۹۸۰ء میں لاہور

سے شائع ہو چکا ہے)...... مصنف نے اس کتاب میں اُن غیبی خبروں کو جمع کیا ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں۔ پڑھ کر حیرت بڑھتی جاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ماضی و مستقبل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئینہ تھے...... اور کیوں نہ ہوں کہ سرکار خود فرما رہے ہیں: میرے پاس زمین کے خزانوں کی کنجیاں لائی گئیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دی گئیں (بخاری شریف، ص ۸۴۸)

خزانے کا مالک وہی ہوتا ہے جس کے پاس کنجیاں ہوتی ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ، اللہ تعالےٰ بے اختیار ہو گیا بلکہ اس سے اللہ کا اختیار اور قدرت اور ظاہر ہوتی ہے...... اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا نوازا ہے! یہی وہ کنجیاں ہیں جن سے آیاتِ قرآن کے معانی کے خزانے کھولے جاتے ہیں...... قرآن کو ہم بھی دیکھتے ہیں، ہم بھی پڑھتے ہیں مگر آیاتِ قرآنی میں نگاہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ دیکھتی ہے ہم نہیں دیکھ سکتے...... صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں...... قرآن کریم میں ایک آیت ہے:

اور اُن کے لیے تیار رکھو جو ''قوت'' تمہیں بن پڑے (انفال: ۶۰)۔ (یعنی دشمنانِ اسلام کے لیے) یہاں لفظ ''قوت'' کے معنی میں بظاہر کوئی راز نہیں معلوم ہوتا لیکن جب اس راز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پردہ اٹھاتے ہیں تو انسانی عقل حیران ہو جاتی ہے...... لفظ ''قوت'' کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

خبردار، یہ قوت ''رمی'' ہے!...... خبردار، یہ قوت ''رمی'' ہے!...... خبردار، یہ قوت ''رَمی'' ہے۔ (مسلم شریف، ج ۲، ص ۱۴۳)

عربی میں ''رمی'' کے معنی ''پھینکنا'' آتے ہیں۔ چنانچہ حج میں جمرات پر جو کنکریاں پھینکی جاتی ہیں اس کو ''رمی'' کہتے ہیں...... اس حدیث پاک میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن تمام ہتھیاروں کا ذکر فرمایا جو آج ہمارے سامنے ہیں اور قوت کا توازن اس ملک کے حق میں ہے جس کے پاس یہ ہتھیار ہیں۔ خصوصاً خطرناک ایٹم بم، راکٹ، میزائیل وغیرہ...... یہ سب ہتھیار پھینکے جاتے ہیں اور ''قوت'' کا راز بنے ہوئے ہیں۔

احادیث کا مطالعہ کریں تو آپ کو غیبی خبروں کا ایک سیلاب اُمنڈتا نظر آئے گا۔

...... اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا اُس کی روشنی میں ہمیں ''علم غیب'' کے بارے میں جن حقائق کا علم ہوتا ہے، ان حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

۱- پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''علم غیب'' ایک حقیقت ہے۔

۲- دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''علم غیب'' اللہ ہی کے لیے ہے۔

۳- تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ''علم غیب'' عطا فرماتا ہے۔

۴- چوتھی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام کو ''علم غیب'' عطا فرمایا ہے۔

۵- پانچویں بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''علم غیب'' عطا فرمایا ہے۔

۶- چھٹی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ''علم غیب'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا ہے اور انھوں نے ہم کو بتایا۔

اس وقت دنیائے اسلام، عالمی سازش کی زد میں ہے۔ دشمنانِ اسلام کا ہدف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ یہی وہ مرکز قلب ونظر ہے جس سے زندگی ملتی ہے۔ اس سازش کے تحت مسلمانانِ عالم کو ہر اُس سوچ اور ہر اُس عمل سے روکا جا رہا ہے جس سے دل ودماغ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کا نقش بیٹھتا چلا جائے...... اس سازش سے آپ خود کو محفوظ رکھیں اور یہ یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ عطا فرمایا ہے۔ بے شک ؎

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے وجود میں حباب

مصطفٰے جان رحمت ﷺ کے جوامع الکلام

جسٹس مفتی سید شجاعت علی قادری

(پاکستان)

دنیا میں جتنے انبیاء کرام ورسل عظام صلوت اللہ وسلام علیہم اجمعین جلوہ فرما ہوئے۔ سب کے سب ''آیات بینات'' معجزات باہرات'' سے موید ومصدق تھے۔ نبوت ورسالت کا تصور معجزہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

ہم نے آپ سے پہلے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا کہ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ تو اگر علم نہیں رکھتے ہو تو اصحاب علم سے پوچھ لو۔ (ان کو) معجزات اور صحیفوں کے ساتھ بھیجا۔ (نحل: ۴۳، ۴۴)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے نبوت ورسالت مردوں ہی کے ساتھ خاص ہے، کبھی کسی عورت کو نبوت نہیں دی گئی۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام معجزات اور صحیفوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ اس آیت کے علاوہ قرآن کریم میں لاتعداد جگہ انبیاء کے ذکر کے ساتھ ''بالبینات'' کا لفظ موجود ہے۔ پھر وحی بذات خود ''امر خارق اللعادۃ'' ہے اور معجزہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی نبی بغیر وحی نبوت کے نبی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس مشترک معجزہ کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو خصوصی معجزات سے بھی نوازا گیا۔ جب ہم معجزات انبیاء پر تفصیلی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حکمت نظر آتی ہے کہ ہر نبی کو اسی قسم کا معجزہ عطا ہوا، جس قسم کے کمال کا دعوی اس کی قوم کو تھا۔ تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ظاہری اسباب کو اختیار کر کے جو کچھ حاصل ہوسکتا ہے، وہ تم نے حاصل کر لیا۔ اب ہمارا نبی جو کچھ پیش کر دے وہ ''مافوق الاسباب'' ہے اور یہ تائید الٰہی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہ مدعی

نبوت جھوٹا ہوتا تو تائید الٰہی کبھی اس کے شریک حال نہ ہوتی۔ یہی ''تلازم'' ہے معجزہ اور ثبوت نبوت میں مثلاً سیدنا داؤد علیہ السلام کی قوم ''فن آہن گری'' میں کمال رکھتی تھی تو آپ کو اس قسم کا معجزہ عطا ہوا۔ آپ کے ہاتھ میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور زرہیں اور دوسری آہنی اشیاء ایسی عمدہ بنا لیتے تھے کہ پوری قوم اس سے عاجز تھی۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قوم کو اپنی ''طبابت'' پر ناز تھا۔ مگر کوڑھیوں اور مادرزاد اندھوں کو شفا دینے سے وہ قاصر تھے۔ ان کا علاج ان کے پاس نہ تھا۔ قرآن کریم نے صراحتاً بیان کر دیا کہ عیسٰی السلام کوڑھیوں، مادرزاد اندھوں کو شفا دیتے، حتی کے مردوں کو بھی باذن الٰہی زندہ کر دیتے تھے۔

حضور اکرم، نور مجسم، نبی محترم رسول محتشم صلی اللہ علیہ وسلم جس عہد میں تشریف لائے اور جس قوم کی طرف آپ کی اولین بعثت ہوئی، اس میں فصاحت و بلاغت اور زبان آوری کا چرچا تھا۔ اس قوم میں جو مقام شاعر وادیب کو حاصل تھا، وہ کسی کو نہ تھا۔ شاعر یا خطیب خود معزز تھا ہی جس قبیلہ میں وہ پیدا ہوتا وہ قبیلہ بھی معزز ہو جاتا۔ لوگ اسے مبارک باد دیتے اور اس کی عزت کرتے۔ اس لئے آپ کو جو سب سے بڑا معجزہ عطا ہوا، وہ فصاحت و بلاغت سے متعلق ہے تا کہ وہ قوم جو اپنی زبان آوری پر متفخر ہے۔ اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس نبی کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر یا تو ساکت ومبہوت ہو جائے یا حق وصداقت کا یقین کر کے دولت ایمان سے مالا مال ہو جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معجزہ کا ذکر ایک حدیث میں کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں سے فضلیت دی گئی ہے۔ مجھے ''جوامع الکلم'' دیئے گئے ہیں۔ (مسلم شریف)

اس حدیث کی تشریح میں محدثین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصیح و بلیغ بنایا۔ آپ مختصر عبارات سے دقیق اور غامض پر از حکمت مفاہیم ومعانی کو آسانی ادا فرمادیتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن عزیز ہے۔ مگر میں یہ سمجھتا

ہوں کہ اگر اس سے بیک وقت دونوں چیزیں مراد ہو جائیں تو کسی قسم کی قباحت لازم نہ آئے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک ''وحی متلو'' ہے اور دوسری ''غیر متلو'' وحی یعنی قرآن معجزہ ہے اور اس کے اعجاز کی کئی وجوہ ہیں۔ چند یہ ہیں:

۱- اس کی ترکیب بہت منظّم ہیں۔ کلمات وسیع ہیں اور اس کی بلاغت نے فصحائے عرب کی فصاحت و بلاغت کو مات کر دیا۔

۲- اس کا اسلوب بیان انوکھا و انداز کلام نرالا ہے۔ یہ کلام عرب والوں کی نظم و نثر دونوں طریقوں سے الگ تھلگ ہے۔ اس کی آیات کے فواصل اور افتتاحیہ کلمات ان کے انداز بیاں سے سراسر مختلف ہیں۔

۳- اس میں آئندہ آنے والے واقعات کی جو خبریں دی گئی ہیں، ہو بہو درست ثابت ہوئیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ نیز یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا تاکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ زندہ تابندہ رہے اور دم بدم دعوت الی اللہ کا باعث ہو۔

۴- گذشتہ واقعات کی صحیح ترین خبریں تو جو آپ نے نہ تو کسی معلم کے ذریعے کیں اور نہ ہی کسی کتاب سے ملیں، صرف معجزانہ انداز میں وحی ربانی سے حاصل ہوئیں۔

۵- لوگوں کے دلوں کا حال بتا دیا۔ اذ ھمت طآئفتان منکم ان تفشلا جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی کا ارادہ کیا۔ اب یہ ایک قلبی واردات تھی جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزانہ طور پر بتادی۔

۶- کفار مکہ اور یہود، نصاریٰ، سب ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دشمن تھے۔ ان کو بار بار چیلنج کیا جاتا رہا اور مختلف مراعات کے ساتھ اعلان کیا گیا تم سب مل کر ہی اس قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کے مقابل کوئی کلام بنا کر لاؤ۔ مگر ان میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ معارضہ کرے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

۷- جب اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو دلوں پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ جب قرآن کی تلاوت کی گئی تو کافر بھی مرعوب ہوگئے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ابھی

اسلام نہیں لائے تھے، بیان کرتے ہیں کہ نماز مغرب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورہ طور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے ام خلقو امن غیر شیئی ام ھم الخالقون (الطّور:۳۵)

کیا وہ بلا کسی چیز کے پیدا کر دیئے گئے ہیں، یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں۔ جب میں نے اسے سنا تو میرا دل پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔ اسی دن سے عظمت اسلام میرے دل میں قائم ہوگئی۔

۸- اگر کسی کتاب کو خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، آپ ایک دو مرتبہ پڑھ لیں تو پھر تیسری مرتبہ پڑھنے کو جی نہ چاہے گا مگر یہ قرآن ہے کہ جتنی مرتبہ پڑھیئے، اس کی لذت و حلاوت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نہ پڑھنے والا تھکتا ہے اور نہ سننے والا تنگ آتا ہے۔

۹- اس کی حفاظت کا وعدہ جو اسی کتاب میں کیا گیا ہے۔ درست ثابت ہوا اور قیامت تک یہ محفوظ رہے گی۔

۱۰- یہ تمام علوم کی جامع ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں، اعمال بھی، مواعظ بھی، حکم بھی، قصص بھی ہیں، امثال بھی، علوم بھی، فنون بھی غرضیکہ سب کچھ موجود ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے'' و نزلنا علیك الكتاب تبيانا لكل شئى (النحل:١٦) انبیاء سابقین علیہم السلام کے صحیفوں اور کتابوں میں جو کچھ منتشر طور پر تھا۔ وہ اس مقدس کتاب میں اکٹھا کر دیا گیا۔ فرمان الٰہی ہے: ان ھذا لفی الصحف الا ولی، صحف ابراھیم و موسیٰ (الاعلیٰ:۱۸-۱۹) بلاشبہ یہ قرآن پہلے صحیفوں میں ہے۔ ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں۔

۱۱- ایک اور اعتبار سے دیکھیئے تو اس ایک معجزہ میں ہزاروں معجزات ہیں۔ اس لئے کہ قرآن میں جو چیلنج دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''فا تو ابسورۃ من مثلہ (البقرۃ:۲۳) تم اس قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل لاؤ۔ اب سب سے چھوٹی سورہ ''والعصر'' ہے، جس کی آیات تین ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف یہی

سورۃ معجزہ نہیں بلکہ قرآن کریم کی ہر وہ مقدار جو ان تین آیات کے برابر ہو، مستقل معجزہ ہے۔ اس سورہ کے کلمات کی تعداد تقریباً ۱۹ ہے۔ جب کہ کل قرآن کے کلمات کی تعداد ستر ہزار نو سو چونتیس ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مقدار جو معجزہ ہے تقریباً سات ہزار ہے۔ (الخصائص الکبریٰ: ۱/ ۱۵۸)

یہ تو چند وجوہ اعجاز ہیں جو قارئین کے لئے بطور اشارہ ذکر کی گئی ہیں، ورنہ امام جلال الدین السیوطی نے اپنی کتابوں الاتقان'' اور ''اسرار التنزیل'' میں وجوہ اعجاز کو جس تفصیل وبسط سے بیان کیا ہے، اس کو پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں: میں نے قرآن کریم کی صرف ایک آیت سے بلاغت کی ایک سو بیس (۱۲۰) وجوہ کو ظاہر کیا ہے۔

دعاؤں میں جوامع الکلم:

بارگاہ رب العزت جل مجدہ، میں جب بندہ حاضر ہو کر عرض کرتا ہے تو اس پرشکوہ بارگاہ کا تقاضہ ہوتا ہے کہ لب کشائی کم سے کم ہو۔ ادھر بندہ کی حاجات بے انتہا ہوتی ہیں۔ اب سوائے اس کی اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ ایجاز واختصار کے ساتھ بندہ اللہ کے حضور اپنی معروضات پیش کرے، اس لئے دعا میں جامع اور مختصر کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ دعائیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماثور و منقول ہیں۔ ''جوامع الکلم'' کی اعلیٰ مثال ہیں۔ چند دعائیں ملاحظہ ہوں۔

۱- اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمۃ أمری، واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی، واصلح لی آخرتی التی الیھا معادی، واجعل الحیاۃ زیادۃ لی فی کل خیر واجعل الموت راحۃ لی من کلی شر (مسلم شریف)

ترجمہ: یا اللہ تو میرے دین کو درست رکھ جس کے باعث میرے تمام معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اور میرے لئے میری دنیا کو درست فرما جس میں میری زندگانی ہے۔ اور میرے لئے میری آخرت کو درست فرما جس کی طرف مجھے لوٹنا ہے۔ اور زندگی کو میرے لئے ہر بھلائی میں زیادتی کا باعث بنا اور موت کو ہر برائی سے

نجات کا ذریعہ بنا۔

۲- اللھم انفعنی بما علمنی و علمنی ماینفعنی وزدنی علما الحمد للہ علی کل حال واعوذباللہ من حال اھل النار (ترمذی)

یا اللہ مجھے میرے علم سے نفع دے اور وہ علم عطا فرما جو مجھے نفع دے اور میرے علم میں اضافہ فرما۔ اللہ کا ہر حال میں شکر ہے اور میں جہنمیوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

۳- اللھم متعنی بسمعی وبصری واجعلھما الوارث منی وانصرعلیٰ من ظلمنی وخذ منہ بثاری (ترمذی)

ترجمہ: یا اللہ مجھ کو میرے کانوں اور آنکھوں سے نفع عطا فرما اور ان کو تا دیر باقی رکھ۔ اور جو مجھ پر ظلم کرے اس پر مجھے مدد دے اور میرا بدلہ اس سے لے۔

۴- رب اعنی ولا تعن علی وانصرنی ولا تنصر علی وامکرلی ولا تمکرعلی واھدنی وانصرنی علی من یبغی علی رب اجعلنی لک شاکرالک ذاکر لک راھبا مطواعاً لک مختبتا الیک اواھا، منیباً رب تقبل توبتی، واغسل حوبتی واجب دعوتی ثبعت حجتی وسد دلسانی واھدقلبی واسلل سخیمۃصدری (ترمذی)

ترجمہ: اے میرے رب میری مدد فرما۔ میرے خلاف کسی کی مدد نہ کر۔ میرے لئے تدبیر فرما۔ اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما اور مجھے ہدایت پر قائم فرما اور جو مجھ پر زیادتی کرے، اس پر مجھے نصرت عطا فرما۔ میرے رب مجھے اپنا شکر گزار، ذکر کرنے والا بنادے۔ اپنے سے ڈرنے والا، بہت اطاعت گزار، اپنے لئے متواضع گناہوں پر افسوس کنندہ اور رجوع کرنے والا بنا دے۔ میرے رب میری توبہ قبول فرما۔ میری خطاؤں کو دھوڈال اور میری دعا قبول فرما۔ میری صحت کو ثابت رکھ۔ میری زبان کو درست فرما۔ میرے دل کو ہدایت پر ثبات عطا فرما۔ میرے دل کو کینہ سے پاک رکھ۔

۵- اللھم لک اسلمت وبک امنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک

خاصمت اللهم انی اعوذ بعزتك لا الله الا انت تضلنی انت الحی لا تموت، والجن والا نس تموتون (بخاری شریف)

اے اللہ میں تیرا فرماں بردار ہو گیا۔ تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر ہی بھروسہ کیا اور تیری طرف ہی رجوع، اور تیری مدد ہی سے دشمنوں سے مقابلہ کیا۔ اے اللہ میں تیری عزت کی پناہ لیتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں کہ تو مجھے گمراہ کر دے۔ تو زندہ ہے مرے گا نہیں، جب کہ جن وانس سب ہی مر جائیں گے۔

۶- اللّٰهم انی اسالك الهدی والتقیٰ والعفاف والغنی (۳)

اے اللہ میں تجھ سے ہدایت، پرہیز گاری، پاک دامنی اور بے نیازی کا طالب ہوں۔

۷- اللهم انی اسئالك فعل الخیرات وترك المنكرات وحب المساكین واذا اردت بقوم فتنة فاقبضنی الیك غیر مفتون (موطا امام مالک)

اے اللہ میں تجھ سے نیک کاموں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کی توفیق طلب کرتا ہوں اور مسکینوں سے محبت کا طلبگار رہوں اور جب تو کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا فرمائے تو مجھے اپنے پاس بلا آزمائش کے بلا لینا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگتے تھے۔

۸- اللهم انی اعوذبك من العجزوالكسل والجبن والهرم والبخل واعوذبك من عذاب القبر واعوذبك من فتنة المحیاوالمات (بخاری شریف)

اے اللہ میں عاجزی، کسلمندی، بزدلی، بڑھاپے اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تیری پناہ مانگتا ہوں عذاب قبر سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کی آزمائشوں سے۔

۹- اللهم انی اعوذبك من قلب لا یخشع ومن دعاء لایسمع ومن

نفس لا تشبع ومن علم لا ینفع اعوذبك من هذه الاربع.

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس دل سے جس میں تیرا خوف نہ ہو، اس دعا سے جو مسموع نہ ہو، اور اس نفس سے جس میں قناعت نہ ہو اور اس علم سے جو منفعت بخش نہ ہو۔ میں ان چاروں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

۱۰- االله انی اعوذبك من الشقاق و النفاق و سوء الاخلاق.

یا اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں پھوٹ سے اور انفاق سے اور بداخلاقی سے۔

یہ دس دعائیں، ان بے شمار دعاؤں میں سے ہیں جو فصاحت وبلاغت کی بلندیوں پر ہیں اور جو اپنی جامعیت وایجاز کے اعتبار سے گویا حد اعجاز تک پہنچتی ہیں۔

جوامع الکلم بصورت امثال وحکم:

آپ نے اپنی امت کی مثال میں فرمایا۔

۱- مثل امتی مثل المطرلا یدری اوله خیر ام آخره

میری امت کا حال بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں۔ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے یا آخری حصہ۔

۲- ان من البیان سحرا، وان من العلم جهلا، من الشعرحكما۔

بلاشبہ بعض گفتگو جادو کی طرح ہوتی ہے۔ اور بعض علم جہل کی طرح ہوتا ہے۔ اور بعض اشعار پر از حکمت ہوتے ہیں۔

۳- ساقی القوم آخرهم شرباً کسی قوم کا ساقی خود سب سے آخر میں پیتا ہے۔

اس کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے۔ مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو لوگوں کی فلاح وبہبود کے کام سونپے جائیں۔ اس کو چاہئے کہ پہلے ان کی بھلائی کی سوچے۔ بعد میں اپنی فکر کرے۔ یہ نہ ہو کہ سب کچھ خود اپنی ہی جھولی میں ڈال لے اور بے چارے عوام محروم رہ جائیں۔

۴- رضاء الرب فی رضاإالوالد و سخط الرب فی سخط الوالد۔

رب کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں مضمر ہوتی ہے اور رب کی ناراضگی

والد کی ناراضگی میں ہوتی ہے۔ یہاں والد سے مراد باپ ہی نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یہی حکم ماں کا بھی ہے۔ بلکہ طبرانی کی روایت میں۔

۵- ان ابرالبران یصل الرجل اهل وایه۔

بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کے متعلقین سے تعلق قائم رکھے۔ اس میں باپ کے رشتہ دار دوست واحباب اور ماں کے رشتہ دار اور تمام متعلقین آجاتے ہیں۔

۶- الیس الواصل بالمکافی، ولکن الواصل الذی اذانقطعت رحمه وصلها.

جو کسی کا بدلہ چکائے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو تعلق منطقع کرنے والوں کے ساتھ بھی تعلق قائم کرے۔

۷- من لا یرحم لا یرحم .

جو دوسروں پر رحم نہیں کرے گا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

۸- لیس منامن لم یرحم، صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا.

ترجمہ: جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

۹- المسلم اخو مسلم لا یخونه ولا یکذبه ولا یخذله کل المسلم علی المسلم حرام عرضه وماله دمه.

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اس کو اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو خیانت کرنی چاہیے۔ نہ جھوٹ بولنا چاہئے اور نہ ہی بے مدد چھوڑنا چاہیے۔ مسلمان پر دوسرا مسلمان کلی طور سے حرام ہے۔ اس کی عزت، اس کا مال اور اس کا خون سب حرام ہے۔

۱۰- المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضا.

مومن، دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہے۔

۱۱- ان احدکم مرآة أخیه فان رائ به اذی فلیمطه عنه (ترمذی)

تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے تو اگر وہ اس میں کوئی گندگی

دیکھے تو اسے دور کردینا چاہیے۔

۱۲- لا تقا طعوا، ولا تدابروولا تباغضوا ولا تحاسدوا، وکونوا عباداالله اخوانا ولا یحل للمسلم ان یهجراخاه فوق ثلاث.

تم قطع رحمی نہ کرو۔ ایک دوسرے سے روٹھ نہ جاؤ اور نہ ایک دوسرے سے دشمنی کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ خدا کے بند و بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زائد تک بول چال چھوڑے رکھے۔

کس قدر اختصار وجامعیت کے ساتھ ایک محبت بھرے اسلامی معاشرے کے قیام کی ہدایات اس حدیث شریف میں دی گئی ہیں۔ کیا ایک اچھے معاشرے کے لئے اس سے زائد کچھ اور کہا جاسکتا ہے۔

۱۳- من ضارضار الله به ومن شاق شاق الله به.

جو دوسروں کو تکلیف ونقصان پہنچائے گا اللہ اس کو تکلیف دے گا اور جو لوگوں کو مشقت میں ڈالے گا، اللہ اس کو مشقت میں ڈالے گا۔

۱۴- من لا یشکرالناس لا یشکرالله.

جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا ہے۔ وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

ظاہر ہے کہ لوگوں کے انعامات اللہ کے انعامات کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو جو شخص معمولی انعام کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا، وہ لاتعداد نعمتوں کا شکرگزار کس طرح ہوگا۔

۱۵- الجاهل السخي احب الی الله من عابد بخیل.

سخی جاہل اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے زیادہ محبوب ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو شخص بخل کرتا ہے وہ دنیا سے محبت رکھتا ہے اور مشہور ہے کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہ دنیا کی محبت ہی ہے جو چوری، رشوت، سودخوری اور حرام خوری کے راستے پر لوگوں کو ڈالے ہوئے ہے پھر شرعاً ”بخیل“ وہ ہے

جو اپنے اوپر عائد ہونے والے حقوق ادا نہیں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص واجب کا تارک ہے، اس شخص سے زیادہ برا ہے جس نے محض نفل کو (حصول علم) چھوڑا ہوا ہو۔

۱۶- المومن غر کریم و الفاجر خب الئیم.
مومن بھولا بھالا سخی ہے اور فاجر بخیل کمینہ ہے۔

۱۷- لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولاا لفاحش ولا البذی.
مومن عیب جو، لعنت کرنے والا، بیہودہ گو، اور بے حیا نہیں ہوتا۔

۱۸- ایا کم والظن فان الظن اکذب الحدیث.
تم گمان سے بچو کہ گمان سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

۱۹- کفی بك اثما ان لاتزالوا اخاصما.
تمہارے گناہگار ہونے کو اتنا ہی کافی ہے کہ تم ہر وقت جھگڑتے رہو۔

۲۰- احیب حبیبك ھونا ماعسی ان یکون بغیضك یوما ما وابغض بغیضك ھونا ماعسی ان یکون حبیبك یوماما.
تم جس سے محبت کرو، ایک حد تک کرو کہ شاید کسی دن وہ شخص تم کو نا پسندیدہ معلوم ہو۔ اور جس سے دشمنی کرو، ایک حد تک کہ شاید کسی دن وہ تمہارے دوست بن جائے۔

۲۱- الحیاء من الایمان. حیاء ایمان کا جزو ہے۔

۲۲- لاید خل الجنة قتات۔ جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا۔

۲۳- الاعمال بالنیات. اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

۲۴- المستشار موتمن. جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔
یعنی جب آپ نے کسی شخص کو مشورہ کرنے کے لئے منتخب کیا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دیانتداری سے جوابات صحیح سمجھتا ہے کہے۔ یہ نہیں کہ دوسرے کے اعتماد سے غلط فائدہ اٹھائے۔

۲۵- المرٔمع الخیار مالم یتکلم. جب تک انسان گفتگو نہ کرے اس کو اختیار رہتا ہے۔

یعنی انسان کو بولنے میں عجلت سے کام نہ لینا چاہیے۔ اگر لوگ اس زریں قول کو بطور اصول زندگی اختیار کرلیں تو بلاوجہ کی ندامت وخجالت سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

۲۶- لاخیرفی صحبة من لایری لك ماتری له.
اس شخص کی دوستی اچھی نہیں جو تمہارے حق میں وہ بات نہیں سوچتا جو تم اس کی بابت سوچتے ہو۔

۲۷- الناس کا سنان المشط. لوگ کنگھی کے دانوں کی طرح ہیں۔
یہ مساوات محمدی کی حسین تعبیر ہے جس سے معاشرتی زندگی میں لوگوں کے حقوق وفرائض میں مساوات کا تصور ملتا ہے۔

۲۸- المرء من احب. انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔
بظاہر اس کا مفہوم یہی ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے، وہ اس کے طریقہ کو اپنائے گا اور اس پر گامزن رہے گا پھر جو انجام آخرت میں اس کا ہوگا وہی اس کا بھی ہوگا۔ لیکن اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں ہر شخص اس کے ساتھ رہتا ہے جس سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ اس طرح کسی انسان کی پہچان کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ اس کے دوستوں کو دیکھئے کہ آیا اچھے لوگ ہیں یا برے لوگ اور ان دوستوں پر ہی اس شخص کو قیاس کریں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

۲۹- الیدالعلیا خیرمن الید السفلی. اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔
اس میں گداگری کی ممانعت ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب ہے۔

۳۰- خیر الامور اوسطها.
بہترین چیز درمیانہ درجہ کی ہے۔
یہ اصول پوری زندگی کی محیط ہے۔ انسان کو میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔

۳۱- لایلدغ المومن من جحرمرتین. مومن ایک سوارخ سے دومرتبہ نہیں ڈسا جاتا ہے۔
جب ایک مرتبہ مسلمان کو کسی چیز میں نقصان ہوجائے۔ یا کسی شخص سے نقصان

اٹھانا پڑے تو دوسری مرتبہ اس سمت کا رخ بھی نہ کرے۔

۳۲- السعيد من وعظ بغيره. نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔
یعنی اگر انسان کی فکر صحیح ہے تو وہ نیکوں سے تو اچھی باتیں سیکھ ہی لے گا، بروں سے بھی سیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ برے لوگوں کا انجام بد رہا۔ ہمارے سامنے اسی دنیا میں آتا ہے اگر ہم اپنے دیدہ عبرت کو وا رکھیں تو نصیحت آموزی کے لئے کافی ہے۔

۳۳- الوحدة خير من جليس السوء ۔ تنہائی برے ساتھی کی صحبت سے اچھی ہے۔

۳۴- قل الحق وان كان مرا. حق بات کہو خواہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

۳۵- حبك الشئی يعمی ويصم. تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا اندھا بہرہ کردیتا ہے۔
یعنی محبوب کی برائی دیکھنے اور سننے سے اندھا بہرہ ہوجاتا ہے۔ اس کو محبوب میں نہ تو کوئی عیب نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کوئی بات بری سنتا ہے۔

۳۶- خير العمل ماقل ودام. بہترین کام وہ ہے جو کم ہو، اور ہمیشہ کیا جاتا رہے۔

۳۷- انزلوا الناس منازلهم۔ لوگوں کے ساتھ حسب مراتب سلوک کرو۔

۳۸- المسلمون تتكافو دماء هم . مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔
یہ نہیں کہ میرا خون بمقابلہ غریب کے زیادہ قیمتی ہو اور اگر امیر غریب کو قتل بھی کردے تو قصاص نہ لیا جاسکے۔

یہ چند ''جوامع الکلم'' ہیں جو بطور نمونہ ہدیہ قارئین ہیں۔ یہی وہ پاکیزہ تعلیمات ہیں جن کی بدولت ایک وحشی، امی، سنگ پرست قوم ذلت وادبار کی پستی سے اٹھ کر عزت وعظمت کی چوٹیوں پر آ کھڑی ہوئی۔ کاش کہ ہم جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں، ان انمول موتیوں کو اپنی جھولیوں میں سمیٹ سکیں، تاکہ دین ودنیا کی سربلندیاں ہمارا مقدر بن جائیں۔ آمین بجاہ النبی الامین صلی الله عليه وسلم. [بشکریہ نقوش لاہور، رسول نمبر]

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے معجزات

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی
جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی، مئو

اس پر تمام مسلمانان عالم کا اجماع واتفاق ہے، قرآن وحدیث کے نصوص اس بات پر دال ہیں اور اس پر کسی صاحب ایمان کے لیے ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ واولیٰ ہیں۔ خَلق وخُلق کے اعتبار سے سب سے حسین وجمیل، ذات اور اسماوصفات کے لحاظ سے سب میں افضل، قدر ومنزلت کے اعتبار سے سب سے بلند اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سب سے زیادہ معجزات والے، وہ اللہ عزوجل کے نائب مطلق، رسول اعظم، عبد مصطفیٰ رسول مجتبیٰ اور حبیب مرتضیٰ ہیں۔ جس طرح دیگر اوصاف وکمالات اور فضائل وشمائل میں کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں۔ یونہی کثرت معجزات میں بھی کوئی آپ کا عدیل ومثیل نہیں۔

معجزات دعوئ نبوت کی صحت کی دلیل ہوتے ہیں۔ ''معجزہ'' یہ ''عجز'' سے ماخوذ ہے جو قدرت کی ضد ہے معجز کا معنیٰ حقیقی اپنے غیر میں عجز پیدا کرنے والا ہے اور ظاہر ہے کہ اس معنی میں لفظ ''معجز'' کا اطلاق اللہ عزوجل پر ہوگا۔ انبیاء کرام ورسولان عظام علیہم السلام کی صداقت کے دلائل کو ''معجزہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ انبیاء ورسل جن کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں وہ افراد واشخاص انبیائے کرام کے معارضے

ومقابلے سے عاجز ہوتے ہیں (طیبی مرقاۃ بحوالہ حاشیہ مشکوٰۃ ۵۳۰)

انبیاءکرام جو معجزے لے کر آئے انھیں معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ مخلوق اس کی مثال پیش کرنے سے عاجزہ قاصر ہے۔[شفا شریف-۱/۲۵۲]

''معجزہ کی تعریف مختلف الفاظ میں کی گئی ہے، مگر جمہور اصولیین و محققین نے جو تعریفیں کی ہیں، ان سب کا حاصل ایک ہے، یعنی مدعی نبوت ورسالت سے ایسے خارق عادت امر کا ظہور جس کے مقابلے ومعارضے سے لوگ عاجز وقاصر ہوں۔

وقد حد جمهور الاصوليين: المعجزة بأنها أمرٌ خارق للعادة مقرون بالتحدّی، مع عدم المعارضة من الرسل اليهم بأن لا يظهر منهم ذلك الخارق، والمراد بالتحدّی هو الدعوى للرسالة[حجة الله العالمين للنبهانی-ص ۱۲] وهی "المعجزة" فعل يخلّة الله خارقا للعادة علی يد مدّعی النبوة معترفا بدعواة[ایضاً،ص ۵۵]۔

آخر الذکر تعریف شیخ ابو طاہر قزوینی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''سراج العقول'' میں کی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں ''معجزہ امر خارق عادت کہ ظاہر گردد بدست مدّعی رسالت کہ مقرون باشد بتحدّی۔ و تحقیق آنست کہ در معجزہ تحدی شرط نیست[مدارج النبوۃ-۱/۱۷۳]۔

علامہ قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں: ''معجزہ'' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ معجزہ ہے جو طاقت بشری سے بالکلیہ باہر تو نہیں مگر اس کے باوجود لوگ اس سے عاجز اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس تعلق سے عاجز بنا دیا ہے تا کہ وہ امر نبی کی صداقت پر دلیل ہو جائے۔ بلفظ دیگر جس کی نوع تو طاقتِ بشری سے باہر ہو مگر اس کی جنس طاقتِ بشری میں داخل ہو جیسے بعض کی رائے پر قرآن کی مثل پیش کرنے سے عاجزی۔ دوسری قسم ''معجزہ'' کی وہ ہے جو طاقت بشری سے بالکل باہر ہے۔ بشر اس کے مثل لانے پر ہرگز قادر نہیں۔ جیسے مردے کو زندہ کرنا، عصا کو سانپ میں بدل دینا، پتھر کی چٹان سے اونٹنی نکالنا، درخت کا کلام کرنا، انگلیوں سے پانی کے چشمے کا جاری

ہونا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔ یہ ایسے امور ہیں جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اللہ عزوجل نے ان امور کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ قدرت میں عطا فرمادیا ہے، تاکہ جو لوگ آپ کو دعویٰ نبوت میں نہ جھٹلائیں، وہ ان امور سے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے صداقت کا یقین کرلیں۔

دونوں ہی قسم کے معجزات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے، جو آپ کی نبوت کے دلائل اور آپ کی صداقت کے براھین ہیں۔ دیگر انبیائے کرام کو جتنے معجزے عطا کیے گئے وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں ہی، ان کے علاوہ بے شمار معجزات آپ کو عطا ہوئے۔ خود قرآن مقدس نہ صرف ایک معجزہ ہے بلکہ معجزات کا مجموعہ، جن کی تعداد شمار سے باہر ہے[شفا شرف-۱/۳۵۲]۔

علامہ قسطلانی ''المواہب الدنیہ'' میں علامہ ابن مرزوق کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام و مرسلان عظام کو جو بھی انوار معجزات عطا ہوئے وہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے مستفاد ہیں کیوں کہ نور محمدی ہر نبی کے ساتھ ہر زمانے میں موجود و قائم رہا۔ حضور اقدس فضل کے سورج ہیں اور دیگر انبیائے کرام ستارے، ستارے بذات خود روشن نہیں ہوتے، ان کی روشنی سورج سے مستفاد ہوتی ہے[حجۃ اللہ علی العالمین-ص ۱۵]۔

علامہ اسماعیل نبھانی نے قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کسی نبی کو کوئی معجزہ عطا ہوا تو اس کے مثل ہمارے نبی کو بھی ضرور عطا ہوا، جس کا ذکر تفصیل کا متقاضی ہے۔ یہاں صرف دو ایک مثالوں کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں۔

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ آپ کا عصائے مبارک سانپ بن گیا، اگر چہ اس سانپ میں قوت نطق نہ تھی۔ تو اسی کے مثل ہمارے نبی خاتم الانبیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ کھجور کا تنا جس پر آپ تکیہ لگاتے تھے، آپ کے فراق میں رونے لگا۔ یہ روایت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت نے متعدد طریقے سے بیان کی ہے۔ جس

سے قطع ویقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے [حجۃ اللہ،ص١٦]۔

اسی سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ وہ ہے جسے امام رازی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

جب ابوجہل نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکنے کا ارادہ کیا تو اپنے دونوں شانوں پر اس نے اژدہے (کوبرا) دیکھے تو گھبرا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

☆ حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ نمرود کی دہکتی ہوئی آگ کے شعلے گلزار بن گئے اور وہ آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی۔ تو اس کی نظیر سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ عطا ہوئی کہ آپ کے طفیل برسوں سے چلی آرہی جنگ کی آگ بجھ گئی۔ ایسی آگ جس کا ایندھن تلواریں تھیں، جس کا چولھا حسد تھا اور جس کی بھڑک موت تھی، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

کلّما اوقدوا نارا للحرب أطفأ ھا اللہ (المائدہ:٦٤) جب بھی ان لوگوں نے جنگ کی آگ بھڑکائی اللہ نے اسے بجھا دیا۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں وقد خمدت نار فارس لنبینا و کان لھا ألف عام لم تخمد [زرقانی علی المراتب]

روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج آگ کے اس سمندر پر سے سلامتی کے ساتھ گذرے جو آسمان دنیا کے نیچے ہے۔

امام نسائی نے یہ روایت بیان کی کہ محمد بن حاطب کہتے ہیں: میرے بچپنے میں گرم ہانڈی مجھ پر گر پڑی اور میری پوری جلد جل گئی۔ میرے والد گرامی مجھے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضور نے میری جلد پر اپنا لعاب دہن لگا دیا اور اپنا دست مبارک جلے ہوئے اعضاء پر پھیر دیا۔ پھر فرمایا، أذھب الباس رب العالمین۔ بار الٰہ! اس سختی کو دور فرما دے، تو میں بالکل اچھا ہو گیا۔

ابن سعد نے عمرو بن میمون سے روایت کی ہے کہ مشرکین نے حضرت عمار بن یاسر کو آگ میں ڈال دیا جس سے وہ کافی جل گئے تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے اپنا دست مبارک ان کے سر پر رکھا اور فرمایا ''یانار کونی برداً وسلاما علی عمار'' اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا عمار پر، تو وہ اچھے ہو گئے۔ [حجۃ اللہ علی العالمین،ص١٦]

ابونعیم عبادۃ بن عبد الصمد سے روایت کرتے ہیں۔ ہم حضرت انس ابن مالک کے پاس آئے۔ وہ اپنی باندی سے کہہ رہے تھے! دسترخوان لے آؤ ناشتہ کریں گے پھر فرمایا رومال لے آؤ۔ باندی میلا رومال لے آئی تو حضرت انس نے فرمایا اسے تنور میں ڈال دو، اس کا میل ختم ہو جائے گا۔ باندی نے رومال کو تنور میں ڈال دیا۔ جب اسے نکالا تو وہ دودھ کی طرح صاف وشفاف نکلا۔ میں نے کہا یہ کیا ہے؟ تو فرمایا یہ وہ رومال ہے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرے کو مسح فرماتے تھے۔ جب یہ رومال میلا ہو جاتا ہے تو ہم اسی طرح تنور میں ڈال کر صاف کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ آگ اس چیز کو جلا نہیں سکتی جو انبیاء کے چہرے اور آنکھ سے مس ہو چکی ہو۔

رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کے تفصیلی ذکر کے لیے تو کئی دفاتر درکار ہیں، جن کے ذکر سے اہل ایمان کی آنکھیں روشن ہوں گی اور اہل باطل کے لیے نشان راہ منزل۔ معجزات کے قطع ویقین کے تعلق سے علامہ قاضی عیاض مالکی قدس سرہ شفا شریف میں اور علامہ عبد الباقی زرقانی مالکی زرقانی علی المواہب میں فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور معجزات کی خبریں مشہور ہیں، جن کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ جو معجزہ قطعی طور پر معلوم ہوا اور ہم تک تواتر کے ساتھ منقول ہو جیسے قرآن کریم۔ اس میں کوئی شبہ اور اختلاف نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر آئے اور اس کا ظہور آپ ہی کی وجہ سے ہوا اور قرآن کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کے ثبوت پر استدلال کیا جاتا ہے اور اس بات پر کہ آپ تمام مخلوقات کی جانب رسول بنا کر بھیجے گئے۔ اگر کوئی شخص آپ کے قرآن لانے کا اور آپ کی وجہ سے اس کے ظہور کا منکر ہو تو وہ معاند منکر ہے اور اس کا انکار نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کے دنیا میں وجود کے انکار کی طرح ہے۔ دوسری قسم معجزات کی وہ ہے جو مشہور ہوئے اور لوگوں میں پھیلے اور جن کو کثیر تعداد میں لوگوں نے روایت کیا۔ ان معجزات کی خبریں محدثین، رواۃ میں شائع ہوئیں اور ارباب سیر واخبار نے انہیں نقل کیا، جیسے آپ کے انگشتہائے مبارک سے پانی کا جاری ہونا اور کھانے کا بڑھ جانا۔ تیسری قسم معجزات کی وہ ہے جو اس درجہ مشہور ومعروف نہ ہوئے اور ایک دو راویوں ہی کے ساتھ مختص رہے اور معمولی تعداد نے ان کی روایت کی ہے۔ یہ دوسرے معجزات کی طرح مشہور نہ ہوئے لیکن جب ان جیسے معجزات سے اسے ملایا جائے تو معنی مقصود یعنی بیان اعجاز میں سب برابر ہوں گے اور معجزے کو پیش کرنے پر متفق ہوں گے جیسا کہ ہم بیان کر آئے۔ کیوں کہ اس پر تو اتفاق ہے کہ ان معجزات کے مفاہیم آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے اور جب ایک روایت کو دوسری روایت سے ملایا جائے تو یہ مفید قطعیت ہوگا[زرقانی-۵/۸۱-شفا شریف-۱/۲۵۳]

پہلے ہم اختصار کے ساتھ ظہور معجزہ کی پہلی صورت جو قطعی ویقینی ہے بیان کر رہے ہیں۔ یہ پہلی صورت اعجاز قرآن کی ہے، قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور یہ حضور کی نبوت ورسالت کے ثبوت پر برہان قاطع ہے۔ اس میں اعجاز کی چار بنیادی وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ تالیف قرآن کا حسن، ایک کلمہ کا دوسرے کلمہ سے جوڑ، فصاحتِ کلمات اور وجوہِ ایجاز وبلاغت اور حکمت وخطاب کا اس شان سے پایا جانا کہ عرب ارباب فصاحت ہونے کے باوجود اس کی مثیل لانے پر قادر نہیں۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے وان کنتم فی ریب ممانزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ [البقرۃ:۲۳] قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یاتوا بمثل ھذا القرآن [الاسراء:۸۸]

دوسری وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن مقدس کی صورتِ نظم اور نادر اسلوب کی کوئی مثال ونظیر نہیں۔ کلام عرب کے اسالیب اسلوب قرآن کے قریب قریب بھی نہیں۔

ایسا منہج نظم کسی نثر میں ہے نہ نظم میں، نہ سجع میں، نہ رجز میں، نہ شعر میں۔ یہی وجہ ہے کہ ولید بن مغیرہ جیسے فصیح شاعر نے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلام سنا اور قرآن مقدس کی آیت مقدسہ آپ کی زبان مبارک سے سماعت کیں، پھر جب ابوجہل ناگواری کی حالت میں اس کے پاس آیا تو ولید بن مغیرہ نے کہا واللہ مامنکم احد أعلم بالاشعار واللہ مایشبہ الذی یقول شیئا من ھذا[شفا شریف-۱/۲۶۴]

بخدا تم لوگ مجھ سے زیادہ اشعار کی معلومات نہیں رکھتے اور بخدا یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان اشعار وغیرہ کے مشابہ نہیں۔

تیسری وجہ اعجاز قرآن کی یہ ہے کہ قرآن کریم غیب کی خبروں پر مشتمل ہے۔ جو چیز معرض وجود میں نہ تھی قرآن کے فرمان کے مطابق وقوع پذیر ہوئیں۔ مثلا اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین[الفتح:۲۷]

بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے۔

لیظھرہ علی الدین کلہ[الفتح:۲۸] کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے

اذاجاء نصر اللہ والفتح[النصر:۱] جب اللہ کی مدد اور فتح آئے

اعجاز قرآن کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے گذری ہوئی قوموں اور زمانوں، اور گذری شریعتوں کی خبریں دیں جن کو جاننے کے لیے لمبی لمبی عمریں تحصیل علم میں صرف کردی جائیں، جب بھی وہ تمام حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گذرے ہوئے واقعات وحالات بیان فرمائے جب کہ آپ امّی تھے۔ اہل کتاب اس تعلق سے طرح طرح کے سوالات آپ سے کرتے اور آپ اس کے جواب مرحمت فرماتے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انبیا کرام اور ان کی قوموں کے قصے بیان فرمائے۔ حضرت موسیٰ، حضرت خضر، حضرت یوسف اور ان کے بھائی، اصحاب کہف، ذو القرنین، حضرت لقمان علیہم السلام وغیرہ کے حالات وواقعات بیان فرمائے۔ توریت، زبور، وانجیل اور حضرت ابراہیم وموسیٰ علیہم السلام

کے صحیفوں میں مذکور احکام وقصص کا ذکر فرمایا وغیرہ۔

ان چار وجوہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد امام قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں:

''یہ چار وجوہ اعجاز وہ ہیں جو ظاہر اور روشن ہیں۔ اس میں کوئی نزاع نہیں، نہ ہی شک کی گنجائش ہے۔'' [شفا شریف-۱/۲۷۲]

معجزات کی دوسری قسم وہ ہے جو مشہور ومعروف ہیں اور ان کی روایت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ محدثین وارباب سیر کے نزدیک یہ معجزات معروف ہیں۔ ان کی دو مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

انگلیوں سے پانی کے چشمے کا جاری ہونا:

اس سلسلے میں متعدد روایتیں ہیں۔ ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ صلح حدیبیہ کے روز لوگوں پر پیاس کا شدید غلبہ ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی کا ایک کوزہ تھا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔ تمام لوگوں نے آپ کی طرف توجہ کی اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے پاس پانی بالکل ختم ہو چکا ہے، صرف آپ کے کوزے میں پانی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو کوزے میں بھگو دیا۔ فجعل الماء یفور من بین اصابعہ کأمثال العیون۔ تو آپ کی انگلی سے پانی چشمے کی طرح ابلنے لگا۔ حضرت جابر سے پوچھا گیا کتنے لوگ تھے؟ انھوں نے کہا اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی کافی تھا، لیکن ہماری تعداد پندرہ سو تھی [شفا شریف ۱/۲۸۲-شواہد النبوۃ-۱/۱۸۳]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے یعنی متواتر ہے اور علم قطعی کا افادہ کرتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں۔ ''یکے از معجزات مشہورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ مکرر واقع شدہ است در مواطن عدیدہ ومشاہد عظیمہ وروایت کردہ شدہ از طرق کثیرہ کہ افادہ می کند علم قطعی بتواتر معنوی رواں شدن چشمہا ست از میان اصابع مبارک دے [مدارج النبوۃ-۱/۱۸۲]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔ واقعات متعدد ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وضو کا پانی نہ تھا، عصر کا وقت قریب تھا۔

حضرت براء بن عازب وسلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہما نے قصہ حدیبیہ سے متعلق جو روایت بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگ چار سو کی تعداد میں تھے۔ وہاں ایک کنواں تھا جو پچاس بکریوں کے لیے ناکافی تھا۔ ہم نے اس سے پانی کھینچا تو پانی کم ہو گیا۔ لوگ پیاس کی شکایت لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے ایک ڈول پانی نکلوا کر اس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا تو کنویں سے اتنا پانی ابل پڑا کہ ہم سب کے لیے کافی ہو گیا اور ہماری سواری کے جانوروں کے لیے بھی۔

ابن شہاب زھری کی روایت میں یہ ہے کہ حضور نے اپنی ترکش سے تیر نکالا اور اسے کنویں کی گہرائی کے خشک حصے میں ڈال دیا تو اتنا پانی اُبل پڑا کہ لوگ سیراب ہو گئے [شفا شریف-۱/ ۲۸۸]

کھانے کی برکت کا ظہور:

بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے، حضرت جابر کہتے ہیں: جنگ خندق کے موقع پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے پتھر توڑ رہے تھے۔ جب میں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو گھر آیا اور اہلیہ کو سارا قصہ سنایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھر میں ایک صاع جو اور ایک بکری کا بچہ ہے۔ میں نے جو کا آٹا گوندھا اور بکری کے بچے کو ذبح کیا اور دیگ کو چولہے پر رکھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری اہلیہ نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ کھانے وغیرہ کی صورت حال حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بتا دینا تا کہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات بتا دیے بخاری کی روایت میں ہے ومعک رجل أو رجلان یا رسول اللہ آپ تشریف لے چلیں اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمی کے چلنے کی گنجائش ہے۔ آپ نے تمام خندق کھودنے والوں کو بلایا اور فرمایا:

اے اہل خندق! آج جابر نے ضیافت کا انتظام کیا ہے سب چلو۔حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اپنی اہلیہ سے کہہ دینا جب تک میں نہ آجاؤں دیگ نہ اتاری جائے اور نہ ہی روٹی پکائی جائے۔ میں نے اپنی اہلیہ کو بتایا اور یہ بھی بتایا حضور علیہ السلام تمام صحابہ کو لے کر تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے تو کوئی ڈر نہیں۔ جب آپ صحابہ کے ساتھ تشریف لائے۔ تو مجھے حکم دیا کہ گوندھا ہوا آٹا اور گوشت کی دیگچی مجھے دکھاؤ میں نے حضور کو گھر میں لایا۔ آٹے کے قریب آ کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن آٹے میں لگا دیا اور آٹے کو دوبارہ گوندھنے کا حکم دیا پھر گوشت کی دیگچی کے پاس تشریف لائے اور اپنا لعاب دہن گوشت کی دیگچی میں ڈال دیا پھر حکم فرمایا کہ روٹی پکانے والوں کو بلاؤ کہ روٹی پکاتے جائیں۔

حضرت جابر کہتے ہیں میں تنور سے روٹیاں اور دیگ سے گوشت نکالتا جاتا اور کھلاتا جاتا۔ یہاں تک کہ سب کے شکم سیر ہوگئے اور گوشت اور کھانا کافی مقدار میں بچ بھی گیا۔ ایک روایت میں ہے لأقسم بالله لأكلوا حتى تركوه وانحرفوا وان برمتنا لتغطّ كما هي وان عجينا ليجز[بخاری شریف-۲/۵۸۹]

''معجزہ شق القمر:

علامہ قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: اقتربت الساعة وانشق القمر ،قیامت قریب ہوئی اور چاند پھٹ گیا۔ چاند پھٹنے کی خبر صیغۂ ماضی سے دی گئی جو اس کے وقوع کو بتاتا ہے اور اس پر تمام مفسرین وعلمائے اہل سنت کا اتفاق ہے[شفا شریف-۱/۲۸۱]۔ اس خبر میں اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو چاند کو دوٹکڑے کرنے سے متعلق ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔

دعوئ نبوت کی صداقت کو جانچنے کے لیے مشرکین مکہ نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے چاند کو دوٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے چاند کو

دوٹکڑے کر کے دکھایا۔ بخاری ومسلم کی روایت یہ ہے:

عن انس قال: ان اهل مكة سألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يريهم آية فأراهم القمر شقّين حتى رأوا حراء بينهما''[مشکوٰۃ شریف-ص۵۲۴]۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بایں الفاظ ہے۔ انشق القمر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فرقتين فرقة فوق الجبل وفرقة دونهٗ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اشهدوا [مشکوٰۃ شریف-ص۵۲۴]۔

چاند عہد رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں دو حصوں میں ٹکڑے ہو گیا ایک حصہ پہاڑ کے اوپر اور دوسرا اس کے نیچے، تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! گواہ رہنا۔

حضرت مسروق کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب مشرکین نے چاند کو دوٹکڑے ہوتے دیکھا تو کہا: محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم پر جادو کر دیا، پھر کہنے لگے کہ اگر مختلف جگہوں سے آنے والے یہ کہہ دیں کہ انھوں نے شق قمر کا مشاہدہ کیا ہے تو یہ سچ ہوگا ورنہ شعبدہ بازی۔ مشرکین نے جس مسافر سے بھی پوچھا، اس نے تصدیق کی کہ ہم نے ایسے ہی دیکھا ہے جیسے تم نے۔ یہ چاند کی چودھویں تاریخ تھی[شفاء شریف-۱/۲۸۱]۔

معجزہ ردّ شمس:

اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہیں کہ مقام صہباء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر اقدس حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے زانو پر تھا۔ یہ وقت نزول وحی کا تھا۔ حضرت علی نے ابھی عصر نہیں پڑھی تھی کہ سورج غروب ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھی ہے؟ انھوں نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعا کی:

اللهم انه كان في طاعتك وطاعة رسولك فارددُ عليه الشمس۔

اے اللہ علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مصروف تھے۔تو سورج پلٹا دے۔حضرت اسماء کہتی ہیں کہ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ پھر طلوع ہوا اور دشت وجبل اس کی کرنوں سے جگمگانے لگے[زرقانی-۵/۱۱۳]۔

علامہ قاضی عیاض مالکی اس حدیث کے تعلق سے فرماتے ہیں:

امام طحاوی نے ''مشکل الحدیث'' میں اسماء بنت عمیس کی روایت دو طریقوں سے بیان کی ہے اور یہ دونوں حدیثیں ثابت ہیں۔ان کے راوی ثقہ ہیں۔ امام طحاوی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ احمد بن صالح کہا کرتے تھے کہ جو شخص راہ علم پر ہے، اس کے لیے اسماء کی حدیث کے حفظ سے پیچھے رہنا مناسب نہیں کیوں کہ وہ علامات نبوت سے ہے۔[شفا شریف-۱/۲۸۳]

علامہ زرقانی کی وضاحت یہ ہے:

امام طحاوی اور قاضی عیاض نے حدیث اسماء کو صحیح کہا ہے اور تمہارے لیے ان دونوں کا حدیث کو صحیح قرار دینا کافی ہے۔ابن مندہ اور ابن شاہین نے اسماء بنت عمیس کی حدیث، اسناد حسن کے ساتھ تخریج کی ہے اور ابن مردویہ نے ابوہریرہ کی حدیث اسناد حسن کے ساتھ نقل کی ہے۔طبرانی نے معجم کبیر میں اس روایت کو اسناد حسن کے ساتھ بیان کیا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام نے شرح ''تقریب'' میں نقل کیا ہے۔ابن عراقی نے کہا کہ طبرانی نے معجم اوسط میں بھی جابر ابن عبداللہ کی روایت سے سند حسن کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے۔[زرقانی-۵/۱۱۵]

علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱) فرماتے ہیں:

ابن مندہ وابن شاہین اور طبرانی نے حضرت اسماء کی روایت کو اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے جن میں بعض صحت کی شرط پر ہیں اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ سے بیان کیا[خصائص کبریٰ-۲/۸۲]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا، میں آپ کو کس دلیل سے نبی مان لوں۔آپ

نے فرمایا اگر میں اس کھجور کے درخت کو کہوں کہ میرے پاس چلا آئے تو کیا تو ایمان لائے گا؟اس نے کہا: ہاں۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا تو وہ اپنی جگہ سے چلا آیا۔وہ درخت زمین کو کھودتے ہوئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور تین بار اس نے آپ کی رسالت کی گواہی دی، جس طرح حضور نے فرمایا تھا پھر حضور کے حکم پر وہ درخت اپنی جگہ لوٹ گیا''۔حضرت بریدہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ درخت جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو اس نے السلام علیك یا رسول اللہ کہا[شفا شریف-۱/۲۹۸]۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دریا کے کنارے تشریف فرما تھے۔ عکرمہ بن ابوجہل بھی بیٹھا تھا۔اس نے کہا اگر آپ اپنے دعویٔ نبوت میں سچے ہیں تو اس پتھر کو جو دوسرے کنارے پر واقع ہے بلایئے کہ وہ آپ پر تسبیح پڑھے اور پانی میں ڈوبے نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر کی طرف اشارہ فرمایا تو وہ پتھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تسبیح پڑھتا ہوا رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روبرو حاضر ہو گیا اور آپ کی رسالت کی گواہی دینے لگا[حجۃ اللہ علی العالمین-ص۱۶]۔

یہ چند شواہد معجزات سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام پیش کیے گئے۔اس قسم کی بے شمار احادیث وروایات ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل ونشانات ہیں اور ایک ایک دلیل وبرہان پر تبصرہ بسط وتفصیل کا متقاضی ہے۔سردست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔مولیٰ تعالیٰ ہمارے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور کامل محبت پیدا فرمائے اور اسی پر ہمارا خاتمہ ہو۔آمین!

مصطفےٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شگفتہ مزاجی

ارشد میر

عربی زبان کا ایک مقولہ ہے ”مزاح المومنین عبادة“ یعنی ایمان کی حدود کے اندر مومنین کا باہمی مزاح بھی عبادت ہے۔اسی طرح یہ بھی معروف قول ہے” المزاح فی الکلام کا لملح فی الطعام“ جس کا مطلب ہے کہ کلام میں مزاح کو وہی مقام حاصل ہے جو طعام میں نمک کو ہے۔

انسانی فطرت حزن و مسرت سے مرکب ہے اور متانت کے ساتھ مسکراہٹ سے ہی حیاتِ انسانی کا قافلہ رواں دواں ہے۔سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم ،فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ربانی مقصد جلیلہ کی تکمیل کے لیے اپنی حیات گرامی کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا اور انتہائی دلسوزی، دردمندی اور سنجیدگی سے فلاح انسانی کے لیے کوشاں رہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مرحلہ پر بھی ترش روئی یا عبوست کو پسند نہیں فرمایا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی فطری تقاضوں کو اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لیے وقف رہتی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح میں بھی متانت کا پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور کبھی کھلکھلا کر یا قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہنسی ہمیشہ تبسم تک محدود رہتی تھی۔ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مزاح فرماتے تھے؟

تو آپ نے فرمایا: ہاں !لیکن ہر کہہ ومہ کے ساتھ نہیں بلکہ مخاطب کے محل و مقام اور استعداد کے مطابق ایسا فرماتے تھے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز کوئی ضعیفہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم !دعا کیجئے میں جنت میں جاؤں،جس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کر کے داخل فرمائے گا۔ اس پر وہ بڑھیا خوش ہوگئی۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ اسے کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا۔ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے۔اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اونٹنی کے بچہ کو لے کر کیا کروں گا؟ (کیونکہ سواری کے لیے بچہ تو کام نہیں دے سکتا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا۔اونٹ کو ناقہ یعنی اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔مزاح کا یہ لطیف پیرایہ نہ صرف زیرِ لب تبسم کا عکاس ہے بلکہ اس میں صداقت کا پہلو بھی پوری آب و تاب سے نمایاں ہے۔چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے پوچھا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم !آپ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یقیناً مگر اس میں صرف سچی بات کہتا ہوں۔''لطیف ترین اور صداقت پر مبنی مزاح کی ایک اور درخشاں مثال یوں ہے کہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شوہر کی بابت پوچھا تو اس نے نام بتایا۔اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔جونہی وہ عورت گھر پہنچی ،اپنے شوہر کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔اس کے خاوند نے کہا: تجھے کیا ہوگیا ہے؟ عورت نے جواب دیا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا، میں نے

بتایا تو فرمایا وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ کیا میری آنکھوں میں سفیدی سیاہی سے زیادہ نہیں ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شگفتہ مزاجی کی ایک اور مثال حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گاؤں کی چیزیں تحفہ کے طور پر لایا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سے بے حد انس تھا اور آپ بھی اسے شہر کی کوئی نہ کوئی سوغات ضرور عنایت کیا کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں''۔ زاہر کی شکل وصورت بھی اچھی نہ تھی۔ ایک دن وہ اپنا سودا بیچ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے آئے اور بے خبری سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے کہا کون ہے مجھے چھوڑ دے مگر جب مڑ کر دیکھا تو رسولِ خدا تھے جس پر وہ اپنی کمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے ملنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ غلام کون خریدتا ہے؟ زاہر کہنے لگا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے کھوٹا سکہ پائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مگر اللہ کے نزدیک تو تو بہت قیمتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام کے لیے شائستہ مزاح پیدا کرنا تبلیغی اور دینی ضرورت بھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اگر ایسا نہ کرتی تو ان کے قدرتی رعب وجلال کی بنا پر حاضرین کا ان کے قرب میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا۔ مزید برآں سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے آنے والے اکابر عمداً مزاح سے اجتناب کرتے۔ یہی سبب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مزاحاً ان کے حسب حال القابات سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز تفنن کے طور پر فرمایا۔ ''یا ذالا ذنین'' یعنی اے دو کانوں والے۔ بادی النظر میں کان تو ہر شخص کے دو ہی ہوتے ہیں۔ انہیں جو خصوصیت سے یہ لقب عطا کیا تو ان کے کان بڑے ہوں گے۔ بصورتِ دیگر ان کی قوتِ سامعہ کافی تیز ہوگی۔ اسی طرح حضرت

ابوہریرہ کو یہ لقب (یعنی بلی کا باپ) اس لیے دیا کہ عربی میں ہریرہ بلی کو کہتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلی پالی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت علی کو ابوتراب (مٹی کا باپ) کا لقب اس بنا پر مرحمت ہوا کہ ایک دن خاک پر سوتے میں ان کے رخساروں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ نیز انھوں نے حضرت انس کے چھوٹے بھائی کی کنیت بھی رکھی اور اسے ابوعمیر کہہ کر پکارا۔ ابوعمیر کے پاس نُغَیر نامی پرندہ تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ پرندہ مر گیا، جس سے بچہ بہت رنجیدہ تھا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مزاحاً کہا: اے عمیر نغیر کو کیا ہوا؟

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جہاں خود شستہ مذاق کرتے تھے، وہاں اگر صحابہ کرام بھی اس نوع کا مذاق کرتے تو اس سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے دوران ایک بالکل چھوٹے سے خیمہ میں بیٹھے تھے کہ میں نے باہر سے سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آ جاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا پورا آ جاؤں۔ فرمایا: ہاں پورے آ جاؤ۔

اسی طرح حضرت ام سلمٰی راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل حضرت ابوبکر تجارت کے لیے بصرہ گئے۔ ان کے ہمراہ حضرت نعمان اور حضرت سویبط بھی تھے۔ ان میں سے حضرت سویبط ظریف الطبع تھے۔ دوران سفر ایک روز حضرت سویبط نے حضرت نعمان سے کھانا مانگا۔ حضرت ابوبکر وہاں موجود نہ تھے۔ نعمان نے کہا حضرت ابوبکر کے آنے پر دوں گا۔ حضرت سویبط نے کہا کہ اچھا میں تم سے دیکھ لوں گا۔ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے تو سویبط نے وہاں کچھ لوگوں سے کہا کہ میرے پاس ایک غلام ہے۔ اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو لے لو مگر اس میں ایک بات ہے کہ وہ خود کو آزاد کہتا رہے گا لیکن تم اسے چھوڑنا نہیں۔ چنانچہ دس اونٹوں پر معاملہ طے ہو گیا اور ان لوگوں نے نعمان کے گلے میں چادر ڈال لی۔ یہ بیچارے چیختے ہی رہے کہ میں آزاد ہوں مگر انہوں نے کہا کہ ہمیں

تمہاری اس بات کا علم ہے، حتیٰ کہ حضرت ابوبکر آ گئے تو انہوں نے ان کی جان چھڑائی اور مال واپس کرا دیا۔ جب یہ حضرات مدینہ منورہ آئے تو یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوب مسکرائے گویا خود بھی شگفتہ مزاج تھے اور شگفتگی کلام کو پسند بھی فرماتے تھے۔

ایک دن ایک شخص سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی۔ اس سادہ دل نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے اور فرمایا کہ ہوش کر، تجھے تیری ماں یاد نہیں رہی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز صحابہ کرام کے جلو میں کھجوریں کھا رہے تھے۔ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حاضرین کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیوں کو حضرت علی کے آگے رکھتے جا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاحاً فرمایا۔ کہ گٹھلیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علی نے کھائی ہیں۔ حضرت علی بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی آغوش تربیت کے پروردہ تھے۔ انہوں نے برجستہ کہا کہ دیکھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دی ہیں۔ جن کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں وہ شاید مع گٹھلیوں کے کھا گئے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام اس حاضر جوابی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اسی طرح حضرت صہیب کہ مشہور صحابیِ رسول تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کھجوریں کھانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آنکھ آئی ہوئی ہے اور کھجوریں کھا رہے ہو۔" جس پر حضرت صہیب نے کہا۔"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اچھی آنکھ سے کھا رہا ہوں۔ ایک آنکھ تو درست ہے۔" اس بدیہہ گوئی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی مدینہ منورہ میں آیا۔ اونٹنی کا زانو باندھا اور مسجد نبوی

صلی اللہ علیہ وسلم میں جا کر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر آیا اور اونٹنی پر سوار ہو کر بلند آواز سے کہا۔"اے ربِ ذوالجلال! مجھ پر رحم فرما اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہم دو کے سوا اور کسی کو اس میں شریک نہ کرنا۔" یہ کلمات سن کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔"تم اس (دہقانی) اور اونٹ میں سے کسے زیادہ ناسمجھ کہو گے۔ تم نے سنا اس نے کیا کہا ہے۔"

صحابہ کرام بھی مسکرائے اور عرض کیا۔"جی ہاں سنا۔"

ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں ایک صحابی نے عرض کیا۔"یارسول اللہ! مجھے میرے بت نے بہت نفع دیا۔" صحابۂ کرام نے حیرانی کے عالم میں صحابی کے منہ کی جانب دیکھا کہ بت بھلا کیسے کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے۔ یہ صورت حال بھانپتے ہوئے صحابی نے کہا۔"یاحبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم! میں سفر پر روانہ ہوا۔ دورانِ سفر میں نے ستوؤں کا بت بنایا۔ دورانِ سفر کھانا ختم ہوا تو میں نے بت کو توڑ کر کھایا مجھے تو بت نے بے حد نفع دیا۔" یہ جملہ سن کر جملہ صحابۂ کرام ہنسنے لگے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسکرا دیئے۔

امام عالی مقام حضرت امام حسین نے سواری شتر کی خواہش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہی تمہارا اونٹ بننے کو تیار ہوں جس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کاندھوں پر اٹھا لیا اور حجرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لے گئے۔ اسی دوران امام عالی مقام نے فرمایا کہ اونٹ کی تو مہار ہوتی ہے، جب کہ میرے اونٹ کی مہار کوئی نہیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گیسو اُن کے ہاتھ میں دے دیئے کہ یہ مہار ہے۔ اس حالت میں حضرت عمر تشریف لے آئے اور حضرت امام حسین سے کہا کہ بھئی تمہیں سواری خوب ملی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم نے فرمایا کہ سوار بھی تو خوب ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوذر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، سنا ہے کہ

جب دجّال ظاہر ہوگا تو دنیا قحط کا شکار ہوگی۔اس عام قحط میں دجال لوگوں کی ضیافت کرے گا جس میں انواع واقسام کے کھانے ہوں گے۔میرا خیال ہے کہ اگر میں اس دور میں ہوا تو پہلے اس کے کھانوں سے خوب پیٹ بھروں گا اور پھر اس سے منحرف ہوجاؤں گا۔یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس دور میں ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی نعمتوں سے بے نیاز کردے گا۔

بطور نمونہ مشتے از خروارے یہ چند مثالیں محض اس لیے درج کی گئی ہیں تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ نبی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے لطیف اور پاکیزہ مذاق سے کس قدر محظوظ ہوتے تھے۔شگفتگی برجستگی اور متانت کا ایک حسین امتزاج ہوتا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے تو زیرلب تبسم فرماتے قہقہہ لگانا نبوت کی سنجیدگی کے خلاف تھا۔قہقہہ تو وہ لوگ لگائیں جو بے فکر ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں کیونکر بے فکر ہوں، جب کہ صاحبِ صور تیار کھڑا ہے اور قرآن پاک کی بعض سورتوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کردیا ہے۔گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یوں تھی ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم بھی اس لیے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصالحِ خلق وابستہ تھا۔البتہ کبھی کبھی بوقتِ تبسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک نظر آجاتے تھے۔اس وقت دندانِ مبارک یوں چمکتے تھے جیسے بادلوں کی اوٹ میں بجلی چمکی ہو۔اس سلسلہ میں عامر بن سعد بن ابی وقاص راوی ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق کے موقع پر تبسم فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک نظر آنے لگے۔عامر نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم کس نوع کا تھا۔اس پر سعد کہنے لگے کہ غزوہ خندق میں ایک آدمی نے تیروں سے بچنے کیلئے لوہے کی ڈھال کا سہارا لیا تھا۔میں تیر پھینکتا جارہا

تھا اور وہ شخص اپنا چہرہ ڈھال سے بچا رہا تھا۔اسی دوران میں نے ایک تیر چلانے کے لیے نکالا۔اس نے اچانک سر اونچا کیا، میں نے فوراً تیر چلا دیا جو اس کی پیشانی میں دھنس گیا اور وہ بل کھا کر گر پڑا۔اس کی یہ کیفیت دیکھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ مسکرا پڑے۔اس وقت ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک دیکھے۔

تاریخ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آویز جس مزاح کا ایک اور واقعہ محفوظ رکھا ہے۔غزوۂ بنی مصطلق میں مشہور منافق عبداللہ بن ابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کی اور ایک مجلس میں کہا کہ مدینہ جا کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔اس مجلس میں حضرت زید بن ارقم موجود تھے۔وہ اس وقت بالکل بچے تھے۔انہوں نے یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا۔جب عبداللہ بن ابی سے دریافت کیا گیا تو اس نے انکار کیا۔زید پر لوگوں نے شک کیا کہ انہوں نے غلط اطلاع پہنچائی ہے مگر سورۂ منافقون کی آیت نمبر ۸ میں اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ارقم کو بلایا اور مسکرا کر ان کا کان پکڑا اور فرمایا ''لڑکے کا کان سچا تھا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اپنے اندر جہاں شگفتگی اور واقعیت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے، وہاں علم بیان کی بلاغتوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔مجاز مرسل میں بعض اوقات آلہ کہہ کر وہ چیزیں مراد لی جاتی ہیں جن کے لیے وہ آلہ مخصوص ہو۔اس فرمان میں ''کان'' سے سنی ہوئی بات مراد ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ''افصح العرب'' تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد فصاحت وبلاغت کی بے پایاں کیفیتوں کا امین ہوتا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شگفتگی، شائستگی اور پاکیزگی کا حامل تھا۔یہ دلوں میں گدگدی پیدا کر کے بے پایاں طمانیت عطا کرتا تھا۔مزاح کا یہی وہ نادر، مثالی اور انمول نمونہ ہے کہ جس سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: اپنے بھائی کے ساتھ خصومت نہ کرو اور ایسا مذاق نہ کرو جس سے اسے ایذا پہنچے اور ایسا وعدہ نہ کرو جو وفا نہ کرسکو۔'' ایک اور مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خالص ایمان تک آدمی

نہیں پہنچتا جب تک مزاح اور جھوٹ کو نہ چھوڑ دے۔'' ظاہر ہے کہ جب مزاح کے ساتھ جھوٹ کی آمیزش ہو جائے گی تو ایک طرف مزاح لطیف نہیں رہے گا بلکہ پھکڑ پن میں بدل جائے گا اور دوسری طرف اس مزاح کا نشانہ بننے والا بات کی کسک دل میں محسوس کرے گا اور یوں دل پر ایسے زخم لگ جائیں گے جو کبھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔ مزاح کے اپنے حدود ہیں۔ جب مزاح ان سے گزر جائے تو وہ پھکڑ پن جاتا ہے۔ ایک ادیب کے الفاظ میں ''ادب کے جس نقطۂ عروج پر بیان کی خوبیاں، ذہن کے تنقیدی زاویے اور قلم کی تعمیری شوخیاں پختہ تر ہو کر ایک معیاری لطافت بن جاتی ہیں، مزاح کہلاتا ہے۔'' گویا مزاح کا مقصد تعمیر ہے، تخریب نہیں، طمانیت ہے دل آزاری نہیں، تبسم ہے قہقہہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شگفتہ طبعی کے جو پاکیزہ نمونے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، انہیں پڑھ کر لبوں سے زیادہ دل مسکراتا ہے۔

قرآن حکیم میں واضح حکم ہے:

''اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔''

(الحجرات: ۱۱) اسی فرمان اقدس سے اس پھبتی، طنز اور تضحیک کی نفی ہو جاتی ہے جس سے دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں شگفتگی بدرجۂ اتم موجود تھی مگر دل آزاری کا شائبہ بھی نہیں تھا اور اسی انداز کی تقلید ہم سب پر لازم ہے کہ یہی طریقہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔ [بشکریہ نقوش لاہور، رسول نمبر]

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی خاندانی وجاہت

اختر حسین فیضی مصباحی
استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

شرافت ونجابت اور عزت ووجاہت کے اعتبار سے مصطفیٰ جان رحمت حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان ''خاندان بنی ہاشم'' عرب کے تمام خاندانوں اور قبیلوں میں امتیازی شان کا مالک تھا۔

کتب سیر میں آپ کا حسب ونسب بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس سے طہارت وپاکیزگی صاف جھلکتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کا شجرۂ خاندانی اتنی وضاحت کے ساتھ تاریخ کے اوراق میں نہ مل سکے گا۔ یہ شرف صرف اسی ذات گرامی کو حاصل ہو سکتا ہے جسے اللہ رب العزت نے سارے عالم میں ممتاز بنایا ہو اور حضرت آدم علیہ السلام تک آبائے کرام کی حفاظت فرمائی ہو۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تمام مخلوق سے برگزیدہ اور صاحب کرامت بنایا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا قول بیان فرماتی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے زمین کے مشارق ومغارب کو کھنگھالا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل کسی کو نہیں پایا اور کسی کی اولاد کو بنی

ہاشم سے افضل نہیں دیکھا۔(ضیاء النبی:ج:۱،ص:۳۹۸)

یہ شعر اسی روایت کی ترجمانی کرتا ہے ۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

امام احمد رضا قادری بریلوی رطب اللسان ہیں ۔

یہی بولے سدرہ والے چمن جہاں کے تھالے
سبھی میں نے چھان ڈالے ترے پایہ کا نہ پایا

شرافت خاندانی اور پاکیزگی نسب کے تعلق سے چند حدیثیں قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ! حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں، ناجائز طریقہ سے نہیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک جب کہ میرے والدین نے مجھے جنا، زمانۂ جاہلیت کی غلط روی میرے قریب نہیں آئی۔ (دلائل النبوۃ ۱/۵۷)

ترجمہ! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بنی آدم کے بہترین زمانے میں مبعوث ہوا، صدیوں پر صدیاں گذرتی گئیں یہاں تک کہ یہ زمانہ آیا جس میں میں پیدا ہوا۔ (حدیث ۳۵۵۷، بیروت)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: بے شک اللہ نے اولاد اسمٰعیل سے کنانہ کو جنا اور کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے منتخب کیا۔ (مسلم ۲- کتاب الفضائل، ص ۲۴۵)

ان احادیث مبارکہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ رسول کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت وکرامت اور عظمت وشوکت والے آبا واجداد کی اولاد سے ہیں۔

نسب:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا وہ حصہ جس کی صحت پر علمائے سیر کوئی اختلاف نہیں کرتے۔ یہ حصہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اوپر عدنان تک ہے۔ خود نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنا نسب عدنان تک بیان کرتے۔ دوسرا حصہ جس میں اہل سیر کا اختلاف ہے یہ عدنان سے اوپر ابراہیم علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ وہ ہے جس میں بہر حال غلطیاں ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام سے اوپر حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ذیل میں تینوں سلسلوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

حصۂ اول: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

حصۂ دوم: عدنان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک:

عدنان بن ادّ بن مقوّم بن ناحور بن تیرح بن یعرب بن یشجب بن نابت بن اسماعیل بن ابراہیم خلیل الرحمٰن۔

حصۂ سوم: ابراہیم علیہ السلام سے آدم علیہ السلام تک:

حضرت ابراہیم علیہ السلام بن قارح (اصل نام آزر) بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالخ بن عیبر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح بن لک بن متوشلخ بن اخنوخ (وہو ادریس النبی) بن یرد بن مہلیل بن قینن بن یانش بن شیث بن آدم صلی اللہ علیہ وعلیہم سلم۔ [السيرة النبوية لابن هشام، ج ١ ص ١-٣، بيروت]

آزر کے تحت روضۃ الالباب کے حوالے سے حاشیہ میں مذکور ہے کہ ''آزر''

ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا نہ کہ باپ۔ اگر یہ حقیقی باپ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ''لابیہ آزر'' نہ فرماتا، اس لیے کہ عرب جب لفظ ''اب'' کے بعد کوئی نام ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد چچا ہوتا ہے نہ کہ حقیقی باپ۔ [سیرت ابن ہشام ۱/۲ حاشیہ ۸]

پیش کردہ سلسلۂ نسب میں اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے ''نابت'' کا ذکر ہے۔ یہ سیرت ابن ہشام کی روایت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد سے ہیں، جب کہ بیشتر علمائے سیر نے لکھا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں ''قیدار'' نے حجاز میں بودوباش اختیار کی اور یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''جد'' ہیں۔

شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ، حضرت آدم علیہ السلام تک نسب نامۂ رسول کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

عدنان تک سلسلۂ نسب متفق علیہ ہے۔ اس لیے علمائے محتاطین نے اسی پر اکتفا فرمایا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نسب پاک عدنان تک بیان فرما کر خاموش ہو جاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت آدم تک سلسلۂ نسب بیان کرنے والوں کے خلاف اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے۔

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ لَا یَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ [ابراہیم:۱۳]

ترجمہ! کیا تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں جیسے قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد کی اقوام جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور فرمایا کرتے تھے ''کذب النسّابون'' نساب جھوٹے ہیں۔ یوں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عدنان تک تو معلوم ہے، آگے کا پتا نہیں۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جو عدنان کے آگے سلسلۂ نسب جانتا ہو۔ ایک شخص اپنا نسب نامہ حضرت آدم تک بیان کرتا تھا۔ اس کے بارے میں امام

مالک رضی اللہ عنہ سے جب سوال کیا گیا تو امام مالک نے فرمایا کہ اس کو کس نے بتایا ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کے نسب کو حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچانے سے امام مالک نے بھی منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت آدم تک تمام اشخاص کے نام معلوم کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں اور اختلافات کی کثرت کی وجہ سے ناموں میں خلط ملط اور رد و بدل کا قوی اندیشہ ہے، لہٰذا ہمیں بھی عدنان پر اکتفا کرنا چاہیے، البتہ علمائے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ آبائے کرام میں عدنان کے آگے حضرت اسمٰعیل، حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت شیث، حضرت آدم بالضرور ہیں۔ سلام اللہ علیہم اجمعین۔

عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک امام بخاری نے اپنی تاریخ میں چھ، علامہ عینی نے شرح بخاری میں آٹھ، کسی نے سات، کسی نے پندرہ، کسی نے انتیس نام گنائے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ درمیان میں چالیس پشت ہے۔

اسی طرح ''روضۃ الاحباب کے حاشیہ میں ابن جوزی کی کتاب ''انساب'' سے نقل کیا ہے کہ عدنان سے اوپر حضرت آدم علیہ السلام تک صرف تیس پیڑھیاں ہیں، لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ علامہ سہیلی نے ''الروض الانف'' میں تحریر فرمایا ہے کہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے مابین جو زمانہ ہے، وہ اتنا طویل ہے کہ اس میں کسی طرح چالیس پشت سے کم نہیں ہو سکتی۔ یوں ہی علامہ طبری نے تحریر کیا ہے کہ بعض نسب دانوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض علمائے نسب نے مَعَد سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک چالیس نام گنائے ہیں اور وہ اس کی تائید عرب کے اشعار سے پیش کرتے ہیں اور اہل کتاب کی تحقیق بھی یہی ہے۔ علامہ موصوف ابو یعقوب نامی ایک نومسلم یہودی ''تدمر'' کے باشندے کا بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک نسب نامہ ہے جو ''ارمیا'' پیغمبر کے منشی کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک چالیس پشت ہے۔ تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ عدنان سے حضرت آدم تک

تیس ہی پشت ہے۔ عدنان کے نسب نامہ میں اتنی کمی بیشی اس وجہ سے ہے کہ اہل عرب عدنان تک نسب علی الاتصال پہنچاتے تھے اور عدنان کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا چوں کہ امر مسلم تھا، اس لیے عام طور پر اوپر جا کر مشہور مشہور نام گنا دینا کافی سمجھتے تھے۔

عام نسب ناموں میں چوں کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک صرف آٹھ، نو نام ہیں اور زمانہ بہت طویل ہے، اس لیے بعض عیسائیوں نے اس سے انکار کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف بیسیوں یورپین اور یہودی مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ قریش بلکہ تمام شمالی عرب وحجاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں [اشرف السیر ص ۵۹-۶۱]

یہاں سردار انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اجداد کا ذکر اختصاراً پیش کیا جارہا ہے جو عدنان اور حضرت عبداللہ کے درمیان ہیں کیوں کہ یہ شجرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمایا ہے، اس لیے اس کی صحت پر کامل اعتماد ہے۔

عدنان:

عدنان بن ''اُدَد یا اُدُ'' یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں اکیسویں پشت میں ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹوں میں ''قیدار'' نے حجاز میں سکونت اختیار کی۔ اللہ نے انھیں بڑی عزت وشہرت عطا فرمائی، ان کے بعد بنو جرہم کے غلبہ کی وجہ سے دیگر اجداد شہرت نہ پا سکے۔ آگے چل کر جس ذات گرامی نے نمایاں مقام حاصل کیا، وہ عدنان کی ذات تھی۔

علامہ احمد بن زینی دحلان لکھتے ہیں: عدنان پہلے شخص ہیں جنھوں نے بیت اللہ شریف کو غلاف پہنایا اور یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کا نام عدنان اس لیے مشہور ہوا کہ یہ عدن سے مشتق ہے جس کا معنی قائم اور باقی رہنا ہے۔ کیوں کہ شیاطین جن وانس کے شر سے ان کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کر دیے تھے، اس لیے

یہ عدنان کے نام سے موسوم ہوئے۔ [ضیاء النبی-۱/۴۰۱]

عدنان کے دو فرزند تھے معد اور عک، عک نے حجاز سے یمن کا سفر کیا اور وہیں اپنی حکومت قائم کر لی۔

معد:

آپ کی ماں کا نام مَہْدَد بنت اللّہم تھا۔ بعض اہل نسب کا بیان ہے کہ عک یمن کی سرزمین ''سمران'' چلے گئے اور اپنے بھائی ''معد'' کو (حجاز) میں چھوڑ دیا۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے ملتی ہے کہ جب اہل حضور نے شعیب علیہ السلام بن ذی مہدم حضوری کو شہید کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں سزا دینے کے لیے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا، تو ارمیا اور برخیا پیغمبر (بحکم خداوندی) معد کو اپنے ساتھ لے کے چلے گئے۔ جب جنگ فرد ہوئی تو ان دونوں نے معد کو مکہ واپس بھیج دیا۔ جب انھوں نے یہاں آکر دیکھا کہ ان کے بھائی اور چچا جو بنو عدنان سے تھے، قبائل یمن میں بود و باش اختیار کر لی ہے اور انھیں میں شادیاں بھی کر لی ہیں۔ چوں کہ بنو عدنان جرہم کی اولاد سے تھے، اس لیے اہل یمن نے ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا، اس پر یہ شعر شہادت میں پیش کیے گئے۔

ترکنا الدیث اخوتنا وعکا   الی سمران فانطلقوا سراعا

وکانوا من بنی عدنان حتی   اضاعوا الامر بینہم فضاعا

[تاریخ طبری، ۱/۲۰۲]

ہم نے اپنے بھائی دیث اور عک کو سمران جانے کی اجازت دے دی تو وہ تیزی سے ادھر چلے۔ وہ بنو عدنان تھے، مگر ان لوگوں نے جب اپنا معاملہ خراب کر لیا تو بات بگڑ گئی۔

معد کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف جنگ وحرب کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور جس سے جنگ آزما ہوتے کامیاب وکامران

واپس لوٹتے۔ یہ کامیابیاں نور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی جو ان کی پیشانی میں جلوہ گر تھا۔[السیرۃ النبویہ للدحلان-۱/۲۱]

آپ کے دو بیٹے تھے نزار اور قنص۔ قنص کی اولاد قنصی کہلائی۔

نزار:

یہ معد کے فرزند ہیں، ان کی کنیت ابو ربیعہ ہے، ان کی والدہ کا نام ''معانہ یا ناعمہ'' تھا۔[اشرف السیر]

امام سہیلی فرماتے ہیں:

جب نزار کی پیدائش ہوئی تو ان کے والد معد نے ان کی آنکھوں کے درمیان نور نبوت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسلاً بعد نسل منتقل ہو رہا تھا دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ نے اونٹ ذبح کیا اور دعوت طعام کا اہتمام کیا اور کہا کہ اس بچے کے حق میں یہ بہت قلیل ہے، اسی وجہ سے ان کا نام نزر پڑ گیا۔ (نزر بمعنی قلیل)[الروض الانف-۱/۱۰]

علامہ زینی دحلان رقم طراز ہیں:

آپ اپنے وقت میں بڑے حسین وجمیل تھے اور عقل وفہم میں اہل زمانہ پر فائق تھے۔ (السیرۃ النبویہ، ۱/۲۰)

آپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک سودہ بنت عک سے، جن سے مضر اور ایاد ہیں۔ دوسری جدالہ بنت وعلان سے، جن سے ربیعہ اور انمار ہیں۔ مضر اور ربیعہ کی اولاد وسط عرب میں، انمار کی نجد اور اطراف حجاز میں اور ایاد کی سرحدی علاقے میں پائی جاتی ہے۔

مضر:

ان کی والدہ کا نام سودہ بنت عک تھا۔ مضر کی وجہ تسمیہ یہ ہے:

مضر اپنے حسن وجمال کی وجہ سے دلوں کو اپنا شیدائی بنا لیتے تھے اور جو شخص

بھی انھیں دیکھتا فریفتہ ہو جاتا کیوں کہ ان کے چہرے میں نور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضوفشاں تھا۔[السیرۃ النبویۃ ۱/۲۰]

جب نزار کا وقت وفات قریب آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور اپنا مال ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ سرخ خیمہ اور اسی کے مشابہ دوسری چیزیں ''مضر'' کو دیں اس لیے مضر کا نام مضر الحمراء پڑ گیا۔ سیاہ خیمہ اور اس کے مشابہ چیزیں ربیعہ کو دیں، چونکہ ان کے حصہ میں سیاہ گھوڑا بھی آیا اس لیے ربیعۃ الفرس سے جانے گئے۔ خادم اور اس کے مشابہ چیزیں ایاد کے حصہ میں آئیں تو انھوں نے ابلق جانور اور کھر کی بکریاں لے لیں، درہم کی تھیلی اور ایوان انمار کو دیا اور کہا کہ اس تقسیم کی عمل پذیری میں اگر کوئی اختلاف رونما تو تصفیہ کے لیے افعی جرہمی کے پاس چلے جانا، وہ تصفیہ کر دے گا۔ [تاریخ الطبری، ۲/۲۰۰]

حسن وجمال کے ساتھ آپ خوش آواز تھے، حدی کا آغاز آپ ہی سے ہے۔ ایک روز اونٹ سے گر گئے، ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ شدت درد سے آپ نے کہا ''یایداہ''، ہائے میرے ہاتھ، ہائے میرے ہاتھ۔ آواز کی کشش کی وجہ سے جو اونٹ چراگاہوں میں چر رہے تھے آپ کے پاس جمع ہو گئے، جب آپ صحت مند ہوئے تو حدی خوانی شروع کی۔[التاریخ الکامل لابن اثیر ۱/۶۳۳]

الیاس:

آپ کی کنیت ابو عمرو تھی۔ ماں کا نام رباب بنت حَیدَہ بن معد تھا۔ آپ قبائل عرب کے سردار تھے، عرب انھیں سید العشیرہ کے نام سے یاد کرتے۔ سب سے پہلے آپ ہی قربانی کا جانور بیت اللہ شریف میں لے گئے۔ حدیث شریف میں ہے:

الیاس کو سخت وسست نہ کہو اس لیے کہ وہ مومن تھے۔ عرب میں ان کی وہی حیثیت ہے جو حیثیت لقمان حکیم کی ان کی قوم میں تھی۔[السیرۃ النبویۃ-۱/۱۹]

مشہور ماہر انساب ابن زبیر سے منقول ہے کہ جب الیاس جوان ہوئے تو

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان پر انھیں زجر وتوبیخ کی اور انھیں تلقین کی کہ اپنے جلیل القدر آباء واجداد کی سنن اور اطوار کی پابندی کریں۔ آپ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور آپ کی قوم نے از سر نو راہ راست کو اختیار کرلیا، جوان کے سلف صالح نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ قبیلہ کے سارے مرد وزن آپ کی دل سے تعظیم کرتے اور آپ کو عزت واجلال کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔[ضیاء النبی-۱/۴۰۹]

ان کے تین لڑکے تھے۔ مدرکہ، طابخہ، قیس غیلان۔ انھیں کی نسل سے عرب کے مشہور قبائل بنو اشجع، ذبیاں، غطفان، ہوازن اور بنو سلیم ہیں۔[اشرف السیر ص۹۸]

مُدرکہ:

آپ کا نام عامر یا عمرو تھا، والدہ کا نام لیلیٰ بنت حلوان تھا، لقب خندف تھا، یہ یمن کے ایک قبیلے کی خاتون تھیں۔ اپنے اوصاف ومحامد کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتیں اسی لیے ان کی اولاد کو باپ کے بجائے ماں کی طرف منسوب کیا گیا۔

ایک قول ہے کہ مدرکہ کا نام عامر تھا اور طابخہ کا نام عمرو۔ طبری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ دونوں اونٹ چرا رہے تھے، اسی دوران ایک شکار ہاتھ لگا۔ وہ اسے پکانے میں مصروف ہوگئے، اونٹ بدکا اور بھاگ پڑا۔ عامر (مدرکہ) نے عمرو (طابخہ) سے کہا کہ تم اونٹ پکڑنے جاؤ گے یا شکار پکاؤ گے؟ عمرو نے کہا شکار پکاؤں گا۔ عامر اونٹ کے پیچھے دوڑا اور اسے پکڑ لیا۔ جب شام کو دونوں گھر آئے اور واقعہ بیان کیا تو باپ نے فرط مسرت میں عامر کو کہا ''انت مدرکہ'' اور عمرو کو کہا ''انت طابخہ'' اس وقت سے یہ دونوں اسی نام سے مشہور ہوگئے۔[تاریخ طبری ۲/۲۰۰-۱۹۹]

مدرکہ نام رکھنے کی وجہ ایک یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے اپنے آباو اجداد کے فضل وکمال حاصل کرلیے تھے، اس لیے مدرکہ نام پڑا۔ اصل لفظ مدرک ہے۔ ''تا'' معنی وصفی سے اسم کی جانب نقل کے لیے ہے۔ مدرکہ کے معنی عربی میں

پانے والے کے ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے خزیمہ اور ہذیل۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہذیل کی نسل سے ہیں۔ (اشرف السیر ص۹۸)

خزیمہ:

آپ کی کنیت ابوالاسد تھی، والدہ کا نام سلمیٰ بنت اسلُم بن حاف بن قضاعہ تھا۔ طبری نے اسلُم کے بجائے سُلیم لکھا ہے۔ ابن ہشام کے مطابق آپ کے چار لڑکے تھے۔ کنانہ، اسد، اسدہ اور ہَوُن۔ [سیرت ابن ہشام ۱/۹۲]

امام محمد بن یوسف الصالحی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے چار بیٹے تھے جن کی والدہ کا نام طاہرہ بنت مر بن اد بن طابخہ تھا۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ لوگوں پر ان کے انعامات واحسانات کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے فضائل ومکارم کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے: جتنے فضائل ومکارم تھے وہ سب کے سب تیزی سے خزیمہ کی ذات میں جمع ہوگئے ہیں اور ان میں سے کوئی مکرمت باقی نہیں رہ گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ خزیمہ کی وفات ملت ابراہیمی پر ہوئی۔[ضیاء النبی ۱/۴۱۰]

کنانہ:

آپ کی والدہ کا نام عوانہ بنت سعد بن قیس بن عیلان تھا۔ بعض نے کہا کہ والدہ ہندہ بنت عمرو بن قیس تھیں۔[طبری ۲/۱۹۹]

کنانہ کے چار لڑکے تھے۔ نضر، مالک، عبد مناۃ اور ملکان۔ آپ کی جلالت شان کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی کافی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولاد ابراہیم علیہ السلام سے اسمٰعیل (علیہ السلام) کو چن لیا اور اولاد اسمٰعیل سے کنانہ کو، اولاد کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم سے مجھ کو منتخب فرمایا۔[صحیح مسلم ۲/۲۴۵]

نضر:

آپ کا نام قیس تھا، کنیت ابو یخلُد تھی۔ حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھے۔ اس لیے نضر کے نام سے مشہور ہوگئے۔ (نضر، زرسرخ کو کہتے ہیں) والدہ کا نام بَرہ بنت مُر بن اُد بن طابخہ تھا۔ [الکامل فی التاریخ ۱/۶۲۸، ۶۲۹]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ نضر ہی کا نام قریش ہے، انھیں کی اولاد قُرشی کہلائے گی، ان کے علاوہ کی اولاد قُرشی نہیں۔ جریر بن عطیہ جو بنی کُلیب بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم کا ایک فرد ہے، ہشام بن عبدالملک بن مروان کی مدح میں کہتا ہے۔

فَمَا الاُمُّ الَّتِیْ وَلَدَتْ قُرَیْشًا بِمُقْرِفَةِ النَّجَّارِ وَلَا عَقِیْمِ
وَمَا قَوْمٌ بِاَنْجَبَ مِنْ اَبِیْکُمْ وَمَا خَالٌ بِاَکْرَمَ مِنْ تَمِیْمِ

ترجمہ! جس ماں نے قریش کو جنا، نہ وہ نسب کے اعتبار سے عیب دار ہے اور نہ بانجھ ہے۔ اے قبیلۂ قریش کے لوگو! سن لو، نہ کوئی خاندان تمھارے باپ سے زیادہ شریف و بزرگ ہے، نہ کسی کا ماموں تمیم سے زیادہ عزت دار ہے۔

ان اشعار سے برہ بنت مُر کی طرف اشارہ ہے جو تمیم بن مُر کی بہن اور نضر کی ماں تھیں۔ بعض نے فہر بن مالک کا نام قریش بتایا ہے۔ جو ان کی نسل سے ہے وہ قرشی ہے اور جو ان کی نسل سے نہیں وہ قرشی نہیں۔

قریش، تَقَرّش سے بنا ہے اور اس کا معنی تجارت و اکتساب کے ہوتے ہیں یہ قبیلہ تجارت پیشہ تھا، اس لیے انھیں قریش کہنے لگے۔ ابن اسحاق نے کہا قریش کو قریش اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ متفرق ہونے کے بعد اکٹھا ہوا ہے، اس لیے اس کو قریش کہتے ہیں۔ ''تَقَرّش'' کے معنی جمع ہونے کے بھی ہیں۔ [سیرت ابن ہشام ۱/۹۳]

ان کی والدہ کے بارے میں ایک غلط بات یہ مشہور ہے کہ خزیمہ کی وفات کے بعد ان کے والد کنانہ نے عرب کے رواج کے مطابق ان سے بیاہ کرلیا، اس کے

نتیجے میں نضر کی ولادت ہوئی۔ بیٹے کا باپ کی بیوہ سے نکاح کرنا اگرچہ وہ اس کی سگی ماں نہ ہو، درست نہیں۔ اس لیے وہ لوگ جن کے دلوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ بغض کی بیماری ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسب پاک پر طعنہ زنی کرنے کے لیے اس واقعہ کو بہت اچھالتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے علمائے محققین پر جنہوں نے اپنے نشتر تحقیق سے اس جھوٹ کا پردہ چاک کیا اور حقیقت کا رخ زیبا سب کے سامنے آشکارا کردیا۔

ہم قارئین کی خدمت میں ابوعثمان الجاحظ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، حقیقت حال واضح ہوجائے گی۔ جاحظ ایک آزاد منش محقق تھے۔ اپنی تحقیق سے جس بات کی حقانیت ان پر واضح ہوجاتی ہے، اس کے اظہار میں وہ بڑے بے باک تھے اور کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

کنانہ کے والد خزیمہ کا جب انتقال ہوا تو زمانۂ جاہلیت کے رواج کے مطابق انھوں نے اپنے باپ کی بیوہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا، لیکن وہ جلد ہی فوت ہوگئیں۔ ان کے شکم سے نہ کوئی بیٹا پیدا ہوا نہ کوئی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد کنانہ نے اپنی پہلی بیوی کے بھائی کی بیٹی کے ساتھ نکاح کیا جس کا نام برہ بنت مر بن اد بن طابخہ ہے۔ ان کے شکم سے کنانہ کے فرزند ''النضر'' پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے جب یہ سنا کہ کنانہ نے اپنے باپ کی بیوہ کو اپنی زوجیت میں لیا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ کنانہ نے اپنے باپ کی بیوہ کو زوجیت میں لے لیا اور اس کے شکم سے نضر پیدا ہوا، اور اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بیویوں کے نام بھی ایک تھے اور ان کا باہمی رشتہ بھی بہت نزدیک کا تھا، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب پاک پر ناپسندیدہ اور مبغوض نکاح کا داغ لگائیں، حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ابتدا سے آخر تک اسلامی نکاح کے مطابق ایک پشت سے دوسری پشت میں منتقل ہوا۔ [السیرۃ النبویہ للدحلان-۱/۲۱]

اس تحقیق سے بالکل واضح ہے کہ سرور انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب کسی زمانے اور قرن میں داغدار اور مقبوح نہیں تھا۔ آپ کے آبا واجداد ہر قسم کے عیوب سے پاک صاف تھے۔

مالک:

یہ نضر کے فرزند تھے، کنیت ابوالحارث تھی، والدہ کا نام عاتکہ بنت عدوان بن قیس بن عیلان تھا۔ عکرشہ لقب تھا۔ ان کے فرزند تھے فہر اور حارث۔ [طبری، ۱۹۷/۲]

فِہر:

آپ کی کنیت ابو غالب تھی اور لقب ''جَمّاع قریش'' تھا۔ ماں کا نام جَندلہ بنت عامر بن حارث بن مُضاض جرہمی تھا۔ آپ مکہ کے رئیس تھے، حاکم یمن حسان بن عبد کلال حمیری اس نیت سے مکہ پر حملہ آور ہوا کہ خانۂ کعبہ کو ڈھا کر یمن میں دوسرا کعبہ تعمیر کرے اور لوگ بجائے مکہ کے حج کے لیے یمن آئیں۔ جب قریش اور دیگر قبائل کے لوگوں نے یہ زیادتی دیکھی تو مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ رئیس مکہ فہر بن مالک کی قیادت میں بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ حسان اور اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی، حسان گرفتار کر لیا گیا اور تین سال تک مکہ میں قید رہا، فدیہ دے کر رہائی حاصل کی اور مکہ سے یمن جاتے ہوئے راستہ میں مر گیا۔ [ابن اثیر ۶۲۷/۱ - طبری ۱۹۷/۲]

علمائے سیر کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ قریش انھیں کا لقب ہے۔ زین عراقی کہتے ہیں: صحیح ترین قول یہی ہے کہ فہر ہی قریش ہیں۔ اور بہتوں کا قول ہے کہ قریش نضر کا لقب ہے۔

ان دونوں اقوال کا حاصل ایک ہے۔ کیوں کہ نضر کی نسل صرف مالک سے چلی اور مالک کی صرف فہر سے، اس لیے فہر کی اولاد کے علاوہ نضر کی اولاد کا وجود نہیں۔ [اشرف السیر ص ۱۰۰]

غالب:

کنیت ابو تیم تھی، ماں کا نام لیلیٰ بنت حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ تھا۔ یہ طبری کی روایت ہے اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ماں کا نام سلمٰی بنت عمرو خزاعی تھا۔ غالب کے دو بیٹے تھے لوی اور تیم۔ بنو تیم ہی کو بنوالادام کہا جاتا ہے۔ [طبری ۱۹۷/۲، سیرت ابن ہشام ۹۵/۱]

لُوَیّ:

ان کی ماں کا نام عاتکہ بنت یخلد بن نضر بن کنانہ تھا۔ قریش کی عاتکہ نامی خواتین میں جن کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں آتا ہے، ان میں سے یہ پہلی عاتکہ ہیں۔ [طبری ۱۹۶/۲]

لوی بن غالب کے چار بیٹے تھے، کعب، عامر، سامہ اور عوف۔ کعب، عامر اور سامہ کی ماں، ماویہ بنت کعب بن قین بن جَسر تھیں جن کا تعلق بنی قضاعہ سے تھا۔ [سیرت ابن ہشام، ۹۶/۱]

کعب:

آپ کی کنیت ''ابو ہُصَیص'' تھی۔ آپ ایسے جاہ وحشمت والے آدمی تھے کہ عام فیل یعنی چار سو سال تک ان کا سنہ وفات جاری رہا۔ ایام حج میں لوگوں کو خطبہ فرماتے، آپ کا وہ خطبہ بہت مشہور ہے جس میں آپ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دیتے۔ [ابن اثیر، ۶۲۴/۱، طبری ۱۹۶/۲]

آپ کے تین لڑکے تھے۔ مرہ، عدی، ہُصَیص۔ ان کی ماں وحشیہ بنت شیبان بن مُحارب بن فہر بن مالک بن نضر تھیں۔ [سیرت ابن ہشام ۱۰۳/۱]

مُرہ:

کنیت ابو یقظہ تھی، ماں کا نام وحشیہ یا مخشیہ تھا۔ مرہ کے تین بیٹے تھے، کلاب، تیم، یقظہ۔ تیم اور یقظہ کی ماں کا نام اسما بنت عدی بن حارثہ تھا۔ [ابن اثیر ۱۹۶/۲]

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نسب مرہ پر آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

کِلاب:

نام حکیم تھا، ابوزہرہ کنیت تھی، ماں کا نام ہند بنت سُریر بن ثعلبہ بن حارث بن فہر بن مالک تھا۔ انھیں کلاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کتوں کے ساتھ بہ کثرت شکار کرتے تھے۔ اس لیے اس نام سے مشہور ہو گئے۔

ابو رقیش اعرابی سے پوچھا گیا کہ آپ لوگ اپنے بیٹوں کا برا نام مثلاً ”کلب وذئب“ وغیرہ رکھتے ہیں اور غلاموں کے اچھے نام مثلاً مرورق، رباح وغیرہ، ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ ہم بیٹوں کے نام اپنے دشمنوں کے لیے اور غلاموں کے نام اپنے لیے رکھتے ہیں، گویا لڑکے دشمنوں کے لیے سامانِ حرب ہیں اور ان کے سینوں کے لیے تیر۔ [الروض الانف ۱/۸] ان کے دو بیٹے تھے: قُصَی اور زہرہ۔

قصیّ:

نام زید اور قصی لقب تھا، تقریباً ۴۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ قصی مشہور ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ والد کلاب بن مرہ کے انتقال کے بعد آپ کی ماں فاطمہ بنت سعد بن سہیل نے بنو قضاعہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ قصی چوں کہ ایام شیر خوارگی میں تھے، اس لیے ماں کے ساتھ بنو قضاعہ چلے گئے اور وہیں ان کی تربیت ہوئی۔ بنو قضاعہ شام کی سرحد کے قریب مقام عذرہ میں آباد تھے۔ ایک روز کسی قضاعی سے تکرار ہو گئی، اس نے انھیں غریب الوطنی کا طعنہ دیا اور کہا کہ تم ہماری قوم سے نہیں ہو۔ کیوں نہیں اپنی قوم اور خاندان میں چلے جاتے۔ یہ سن کر آپ افسردہ خاطر ہوئے، ماں کے پاس آئے اور حقیقت سے آگاہی چاہی۔ ماں نے کہا! بیٹا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ تو ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کی سارے عرب میں عزت وتکریم ہے۔ تو اپنی ذات اور نسب کے اعتبار سے یہاں سب سے

اعلیٰ اور اشرف ہے۔ تو کلاب بن مرہ کا بیٹا ہے۔ تیرا قبیلہ قریش مکہ میں اور حرم بیت اللہ میں اقامت گزیں ہے۔ اتنا سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ اے مادر مہربان! اب مجھے اپنے وطن اور خاندان میں جانے کی اجازت دیجیے مجھ سے غریب الوطنی کے طعنے نہیں سنے جا سکتے۔ ماں نے کہا بیٹا! تھوڑا انتظار کرو۔ حج کے مہینے آ جائیں اور حجاج کا قافلہ مکہ جانے لگے تو ان کے ساتھ چلے جانا تو سلامتی سے پہنچ جاؤ گے، اس وقت جانے میں تمھاری جان کا خطرہ ہے۔ قصی نے ماں کا مشورہ مان لیا، چناں چہ جب حج کا مہینہ آیا تو حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ مکہ روانہ ہو گئے۔ مکہ پہونچنے کے بعد حج کیا اور وہیں اپنے بڑے بھائی زہرہ کے پاس اقامت اختیار کی۔ [طبری ۲/۱۹۲]

بچپن کے ایام چوں کہ آپ نے اپنے وطن سے دور گزارا اس لیے قصی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ قصی قاص کی تصغیر ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔

قصی ایک بہادر اور شریف شخص تھے، انھوں نے حُلیل بن حبشی کی بیٹی حُبّٰی کے لیے پیغام نکاح بھیجا۔ حلیل نے خاندانی شرافت کے پیش نظر یہ رشتہ قبول کر لیا اور اپنی بیٹی کا نکاح قصی سے کر دیا۔ جن کے شکم سے آپ کے چار بیٹے پیدا ہوئے: عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد ابن قصی۔ حلیل کعبہ کے متولی اور امیر مکہ تھے اخیر عمر میں انھوں نے کعبہ کی تولیت اپنی بیٹی حُبّٰی کے حوالے کر دی۔ اس نے کہا والد گرامی: آپ جانتے ہیں کہ میں کعبہ کا دروازہ کھول سکتی ہوں، نہ بند کر سکتی ہوں۔ حلیل نے کہا: اچھا، تو میں اس کام کے لیے دوسرے شخص کا انتظام کر دیتا ہوں جو تیرا نائب بن کر یہ کام انجام دے گا۔ چناں چہ یہ خدمت ابوغُبشان سلیم بن عمرو کے سپرد ہوئی۔

قصی نے ایک مشک شراب اور ایک عود کے عوض ابوغبشان سے کعبہ کی تولیت خرید لی۔ اس پر بنوخزاعہ بڑے برافروختہ ہوئے اور قصی سے آمادۂ پیکار ہوئے۔ قصی نے اپنے بھائیوں سے مدد مانگی، بھائیوں نے قصی کی مدد کی اور خزاعہ سے لڑے (جس کے نتیجے میں بنوخزاعہ کو مکہ چھوڑنا پڑا) اصل حقیقت اللہ جانتا ہے مگر بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں خسرہ کی بیماری ہو گئی اور قریب تھا کہ سب کے سب اس مرض میں ہلاک

ہو جائیں، انھوں نے خود ہی مکہ کو خیر باد کہہ دیا۔ بعض نے اپنا مکان بلا معاوضہ کسی کو دے دیا، بعض نے بیچ دیا اور بعض وہیں رہ گئے۔ اب قصی بلا شرکت غیر کعبہ کے متولی اور مکہ کے امیر ہو گئے اور انھوں نے قریش کے منتشر قبیلوں کو اکٹھا کیا اور انھیں مکہ کے پہاڑ پر آباد کیا، انھوں نے خزاعہ کے مکان قریش میں تقسیم کر دیے، اس لیے انھیں ''مجمع'' کہا جانے لگا۔ اس تعلق سے مطرود یا حذافہ بن غانم کا یہ شعر مشہور ہے ۔

ابو کم قصی کان یُدعی مجمّعا

بہ جمع اللہ القبائل من فھر

یعنی تمھارا باپ قصی ہے جنھیں مجمع کہا جاتا ہے۔ انھیں کے ذریعہ اللہ نے فہر کے قبائل کو یک جا کر دیا [تاریخ طبری ج ۲/ص ۱۹۲،۱۹۳]

رب کریم نے قصی کو اعلیٰ دماغ سے نوازا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے بڑے عظیم الشان کام انجام دیے۔ قصی دنیا میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۴۴۰ء میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کی:

☆ مکہ میں دار الندوۃ قائم کیا جہاں اہل مکہ اپنے کسی اہم اور مخصوص کام کے لیے اکٹھا ہو کر مشورہ کرتے۔

☆ ایام حج میں حاجیوں کو پانی کی سخت دشواری پیش آتی۔ اس کے لیے انھوں نے معقول انتظام کیا تاکہ تمام حاجی سیراب ہو سکیں۔ اس خدمت کو ''سقایہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

☆ کھانا کھلانے کے لیے الگ ایک محکمہ قائم کیا جسے ''رِفادہ'' کہا جاتا ہے۔

☆ خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے ایک منصب تجویز کیا جسے ''حجابہ'' کہا جاتا ہے، جس کے تحت خانہ کعبہ کی کلید برداری اور اس میں رکھی ہوئی امانتیں، قیمتی تحائف اور زیورات کی حفاظت تھی۔

☆ لڑائیوں میں ''لواء'' انھیں کی ایجاد ہے۔ جسے اس زمانے میں وزارت دفاع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح اور دوسرے کام قصی کے تفردات سے ہیں۔ انھیں خدمات نے آپ کو پورے عرب میں عظیم و جلیل بنا دیا۔

بیان کردہ تمام مناصب ان کے پاس تھے، انھوں نے انتقال کے وقت یہ تمام مناصب اپنے بڑے بیٹے عبد الدار کے سپرد کر دیے، جس کی وجہ سے ان کی اولاد میں جذبۂ رقابت پیدا ہو گیا اور نفاق کی بنیاد پڑ گئی۔

بعض نے کہا کہ قصی کا لقب قریش ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ روافض کی اختراع ہے تاکہ حضرات صدیق و فاروق کا قریشی ہونا ثابت نہ ہو سکے۔ [طبری، ضیاء النبی،]

عبد مناف: نام مغیرہ تھا، حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھے، اس لیے ''قمر البطحاء'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان کی ماں حُبّٰی نے انھیں مناۃ نامی بت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا، اسی مناسبت سے ان کا نام ''عبد مناۃ'' پڑ گیا، پھر ان کے والد قصی نے جب غور کیا تو کہا کہ یہ تو کنانہ کے بیٹے عبد مناۃ کے موافق ہو گیا، اس لیے انھوں نے بدل کر ''عبد مناف'' کر دیا۔ [الروض الانف ۱/۸]

باپ کی زندگی ہی میں عبد مناف نے غیر معمولی عزت و شہرت حاصل کر لی تھی۔ بڑے کریم النفس اور خدا ترس و حق شناس تھے، طبیعت فیاض تھی، بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے قصی نے تمام مناصب عبد الدار کو دیدیے تھے، لیکن نااہلی کی وجہ سے وہ اسے نباہ نہ سکا، بالآخر قریش کی سیادت و قیادت عبد مناف کے ہاتھ میں آئی۔

علامہ زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ ایک کتبہ پر یہ لکھا ہوا پایا گیا: انا المغیرة بن قصی اٰمر بتقوی الله و صلة الرحم و ایای عنی القائل ۔

کانت قریش بیضة فتقلقلت

المخ خالصة بعبد مناف

ترجمہ! قریش انڈا ہیں تو مغز خالص عبد مناف ہیں [اشرف السیر ۱۰۵]

ان کے پاس نزار کا جھنڈا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کمان تھی۔ نور

محمدی کے اثر سے بے مثال حسین تھے۔ان کے چار بیٹے تھے:

۱- ہاشم، ۲- عبد شمس، ۳- مطلب، ۴- نوفل

اول الذکر تین کی ماں کا نام عاتکہ بنت مرہ بن ہلال اور نوفل کی ماں کا نام واقدہ بنت عمرو مازنیہ ہے۔[سیرت ابن ہشام ۱/۱۰۶]

ہاشم:

آپ کا اصل نام عمرو ہے اور ہاشم کے نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ آپ نے مکہ میں سب سے پہلے روٹیوں کو شوربے میں توڑ کو اپنی قوم کو کھلایا۔مطرود بن کعب خزاعی یا ابن کلبی کے قول کے مطابق زبعریٰ نے یہ شعر اسی واقعہ سے متعلق کہا ہے۔

عمرو الذی ھشم الترید لقومہ
ورجال مکۃ مسنتون عجاف

وہ عمرو جس نے اپنی قوم کو روٹیاں چورا کر کے کھلائیں جب کہ اہل مکہ سخت قحط میں گرفتار تھے۔ان کی قوم افلاس اور قحط میں مبتلا تھی، انھوں نے فلسطین کا سفر کیا اور وہاں سے آٹا خریدا اور مکہ واپس آئے، روٹیاں پکوائیں اور بہت سے اونٹ ذبح کر کے قورمہ تیار کیا اور اس میں روٹیاں توڑ کر اپنی قوم کی دعوت کی۔[تاریخ طبری ۲/۱۹۰]

کہا جاتا ہے کہ ہاشم اور عبد شمس جڑواں پیدا ہوئے تھے۔جو پہلے پیدا ہوا، اس کی انگلی دوسرے کی پیشانی سے چمٹی ہوئی تھی، اس لیے کاٹ کر دونوں کو الگ الگ کیا گیا اور خون بہا۔اس لیے فال لی گئی کہ ان کے درمیان خوں ریزی ہوگی۔ باپ کے بعد ہاشم کعبہ کے متولی ہوئے، سقایہ اور رفادہ کا انتظام ان سے متعلق ہوا۔[طبری ۲/۱۹]

آپ کے چار لڑکے تھے، عبدالمطلب، اسد، ابا صیفی، فضلہ۔عبدالمطلب کی ماں کا نام سلمیٰ بنت عمرو بن زید تھا۔ باقی دوسری ماں سے ہیں۔[سیرت ابن ہشام ۱/۱۰۷] ہاشم اپنے خاندان کے ایک معزز فرد تھے، اس لیے ان کا خاندان انھیں کی

طرف منسوب ہوکر ہاشمی خاندان کہلایا۔

اعزازِ بنو ہاشم اور مستشرقین کا تعصب:

خاندان بنو ہاشم کا مقام ومرتبہ گھٹانے اور مسلمانوں کو حقیر وذلیل کرنے کے لیے مستشرقین نے یہ اسلوب اپنایا کہ قبیلۂ قریش کی مختلف شاخوں کو اپنے تخیل کے زور پر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ایک طرف قبیلہ کی وہ شاخیں تھیں جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا اور طائف کی تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر وہ جو چاہتے کرتے تھے۔دوسری طرف اس قبیلے کی کچھ شاخیں تھیں جو کمزور تھیں۔یہ قبیلے اس قابل نہ تھے کہ وہ شام یا یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیج سکتے۔ مستشرقین کہتے ہیں کہ قبیلۂ بنو ہاشم کا شمار انھیں کمزور قبائل میں ہوتا تھا۔مکہ کے طاقت ور اور دولت مند قبائل کے مقابلے میں قبیلۂ بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

ہم مستشرقین کی تحریروں کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ خاندان بنو ہاشم کی اہمیت کو کم ثابت کرنے کے لیے مستشرقین نے کس قسم کے حربے استعمال کیے ہیں۔ولیم میور اپنی کتاب ''محمد اینڈ اسلام'' میں لکھتا ہے:

''عبدالمطلب کے بیٹے اپنے باپ کے وقار کو برقرار نہ رکھ سکے تھے اور انھوں نے بعض ان عہدوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی جن پر ان کے والد فائز تھے، اس طرح وہ نسبتاً پست معیارِ زندگی پر قانع ہو گئے تھے۔'' (محمد اینڈ اسلام)

ولیم میور نے یہ نہیں بتایا کہ عبدالمطلب کے بیٹے کن کن عہدوں سے دست بردار ہوئے۔سوچنے کی بات ہے کہ قریش کے جن قبائل نے حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے تلواریں نکالی تھیں، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ اس اعزاز سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو جائیں جو انھیں آبا واجداد سے ورثے میں ملا تھا۔اگر بنو ہاشم میں اس قسم کی کمزوریاں ہوتیں تو ان کے لیے مکہ میں سر اٹھانا ممکن نہ رہتا۔

''مونٹوگومیری'' نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن میں قبیلۂ بنو ہاشم کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پرست صرف یہ احتیاط کرتے کہ وہ بھوک سے مر نہ جائیں۔ اس سے زیادہ وہ ان کے لیے کچھ نہ کر سکتے تھے، خصوصاً جب کہ اس زمانے میں بنو ہاشم کی مالی حالت گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یتیم جس کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے جسمانی طور پر کوئی آدمی موجود نہ تھا، اس نے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز انتہائی کمزور طریقے سے کیا اور یقیناً اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ [محمد: پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین]

مونٹوگومیری واٹ بنو ہاشم کے تمام افراد کو غریب اور دوسرے درجے کا شہری ثابت کرنے کے لیے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے بارے لکھتا ہے:

''ایک چھوٹے پیمانے کا بنکار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں پرسکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔'' [ایضاً]

مونٹوگومیری واٹ اپنے تخیل کے زور پر ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی معاشی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

''جس زمانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی، اس زمانے کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مکہ کی بڑھتی ہوئی تجارتی خوشحالی نے ایک نیا اعلیٰ طبقہ مکی سوسائٹی میں پیدا کر دیا تھا، یعنی انتہائی امیر اور انتہائی طاقت ور تاجروں کا طبقہ۔ یہ لوگ اپنی اس حیثیت کے ساتھ ساتھ انتہائی طاقت ور قبائل کے سردار بھی تھے یا ان قبائل میں ان کا زبردست اثر تھا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی تجارت کے انتہائی منافع بخش شعبوں پر ان لوگوں کو اجارہ دارانہ کنٹرول حاصل تھا۔ یہ طبقہ تقریباً سارے کا سارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف تھا۔ [محمد: پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین]

مستشرقین کی کتابوں میں اس قسم کی تحریریں جابجا ملتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ نویسی سے مستشرقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو طبقاتی کش مکش سے جنم لینے والی ایک تحریک قرار دے سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ مکہ والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مخالفت کی تھی، اس کی وجہ مذہبی اور نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ مکہ کے امیر اور غریب طبقے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے۔ اس طرح کی تحریروں سے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی مقام گھٹانے اور کمزور طبقے کا فرد ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس شخص کے آباواجداد میں قصی، عبد مناف، ہاشم اور عبدالمطلب جیسے تاریخ ساز سرداروں کے نام آتے ہوں، اسے اس کی قوم میں ایک معمولی خاندان کا فرد ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیالی تاریخ نویسی کے خلاف مغرب کے مستند اور مشہور مورخ ''گبن'' کی شہادت ملاحظہ فرمائیں۔ وہ لکھتا ہے:

''آپ کا اسماعیلی النسل ہونا قومی اعزاز تھا یا افسانہ، لیکن اگر ان کے نسب نامے کی ابتدائی کڑیاں تاریک اور مشکوک ہوں تو بھی وہ اپنے نسب نامے کی کئی نسلوں میں ایسے عظیم لوگ پیش کر سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریف اور عظیم تھے، انھوں نے قریش کے قبیلے اور ہاشم کے خاندان میں جنم لیا تھا جو معزز ترین عرب تھے۔ مکہ کے بادشاہ تھے اور خانۂ کعبہ کے موروثی پاسبان تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب تھے جو ہاشم کے بیٹے تھے، وہ ہاشم جو مالدار اور سخی شہری تھے۔ انھوں نے قحط کی سختیوں کو اپنے مال تجارت کے ذریعہ کم کیا تھا۔ مکہ جسے باپ کی کشادہ دلی نے حالت قحط میں کھانا کھلایا تھا، اس مکہ کو اسی باپ کے بیٹے کی بہادری نے بچایا تھا۔'' [دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر، ص۲۲۹]

گبن کے اس بیان سے ولیم میور اور مونٹوگومیری واٹ کے مفروضے چکنا چور ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر قبیلہ بنو ہاشم اتنا ہی کمزور تھا جتنا انھیں نظر آتا ہے اور دیگر قبائل قریش ان کے مقابلے میں ان سے کہیں زیادہ طاقت ور اور مالدار تھے تو

وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو وہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

جو چیزیں عربوں کے یہاں قابل فخر تھیں، ان میں بنو ہاشم کسی سے کم نہ تھے۔ ان کے نزدیک بینک بیلنس مایۂ افتخار نہ تھا، بلکہ ان کے یہاں عظیم وہ تھا جو دوسروں کی نسبت زیادہ سخاوت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ان کے وقار کا امتحان ان کی جرأت اور بہادری سے ہوتا تھا۔ مستشرقین ابوجہل کو قریش کے طاقت ور اور مضبوط ترین قبیلے کا سردار مانتے ہیں، لیکن انھیں معلوم ہے کہ ایک مرتبہ جب ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی تھی اور آپ کے چچا حمزہ کو جو ابھی حلقہ بہ گوش اسلام نہیں ہوئے تھے، ابوجہل کی اس جسارت کا علم ہوا تھا تو انھوں نے سب کے سامنے ابوجہل کی مرمت کی تھی اور مکہ کے امیر ترین بہت ہی طاقت ور اور بہت ہی بااثر لوگوں میں سے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ حمزہ کے ہاتھ روک سکے۔

مونٹو گومیری واٹ کے پیش کیے گئے اقتباسات سے خاندان بنی ہاشم کی ایک بگڑی ہوئی صورت نظر آتی ہے، لیکن وہی شخص جب میدان کارزار کی منظر کشی کرتا ہے تو یوں لکھتا ہے:

’’عربوں کا دستور تھا کہ وہ اپنی بہادری، جرأت اور عظمت کا فیصلہ میدان جنگ میں کرتے تھے، وہ جنگ کا بازار گرم ہونے سے پہلے مبارزت طلبی کرتے تھے اور اپنے مقابلے میں اسی کو آنے کی اجازت دیتے تھے جسے وہ اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔‘‘ بدر میں بھی عام لڑائی سے پہلے یہ انفرادی معرکہ آرائی ہوئی جس کی تفصیل خود ولیم میور نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

شیبہ اور عتبہ وقریش سردار اور ولید بن عتبہ جو ابھی ابوجہل کے طعنوں کی ٹیس محسوس کررہے تھے، میدان میں آئے اور لشکر مدینہ سے تین مبارز طلب کیے۔ کئی لوگ آگے بڑھے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں روک دیا اور اپنے اہل خاندان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا۔ بنو ہاشم! اٹھو اور مقابلہ کرو، کیوں کہ یہ تمہارا ہی حق ہے۔ عبیدہ،

حمزہ اور علی، ایک محمد کے چچا اور دو چچیرے بھائی آگے بڑھے، ان کے چہرے خودوں میں چھپے ہوئے تھے، اس لیے عتبہ نے ان سے ان کے نام پوچھے۔ اس نے کہا: تم بولو اگر تم ہمارے مقابلے کے ہوئے تو ہم تم سے لڑیں گے۔ حمزہ نے رزمیہ انداز میں اپنا نام بتایا، میں خدا اور خدا کے رسول کا شیر ہوں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ عتبہ نے جواب دیا: تم واقعی ہمارے مد مقابل آنے کے قابل ہو۔ لیکن یہ تمھارے ساتھ کون ہیں؟ حمزہ نے ان کے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا اٹھو اور اپنے اپنے غنیم کا مقابلہ کرو۔ اس طرح وہ مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ شیبہ وغیرہ ان ہاشمیوں کو اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔

ابوسفیان جو اسلام لانے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن تھے، بادشاہ روم ہرقل نے پوچھا کہ یہ جو تم میں دعویٰ نبوت کرتا ہے، اس کا نسب کیا ہے تو ابوسفیان نے کہا بہت اعلیٰ۔ اس طرح ابوسفیان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی عظمت کی شہادت دی تھی۔

وہ باتیں جن میں عرب قبائل باہم مفاخرت کیا کرتے تھے ان میں قریش کے تمام قبائل ہم پلہ تھے اور ان میں اگر کوئی قبیلہ دوسروں پر فوقیت رکھتا تھا تو وہ قبیلۂ بنو ہاشم ہی تھا، کیوں کہ قصی کے بعد قریش میں کوئی سردار ایسا نہیں گذرا جسے ہاشم اور عبدالمطلب کا ہم پلہ قرار دیا جاسکے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندان بنو ہاشم کا مرتبہ گھٹانے کے لیے مستشرقین نے بہت سے شوشے چھوڑے ہیں لیکن انھیں کی تحریروں سے ان کی تردید بھی ہوتی ہے۔ الحق ماشهدت به الاعداء [ضیاء النبی ۷/ ۱۹۶ تا ۲۰۸، بحذف واضافہ]

عبدالمطلب:

آپ کا نام شیبہ ہے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے سر میں چند بال

سفید تھے اس لیے آپ کو شیبہ کہا جانے لگا، شیبہ کا معنی سفید بال والا ہوتا ہے۔ ماں کا نام سلمٰی بنت عمرو بن زید خزرجیہ تھا، کنیت ابو الحارث تھی۔ آپ کے والد بہ سلسلۂ تجارت شام کو روانہ ہوئے۔ مدینہ کے راستے سے گذر ہوا تو آپ عمرو بن زید بن بعید خزرجی کے پاس فروکش ہوئے اور وہیں ان کی لڑکی سلمٰی سے نکاح ہوا اور وہ خود شام کے سفر پر نکل گئے، جب سفر سے واپس ہوئے تو سلمٰی کو بھی ساتھ مکہ لائے۔ دوبارہ جب شام کا سفر کیا تو سلمٰی کو بھی ساتھ لے گئے اور مدینہ سلمٰی کو ان کے میکے چھوڑ دیا اور اپنے کام پر نکل گئے اور وہیں غزہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی بیوی سلمٰی کے یہاں عبد المطلب پیدا ہوئے۔ انھوں نے سات آٹھ سال وہیں نشو ونما پائی۔ جب ان کے چچا مطلب کو ان کی واپسی کا خیال ہوا تو مدینہ پہنچے اور پورے شہر کا چکر لگایا تب کسی طرح انھیں ان کی ماں کا پتا چلا۔ مطلب نے جب تک ان کی ماں سے شیبہ کے لیے اجازت نہ لے لی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب اجازت مل گئی تو وہ انھیں لے کر مکہ روانہ ہوئے جب وہ مکہ میں داخل ہوئے اور شیبہ کو قریش نے اونٹ پر پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ مطلب کا غلام ہے جسے وہ خرید کر لا رہا ہے۔ اسی وجہ سے شیبہ کا نام عبد المطلب مشہور ہو گیا۔ اس پر مطلب نے کہا: کم بختو! یہ میرا غلام نہیں ہے۔ بلکہ میرے بھائی ہاشم کا فرزند ہے جسے میں مدینہ سے لا رہا ہوں۔

جب عبد المطلب سن بلوغ کو پہنچے اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گئے تو آپ کے چچا مطلب نے آپ کے باپ کی جائداد آپ کے حوالے کر دی۔ رفادہ اور سقایہ جو مناصب ہاشم کے سپرد تھے وہ بھی ان کے حوالے کیا، لیکن ایک دوسرے چچا نوفل نے آپ کی جائداد پر قبضہ کر لیا اور مناصب چھیننے کی کوشش کی، لیکن عبد المطلب اپنے ماموؤں کے تعاون سے اپنا حق واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

عبد المطلب فیاض تھے، انسان تو انسان جانوروں کے لیے بھی ان کا دسترخوان وسیع تھا۔ اس لیے آپ کو مطعم الطیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ فہم وفراست میں یکتائے روزگار تھے، اس لیے جب عبد المطلب اور حرب بن امیہ کے

درمیان مکہ کی سرداری کے تعلق سے اختلاف ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے والد خطاب نے بحیثیت فیصل آپ کے حق میں فیصلہ صادر کیا کہ عبد المطلب مکہ کی سرداری کے لائق اور حقدار ہیں۔ آپ کی برکت سے چاہ زمزم کا دوبارہ سراغ لگا اور آج تک لوگ اس سے سیراب ہو رہے ہیں اور ابرہہ جو ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ کو ڈھانے آیا تھا، تباہ و برباد ہوا۔ اس طرح اور بہت سے واقعات ہیں جو آپ کی عظمت ورفعت کا پتا دیتے ہیں۔

عبد المطلب نے کئی شادیاں کیں، جن کے بطن سے دس لڑکے اور چھ لڑکیاں تولد ہوئیں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں:

۱- عباس، ۲- حمزہ، ۳- عبداللہ، ۴- ابوطالب،
۵- زبیر، ۶- حارث، ۷- حجلا ۸- مقوم
۹- ضرار ۱۰- ابولہب

لڑکیوں کے نام یہ ہیں:

۱- صفیہ ۲- ام حکیم بیضا ۳- عاتکہ
۴- امیمہ ۵-اروٰی ۶-بَرّہ [سیرت ابن ہشام ج ۱]

عبداللہ:

آپ کی والدہ کا نام فاطمہ تھا جو عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ کی بیٹی تھیں۔ عبد المطلب کی اولاد میں آپ سب سے چھوٹے تھے، نہایت حسین وجمیل اور ہر دل عزیز تھے۔ آپ کو ذبیح کہا جاتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عبد المطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوں گے اور سب جوان ہو کر صحت مند رہیں گے تو ان میں سے ایک اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ عبد المطلب کی آرزو پوری ہوئی، انھوں نے قرعہ ڈالا کہ جس لڑکے کے نام قرعہ نکلے، اسے راہ خدا میں قربان کریں۔ اتفاق سے قرعہ آپ کے محبوب ترین فرزند عبداللہ کے نام نکلا۔ عبد المطلب نے عبداللہ

کا ہاتھ پکڑا، چھری لی اور کعبہ کے پاس لے گئے کہ انھیں قربان کریں، لیکن قریش کے لوگ اور حضرت عبداللہ کے ننہال والے آڑے آئے، بالآخر انھیں قربانی سے ہاتھ روکنا پڑا اور ایک کاہنہ کے مشورہ پر عبداللہ اور اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی ہوئی۔ کئی مرتبہ کی قرعہ اندازی کے بعد عبداللہ کے بدلے سو اونٹوں کے نام قرعہ نکلا، عبد المطلب نے عبداللہ کے بدلے سو اونٹوں کی قربانی پیش کی۔

عبدالمطلب کی عمر ستر سال کے قریب تھی اور ان کے فرزند حضرت عبداللہ گلستان حیات کی چوبیسویں بہار دیکھ رہے تھے۔ باپ نے ان کی شادی کے لیے آمنہ بنت وہب کا انتخاب کیا۔ حضرت آمنہ کا نسب چند پشتوں کے بعد حضرت عبداللہ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ نسب یہ ہے: آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب۔ کلاب یہ حضرت عبداللہ کے بھی اجداد میں سے ہیں۔

ایک روز عبدالمطلب اپنے نور نظر عبداللہ کو لے کر بنو زہرہ میں تشریف لے گئے اور وہب بن عبد مناف کو ان کی بیٹی آمنہ سے عبداللہ کے لیے عقد مناکحت کا پیغام دیا۔ وہب نے بخوشی منظور کرلیا اور عبداللہ کے ساتھ اپنی پیاری بیٹی آمنہ کا نکاح کردیا۔ وہب ان دنوں بنو زہرہ کے سردار تھے، اور حضرت آمنہ قریش کی تمام عورتوں میں نسب اور شرافت کے اعتبار سے فوقیت رکھتی تھیں۔ تکمیل مناکحت کے بعد حضرت عبداللہ مسلسل تین روز تک بی بی آمنہ کے دولت خانہ پر فروکش رہے (ایسا عرب کے رواج کے مطابق تھا) چوتھے روز دونوں عبدالمطلب کے دولت خانہ میں تشریف لائے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے لیے شام کے سفر پر تشریف لے گئے اس وقت سیدہ آمنہ کا نخل امید بارآور ہو چکا تھا۔ جناب عبداللہ بھی اس سفر میں یہ بشارت اپنے ساتھ لے گئے۔ روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ شام سے واپسی پر مدینہ میں قیام کے دوران حضرت عبداللہ کا انتقال ہو گیا اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ کو عبدالمطلب نے کھجور لانے کے لیے مدینہ بھیجا تھا اور وہیں انتقال ہو گیا۔ جب یہ خبر مکہ پہنچی تو بی بی آمنہ جو اپنے شوہر کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھیں دم بخود

ہو کر رہ گئیں اور عبدالمطلب بھی اس خبر سے دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ لیکن جب حضرت آمنہ کے بطن سے ایک خوبصورت بچے کی ولادت ہوئی اور عبدالمطلب کو اس کی خبر دی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ اب ان کے مرحوم فرزند عبداللہ کی نسل جاری رہے گی۔ دادا نے اس نومولود کا نام ''محمد'' رکھا۔ [سیرت ابن ہشام، جلد ا]

یہی نبی آخر الزماں ہیں، جن کے آخری نبی ہونے کے سلسلہ میں نبیوں نے خبر دی تھی اور آسمانی کتابوں میں بشارتیں بھی آئیں۔

اس اجمالی تعارف سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد کس معیار اور مرتبہ کے ہیں۔ جب آپ اس نسب نامے پر غور کریں گے تو آپ کو ان میں وہ لعل و گہر ملیں گے کہ اہل عرب جن کی شرافت و بزرگی تسلیم کرتے تھے اور شجاعت و بہادری کا لوہا مانتے تھے۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں نسب کے اعتبار سے بھی سب سے افضل اور عزت کے لحاظ سے بھی سب سے برتر تھے، والد کی جانب سے بھی اور والدہ کی جانب سے بھی۔ صلی اللہ علیک یارسول اللہ!

والدین کریمین کا اسلام:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے ایمان کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض انھیں مومن نہیں مانتے اور بعض توقف کرتے ہیں۔ اس اختلاف سے مفسدین کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف پر حملہ کرنے اور خاندانی شرافت کو مجروح کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا، جس کی آڑ میں طرح طرح کے شگوفے چھوڑے گئے۔ مگر محققین علمائے اہل سنت مثلاً امام جلال الدین سیوطی، علامہ ابن حجر ہیثمی، امام قرطبی، حافظ الشام ابن ناصر الدین، حافظ شمس الدین دمشقی، قاضی ابوبکر ابن عربی مالکی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، صاحب اکلیل مولانا عبدالحق مہاجر مدنی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری حنفی بریلوی رحمۃ

اللہ علیہم کا یہی عقیدہ اور قول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین بلاشبہ مومن ہیں۔ چناں چہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں رقم طراز ہیں:

حضور کے والدین کو مومن نہ ماننا یہ علمائے متقدمین کا مسلک ہے، لیکن علمائے متاخرین نے تحقیق کے ساتھ اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے کہ حضور کے والدین بلکہ حضور کے تمام آباء واجداد حضرت آدم علیہ السلام تک سب کے سب مومن ہیں۔

ان حضرات کے ایمان کو ثابت کرنے میں علمائے متاخرین کے تین طریقے ہیں۔ اول یہ کہ حضور کے والدین اور آباء واجداد سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے، لہٰذا مومن ہوئے۔ دوم یہ کہ یہ تمام حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے ہی ایسے زمانے میں وفات پا گئے جو زمانۂ فترت کہلاتا ہے اور ان لوگوں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ایمانی پہنچی ہی نہیں۔ لہٰذا ہرگز ہرگز ان حضرات کو کافر نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان لوگوں کو مومن ہی کہا جائے گا۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو زندہ فرما کر ان کی قبروں سے اٹھایا اور ان لوگوں نے کلمہ پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔ حضور کے والدین کو زندہ کرنے کی حدیث اگر چہ بذات خود ضعیف ہے مگر اس کی سند میں اس قدر کثیر ہیں کہ یہ حدیث ''صحیح اور حسن'' کے درجے کو پہنچ گئی۔

اور یہ وہ علم ہے جو علمائے متقدمین پر پوشیدہ رہ گیا، جس کو حق تعالیٰ نے علمائے متاخرین پر منکشف فرمایا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے اپنی رحمت کے ساتھ خاص فرما لیتا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں چند رسائل تصنیف کیے ہیں اور اس مسئلہ کو دلیلوں سے ثابت کیا ہے اور مخالفین کے شبہات کا جواب دیا ہے۔ [اشعۃ اللمعات ۱/ ۲۱۸،]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انما المشرکون نجس یعنی کافر تو ناپاک ہی ہیں۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

ہمیشہ اللہ تعالیٰ مجھے پاک ستھری پشتوں میں نقل فرماتا رہا، صاف ستھرا، آراستہ۔ جب دو شاخیں پیدا ہوئیں، میں ان میں بہتر شاخ میں تھا۔ [رواہ ابو نعیم فی دلائل النبوۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ]

تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آبائے کرام طاہرین وامہات کرام طاہرات سب اہل ایمان و توحید ہوں کہ بہ نص قرآن عظیم کسی کافرو کافرہ کے لیے کرم وطہارت سے حصہ نہیں [فتاویٰ رضویہ جدید ۳/ ۲۶۹]

''افضل القریٰ لقراء ام القریٰ'' میں ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب کریم میں جتنے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں وہ تو انبیا ہی ہیں۔ ان کے سوا حضور کے جس قدر آبا وامہات آدم و حوا علیہما السلام تک ہیں ان میں کوئی کافر نہ تھا کہ کافر پسندیدہ یا کریم یا پاک نہیں کہا جا سکتا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء وامہات کی نسبت حدیثوں میں تصریح فرمائی گئی کہ وہ سب پسندیدہ بارگاہ الٰہی ہیں۔ آبا سب کرام، مائیں سب پاکیزہ ہیں اور آیت کریمہ وتقلبك فی السٰجدین (اور نمازیوں میں تمھارے دورے کو) کی بھی تفسیر یہی ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نور ایک ساجد سے دوسرے ساجد کی طرف منتقل ہوتا آیا تو اب اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور کے والدین حضرت آمنہ وحضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اہل جنت ہیں کہ وہ تو ان بندوں میں جنھیں اللہ عزوجل نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چنا تھا، سب سے قریب تر ہیں۔ یہی قول حق ہے بلکہ ایک حدیث میں جسے متعدد حافظان حدیث نے صحیح کہا اور اس میں طعن کرنے والے کی بات کو قابل التفات نہ جانا، تصریح ہے کہ اللہ عزوجل نے والدین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زندہ فرمایا، یہاں تک کہ وہ حضور پر ایمان لائے۔ [شمول الاسلام مشمولہ فتاویٰ رضویہ ۳۰]

اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے لیے حضرت امام سیوطی کا رسالہ مسالک الحنفا فی والدی المصطفیٰ، امام احمد رضا کا رسالہ شمول الاسلام لاصول الرسول الکرام کا مطالعہ

مفید ہوگا۔ شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قبلہ نے بھی ''اشرف السیر'' میں اور علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی نے ''سیرت المصطفےٰ'' میں اس مسئلہ پر بڑی خوبصورت تحریریں پیش کی ہیں۔

حضور کی خاندانی وجاہت کے خلاف شوشے:

گذشتہ اوراق میں اس بات کی وضاحت ہوچکی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے اور یہ نسب کا وہ حصہ جس میں محققین سیرت کا اختلاف ہے۔ سوائے بعض مستشرقین کے سب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اولاد اسمٰعیل سے ہیں۔ ان تاریخی حقائق کے باوجود مستشرقین نے آپ کی خاندانی وجاہت کو گھٹانے کے لیے یہ مفروضے قائم کیے۔

۱- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے تعلق، آپ کے پیرو کاروں کی اختراع ہے۔

۲- حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا کوئی فخر کی بات نہیں کیوں کہ وہ خود ایک لونڈی کی اولاد تھے۔

اب یہاں ترتیب وار ان مفروضوں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نسل اسمٰعیل سے ہیں:

عربوں نے اپنی خداداد قوت حافظہ کو اپنے نسب نامے حفظ کرنے کے لیے دل کھول کر استعمال کیا تھا۔ ہر قبیلے کا رکن صرف اپنے قبیلے کے نسب ناموں ہی کو یاد نہ کرتا تھا بلکہ ان تمام قبائل کے نسب ناموں کو یاد رکھنا بھی ان کے لیے ضروری تھا جن کے ساتھ میدان میں ان کے تصادم کا امکان ہوتا۔ وہ اپنے اجداد کے کارناموں اور مخالفین کے نسب ناموں کی کمزوریوں کو یاد رکھتے تھے تاکہ وہ وقت آنے پر مخالفین کے مقابلے میں اپنے نسب کو بلند ثابت کرسکیں۔

ان حالات میں کسی شخص کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کسی روایت کو توڑ مروڑ کر پیش کرے۔ کیوں کہ یہ روایتیں ان کے دشمنوں کو بھی ازبر ہوتی تھیں اور یہ سوچنا محال تھا کہ کوئی شخص اس قسم کی غلط بیانی کرے اور پکڑا نہ جائے۔ عربوں کے اندر اگرچہ بے شمار خامیاں موجود تھیں، جہالت وبربریت اور تکبر ونخوت ان کی زندگی کا لازمہ تھا، لیکن وہ جھوٹ سے نفرت کرتے تھے، انھیں اس بات کا ہمیشہ خوف رہتا تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان جھوٹے نہ مشہور ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابوسفیان ہرقل کی بارگاہ میں خواہش کے باوجود نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی جھوٹی بات نہ کہہ سکے۔

عربوں کی ایک قسم جو ''عرب مستعربہ'' کہلاتی تھی۔ وہ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی نسل سے تھی، قریش اسی ''عرب مستعربہ'' کا ایک قابل احترام قبیلہ تھا، جس کی ایک معزز شاخ بنو ہاشم تھی۔ کسی کو قریش کے نسل اسمٰعیل سے ہونے میں شک نہ تھا، اچانک کچھ مستشرقین کے تخیل نے انگڑائی لی اور ولیم میور نے یہ انکشاف کیا:

''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کہ وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ثابت کیے جائیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں پیدا ہوئی...اور اس کے لیے آپ کے ابراہیمی نسب نامے کے ابتدائی سلسلے گڑھے گئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے، نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے۔ [ضیاء النبی ۷/۱۷۱]

یہ اقتباس ولیم میور کی کتاب حیات محمد (Life of Muhammad) کا ہے جس میں اس مستشرق نے یہ ذہن دینے کی کوشش کی ہے کہ عرب کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسل اسمٰعیل سے ہونا مشہور نہ تھا، ان کے اندر خاندانی عظمت ووجاہت کی آرزو پیدا ہوئی تو انھوں نے اپنا سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تک جوڑنے کے لیے نسب نامے گڑھے۔ اسی طرح کی یاوہ گوئی مشہور مستشرق مونٹو گومیری واٹ بھی

کرتا ہے۔اس کی تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں کو حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام
کے ساتھ تعلق کا علم نہیں تھا اور مسلمانوں کو بھی ہجرت سے پہلے ان چیزوں کا علم نہ تھا۔
ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا یہودیوں سے رابطہ ہوا تو انھیں پتا چلا کہ وہ حضرت
ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد ہیں۔

ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے یہ سارے مفروضے بے بنیاد ہیں۔حقیقت یہ
ہے کہ عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد سمجھتے تھے،انھیں
ان عظیم ہستیوں کی اولاد ہونے پر فخر بھی تھا۔انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خانۂ کعبہ کو انھیں
نفوس قدسیہ نے تعمیر کیا تھا اور جس دین پر وہ کاربند تھے،ان کے خیال میں وہ دین
ابراہیم ہی تھا اور بزعم خویش وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی
کر رہے ہیں۔

عربی روایات میں حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا ذکر نہ
ہونے کا دعویٰ وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو عربوں کی تاریخ سے کلیۃً ناآشنا ہو یا پھر
حسد،بغض اور تنگ نظری کی وجہ سے دن کو رات کہنے پر مصر ہو۔عرب جو مذہبی زندگی
گزار رہے تھے،اس کا مرکز ہی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھتے تھے۔ان کی تمام
دینی اور مذہبی رسوم دین ابراہیم کے نام پر تھیں۔یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس
خالص دین توحید کی عبادات کو مشرکانہ رسموں میں بدل لیا تھا جس کی وجہ سے دین
ابراہیمی کی روح رخصت ہوچکی تھی اور بت پرستی عام ہوچکی تھی۔اس زمانے میں
صحرائے عرب میں خال خال نفوس ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ عرب دین ابراہیمی کے
نام پر جو کچھ کر رہے ہیں،وہ ابراہیمی دین نہیں ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے۔
انھوں نے عربوں کے مذہب سے بیزار ہوکر حقیقی دین ابراہیم کی تلاش کی کوششیں بھی
کیں۔ان خوش نصیب لوگوں میں قس بن ساعدہ الایادی زید بن عمرو بن نفیل،امیہ
بن ابی صلت،اسعد ابوکرب الحمیر ی،سیف بن ذی یزن اور ورقہ بن نوفل کا نام تاریخ
میں محفوظ ہے،جنھوں نے شرک وبت پرستی کی شب دیجور میں اپنے سینوں میں توحید

کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔اس قسم کے لوگوں کو تاریخ ''حنفاء'' کے نام سے یاد کرتی
ہے۔حنفاء حنیف کی جمع ہے اور حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کا
لقب ہے۔

یہ تمام باتیں روایات عرب میں موجود ہیں۔ولیم میور اور مونٹو گومیری واٹ
کو ان حقائق کا علم ہے۔لیکن ان حقائق کو تسلیم نہ کرنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر
اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خاندانی عظمتوں اور شرافتوں سے معریٰ ثابت کرنا چاہتے ہیں
اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ان کے بھی جد امجد ہیں،ان کے ساتھ محمد عربی صلی اللہ
علیہ وسلم کی نسبت انھیں گوارا نہیں۔اس لیے وہ دجل وفریب کا سہارا لے کر تاریخ کی
ان روشن حقیقتوں کے گرد شکوک وشبہات کے جال بننا چاہتے ہیں۔لیکن حقیقت کی
روشنی جلوہ گر ہوکر ہی رہتی ہے۔لیجیے مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل اسمٰعیل
سے ہونے پر مستشرقین ہی کی شہادت سنیے۔انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ اتھکس کا
مقالہ نگار Chronicle of Sebeos کے حوالے سے لکھتا ہے:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک اسمٰعیلی تھے جنھوں نے اپنے ہم وطن لوگوں
کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں اور ان خدائی وعدوں سے بہرہ
یاب ہوں جو نسل اسماعیل علیہ السلام سے کیے گئے ہیں۔[۸/۸۷۲]

ایوارڈ گبن وہ مؤرخ ہے جسے سارا مغرب قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔وہ
دیگر مستشرقین کی طرح اسلام کے متعلق معاندانہ جذبات رکھتا ہے،لیکن حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب کو مشکوک بنانے کی جو کوشش دوسرے مستشرقین نے کی ہے،
وہ اس پر شدید الفاظ میں تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل کو حقیر اور عامیانہ ثابت کرنے کی کوشش
عیسائیوں کی ایک غیر دانش مندانہ تہمت ہے،جس سے ان کے مخالف کا مقام بجائے
گھٹنے کے مزید بڑھا ہے۔''

گبن گو خود تو دوٹوک الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل اسماعیل میں

ہونے کا اقرار نہیں کرتا لیکن وہ اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں لکھتا ہے:

''تھیوفنیز جو پرانے زمانے کے یونانیوں میں سے ہے، وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسل اسماعیل سے تھے۔'' گبن یہ بھی دیکھتا ہے کہ ابوالفدا اور گیگنئر (Gagnier) نے اپنی اپنی کتابوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نسب نامہ درج کیا ہے جو مستند ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی نسب نامے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نسل اسماعیل سے ثابت کرتے ہیں۔

مسٹر فاسٹر نے بھی اس حقیقت کی گواہی دی ہے، وہ لکھتا ہے:

''اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیم جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیم روایتوں کو عربوں کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید اور کوئی ثبوت نہ ہو، گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو، مگر روایت کی جانچ پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں، ان کے مطابق ان پر غور کرنے سے اس بات کا انکار ناممکن ہے کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ قدیم روایت ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوتی تھی۔ چناں چہ قوم قریش اور خصوصاً مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنیاد پر کہ اسماعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں، اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق کی تائید کی ہے۔''

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ولیم میور اور منٹگمری واٹ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماعیل النسل ہونے کی حقیقت کو مشکوک کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ عربی روایتوں کے خلاف ہے بلکہ خود مغربی مورخین اور مستشرقین کی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔ یہ مستشرقین اس نسب کو جھٹلانے کی کوشش میں لگے ہیں جسے خود صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان

فرمایا ہے۔ کوشش لاکھ کی جائے مگر اس مبارک نسب کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ [ضیاء النبی، ملخصاً ص ۱۷۹ تا ۱۸۲]

حضرت ہاجرہ شہزادی تھیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماعیلی النسل ہونے کو تو بیشتر مستشرقین تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبی عظمت و شرافت ماننے کو تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسمٰعیل ایک لونڈی کے لڑکے ہیں اور لونڈی کی نسل سے ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ یہاں پر لونڈی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو کہا گیا ہے۔ جب کہ تاریخی شواہد یہ ہیں کہ حضرت ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھیں۔ جب اس نے حضرت سارہ کے روحانی کمالات کو دیکھا (جب اس نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی نیت کی) تو کہا اپنی بیٹی کو ان کی خدمت کے لیے وقف کرنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔ میری بیٹی کا اس کے گھر میں خادمہ بن کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

بائبل میں ہے کہ حضرت ہاجرہ خادمہ تھیں، لونڈی نہیں۔ کتاب پیدائش باب (17) آیت (1) کے الفاظ یہ ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی، لیکن ان کی ایک مصری خادمہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

جیوش انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے ضیاء النبی میں ہے:

''یہودیوں نے بادل ناخواستہ جو اعترافات کیے ہیں ان کو ملاحظہ فرمایئے۔ ہاجرہ کو اس تقویٰ اور پارسائی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں متعارف تھا کیوں کہ ہاجرہ مقدس فرشتے کو دیکھ کر بھی نہیں گھبراتیں۔ ان کی عفت مآبی کو اس بنا پر سراہا جاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے انھیں گھر سے باہر بھیج دیا تو انھوں نے ازدواجی وفاداری میں فرق نہ آنے دیا.... ان کے نام کا ایک

مطلب ''آراستہ'' بھی ہے اور یہ اس لیے کہ آپ نیکی اور تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھیں۔ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی تھے جو حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت ہاجرہ کو اپنے باپ کے گھر واپس لانے گئے تھے.... بادشاہ کے دل میں حضرت سارہ کے لیے عقیدت کے جو جذبات پیدا ہو گئے تھے، ان کے اظہار کے لیے اس نے اپنی ساری جائیداد حضرت سارہ کے نام کر دی تھی اور ''گوشن'' سرزمین ان کے قبضے میں دے دی تھی۔ اس نے اپنی لڑکی بھی کنیز کے طور پر ان کے حوالے کر دی تھی۔''

اس اقتباس سے واضح ہے کہ شاہ مصر نے خود اپنی بیٹی کو حضرت سارہ کے حوالے کیا تھا۔ یہاں پر لفظ لونڈی کے تعلق سے کچھ وضاحتی کلمات تحریر کیے جاتے ہیں تا کہ مسئلہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔

لونڈی یا غلام یا تو وہ ہوتے ہیں جن کو لڑائی میں قیدی بنایا گیا ہو۔ یا وہ ہوتے ہیں جو زرخرید ہوں یا وہ ہوتے ہیں جو کسی لونڈی یا غلام سے پیدا ہوتے ہوں۔ تورات میں بھی ان تینوں قسموں کے لونڈی اور غلاموں کے لیے مختلف اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ پہلی قسم کے لونڈی، غلاموں کے لیے عبرانی میں ''شیلبوث حرب'' دوسری قسم کے لیے ''مقنت کسف'' اور تیسری قسم کے لیے ''یلید بایث'' کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔

حضرت ہاجرہ کو نہ تو مذکورہ طریقوں میں سے کسی طریقے سے لونڈی بنایا گیا اور نہ ہی توراۃ میں ان کے لیے مذکورہ بالا اصطلاحات میں سے کوئی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔

حضرت ہاجرہ کے آزاد خاتون ہونے اور لونڈی نہ ہونے پر بائبیل میں ایک زبردست شہادت موجود ہے۔ اسرائیلی قانون میں لونڈی کی اولاد کبھی جائیداد کی وارث نہیں بن سکتی۔ [رسول مبین، ص ۹۷]

اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں تو حضرت سارہ کے ذہن میں یہ بات کبھی نہ کھٹکتی کہ ہاجرہ کا بیٹا، ان کے بیٹے کے ساتھ اپنے باپ کا وارث بنے گا۔ لیکن بائبیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت سارہ نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا اور حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو گھر سے نکلوانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں اسحاق کے ساتھ اسمٰعیل بھی اپنے باپ کا

وارث قرار نہ پائے۔ کتاب پیدائش باب ۲۱ کی آیت نمبر ۱۰ میں ہے:

اس لیے اس (سارہ) نے ابراہیم سے کہنا شروع کر دیا: اس کنیز اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو، کیوں کہ اس کنیز کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وراثت کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔

حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو کنیز اور لونڈی کہا تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت ہاجرہ حقیقت میں لونڈی ہیں۔ ایک باشعور آدمی خوب جانتا ہے کہ دو سوکنوں کے درمیان اس طرح کی گفتگو مبنی بر حقیقت نہیں ہوا کرتی۔ یہ وقتی جذبات اور آپسی تنازعات کی پیداوار ہیں۔

اگر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو مستشرقین کے مفروضات کے مطابق لونڈی مان ہی لیا جائے تو بنو اسرائیل جنھیں اپنی نسبی عظمت اور نسلی تفوق پر بڑا غرور اور ناز ہے تو وہ بھی نسلی شرافت ونجابت سے بہت نیچے نظر آئیں۔ اب بنو اسرائیل کے نسب کے تعلق سے چند کلمات ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ان چار بیویوں کی اولاد ہیں: لیاہ، راخیل، زلفہ اور بلہہ۔

راخیل اور لیاہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی لڑکیاں ہیں جو ان کے نکاح میں آئیں، لیکن زلفہ اور بلہہ کو ان کے خسر نے اپنی بیٹیوں کو خادمہ کے طور پر عنایت کیا تھا۔ کتاب پیدائش باب ۲۹/آیت ۲۴ میں ہے:

''لابان'' نے اپنی خادمہ زلفہ کو بطور خادمہ ''لیاہ'' کے سپرد کیا۔ اسی باب کی آیت ۲۹ میں ہے:

اس کے علاوہ ''لابان'' نے اپنی خادمہ ''بلہہ'' کو بطور خادمہ اپنی بیٹی راخیل کے حوالے کیا۔ بعد میں اپنی ازدواج کی خواہش پر حضرت نے ان سے بھی نکاح کر لیا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حضرت سارہ کی خواہش پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے چار بیٹے ان دوخواتین کے بطن سے ہیں جن کوتورات خادمائیں کہتی ہے۔اب اگر حضرت ہاجرہ کے خادمہ ہونے کی وجہ سے ان کے بیٹے اسمٰعیل کی نسل کا مقام گھٹتا ہےتو زلفہ اور بلہہ کے خادمائیں ہونے کی وجہ سے ان کی نسل کا مقام کیسے برقرار رہے گا۔جب کہ دونوں قسم کی خادماؤں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔حضرت ہاجرہ سارہ کی خادمہ کہلانے سے پہلے مصر کی شہزادی تھیں، جب کہ زلفہ اور بلہہ تورات کے مطابق ''راخیل اور لیاہ'' کی خادمائیں بننے سے پہلے ان کے باپ ''لابان'' کی خادمائیں تھیں۔

بنواسرائیل اور بنواسمٰعیل کے درمیان چچازاد بھائیوں کا رشتہ تھا،اس لیے اسرائیلیوں کو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں پیش آنی چاہیے تھی کہ حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبی عظمتوں کے وارث ہیں اور جس طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنے نسبی رشتے پر فخر کرنے میں حق بجانب ہیں،اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بھی خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد ہونے پر بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ لیکن تعصب اور خودفریبی نے انھیں اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نسب پر باپ کی طرف سے تو کوئی اعتراض نہ کرسکتے تھے، کیوں کہ اس صورت میں ان کی اپنی خاندانی عظمت خاک میں ملتی نظر آتی تھی، اس لیے انھوں نے ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی طرف سے ان کے مقام کو گھٹانے کی کوشش کی۔[ضیاء النبی ملخصاً ص۱۸۲تا۱۹۲]

شجرۂ نسب کا تیسرا حصہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے،علمائے تاریخ کے مطابق اس میں بہت سی غلطیاں درآئی ہیں، اس لیے وہ معتبر نہیں۔اس سلسلے میں شروع اوراق میں گفتگو ہوچکی ہے،اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا نظام تعلیم وتربیت

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم

صدر شعبہ علوم اسلامیہ، ہمدرد یونیورسٹی، دہلی

اسلام دین فطرت ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (آل عمران:۱۹)اسی دین فطرت کی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خیر البشر حضرت احمد مجتبیٰ محمد ﷺ تک تمام انبیائے کرام ومرسلین عظام نے تبلیغ و اشاعت فرمائی اور ہر دور میں ایک کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ (ایک ہی خدا ہے دوسرا نہیں ذرا سا نہیں) کا پرچم بلند کیا اور اسی پرچم کے تلے تمام خلقت کو مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے آنے کی دعوت دی۔

یااھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولانشرك به شیئا (آل عمران:۶۴)اے کتابیو!ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے یہ کہ عبادت نہ کریں مگر خدا کی اور اس کا شریک کسی کو نہ کریں۔

اس دین فطرت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پر ہوئی جس کا اعلان خداوند قدوس نے ان لفظوں میں کیا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدۃ:۳)آج میں نے تمھارے لئے تمھارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمھارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔

اگر تمام مذاہبِ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح عیاں ہو جائے گی کہ صرف دین فطرت اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے اپنے ماننے والوں کو علم سے آراستہ کرنے کی بات کہی ہے اور جا بجا قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ نے اور احادیث مبارکہ میں مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے حصول علم کی تشویق اور رغبت دلائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱- یرفع اللہ الذین آمنو امنکم والذین اوتوا العلم درجات (المجادلۃ:۱۱)۔
(اللہ تمھارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا)

۲- قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر:۹)
(تم فرماؤ کیا برابر ہیں جاننے والے اور انجان)

۳- فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبۃ:۱۲۲)
(تو کیوں نہ ہو ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں)

قرآن حکیم میں علم کی اہمیت کا ذکر متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ جن کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کے دلوں کا تزکیہ کرنا اور کتاب وحکمت کی تعلیم تھی انہوں نے اپنے امتیوں کو حصول علم کی طرف خاص رغبت دلائی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

۱- العلماء ورثۃ الانبیاء (ابن ماجہ۔ص۲۰) علماء انبیا کے وارث ہیں

۲- من سلک طریقا یطلب فیہ علما سلک اللہ بہ الی الجنۃ (بخاری شریف۔۱/۱۶)
جو شخص طلب علم کے لئے سفر کرے اللہ تعالیٰ اسے جنت کی راہ پر گامزن کرتا ہے

۳- ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا لطالب العلم رضا بما یصنع (مشکوٰۃ شریف۔ص۳۴)
فرشتے طالب علم کے کام سے خوش ہو کر اپنے پر بچھاتے ہیں

تعلیم کے مشن کو فروغ دینے کے لئے پیغمبر آخر الزماں اور ان کے صحابہ و جانشین نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہر ایک نے اپنے مزاج اور بشری طاقت کے مطابق بندگان حق کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی ہر ممکن کوجد و جہد فرمائی جس کی تفصیل صحابہ و تابعین اور بزرگان دین کی دینی و علمی خدمات پر مشتمل سوانحی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مذہب اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب عالم میں علم کی اہمیت، اس کی نشر واشاعت اور اس کے عام و تام کرنے کے تعلق سے ہمیں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ بعض مذاہب کے پرستاروں میں تو علم کا دائرہ مخصوص ذات کے لوگوں کے لئے ہی مخصوص تھا۔ عوام علم کی نعمتوں سے بہرہ مند نہیں تھے۔ یونان میں ارسطو نے عورتوں اور غلاموں اور ہندوستان میں ''منو'' نے شودروں کو تعلیم حاصل کرنے سے نہ صرف روکا ہے بلکہ شودر ''وید'' کے الفاظ سننے کی کوشش کرتا تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ امریکہ جو اس وقت بزعم خویش ترقی یافتہ ممالک میں سرفہرست ہے اس کے یہاں بھی ۱۸۳۴ء میں ایک قانون پاس کیا گیا کہ اگر کوئی شخص غلاموں (حبشیوں) کو تعلیم دیتے ہوئے یا تعاون کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اگر وہ شخص سفید فام ہے تو اس کو ایک سوڈالر جرمانہ اور چھ ماہ کی قید کی سزا دی جائے گی اور اگر وہ کالا ہے تو اس کو پچاس کوڑوں کی سزا اور پچاس ڈالر کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ [آغاز اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔ سید محمد سلیم۔ص۳]

مختصر یہ کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے سب سے پہلے علم کی توقیر کی اور نہ صرف توقیر کی بلکہ اس کے حصول کے لئے ترغیب بھی دلائی اور نہ صرف ترغیب دلائی بلکہ تحصیل علم کو لازم قرار دیا۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (ابن ماجہ۔ص۱۲۰) (ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے) اس سے پہلے دیگر تمام آسمانی مذاہب میں اس طرح تعلیم حاصل کرنے کے تعلق سے کوئی صراحت نہیں ملتی۔ لیکن جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے تو جو آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی

وہ اقرء ہے۔ اس میں پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اور قلم کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے ۔ اس پہلی وحی کو اسلامی نظام تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اقرء باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرء و ربك الاکرم الذی علم بالقلم (العلق: ۱تا۳)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا، پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔

اس پہلی وحی میں پڑھنے اور قلم کا تذکرہ فرما کر لکھنے کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے۔ اس سے اچھی طرح یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ پڑھنا اور لکھنا دونو لازم و ملزوم ہیں۔ کتاب کا رشتہ قلم سے اور قلم کا رشتہ کتاب سے بہت گہرا ہے اور اس پڑھنے اور لکھنے کا ذکر قرآن مقدس میں کئی بار آیا ہے اور نہ صرف ذکر آیا ہے بلکہ پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد ہی کتاب وحکمت کی تعلیم دینا قرار پایا ہے۔ مصطفٰے جان رحمت ﷺ نے اپنے اس مشن کو احسن طور پر انجام دیا۔ یہاں میں ایک بات واضح کرتا چلوں کہ وہ رسول اعظم جو معلم کائنات بن کر دنیا والوں کو علم سے آراستہ کرنے کی غرض سے آیا ہو، اسے مسلمانوں کا ایک طبقہ ان پڑھ مان کر نبی امی کہتا ہے ۔ جب کہ یہ اظہر من الشّمس ہے کہ تعلیم دینے کے لئے پڑھا ہوا ہونا ضروری ہے۔ اگر نبی خود نہیں پڑھا ہوگا تو وہ دوسروں کو کیا پڑھائے گا۔ جو لوگ اس قسم کا نظریہ رکھتے ہیں، انہیں دھوکا لفظ امّی سے ہوا ہے جس کے معنی وہ ان پڑھ لیتے ہیں، حالانکہ یہاں امی کی نسبت مکتہ المکرّمہ نامی بستی کے اصل نام ام القری کی طرف ہے۔ اس مناسبت سے آپ کو امی کہا جاتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ معنی نہیں کہ آپ ناخواندہ اوران پڑھ تھے۔ رسول کی ناخواندگی پر دلیل پہلی وحی سے پیش کی جاتی ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام غار حرا کے اندر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور فرمایا اقرء تو مصطفٰے جان رحمت ﷺ نے فرمایا ما انا بقاری اس ما انا بقاری کا ترجمہ عام طور سے ایسا کیا جاتا ہے جس سے مصطفٰے جان رحمت ﷺ کا ناخواندہ ہونا ثابت ہو جیسے ''میں پڑھنا نہیں جانتا'' جو بالکل غلط ہے۔

یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی منچلا اور ضدی طالب علم اپنے استاذ کی اجازت کے بغیر دفتر میں گھس جائے تو استاذ اس سے کہے اخرج (نکل جا) مگر بجائے نکلنے کے وہ جواب میں کہے ما انا بخارج (میں نکلنا نہیں جانتا) یا وہ شخص جسے ایک گلاس پانی دے کر یہ کہا جائے اشرب مگر وہ شخص جس کو پانی پیش کیا جارہا ہے، اسے پانی کی حاجت نہیں اور وہ جواب میں یہ کہے کہ ما انا بشارب (میں پینا نہیں جانتا) تو آپ بتائیے کہ کیا یہ ترجمہ عقل اور دیانت کے خلاف نہیں؟ تو جس طرح یہ دونوں ترجمے عقل و دیانت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح یہ ترجمہ کہ میں پڑھنا نہیں جانتا بھی عقل و دیانت کے خلاف ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا ''میں نہیں پڑھتا'' میں نہیں نکلتا اور میں نہیں پیتا) یعنی میں پڑھنا تو جانتا ہوں پر مگر کسی وجہ سے نہیں پڑھتا، میں آفس سے باہر نکلنا تو جانتا ہوں مگر کسی وجہ سے نہیں نکلتا میں پینا تو جانتا ہوں مگر کسی وجہ سے نہیں پیتا) لیکن جب جبرئیل علیہ السلام نے اقرء باسم ربك الذی خلق'' فرمایا تو وہ نبی جو بقول دوسرے لوگوں کے ان پڑھ تھا اور یہ فرما رہا تھا میں پڑھنا نہیں جانتا چند لمحوں کے بعد اسے پڑھنا آ گیا اور اس نے پڑھنا شروع کردیا اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا اس کا مطلب واضح ہے کہ نبی پڑھنا جانتے تھے مگر کسی وجہ نہیں پڑھ رہے تھے ۔ مصطفٰے جان رحمت ﷺ کیوں نہیں پڑھ رہے تھے اس کی وجہ ہمارے دانشوروں کو تلاش کرنی چاہئے۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بغیر نام خدا کے سہارے پڑھا رہے تھے اس لئے نبی پڑھنے سے منع کررہے تھے مگر جب جبرئیل علیہ السلام نے صرف اقرا نہیں بلکہ اقرا باسم ربك الذی خلق کہا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھو تو اسی نبی نے پڑھنا شروع کردیا اور پھر پڑھتے ہی چلے گئے۔ مصطفٰے جان رحمت کی اس سیرت سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے کہ دراصل اسلام میں تعلیم کا مقصد حقیقی رضاء الٰہی کا حصول ہے تعلیم کی ساری مہم کو اس نقطۂ نظر سے بار بار دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے اساتذہ اور طلبہ کے اندر تقرب الی اللہ کا جذبہ پیدا ہوگا اور اگر یہ جذبہ طلبہ اور اساتذہ میں نہ پیدا ہو تو سمجھو کہ طریقۂ تعلیم میں کہیں نقص ہے۔ ہمیں اس

نقص کو دور کرنا چاہئے۔

یہی وہ بنیادی مقصد تھا جس کی خاطر مصطفٰے جان رحمت ﷺ نے تعلیم کے مشن کو فروغ بخشا اور اس اہم کام کے لئے ارقم بن ابی ارقم کا مکان جو کوہ صفا کی بلندی پر واقع تھا منتخب کیا۔ سن ۶ ہجری تک اس میں اشاعت اسلام اور نومسلموں کی تربیت آنحضرت خود فرماتے رہے، دولت ایمان سے مشرف ہونے والے سبھی بندگان حق خفیہ انداز میں اسی مکان میں جمع ہوتے اور مصطفٰے جان رحمت ﷺ قرآن کے ان حصوں کو جو آپ کے پاس بشکل وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آتے، اسے سناتے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت پڑھنے کے لئے نہ تو کوئی باضابطہ کتاب تھی اور نہ ہی لکھنے کے لئے کوئی قلم تھا۔ ساری تعلیم زبانی تھی اور اس کا انحصار حافظہ پر تھا۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلا مدرسہ تھا جہاں سے قال اللہ وقال الرسول کے نغمے بلند ہوئے۔ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان مسلمانوں کی تربیت کے لئے وقف تھا۔ ایک سے گیارہ ہجری یعنی مکمل دس سال مصطفٰے جان رحمت ﷺ کا قیام اسی مکان میں رہا۔ دوسرا مدرسہ مدینہ میں قائم ہوا۔ آپ نے وہاں نومسلموں کی تعلیم وتربیت کے لئے حضرت ابن مکتوم، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سعید بن العاص کو مدینہ بھیجا [سیرت ابن ہشام۔۲/۴۷] وہاں اس نیک کام کے واسطے حضرت ابوامامہ اسد بن زرارہ نے اپنا مکان پیش کر دیا، گویا مدینہ منورہ میں یہ مسلمانوں کی پہلی تربیت گاہ تھی۔ مدینہ میں ایک اقامتی درسگاہ دار القراء کے نام سے موجود تھی (نظریہ وفلسفۂ تعلیم اسلامی۔ حکیم محمد سعید۔ ص۵۳) تاکہ وہاں جاکر وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور انھیں دین کی ضروری باتیں سکھائیں لیکن جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کو یہاں آزادانہ فضا میسر آئی جس کا آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ عبادت الٰہی اور دیگر دینی سرگرمیوں کی بخوبی انجام دہی کے لئے مسجد نبوی تعمیر فرمائی۔ اس کے قریب بائیں جانب ایک چبوترہ بھی بنایا۔ اس چبوترے پر نووارد مہمان آکر قیام کرتے جنھیں تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا جاتا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا مدرسہ تھا

جہاں تعلیم کے ساتھ طلبہ کے لئے رہائش کا بھی معقول انتظام تھا گویا کہ یہ باضابطہ ایک اقامتی ادارہ تھا۔ جو طلبہ وہاں مقیم ہوتے ان میں زیادہ تر غریب ونادار ہوتے اور ان کی کیفیت بالکل اسی طرح تھی جس طرح آج دار الایتام کا ہوتا ہے۔ خورد ونوش کیا، ان کے پاس بچھانے تک کا کوئی سامان نہ تھا۔ اسی مدرسہ صفہ کے ایک طالب علم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ:

میں نے صفہ کے طالب علموں میں سے ستر (۷۰) اصحاب کو دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کے پاس اوپر اوڑھنے کے لئے چادر اور تہبند ہو یا چادر تھی یا تہبند۔ تہبند کو وہ گردن میں باندھ لیتے تھے بعض کا تہبند آدھی پنڈلی تک جاتا تھا اور بعض کا ٹخنوں تک۔ وہ اس کو ہاتھ سے پکڑے رہتا کہ کہیں ستر نہ کھل جائے [بخاری شریف۔۱/۲۳]

اس مدرسہ صفہ میں کوئی باورچی خانہ نہ تھا زیادہ تر جاگیر سسٹم تھا باشندگان مدینہ بعض طلبہ کو اپنے گھر لے جاکر کھانا کھلاتے اور بعض صحابہ کرام کھانا مدرسہ صفہ ہی میں بھجوا دیا کرتے تھے۔ اس داد ودہش کے باوجود بھی اہل مدینہ کا یہ عمل تمام طلبہ کے لئے کافی نہیں تھا اس لئے بعض محنتی اور باہمت طلبہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور بازاروں میں فروخت کرتے اور اس سے اپنے کھانے کا بندوبست کرتے۔ اس کے باوجود بعض طلبہ کو فاقے سے دن گزارنے پڑتے۔ خود حضرت ابوہریرہ جس زمانے میں اس درس گاہ کے طالب علم تھے، کئی کئی دنوں فاقوں سے رہ کر زندگی بسر کی۔ مدرسہ صفہ میں طالبان علوم نبوت کا ہمیشہ اژدحام رہتا۔ بسا اوقات طلبہ کی تعداد ستر تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ طلبہ کی اس تعداد میں آئے دن کمی وبیشی ہوتی رہتی تھی۔

مدرسہ صفہ میں نصاب تعلیم کیا تھا، یہ مسئلہ بہرحال غور طلب ہے تاہم اتنا بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم جو نسل انسانیت کے لئے دستور حیات کے طور پر نازل ہوا تھا، اس کی تفہیم اور اس کو صحیح انداز سے پڑھنا یعنی تجوید وقرات کے ساتھ پڑھنا ہی اصل نصاب تھا۔ اس کے علاوہ اسلام کے حلقہ بگوشوں کے لئے

مسائل شرعیہ کی تفہیم لازمی مضمون کی حیثیت سے مدرسہ صفہ میں داخل نصاب تھی۔ یہاں کے فارغین کو قاری کہا جاتا تھا جو نہ صرف فراغت کے بعد اپنے محلوں اور قبیلوں میں جا کر اشاعت دین حق کرتے بلکہ سرکاری عہدوں اور مناصب میں بھی انھیں ترجیح دی جاتی تھی۔ مصطفٰی جان رحمت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد روزانہ بلاناغہ مسجد نبوی میں بیٹھ کر صحابہ کو قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے اور تمام صحابہ کرام حلقہ بنا کر مصطفٰی جان رحمت ﷺ سے اخذ فیض کیا کرتے تھے۔ اس حلقہ میں بسا اوقات اتنے لوگ شامل ہو جایا کرتے تھے کہ دوسرا حلقہ بنانا پڑتا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

”نمازِ فجر کے بعد ہم رسول اللہ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ہم میں سے کوئی شخص قرآن حکیم سے متعلق سوال کرتا تھا، کوئی فرائض (وراثت) کے مسائل دریافت کرتا تھا، کوئی خواب کی تعبیر بیان کرتا تھا۔ یہ بالکل آزادانہ طریقہ تعلیم تھا۔ سارا تعلیمی کاروبار زبانی چلتا تھا۔ تلاوت قرآن مجید، تفسیر قرآن مجید، مسائل فقہیہ، انبیاء کے قصے، وعظ و نصیحت پر وہاں گفتگو ہوتی تھی۔ [آغاز اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ ص۳]

تعلیم و تدریس کے جو اصول مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے بتائے وہ ہر زمانے میں اساتذہ و مدرسین کے لئے مشعل راہ رہیں گے۔ آپ نے فرمایا:

تعلیم دو، سختی مت کرو، علم سکھانا سختی کرنے سے بہتر ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: مضامین کو دلچسپ بنا کر پیش کرو، مضامین سے نفرت نہ دلاؤ، تعلیم میں آسانیاں پیدا کرو، تعلیم میں دشواریاں نہ پیدا کرو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کو ان کی فہم کے مطابق بات سمجھاؤ۔ [ایضاً۔ ص۷]

طلبہ کی اتنی بڑی جماعت کی تعلیم و تربیت، رہن سہن اور خورد و نوش کا انتظام جب کہ وسائل محدود تھے لیکن ان تمام طلبہ کے تعلق سے سارا تمام انتظام اللہ کے نبی ﷺ خود انجام دیتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت کے بارے میں ملتا ہے کہ اس

مدرسہ صفہ کی کچھ تعلیمی گھنٹیاں ان کے پاس بھی تھیں۔ حضرت سعید بن العاص معلّمی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت سعید بن العاص ان گنے چنے افراد میں سے تھے جو اسلام سے پہلے بھی مکہ مکرمہ میں ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی مدرسہ صفہ میں تقرری کا پتا اس عبارت سے چلتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا:

”علمت نا سا اهل الصفة القران والكتابة (ابن ماجہ۔ ص۱۵۶)

رسول اللہ ﷺ نے مجھے مدرسہ صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ میں لوگوں کو لکھنے اور قران کی تعلیم دوں۔

مدرسہ صفہ کے اساتذہ کی تمام تر توجہ اس مدرسہ میں داخل تمام طلبہ کو صرف پڑھانے پر نہ تھی بلکہ وہ حکم قرآنی کے مطابق طلبہ کو لکھنا بھی سکھاتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت جو اس مدرسہ صفہ کے استاذ تھے، وہ خود ایک اچھے خطاط تھے۔ اس کے علاوہ مصطفٰی جان رحمت ﷺ جو اس ادارے کے بانی و مہتم بھی تھے اور مدرس و نگران اعلیٰ بھی، انہیں اس بات کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی کہ کسی طرح سے بہتر سے بہتر انداز میں طلبہ کو علم و فن آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ ہجرت کے دو سال بعد جب جنگ بدر واقع ہوئی، اس جنگ میں مسلمانوں کے ذریعے سے قریش کے کچھ افراد قید کر لئے گئے تھے یہ لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے آپ نے ان سے یہ معاملہ طے کیا کہ تم لوگوں میں سے جو شخص دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دے گا، یہ اس کا زرفدیہ تصور ہوگا [ضیاء النبی۔ ۳/۳۹۵] اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے نزدیک علم کی کیا اہمیت تھی۔ اگر تاریخ عالم کا جائزہ لیا جائے تو شاید یہ پہلا واقعہ ہوگا جس میں زرفدیہ کے طور پر سماج کے لوگوں کو علم سے آراستہ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس موقع سے یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ مدرسہ صفہ میں جو طلبہ قیام پذیر تھے وہ صرف دور دراز ہی کے طلبا نہیں تھے بلکہ بعض مقامی طلبہ بھی وہاں تھے۔ ان تمام طلبا کو جس نصاب تعلیم کے ذریعے آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ان میں:

۱- قران مجید کا پڑھنا اور سمجھنا ۲- لکھنے کا ہنر سیکھنا۔

۳۔ دین کے ضروری مسائل جاننا

اور اس نصاب تعلیم کا مقصد کیا تھا اس تعلق سے مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کیا :

۱۔ وعظ و نصیحت کرنا ۲۔ نیکیوں کا حکم دینا

۳۔ برائیوں سے روکنا۔

اس نصاب کے علاوہ مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے دوسرے ضروری علوم سیکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی اور اس علم سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے طاقت ور اور توانا بننے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ ایسے علوم میں تیر اندازی اور شہ سواری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ دوڑ اور کشتی کے مقابلوں میں حصہ لینے کی طرف نہ صرف آپ نے رغبت دلائی بلکہ کشتی میں تو آپ نے خود حصہ لیا ہے۔ اس کے بعد اس میں حسب ضرورت مزید تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اپنے دور حکومت میں جو نصاب تجویز ہوا اور جسے انہوں نے مختلف اسکولوں میں پہنچایا اس میں:

''لوگ اپنے بچوں کو تیرا کی، شہسواری، مشہور ضرب الامثال، اور اچھی عربی شاعری کی تعلیم دیتے تھے'' [مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ ص ۱۹]

اس طرح ضرورت اور تقاضے کے مطابق نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور سب سے بہتر نصاب تعلیم اہل دانش نے اسی کو سمجھا ہے جو زمانے کی ضرورتوں کی نہ صرف عکاسی کرے بلکہ اس کی تکمیل بھی کرے۔ اسلام کا نظام تعلیم صرف حدیث و تفسیر تک محدود نہیں بلکہ اس میں سائنس، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، جغرافیہ، طبعیات، فلکیات، ارضیات، نباتات، حیوانیات اور تاریخ سب شامل ہیں۔ مسلمانوں نے ان سبھی علوم میں کارہائے نمایاں انجام دئے [نظریہ و فلسفۂ تعلیمی، ص ۴۴]

یہ واضح رہے مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے جس تعلیم کو عام کیا تھا، اس میں دین و دنیا کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ بعد کے لوگوں نے علم کو دو خانوں میں بانٹ کر علم دین اور علم دنیا کی تقسیم کرنے لگے جو سراسر حقائق کے خلاف ہے۔ مصطفٰی جان رحمت ﷺ

نے ایسے علم کی تحصیل پر زور دیا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں مشعل نور کا کام کرے جیسا کہ ''دینی مدارس اور عہد حاضر کے تقاضے'' میں ہے:

''خاص دینی اصطلاح میں اقرار توحید سے علم شروع ہوگا اور اثبات توحید پر اس کے سفر کی منزلیں ختم ہوں گی۔ انفس ہوں یا آفاق یہ جلوۂ الٰہی کے مظاہر ہیں، اسی لئے جب کسی شئے کی حقیقت پر نظر جائے گی تو جلوۂ الٰہی خود بخود ابھر کر سامنے آ جائے گا۔ گویا ہم علم کو دینی اور دنیوی خانوں میں نہیں تقسیم کر سکتے۔ وہ ایک کل ہے اور ''کل'' ہی رہے گا اور کلی حیثیت سے ہی وہ روشنی عطا کرے گا جو ذہن کو خبر باطن اور دل کو دولت ایمان سے سرفراز کرے گا'' [دینی مدارس اور عہد حاضر کے تقاضے۔ ص ۱۰۵]

جب ہم صوفیائے کرام کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں بھی ہمیں یہ باتیں ملتی ہیں حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ بندوں سے صرف دو علموں کا متمنی ہے ۱۔ شناخت عبودیت ۲۔ شناخت ربوبیت۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب حظ نفس کے لئے ہے'' [محفل اولیاء۔ ص ۱۷۵۔ شاہ مراد سہروردی]

مگر اس واضح حقیقت کے باوجود تعلیم کی مختلف تشریحیں کی جاتی ہیں سقراط نے صرف حقیقت کی تلاش کو تعلیم کہا، افلاطون نے معاشرے کی متوازن تنظیم کو تعلیم سے تعبیر کیا، ارسطو نے تعلیم کو جسمانی اور عقلی تربیت کا وسیلہ بنایا لیکن مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے جسم اور روح دونوں کی تربیت کو مقاصد تعلیم قرار دیا تاکہ ذات اور معاشرہ دونوں کو پاک اور مہذب بنایا جا سکے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الا خرة حسنةوقنا عذاب النار (البقرۃ:۲۰۱)

(اے ہمارے رب دنیا میں اچھائی دے اور آخرت میں اچھائی دے)

اس آیت کریمہ میں تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بالمقابل آخرت کا ذکر کیا ہے مگر اس کے بندے دنیا کے بالمقابل دین کو رکھ کر علم کو دین و دنیا دو خانوں میں تقسیم کر دیتے

ہیں جو سراسر قرآنی تقسیم کے منافی ہے۔ سیرت نبوی کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے متبعین و پیرو کاروں کی ہر طرح فلاح دارین کی بات کہی ہے۔ دنیا سے بالکل لاتعلق ہوجانے کو منع کیا ہے۔ قرآن حکیم میں تو دنیا کو صراحۃً بہتر بنا نے کی بات کہی گئی ہے۔ آج ہماری مساجد کے خطبا اپنا زور خطابت صرف اور صرف آخرت کو بہتر بنانے پر صرف کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت کا وہ حصہ جس میں دنیا کو بہتر بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ شاید ان کے پیش نظر نہیں، اس لئے مسلمان طلبہ نہ علم کی طرف زیادہ رغبت کرتے ہیں اور نہ کسی ہنر سیکھنے کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ شاید ان ائمہ مساجد کی تقریروں کا اثر ہے۔ ہمارے واعظین، ائمہ کرام، خطبا اور مقررین کو اس پہلو پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے مساجد کے ائمہ بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ سمجھائیں کہ حصول علم میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی مضمر ہے تو شاید مسلم سماج کا نقشہ کچھ اور ہی ہو۔

بقدر ضرورت دینی تعلیم حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے فرض ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: طلب العلم فریضۃ۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمان جو اپنے بیوی بچوں سے زیادہ اپنے نبی ﷺ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے مگر اس نبوی مشن جس میں تعلیم کو اولیت دی گئی ہے، اس سے کوسوں دور ہے۔ قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو ملت اسلامیہ کے نونہالوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جو مسلمان جاہل ہے اور اپنے بچوں کو بھی اپنی ہی روش پر چلانے کی ترغیب دے رہا ہے، وہ بلا شبہ فرمان رسالت کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ دور رسالت میں سماج کے ہر طبقہ نے حصول علم میں جدوجہد کی اور جو علم اس زمانہ میں رائج تھا، اس سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم کا غلغلہ اس زمانے میں بلند ہوگیا۔ جس میں مردوں اور عورتوں سب نے اس نبوی فیضان سے استفادہ کیا اور حسب صلاحیت اپنے آپ کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ تحصیل علم پر جتنا زور مصطفےٰ جان رحمت ﷺ نے مردوں پر دی، اس سے کم زور عورتوں پر نہیں دیا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کے ساتھ صحابیات نے بھی علم دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نہ صرف حصہ لیا ان میں کمال بھی حاصل کیا، خواہ وہ انصار کی عورتیں ہوں یا مہاجرین کی سب نے یکساں طور پر علم وفن کے حصول میں دلچسپی لی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انصار عورتوں کے حوالے سے فرماتی ہیں:

عورتوں میں انصار کی عورتیں خوب ہیں۔ انہیں دین کی تعلیم میں حیا مانع نہیں ہوتی [بخاری شریف۔ ۱/۱۸۰] اس طرز عمل سے عورتوں کی تحصیل علم سے دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ حضرت خولہ بنت قیس کا بیان ہے کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا خطبہ جمعہ کے دن سب سے پچھلی صف میں بیٹھی ہوئی سنتی تھی۔

اس ذوق وشوق کے پیش نظر اگر ہمارے نبی ﷺ کو یہ معلوم ہوتا کہ میری بات دور تک صاف نہیں پہنچ رہی ہے یا عورتوں کی سمجھ میں میری بات صحیح طور سے نہیں سمجھ میں آرہی ہے تو آپ ﷺ اپنی باتوں کا اعادہ بھی فرمادیا کرتے تھے۔ جس سے ان کی سمجھ میں بات اچھی طرح آجایا کرتی تھی۔ پھر بھی ان کے شوق علم کا عالم یہ تھا، اگر ان کی تشنگی نہ بجھتی تو ان کی تشنگی علم دور کرنے کے لئے ایک دن کوئی مخصوص کرلیا جاتا اور کسی موقر اور معمر صحابی کو ان کے پاس ان کی علم کی تشنگی دور کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں کہ جب مصطفےٰ جان رحمت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے انصاری خواتین کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہمارے پاس حضرت عمر بن الخطاب کو وعظ ونصیحت کے لئے بھیجا۔

مصطفےٰ جان رحمت ﷺ نے جس انوکھے انداز میں صحابہ وصحابیات کو تحصیل علم کی طرف رغبت دلائی، وہ آج کے دور میں ماہرین تعلیم کے لئے منارۂ نور ہے۔ کسی قوم کے بچے مستقبل کی ضمانت ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے مصطفےٰ جان رحمت ﷺ نے والدین کو اس بات کی تلقین فرمائی کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بچیوں کو دین کے احکام سے روشناس کرائیں اور کبھی ان بچیوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنے والوں کو جنت کی بشارت سنائی [بخاری شریف۔ ۱/۳۶] مصطفےٰ جان رحمت ﷺ کی

پیہم کاوشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کی کثیر تعداد زیور علم سے آراستہ ہوگئی۔حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور ام ورقہ نے پورا قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔حضرت ہند بنت اسید، حضرت ام ہشام بنت حارثہ اور حضرت ام سعد قرآن کے بعض حصوں کی حافظہ تھیں۔حضرت ام سعد تو قرآن مجید کا درس بھی دیا کرتی تھیں۔تفسیر اور فقہ میں حضرت عائشہ کو خاص درک تھا۔امہات المؤمنین کے علاوہ ام عطیہ، اسماء بنت ابی بکر، اور فاطمہ بنت قیس کا شمار بھی ان صحابیات میں ہوتا ہے جنھوں نے کثرت سے روایتیں کی ہیں۔

ان صحابہ وصحابیات نے بھی صرف قرآن و احادیث اور فقہ و اصول میں مہارت نہ پیدا کی بلکہ انھوں نے اسرار دین، طب، تاریخ عرب جیسے علوم وفنون میں بھی بالغ نظری حاصل کی۔حضرت اسماء بنت سکن اتنی عمدہ خطیبہ تھیں کہ ایک موقع پر مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا۔مصطفٰی جان رحمت ﷺ کو خواتین کی تعلیم کے ساتھ کتابت یعنی لکھنا سکھانے کا بھی برابر خیال رہتا تھا۔ چنانچہ شفا بنت عبداللہ عدو یہ سرکار دو عالم ﷺ کی خواہش کے مطابق امہات المومنین کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے واسطے تشریف لاتی تھیں[نظریہ وفلسفۂ تعلیم اسلامی۔ص۵۵]

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے مرد وخواتین دونوں کو علوم وفنون سے آراستہ کرنے کی جدوجہد کی اور ایسا معاشرہ تیار کیا جس میں تقریباً صد فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہوگئے تھے۔اس طریقۂ کار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حجاب تحصیل علم کی راہ میں رکاوٹ بالکل نہیں ہے۔اگر جذبہ صادق ہے، حوصلہ بلند ہے تو راہ میں حائل ساری رکاوٹیں بھی پشت پناہی کا کام کرنے لگتی ہیں۔

مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے تعلیم کا دائرہ محدود نہیں فرمایا تھا جس کی طرف اشارہ سطور بالا میں کیا گیا۔بطور خاص اجنبی زبانوں کی تحصیل کی طرف بھی زور دیا اور اپنے صحابہ کو عبرانی اور سریانی زبان سیکھنے کی رغبت دلائی۔خود مصطفٰی جان رحمت ﷺ نے حضرت زید بن ثابت انصاری سے فرمایا: میرے پاس بادشاہوں کے جو خطوط

آتے ہیں، میں نہیں چاہتا یہ خطوط دوسروں سے پڑھوائے جائیں۔اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت زید بن ثابت انصاری نے کسریٰ کے ایلچی سے فارسی اور محمد عربی ﷺ کے خادم سے رومی زبان سیکھی اور دوسروں سے حبشی، قبطی زبانیں سیکھ کر بادشاہوں کے خطوط پڑھنے اور سمجھنے لگے۔

جب اسلام کا دائرہ وسیع تر ہوگیا، الگ الگ ریاستوں میں گورنر متعین کردئے گئے تو ان کے فرائض منصبی میں یہ بات خصوصیت سے شامل کی گئی کہ وہ اپنے علاقے میں عوام کی دینی اور تعلیمی ضروریات کا مناسب انتظام فرمائیں۔مصطفٰی جان رحمت ﷺ کے اس فرمان پر تمام لوگوں نے عمل کیا، اس لئے تمام عالم اسلام میں علم کی گرم بازاری ہوئی۔ بڑی مساجد میں دینی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ایسی مرکزی مساجد جہاں خود مصطفٰی جان رحمت ﷺ لوگوں کے لئے نہ صرف تعلیم کا بندوبست کیا، بلکہ مدینہ سے تربیت یافتہ معلم بھی ان کی تربیت کے لئے بھیجے گئے ایسی مرکزی مساجد میں مسجد صنعا(یمن)، مسجد نجران کا نام لیا جاسکتا ہے۔آپ کی اس درجہ جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳؍سال کی قلیل مدت میں جہاں کل صرف ۱۷/۱۸ خواندہ افراد تھے، وہاں عوام کی خواندگی کا اوسط ۷۰-۸۰؍ فی صدی ہوگیا تھا اور پھر یہ تعلیمی تحریک، تعلیم و تربیت کا نظام پوری دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گیا، حالانکہ اس تعلیم کا رشتہ روزی سے مربوط نہیں تھا پھر بھی لوگ بڑی دلچسپی اور انہاک سے حصول علم میں اپنا وقت لگاتے تھے لیکن موجودہ زمانہ میں جب کہ تعلیم کا رشتہ روزی سے جڑا ہوا ہے پھر بھی مصطفٰی جان رحمت ﷺ کے متبعین اور پیروکاروں میں تعلیم کی جانب سے بے رغبتی ہے جو قابل نفرین ہے۔ہم سب کو مل کر اس مسئلے پر نہ صرف سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا بلکہ سماج کے ہر فرد کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی جدوجہد بھی کرنی ہوگی۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کا نظریۂ جہاد

علامہ یٰسین اختر مصباحی

دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

افراد و شخصیات اور اقوام و قبائل کی کشمکش اور تنازع للبقا کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسانی تاریخ ہے۔ فکر و خیال، زبان و تہذیب، مذہب و ملت، ملک و وطن، مال و زر، زمین و جائداد وغیرہ کی آویزش اور غلبہ و اقتدار کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ روئے زمین پر انسانی نسل کی افزائش کے ساتھ خواہشات و جذبات کی نشو ونما اور ان کی فراوانی نے بے شمار مسائل و مشکلات کو جنم دینا شروع کیا اور ان کے تصادم نے طرح طرح کے فتنوں کی آبیاری کی جس کا سلسلہ نہ آج تک ختم ہوسکا اور نہ آئندہ اس کے آثار ہیں۔ یہی وہ احساسات و خدشات ہیں جن کا ملائکہ مقربین نے بھی بارگاہِ الٰہی میں ذکر کیا تھا جب کہ ربِ کائنات نے ان سے ارشاد فرمایا!

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (البقرۃ ۳۰)

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا! میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے بیک زبان عرض کی:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ

بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ۔ (البقرۃ)

بولے کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خوں ریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔

رب کائنات نے اپنا یہ ربانی حکم سنایا:

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ ۳)

فرمایا! مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

مشیتِ ربانی کیا ہے اسے تم کیا سمجھو؟ اور علم ربانی میں مخلوقات کے جو اعمال اور ان کے نتائج ہیں، ان سب باتوں کو تم کیا جانو؟ تمھیں جو بتایا جا رہا ہے وہ سنو اور جس بات کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ یہی تمھارا فریضہ ہے اور اسی میں تمھاری سعادت ہے۔ چنانچہ حکمت و مصلحتِ ربانی کے سامنے ملائکہ نے سرِ تسلیم خم کیا اور اس عبادت و طاعتِ الٰہی کو ہی اپنا اصل مقصود سمجھتے ہوئے وہ اسی پر کاربند ہیں جو ان کا قدیم شیوہ و وطیرہ ہے۔

انسانوں ہی کے درمیان رب کائنات نے انبیا و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو مبعوث فرمایا جو نسلِ انسانی میں سب سے ممتاز و منتخب اور برگزیدہ مخلوق ہیں۔ اور پھر جماعتِ انبیا و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی امامت کا تاج سید العرب والعجم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے سرِ اقدس پہ رکھ کر رب کائنات نے انھیں افضل الانبیا والمرسلین اور خاتم النبین بنایا۔

یہ نبی عربی و رسولِ ھاشمی ﷺ کسی خاص خطہ و طبقہ اور کسی محدود عہد و زمان کے لیے نہیں بلکہ ساری کائنات کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اور قیامت تک کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے انھیں قرآن حکیم کی شکل میں نسخۂ شفا اور اکسیر ہدایت سے نوازا گیا اور زبانِ نبوت سے نکلی ہوئی ہر بات کو وحی الٰہی قرار دیا گیا۔

اللہ کی مشیت نے اپنی رحمتِ کاملہ اور فضلِ خاص سے آپ کو جمیع اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ حسنہ کا جامع اور ان سے مزین و مکمل فرما کر ''رحمۃ للعلمین'' کا نشانِ امتیاز

بھی آپ کو عطا فرمایا تاکہ بنی نوع انسان اپنے رب کی نعمت اور مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی رحمت سے ہر لحہ مستفید ہوتی رہے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ (سورۃ الانبیاء۔ آیت ۱۰۷)

اور ہم نے تمھیں سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کے وجود کی برکت سے اللہ نے اقوام عالم کو بے شمار ابتلاء و آزمائش اور نقصان و عذاب سے محفوظ فرما دیا۔ ہاں جو سرکش اور باغی ہوں انھیں اپنے انجام کو پہنچنا ہی ہے۔ فرمانِ خداوندی اور مشیتِ ربانی یہی ہے جن کا ذکر ان دونوں آیاتِ مبارکہ کے اندر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَ اَنۡتَ فِيۡهِمۡ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمۡ وَ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ o وَ مَا لَهُمۡ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمۡ يَصُدُّوۡنَ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَمَا كَانُوۡۤا اَوۡلِيَآءَهٗ ؕ اِنۡ اَوۡلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ o (سورۃ الانفال۔ آیت ۳۳، ۳۴)

اور اللہ کا کام نہیں ہے کہ انھیں عذاب دے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو۔ اور اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں جب تک وہ استغفار کر رہے ہیں۔ اور انھیں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے۔ وہ تو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور وہ اس کے اہل نہیں۔ اس کے اولیاء تو پرہیزگار ہی ہیں۔ مگر ان میں اکثر کو علم نہیں۔

یہ انسان جس کے اندر حسن و قبح، نیکی و بدی، سعادت و شقاوت، شرافت و رذالت، شجاعت و بزدلی، عدل و ظلم، امن پسندی و شر پسندی، خیر خواہی و بدخواہی، اخلاص و خودغرضی جیسی بے شمار متضاد صفات ودیعت کی گئی ہیں اور پھر اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جسے چاہے اپنائے اور جس سے چاہے باز رہے۔ اور پھر اس کے اعضاو جوارح کا وزیر عقل کی صورت میں اور سلطان قلب کی صورت میں بنا کر اس کی آزادی بخش دی گئی ہے کہ اس سلطان و وزیر کے حکم و مشورہ کے مطابق یہ اعضا و جوارح اور ان کے مجموعہ پر مشتمل انسان اپنی انسانیت کی جس طرح چاہے حفاظت کرے یا اس کی عزت

و حرمت کو پامال کرے یہ اس کے انتخاب اور اس کی صواب دید پر منحصر ہے۔

اسی حقیقت کو ھادیِ انس و جاں، معلمِ کتاب و حکمت مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله اَلا و هی القلب۔ (صحیح بخاری)

جسم کے اندر ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صحیح ہے اور اگر وہ خراب ہے تو سارا جسم خراب ہے۔ وہ ٹکڑا دل ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے قلب و عقلِ انسانی کو اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز و محور بنایا اور انھیں آلائشوں سے صاف ستھرا رکھ کر پاکیزہ زندگی گذارنے اور اپنے خالق و مالک کے حکم کی اطاعت کرتے رہنے کا درس دیا۔ دنیا کو اپنی محبت و مروت اور ہمدردی و غم گساری سے معمور کر کے امن و سلامتی اور انسانی فلاح و بہبود کے جذبات پروان چڑھانے کا پیغام دیا۔ اور ظلم و استحصال، درندگی و سفاکی، غارت گری و خون ریزی سے دور رہنے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے اسباب و دواعی کے استیصال کی دعوت دی اور صاف و صریح طور پر مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

مَن رأی منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان۔ (صحیح مسلم)

تم میں سے جو کوئی بدی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھوں سے بدل ڈالے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے بدل ڈالے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے اسے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور حصہ ہے۔

کوئی شخص، کوئی قبیلہ، کوئی قوم، کوئی ملک صلاحِ قلب سے محروم ہو کر فساد قلب کے مرض میں مبتلا ہو جائے اور کسی بھی حکیمانہ طریقے پر آمادۂ صلاح و فلاح نہ ہو تو پھر اس کے ساتھ وہ تدبیر اختیار کرنی ضروری ہے جس سے اس کی شر انگیزی و سرکشی کو قابو میں لایا جا سکے، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مریض کو کسی دوا سے افاقہ نہ ہو سکے تو مجبوراً

اس کی صحت وشفایابی کے لئے عمل جراحت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور مریض کے جسم پر نشتر زنی کرنی پڑتی ہے۔

یہیں سے جہاد اور فساد کا مرحلہ اور ان کی محاذ آرائی شروع ہوتی ہے۔ خون کا فساد ہو کہ فکر وخیال کا فساد ہو کہ اخلاق وکردار کا فساد ہو کہ روح کا فساد ہو یا جیسا بھی فساد اور بگاڑ ہو وہ مناسب دوا علاج سے دور نہ ہوسکے تو پھر اس کے لئے جو بھی کڑوی کسیلی دوا ہو کہ نشتر ہو ساری تدبیریں اور صورتیں جائز ومفید ہو جاتی ہیں۔

مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ساری انسانیت کے لئے حیات آفریں پیام اور ساری مخلوقات کے لئے رحمتِ بے کراں بن کر خاک دانِ عالم میں جلوہ گر ہوئے تھے اس لئے انھوں نے قدم قدم پر اس کا لحاظ رکھا کہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ کسی کو کسی طرح کی تکلیف وآزار نہ پہنچ جائے۔ کوئی کسی کا حق نہ غصب کرلے۔ کسی پر کوئی ظلم وتعدی نہ کر بیٹھے۔ داروئے شفا کسی کو دی جائے تب بھی رفق ونرمی کا معاملہ کیا جائے اور نشتر زنی کرنی پڑے تب بھی انسانی حرمت اور اس کے حدود وآداب کا خیال رکھا جائے۔

دنیا کے اندر نافرمان اور سرکش انسان درحقیقت روحانی واخلاقی مریض ہیں کہ نہ وہ اپنے خالق ومالک کے احکام کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ ہی ابنائے جنس کے حقوق کی رعایت وپاس داری سے انھیں کوئی مطلب ہے۔ ایسوں ہی کے عصیان وطغیان کے سامنے بند باندھنے کے لئے اور قتل وخوں ریزی سے خود بچنے اور بہت سی انسانی جانوں کو ضیاع سے بچانے کے لئے اس احتیاطی تدبیر کا حکم دیا گیا ہے جس کا نام جہاد ہے۔ اور صراحۃً یہ حکم دیا گیا ہے کہ مراحلِ جہاد وصلح میں یہ چیزیں پیش نظر رکھو اور اگر باغی وسرکش دشمن فریب دہی کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کافی ہے۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۔ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ o وَ اِنْ

جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ وَ اِنْ يريدوا ان يخدعوك فان حسبك الله و هوالذى ايّدك بنصره و بالمؤمنين۔

(سورۃ الانفال۔ آیت ٦٠ تا ٦٢)

اور ان کے لئے تیار رکھو جو قوت تمھیں بن پڑے اور جتنے گھوڑے باندھ سکو کہ ان سے ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ جو اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن ہیں۔ اور ان کے سوا کچھ اوروں کے دلوں میں جنھیں تم نہیں جانتے اللہ انھیں جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کروگے تمھیں پورا دیا جائے گا اور کسی طرح گھاٹے میں نہ رہوگے۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک وہی سنتا جانتا ہے۔ اور اگر وہ تمھیں فریب دینا چاہیں تو بے شک اللہ تمھیں کافی ہے۔ وہی ہے جس نے تمھیں اپنی تائید ونصرت سے طاقت بخشی اور مسلمانوں کو طاقت دی۔

قتل وخوں ریزی اور خونِ ناحق سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے اور انسانی جان کی حرمت کا احساس بار بار دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ دشمن سے مڈبھیڑ کی آرزو کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔ چنانچہ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لاتتمنوا لقاء العدو فاذا لقيتموهم فاصبروا (صحیح بخاری)

دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور جب مڈبھیڑ ہوجائے تو صبر وثبات قدمی سے کام لو۔

دوسری صورت پیش آہی جائے تو پھر اپنے اصول اور حدود وثغور کی حفاظت سے پیچھے نہ ہٹو نہ دشمن کے سامنے بزدلی اور کسی کمزوری کا مظاہرہ کرو کہ یہ شانِ مومن ومجاھد سے بعید تر بات ہے۔

یاایها الذین اٰمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا و اتقوا اللّٰه لعلكم تفلحون۔ (سورۃ آل عمران۔آیت ٢٠٠)

اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر میں دشمنوں سے آگے رہو اور سرحد پر اسلامی ملک کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اس امید پر کہ تمھیں کامیابی ملے۔

جہاد بمعنی قتال کی شرائط نہایت سخت ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ جہاد کے اجزا میں طلب رضائے الٰہی، اطاعت امیر وامام، مناسب تیاری وطاقت، امیدِ فتح ونصرت، ضرورتِ جہاد شاملِ ہیں جن کے بغیر نعرۂ جہاد بلند کرنا جہاں مقاصدِ واصولِ جہاد کی خلاف ورزی ہے وہیں مسلمانوں کو وحشت وامتحان وذلت ورسوائی میں مبتلا کرنے کی ناپسندیدہ ومضرت رساں کوشش ہے جس کی شریعت وسنتِ نبویہ میں کسی طور پر اجازت نہیں ہے۔

کسی قوم وملک سے عہد وپیمان ہو تو اس کی پابندی لازم ہے اور نقضِ عہد کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ پڑوسی اقوام وممالک کے ساتھ کیے گئے معاہدے اور بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کی طرف سے منظور کردہ قوانین وضوابط اسی ضمن اور اسی دائرے میں آتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے انفرادی اور اندرونِ مملکت بعض پر جوش تنظیموں کی مسلح سرگرمیاں قابلِ تشویش اور محلِ نظر ہیں۔ بنام جہاد (بمعنی قتال یعنی اصطلاحی جہاد) کی گنجائش ان کے اندر نظر نہیں آتی۔ ہاں جہاد بمعنی جد وجہد وکوشش ومحنت کی صحت وجواز میں کوئی کلام نہیں۔ اس جہاد ومجاہدہ وجد وجہد کو ہر قیمت پر جاری رہنا چاہیے اور اپنے حقوق کی بازیابی، ظلم کی سرکوبی، اور دشمن کی سازشوں کو ناکام بنانے کی ہر جائز وممکن تدبیر اختیار کرنا جہاں شریعت کا تقاضہ ہے وہیں بین الاقوامی ضابطہ بھی ہے۔

عہد رسالت اور عہد صحابۂ کرام میں جو غزوات وسرایا ہوئے جو جہاد ہوا جو جنگیں ہوئیں وہی ہمارے لئے اصل محک ومعیار اور فانوسِ ھدایت ہیں۔ انھیں کی روشنی میں جہاد کے احکام ومسائل طے ہوئے ہیں جن کی پابندی والتزام ہر امام وامیر ومجاھد وغازی کے اوپر لازم ہے۔ اپنی سلطنت وحکومت قائم کرنے، اپنے غلبہ واقتدار کی بنیاد مضبوط کرنے، اپنے سیاسی وجنگی عزائم کی تکمیل کرنے اور اپنے شوقِ جنوں کو عملی شکل دینے کے لئے شرائط جہاد کو نظر انداز کرنا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ محض نفسانیت وانانیت وبدنظمی وانارکی ہے جس کا خمیازہ عموماً عام مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور جان ومال کی تباہی وبربادی اور خونِ مسلم کی ارزانی کا وبال ایسے لوگوں کی گردن پر عائد ہوتا ہے

اور وہ اپنے حصے میں ثواب کی بجائے گناہ کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی یارسول اللہ! آدمی لڑے مال غنیمت کے لئے اور ناموری کے لئے اور بہادری دکھانے کے لئے تو ان میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟

آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا وہی ہے جو کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے لڑتا ہے۔ (صحیح بخاری)

اس ضمن میں یہ دو روایات بہت مشہور ہیں جن سے جہاد کی صحیح روح اجاگر ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا!

قیامت کے روز ایک شخص ایک قاتل کا ہاتھ پکڑ کر لائے گا اور کہے گا یارب! اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ قاتل سے رب کائنات پوچھے گا کہ تم نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ وہ کہے گا! میرے پروردگار! اسے میں نے تیری عزت وجلال کے لئے قتل کیا تھا۔ رب تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمائے گا، عزت تو میرے ہی لئے ہے۔

ایک دوسرا شخص ایک قاتل کا ہاتھ پکڑ لائے گا اور کہے گا کہ پروردگار! اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ رب تبارک وتعالیٰ اس سے سوال فرمائے گا۔ تم نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ وہ کہے گا۔ میں نے فلاں حاکم کی عزت کے لئے اسے قتل کیا تھا۔ رب تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ فلاں کے لئے عزت نہیں۔ پھر قاتل کے ذمہ اس کا گناہ ہوگا۔

دامادِ رسول مقبول حضرت علی مرتضیٰ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں:

ایک معرکۂ جہاد میں میں نے ایک کافر کو پچھاڑا اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے غصہ اور تلملاہٹ میں میرے منہ پر تھوک دیا۔

اب آگے کا واقعہ سنیے جو ایک مومن صادق کے اخلاص اور روحِ جہاد کی

حقیقت ہے۔

علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اس کی اس حرکت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے قتل کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کافر حیران رہ گیا۔ حیرت واستعجاب کے ساتھ اس نے پوچھا کہ علی کیا بات ہے آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کا دشمن سمجھ میں نے تیرا کام کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اب میرا نفس اس کے اندر شامل ہو گیا۔ میں اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے جہاد کر رہا تھا اس لئے میں نے تجھ سے اپنا ہاتھ روک لیا۔

جہاد کا حکم بھی ہے اور اس کی اجازت بھی ہے۔ اس کے لئے ترغیب وتشویق بھی ہے اور وعدۂ ثواب وجنت بھی ہے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب جہاد اپنے صحیح اور حقیقی معنی میں جہاد ہو۔ نفسانیت کا اس کے اندر شائبہ نہ ہو۔ نیت کے اندر فتور نہ ہو۔ کسی پر ظلم وجبر کا ارادہ نہ ہو۔ کسی حریف کو زیر کر کے اپنی ناک اونچی کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ جو کچھ بھی ہو وہ رضائے الٰہی کی خاطر ہو اور اسلام و مسلمین کا مفاد ملحوظِ خاطر ہو۔ غدر وبدعہدی نہ ہو۔ شخصی وخاندانی وگروہی حکمرانی کی بساط بچھانے کی منصوبہ بندی نہ ہو۔ ہاں کوئی ظالم وجابر اور غاصب وجارح طاقت ہجوم وحملہ کر کے مسلم آبادیوں کو اپنی زد پہ لے لے اور اسلام و مسلمین کی آبرو وعزت ووقار اور جان ومال کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے تو پھر حکم یہ ہے کہ:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَاتَعْتَدُوْا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ (سورۃ البقرۃ۔ آیت ۱۹۰)

جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے اللہ کی راہ میں لڑو مگر لڑائی میں کوئی تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

عظمت ووقارِ اسلام کے لئے جہاد کرنے والوں ہی کو محبوبیت کی بشارت دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ

مَّرْصُوْصٌ۔ (سورۃ الصف۔ آیت ٤)

بے شک اللہ محبوب رکھتا ہے انھیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں گویا وہ رانگا پلائی ہوئی عمارت ہیں۔

ایسے ہی مواقع اور دفعِ ظلم وفساد کے مراحل کے لئے طاقت وقوت کا استعمال اور اس کا اظہار ضروری قرار دیتے ہوئے جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

و اعلموا ان الجنة تحت ظلالِ السیوف۔ (صحیح بخاری)

جان لو کہ بے شک جنت تلواروں کے سایے میں ہے۔

اسی لئے نفیرِ عام کی صورت میں شریعت مطہرہ نے جہاد کو فرض عین قرار دیا ہے اور اعلان عام ہوتے ہی ہر مرد وعورت پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی کا یہ عام ضابطہ ہے کہ:

فاما اذا عمَّ النفیر بأن هجم العدو علی بلد فهو فرض عین یفترض علیٰ کل واحد من آحاد المسلمین ممن هو قادر علیه لقوله تعالیٰ ...... ولأن الوجوب علیٰ الكل قبل عموم النفیر ثابت لأن السقوط عن الباقین بقیام البعض به۔ فاذا عم النفیر لایتحقق القیام به الا بالكل فبقی فرضاً علی الكل عینا بمنزلةِ الصوم و الصلوٰة۔ فیخرج العبد بغیر اذن مولاه و المرأة بغیر اذن زوجها لأن منافع العبد و المرأة فی حق العبادات المفروضةعیناً مستثناة عن ملك المولیٰ و الزوج شرعاً كما فی الصوم و الصلوٰة۔ و كذا یباح للوالد ان یخرج بغیر اذن والدیه لان حق الوالدین لایظهر فی فروض الاعیان كالصوم و الصلوٰة ۔والله تعالیٰ اعلم۔ (بدائع الصنائع المجلد السابع۔ ص١٤٦۔ للام الكاسانی، م٥٨٧ھ)

جب نفیر عام یعنی اعلان عام ہو جائے کہ کسی بلدِ اسلامی پر دشمن حملہ آور ہو گیا ہے تو ایسی صورت میں جہاد پر قادر ہر مسلمان مرد وعورت پر جہاد فرضِ عین

ہوجاتا ہے۔نفیر عام ہوتے ہی اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ہر مسلمان جہاد کے لئے
نکل پڑے اور وہ اسے نماز و روزہ کی طرح اپنے اوپر فرض عین سمجھے۔الخ
جہاد و شہادت کی عظمت وفضیلت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ
ارشاد فرماتے ہیں۔ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

والذی نفسی بیدہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللّٰہ ثم احیا ثم اقتل
ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل۔ (صحیح بخاری)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔میری
یہی خواہش وتمنا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا
جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔

شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد اس واقعہ میں بھی نظر آتا ہے جس کا ذکر عبداللہ
بن مسعود رضی اللہ عنہ کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے مقداد بن اسود کی زبان سے
ایک ایسی بات سنی کہ اگر وہ میری زبان سے نکلتی تو مجھے وہ ہر چیز سے پیاری ہوتی۔

مقداد بن اسود ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور اس وقت آپ مشرکین سے جہاد کی ترغیب دے رہے تھے۔مقداد بن اسود نے
اس موقعہ پر عرض کی۔

لانقول کما قال قوم موسیٰ: اذھب انت و ربک فقاتلا۔ و لکنا
نقاتل عن یمینک و عن شمالک و بین یدیک و خلفک۔ (صحیح بخاری)

ہم وہ نہیں کہیں گے جو قوم موسیٰ نے کہا تھا کہ ''آپ اور آپ کے رب
جاکے لڑیں۔'' ہم تو آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے لڑیں گے۔

فرأیت النبی ﷺ اشرق و جھہ و سرّہ۔ (صحیح بخاری)

میں (عبداللہ بن مسعود) نے دیکھا کہ نبی اکرم کا چہرۂ مبارکہ خوشی ومسرت
سے چمکنے لگا۔

ندامت وخوف وخشیت اور اخلاص نیت کے ساتھ جو آنسو یا جو لہو بہایا جائے

اور ان کا نذرانہ بارگاہ الٰہی میں پیش کیا جائے وہی محبوب ومقبول ہے ورنہ مردود و
مخذول ہے۔آنسو اور لہو کے انھیں قطرات کے بارے میں مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ
ارشاد فرماتے ہیں۔ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

لیس شیء احب الی اللّٰہ من قطرتین قطرۃ دموعٍ من خشیۃ اللّٰہ و
قطرۃ دمٍ یھراق فی سبیل اللّٰہِ۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو قطروں سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ایک
آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے بہا ہو اور دوسرا خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں بہایا
جائے۔

اسی لئے جہاد کو سنام العمل (عمل کی بلندی) کہا گیا اور جان و مال کے
ذریعہ جہاد کرنے اور اجر وثواب آخرت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔
ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔
یارسول اللہ! سب سے بہتر آدمی کون ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

مؤمن یجاھد فی سبیل اللّٰہ بنفسہٖ و مالہٖ (صحیح بخاری کتاب الجھاد)

وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال کے ساتھ جہاد کرے۔
ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
پوچھا گیا:

ای الاعمال افضل و ای الاعمال خیر۔ قال الایمان باللّٰہ و
رسولہٖ۔ قیل ثم ای شیء۔ قال الجھاد سنام العمل۔ قیل ثم ای شیء
یارسول اللّٰہ۔ قال ثم حج مبرور۔ (ترمذی۔ ابواب فضائل الجھاد)

یارسول اللہ! کون سا عمل افضل اور بہتر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا! اللہ اور
اس کے رسول پر ایمان لانا۔پوچھا گیا پھر کون سا عمل؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جہاد عمل
کی چوٹی ہے۔پوچھا گیا پھر کون سا عمل بہتر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حج مبرور۔
یہود ونصاری اور دور جدید کے مستشرقین نے جہاد کی جو بھیانک تصویر کشی

کرنے کا مذموم سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے واقعۂ ہجرت اور حادثۂ وصال کی درمیانی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد تارِ عنکبوت کی طرح بکھر جاتا ہے۔ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے صرف ازالۂ مرض کے لئے نشتر زنی اور روحانی و اخلاقی مرہم پٹی کا حکم دیا ہے۔ ناحق قتل وخون ریزی کو آپ نے کبھی روا نہیں رکھا اور نہ اپنے کسی صحابی کو اس کی اجازت دی۔

آپ کی حیاتِ ظاہری کے جملہ غزوات وسرایا کے ایک ایک مقتول ومہلوک کی چھان بین کر کے محققین ومؤرخین نے بتلایا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد ایک ہزار اٹھارہ نفوس پر مشتمل ہے جن میں دوسو اُنسٹھ (۲۵۹) مسلم شہداء اور سات سو اُنسٹھ (۷۵۹) کفار ومشرکین ہیں۔

قدیم زمانے کی مہابھارت ہو کہ جدید دور اور بیسویں صدی عیسوی کی جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم۔ ان سب کا سروے کرنے کے بعد ہر مؤرخ یہ پکار اٹھتا ہے کہ محمد عربی ﷺ کے زمانے میں جتنے انسان کل تیئس سال (۲۳) کی مدت میں لقمۂ اجل بنے وہ ان جنگوں کے مقابلے میں ایک فی صد بھی نہیں ہیں۔

سب کچھ چھوڑیے صرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کو سامنے رکھیے جس میں مقتولین کی تعداد پچھتر اسی لاکھ کے قریب تھی۔ اس جنگ میں شامل چند ممالک کے جانی نقصان کی تعداد اس طرح ریکارڈ کی گئی ہے۔ روس سترہ لاکھ۔ جرمنی سولہ لاکھ۔ فرانس پونے چودہ لاکھ۔ آسٹریا آٹھ لاکھ۔ برطانیہ سات لاکھ۔ اٹلی ساڑھے چار لاکھ۔ وغیرہ وغیرہ۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے ہر حال میں انسانی جان کے احترام کا سبق دیا اور اس پر خود بھی عمل کر کے دکھایا ہے۔ غلبہ وقوت اور شوکتِ اسلامی کے عروج وکمال کے وقت بھی مصطفیٰ جان رحمت نے یہ عملی نمونہ پیش کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے اعلان فرمایا۔ الیوم یوم المرحمۃ۔ الیوم یوم المرحمۃ۔ آج رحم کرنے کا دن ہے۔ آج رحم کرنے کا دن ہے۔ اور آپ ہی نے اپنے سارے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ:

کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔ کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔ اور جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے۔ (فتوح البلدان للبلاذری)

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ اپنے مجاہدین کو عموماً یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ:

ولاتغلوا و لاتغدروا و لاتمثلوا و لاتقتلوا ولیداً۔ (ترمذی)

مالِ غنیمت میں چوری نہ کرنا نہ خیانت وبدعہدی کرنا نہ لاشوں کو کاٹ پیٹ کر ان کی بے حرمتی کرنا نہ انھیں روندنا اور نہ ہی کسی بچے کو قتل کرنا۔

اغزوا ولاتغدروا ولاتسرقوا ولاتمثلوا ولاتقتلوا ولیداً۔ (سننِ ابن ماجہ)

جہاد میں نہ غدر وبدعہدی کرو نہ چوری کرو نہ لاشوں کی بے حرمتی کرو نہ ہی کسی بچے کو قتل کرو۔

حنظلۃ الکاتب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہم ایک جہاد میں گئے۔ راستے میں ایک مقتول عورت کے اردگرد ہم نے بھیڑ دیکھی۔ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں نے دیکھا تو آگے بڑھنے کے لئے جگہ دے دی۔ آپ نے اس مقتول عورت کو دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ تو لڑنے والوں میں سے نہ تھی۔

ثم قال لرجلٍ انطلق الیٰ خالدبن الولید فقل لہ ان رسول اللہ ﷺ یأمرك یقول۔ لاتقتلن ذُرّیۃً ولاعسیفاً۔ (سننِ ابن ماجہ)

پھر ایک آدمی سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! تم جا کر خالد بن ولید سے بتلا دو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ کسی عورت اور مزدور کو ہرگز قتل نہ کرنا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

...... بہت بوڑھے کو اور عورتوں بچوں کو قتل نہ کیا جائے۔ (سنن ابوداؤد)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بچوں اور گوشہ نشین عابدوں کو نہ قتل کیا جائے۔

یہاں تک کہ مویشیوں، کھیتوں اور پھل دار درختوں کو کاٹنے اور انھیں

نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کے ساتھ ملک شام بھیجتے وقت یہ ھدایت فرمائی تھی کہ:

کوئی پھل دار درخت نہ کاٹنا، کوئی آباد جگہ نہ ویران کرنا، کھجور کا درخت نہ کاٹنا نہ اسے ڈبونا۔ (مؤطا امام مالک)

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ہمیں یہ ھدایت فرماتے ہوئے جہاد پر بھیجا کہ:

فلاں اور فلاں کو پاؤ تو ان دونوں کو آگ میں جلا دینا۔ جب ہم روانہ ہونے لگے تو آپ نے فرمایا! میں نے فلاں اور فلاں کے لئے تمھیں حکم دیا تھا کہ انھیں آگ میں جلا دینا لیکن آگ کا عذاب تو اللہ ہی دیتا ہے اس لئے ان دونوں کو پاؤ تو قتل کردینا۔ (صحیح بخاری)

جہاد صرف میدانِ جنگ میں شمشیر و سنان اور تیر و تفنگ چلانے کا نام نہیں کہ ان کے ذریعہ اعدائے اسلام کے غرور و نخوت کا بت توڑا جائے اور وہ راہِ راست پر آنے کے لئے تیار نہ ہوں تو ان کا کام تمام کیا جائے بلکہ جہاد کی مختلف اقسام ہیں۔ جہاد بالسیف کے ساتھ جہاد باللسان و جہاد بالقلم و جہاد بالقلب و جہاد بالعقل و جہاد بالعلم وغیرہ بھی اقسام جہاد ہی میں شامل ہیں۔ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ سے براہِ راست جو ہدایات و تعلیمات اھل اسلام کے لئے جاری ہوئیں وہ ذیل میں ملاحظہ کریں جن سے مذکورہ اقسام کی تصدیق کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ میدانِ جنگ سے الگ ہٹ کر اور کیا چیزیں جہاد کا حصہ ہیں جن پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

افضل دينارٍ ينفقه الرجل۔ دينار ينفقه على عياله۔ و دينار ينفقه على فرسٍ في سبيل اللّٰه۔ و دينار ينفقه الرجل على اصحابه في سبيل اللّٰه ۔ (سنن ابن ماجه ، ابواب الجهاد)

آدمی جو خرچ کرتا ہے ان میں سب سے بہتر دینار وہ ہے جسے وہ اپنے اھل و عیال پر خرچ کرے۔ اور وہ ہے جسے وہ اللہ کی راہ میں گھوڑے پر خرچ کرے۔ اور وہ ہے جسے اللہ کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔

علی مرتضٰی و ابوھریرہ و جابر بن عبداللہ وغیرھم رضوان اللہ تعالٰی علیھم اجمعین کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا:

من ارسل بنفقةٍ في سبيل اللّٰه و اقام في بيته۔ فله بكل درهم سبع مائة درهم۔ و من غزا بنفسه في سبيل اللّٰه و انفق في وجهِ ذلك بكل درهم سبع مأة الف درهم۔ (سنن ابن ماجه)

جو شخص اللہ کی راہ میں مال بھیجے اور خود گھر بیٹھا رہے تو اس کے لئے ہر درھم کے بدلے سات سو درھم کا ثواب ہے۔ اور جو شخص اللہ کی راہ میں خود جنگ کرے اور اس میں اپنا مال بھی خرچ کرے تو اس کے لئے ایک درھم کے بدلے سات لاکھ کا ثواب ہے۔

زید بن خالد جھنی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من جهَّز غازياً في سبيل اللّٰهِ فقد غزا۔ و من خلف غازياً في سبيل الله فقد غزا۔ (صحيح بخاری و ترمذی)

جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاھد کے لئے سامان و اسباب فراہم کیا اس نے خود جہاد کیا۔ اور جس نے اللہ کی راہ میں کسی جہاد کرنے والے کے گھر کی نیک نیتی کے ساتھ دیکھ بھال کی اس نے خود جہاد کیا۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ ایک شخص حاضرِ بارگاہِ نبوت ہوا اور اس نے عرض کی۔ یارسول اللہ! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اَ لك والدان۔ کیا تمھارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے ارشاد فرمایا: ففيهما فجاهد۔ (ترمذی) ان دونوں کی خدمت میں پوری کوشش کرو۔ یہی تمھارا جہاد ہے۔

معاویہ بن جاھمہ سلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ

کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی! یا رسول اللہ! میں آپ کے ساتھ شریک جہاد ہونا چاہتا ہوں کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی بھلائی حاصل کر سکوں۔

آپ نے پوچھا کیا تمھاری ماں زندہ ہیں؟ میں نے عرض کی! ہاں میری ماں زندہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور ان کی خدمت کرو۔ میں گھوم کر دوسری طرف سے حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کی۔ میں آپ کے ساتھ شریک جہاد ہونا چاہتا ہوں تا کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی بھلائی جمع کر سکوں۔ آپ نے پھر پوچھا کیا تمھاری ماں زندہ ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں میری ماں زندہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

میں اسی طرح گھوم کر پھر آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں تا کہ رضائے الٰہی اور ثواب آخرت پا سکوں۔ آپ نے پھر فرمایا۔ کیا تمھاری ماں زندہ ہیں؟ میں نے عرض کی کہ ہاں میری ماں زندہ ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا!

الزم رجلها فثم الجنة (سنن ابن ماجه)

اپنی ماں کے قدموں سے لگے رہو وہیں تمھاری جنت ہے۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے میں نے ایک بار عرض کی کہ یا رسول اللہ!

نریٰ الجهاد افضل العمل أفلانجاهد۔ قال و لكن افضل الجهاد حج مبرور۔ (صحيح بخاری كتاب الجهاد)

جہاد کو ہم دیگر اعمال سے بہتر سمجھتی ہیں تو کیا ہم عورتیں جہاد نہ کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا! تم عورتوں کا افضل جہاد حج مبرور ہے۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا!

من آعظم الجهاد كلمة عدلٍ عند سلطان جائرٍ۔ (ترمذی)

ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ عدل وانصاف کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا:

مجاھد وہ ہے جو اللہ کے معاملے میں خود اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ باتوں سے دور ہو جائے۔ (کنز العمال اول)

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه ۔ (ترمذی)

مجاھد وہی ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔

پیغمبر اسلام مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل عدل وانصاف پر مبنی تھا۔ آپ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے اور اسلام وقرآن پر حملہ کرنے والے ہی ایسے بدنہاد اور بدطینت افراد تھے جن کے خلاف آپ نے کسی کارروائی کا حکم دیا۔ آپ نے کبھی کسی کا قتلِ ناحق نہ خود کیا اور نہ اپنے صحابہ کو اس کی اجازت دی۔ کائناتِ انسانیت کے لئے آپ کی ذات رحمت و رأفت کا مجسمہ تھی اور آپ نے جہادِ اسلامی کو جن اصول وآداب اور حدود وضوابط کا پابند بنایا در حقیقت وہی جہاد جہادِ اسلامی ہے۔

گذشتہ صفحات میں آپ اس کی جھلکیاں دیکھ چکے ہیں۔ اہل اسلام کو آپ نے ہر قدم پہ درس دیا کہ ان کے اعمال کا احتساب ہوگا اور ہر عمل کی جزا وسزا سے انھیں بروزِ قیامت دوچار ہونا پڑے گا اس لئے وہ کبھی کسی پر ناحق اپنا ہاتھ نہ اٹھائیں نہ ہی کسی پر کسی طرح کا ظلم کریں۔ آپ نے اپنے صحابہ سے ایک بار ارشاد فرمایا کہ انصر اخاك ظالماً أو مظلوماً۔ اپنے بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم مدد کرو۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن کسی ظالم کی مدد کس طرح کی جا سکتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ظالم جب آمادۂ ظلم ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لو تا کہ وہ کسی پر ظلم نہ کر سکے۔

اسی طرح کے ایک موقع پر مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أول مايحاسب به العبد الصلوٰة۔ و أول مايقضىٰ بين الناس يوم

القیٰمۃ فی الدماء۔ (نسائی)

قیامت کے روز بندے سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان ہوگا وہ خون کا دعویٰ ہے۔

یہی وہ ارشادات وھدایات ہیں جو جہادِ اسلامی کی روح ہیں اور جن پر عمل کر کے خلفائے راشدین وصحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جہاد کو اس کی اصل شکل وصورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہی وہ نظریۂ جہاد ہے جس کے نمونے ہمیں غزوات وسرایا میں ملتے ہیں اور آج بھی بوقتِ ضرورت ہم ان پر عمل کر کے ہی جہادِ اسلامی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اور اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے روز سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ اور دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ جہاد اور رحمت واحترام انسانیت کا توازن اس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے کیوں کہ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق وروحانیت کے پیکر تھے۔ اور دنیائے انسانیت کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا قرآن حکیم نے اس طرح اعلان فرمایا ہے:

وَ مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الانبیاء)

اور ہم نے تمھیں سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا داخلی پہلو

مولانا عبدالستار ہمدانی برکاتی

پوربندر، گجرات

ہر دور میں اسلام دشمن عناصر اسلام کی حقانیت کو مجروح کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً کفّار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ اسلام کی عالمگیر مقبولیت کے خلاف عنادیہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور معاذ اللہ یہ کہتے ہوئے بھی شرم وحیا نہیں محسوس کرتے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھام کر اسلام کی نشر واشاعت کی ہے۔ کذب اور دروغ گوئی پر مشتمل اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں واقع غزوات اور سرایا کی فہرست بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف ودیگر رؤسائے مشرکین عرب کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی حقانیت اور حضور اقدس کے اخلاق کریمہ، انسانیت پر مشتمل تعلیم، اعلیٰ اصول، تمدن اور دیگر بے شمار محاسن کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا جائزہ لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی ظاہری حیات کے ۴۰؍ چالیس سال تک آپ کو تمام لوگ ''محمد امین'' (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے معزز لقب سے یاد کرتے تھے۔ ۴۰؍ چالیس سال کی عمر شریف میں آپ نے دنیا کو توحید کا پیغام دیا اور ۱۳؍ تیرہ سال تک مکہ معظمہ میں

رونق افروز رہ کر لوگوں کو کفر کی ظلمت سے ہدایت کی روشنی کی طرف بلاتے رہے۔ مکی زندگی کے پورے ۵۳/ترپن سال میں آپ نے اپنی حیات کے ہر شعبہ میں اخلاقی محاسن کا مظاہرہ فرمایا بلکہ ۴۰/چالیس سے ۵۳/ترپن سال کے درمیان ۱۳/تیرہ سال کا عرصہ تو آپ نے کفّار مکہ کے ظلم وستم کی کلفت برداشت کرتے ہوئے گزارا۔ آپ پر کئے جانے والے ظلم وستم کا جواب دینا یا انتقام لینا تو ایک طرف رہا، آپ نے کبھی ان ظالموں کی کوئی شکایت تک نہیں کی اور پیکر صبر وتحمل بن کر مصائب برداشت کئے۔ جب ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچے تو آپ نے مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ مکہ معظّمہ آپ نے بحیثیت مظلوم چھوڑا تھا۔ آپ کے خلاف ظالموں نے ایسا پراگندہ ماحول قائم کردیا تھا کہ آپ کو رات کی تاریکی میں خفیہ طور پر نکلنا پڑا۔ پھر آپ مدینہ منورہ سکونت پذیر ہوئے اور ۱۰/دس سال کے بعد پردہ فرمایا۔ اس حساب سے آپ کی عمر شریف ۶۳ ترسٹھ سال ہوئی۔ جس میں ۵۳ ترپن سال مکی زندگی اور ۱۰/دس سال مدنی زندگی کے ہیں۔ آیت جہاد مدینہ منورہ میں ۲ھ میں نازل ہوئی۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف ۵۵/پچپن سال تھی۔ آیت جہاد کے نازل ہونے کے ۸/آٹھ سال بعد آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا۔ الحاصل جہاد وقتال کی مدت صرف ۸/آٹھ سال رہی ہے۔

اب قارئین کرام توجہ فرمائیں کہ جس ذات گرامی نے کل ۶۳ ترسٹھ سال کی ظاہری دنیوی زندگی پائی اور اس میں سے ۵۵/پچپن سال کا عرصہ اس طرح گزرا کہ آپ پر ظلم وستم کئے گئے، اذیتیں دی گئیں، تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچائی گئیں، لیکن آپ نے اُف تک نہ کیا، صبر وتحمل کرتے ہوئے دشمنوں کے آزار برداشت فرمائے، ظالموں کی بدگوئی کرنے کے بجائے اُنہیں دعائیں دیں، یہاں تک کہ اپنے متبعین کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہوئے ظلم وستم برداشت کرنے کی تعلیم وتربیت دی۔ جس ذات گرامی نے اپنی سماجی، خاندانی، ازدواجی، تجارتی اور روابطی زندگی میں کسی سے جھگڑا فساد تو کیا بلکہ اونچے سُر میں بات نہ کی، کسی کے ساتھ بدکلامی نہ کی، گالی کا جواب دعا سے

دیا، تواضع وانکسار کا جو پیکر جمیل رہا، حسن اخلاق کا جو نمونۂ عمل رہا، جو سراپا محبت وہمدردی کا مخزن رہا، جس کے اخلاق کی پاکیزگی کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا، عفو وکرم میں جو بے مثل ومثال رہا، بُردباری میں جو یگانۂ عالم تھا اور ظلم وستم کو نیست ونابود کرنا جس کا وطیرہ، اس ذات گرامی نے اپنی ظاہری حیات کے ۵۵/پچپن سال، یعنی تقریباً (87.30%) اٹھاسی فیصد زندگی تک تلوار نہیں تھامی، اس ذات گرامی پر شمشیر زنی کا گھٹیا الزام عائد کرنا دیانت وانصاف کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

البتہ! آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دست اقدس میں تلوار تھامی اور جہاد وقتال فرمایا لیکن آپ نے صرف اور صرف دفع ضرر کے لئے تلوار تھامی۔ آپ نے شمشیر کا وار ظلم ڈھانے کے لئے نہیں بلکہ ظلم مٹانے کے لئے کیا۔ جس کا صحیح اندازہ آپ کی حیات طیبہ میں واقع ہونے والے غزوات کا بنظر عمیق مطالعہ کرنے سے ہوگا کہ آپ نے کن حالات میں جہاد فرمایا، کن لوگوں کے سامنے جہاد فرمایا، ظالم وجفا کش، قزاق اور ستم گر گروہ کے ظلم وتشدد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام کے لئے آپ نے جہاد کی آہنی دیوار قائم فرمادی اور مظلوم وبیکس لوگوں کی نصرت وحمایت کرکے عدل وانصاف کا ماحول قائم فرمادیا۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر شمشیر زنی کا جھوٹا الزام عائد کرنے والے متعصب عناصر تاریخ، سیر اور گزشتہ واقعات کی معلومات سے یک لخت انجان وبے خبر ہیں یا پھر عناداً وقصداً افترا پردازی سے کام لیتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں کہ جس ذات گرامی کی ظاہری حیات کا تقریباً ۸۸/فیصد حصہ گزر چکا ہو اور صرف ۱۲/فیصد ظاہری حیات کے ایام باقی رہے ہوں اور اس قلیل عرصہ میں جس ذات گرامی نے دنیا کی فلاح وبہبود کے لئے اقوال زرّین یعنی احادیث کا عظیم ذخیرہ، سرمایہ حیات ونجات کی حیثیت سے عطا فرمایا ہو۔ علاوہ ازیں اپنی عملی زندگی سے انسانیت، رحم دلی، اُخوت، صدق، عدل، انصاف، صداقت، احسان، خدمت، تواضع، انکساری، ترک طمع، قناعت، توکل، تقویٰ، پرہیزگاری، عبادت، ریاضت، رشد وہدایت، کرم وعنایت، جود وسخاوت وغیرہ بے شمار اخلاقی محاسن کی تعلیم وتربیت میں

مصروف ہو، اس ذات گرامی نے اگر کبھی اپنے مقدس ہاتھوں میں تلوار تھامی بھی ہے تو
ظلم کو فروغ دینے کے لئے نہیں بلکہ ظلم وستم کو نیست ونابود کرنے کے لئے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعلان نبوت کرنے کے بعد ۱۳؍تیرہ
سال تک مکہ معظّمہ میں قیام پذیر رہے اور جب کفّار مکہ ومشرکین عرب کی عداوت اور
تکالیف حد سے متجاوز ہوگئیں، تب آپ نے بحکم رب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں
سکونت اختیار فرمائی، لیکن مدینہ منورہ میں آپ کو عرب کے کفار، مشرکین اور یہود نے
ایذائیں اور تکلیفیں پہنچانے کی حسب استطاعت کوششیں کیں۔ مدینہ منورہ کی
سرزمین کو اپنے مقدس قدموں سے مشرف فرمانے کے وقت تک یعنی آپ کی ہجرت
کے وقت تک مدینہ منورہ میں یہودی کافی تعداد میں آباد تھے۔ تجارتی،
ثقافتی، اقتصادی، سماجی ودیگر اہم اُمور میں یہودیوں کا کافی اثر اور تسلط تھا۔ مالی اعتبار
سے بھی وہ اہل ثروت میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ معظّمہ کے کفار و مشرکین اور مدینہ
منورہ کے کفار اور یہود کے مابین تجارتی اور سماجی مراسم گہرے تھے۔ ان کے تعلقات
اتنے استوار تھے کہ ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ کے ساتھی ہوا کرتے تھے۔ مکہ معظّمہ
کے کفّار نے اپنے قاصدوں کے ذریعہ اپنے ہم خیال وہم پیالہ لوگوں کو حضور اقدس
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف اُکسانے اور اُبھارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔
لیکن مدینہ منورہ میں محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت توحید
ورسالت عام ہو چکی تھی۔ شمع عشق نبوت کے جاں نثار پروانوں کی تعداد میں دن بہ دن
اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شیدائی اور
فدائی یکے بعد دیگرے مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آتے جاتے تھے
اور مدینہ منورہ مرکز اسلام کی حیثیت سے قوی اور مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ ملک عرب کے
رؤسا اور قوم یہود کے علما میں اہمیت رکھنے والے ذی اثر اور شجاع لوگ اسلام میں
داخل ہو کر اسلام کی طاقت بڑھا رہے تھے۔ اسلام عروج اور ترقی پر آ رہا تھا۔

مکہ کے مشرکین خصوصاً ابوجہل، ابولہب، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ، حارث

بن عامر، ابوسفیان (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) وغیرہ نے مدینہ کے مسلمانوں
پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے، دست درازیاں کیں، بغض وحسد اور تشدد کی حدیں
پار کر گئے۔ لیکن رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صبر وتحمل سے کام لیا اور اپنے
جاں نثار صحابہ کو بھی ہمیشہ صبر کی تعلیم وتلقین فرمائی۔ مسلمانوں کے صبر وتحمل کو کفار ویہود
نے کمزوری میں شمار کیا اور ان کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی
کہ مسلمان روز مرّہ کفار ومشرکین کے ہاتھ اور زبان سے ایذا وآزار پاتے۔ لیکن
رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت نے صحابۂ کرام میں اخلاق حسنہ کے
وہ محاسن پیدا کر دیئے تھے کہ کسی نے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جب
مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا ہونے لگی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم نازل فرمایا:

" اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا " [الحج:۳۹]

ترجمہ: ”پروانگی (اجازت) عطا ہوئی انھیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا
پر کہ ان پر ظلم ہوا۔“ (کنز الایمان)

اس آیت کی شان نزول میں وارد ہے کہ ”کفار مکہ اصحاب رسول اللہ صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو روز مرّہ ہاتھ اور زبان سے شدید ایذائیں دیتے اور آزار پہنچاتے
رہتے تھے اور صحابہ حضور کے پاس اس حال میں پہنچتے تھے کہ کسی کا سر پھٹا ہے، کسی کا
ہاتھ ٹوٹا ہے، کسی کا پاؤں بندھا ہوا ہے۔ روز مرہ اس قسم کی شکایتیں بارگاہ اقدس میں
پہنچتی تھیں اور اصحاب کرام کفار کے مظالم کی حضور کے دربار میں فریادیں کرتے۔
حضور یہ فرما دیا کرتے کہ صبر کرو، مجھے ابھی جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ جب حضور نے
مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی، تب یہ آیت نازل ہوئی اور یہ وہ پہلی آیت ہے جس میں کفار
کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔“ [تفسیر خزائن العرفان، ص:۶۰۵]

ابتدائے اسلام میں جہاد کا حکم نہیں تھا لیکن بعد میں پہلا حکم ۲ ھ میں نازل
ہوا۔ اس سے پہلے قتال کی اجازت نہ تھی۔ جب حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے اور صحابہ کرام کی جمعیت ہوگئی، تو نصرت

الٰہی قائم ہوئی اور اعداء دین کے ساتھ جہاد وقتال کا سلسلہ مستقل طور پر شروع ہوگیا۔

اہم نکتہ:

ایک ضروری امر کی طرف بھی توجہ درکار ہے کہ سپاہ گری کرنے والا بچپن سے ہی اس پیشہ کی طرف ملتفت ہوتا ہے یا تو اس کا خاندانی اور آبائی پیشہ سپاہ گری ہوتا ہے اور اپنے آباء واجداد کا پیشہ اپنا کر سپاہ گری کرتا ہے۔ اس کی سپاہ گری ایام جوانی میں شباب پر ہوتی ہے۔ عموماً ۱۸/اٹھارہ سے ۴۵/پینتالیس برس کی عمر تک وہ سپاہ گری کے فن میں عروج پر ہوتا ہے اور اس عمر کے بعد اس کے فن میں زوال شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ عمر کا تقاضا اور جسمانی ضعف کا مقتضا یہی ہے کہ اب آرام واستراحت کرنے کے دن ہیں۔ تقریباً ۵۰/پچاس یا ۵۵/پچپن سال کی عمر کے بعد اس کو اپنے فن سے فطری طور پر رغبت کم ہوجاتی ہے۔ البتہ بحالت مجبوری کبھی حالات کے تیور للکار دیں تو وہ فن شجاعت دکھانے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا جائزہ لینے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اپنی ظاہری حیات کے پچپن سال تک آلات جنگ کی طرف قطعاً التفات نہیں فرمایا۔ ۲ھ میں سورۂ حج کی آیت کے ذریعہ آپ کو جہاد کا اللہ نے حکم فرمایا۔ تب آپ کی عمر شریف ۵۵/پچپن سال تھی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جس عمر میں عام طور سے آدمی ہاتھ میں تلوار لینے سے اکتاتا ہے، استعفیٰ دے کر یا رٹائر (Retire) ہوکر اپنے فن کی انتہا کرتا ہے۔ اس عمر میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہاتھ میں تلوار تھامنے کی ابتداء فرمائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حالات کے پیش نظر بہت ہی نازک وقت میں اپنے دست اقدس میں تلوار تھامی۔ حالانکہ آپ نے ماضی میں کبھی بھی تلوار نہیں اٹھائی اور نہ ہی آپ کو اس کا تجربہ وملکہ تھا۔

اسلام کی درخشاں تاریخ کے زرّیں اوراق شاہد عدل ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جن غزوات میں شرکت فرمائی یا اپنے جاں نثاروں کو معرکۂ جہاد

میں (سریہ) ارسال فرمایا، وہ تمام غزوات اور سرایا مظلومین کے دفاع اور ظالمین کے استیصال کے لئے ہی تھے۔ تمام غزوات تَوَکُّلُ عَلَیَ اللّٰہِ اور نَصْرُمِّنَ اللّٰہِ کی بنیاد پر ہی تھے۔ کیونکہ ان تمام غزوات میں کہیں بھی مساوات اور برابری کا مقابلہ نہ تھا۔ کفّار ومشرکین بھاری تعداد میں بھرپور جنگی ہتھیاروں کے ساتھ ہوتے تھے اور اسلامی لشکر بہت ہی قلیل تعداد میں اور بے سروسامان ہوتا تھا۔ کفار کے لشکر میں بھاری ڈیل ڈول کے، شکم سیر، ہتھیاروں سے لیس اور گھوڑوں پر سوار لڑنے والے ہوتے تھے۔ جب کہ اسلامی لشکر کے مجاہدین نحیف وناتواں کمزور جسم والے، بھوکے پیاسے، بغیر ہتھیاروں کے پیدل لڑنے والے ہوتے تھے۔ مثلاً:

☆ جنگ بدر (۲ھ) میں دونوں لشکر کا موازنہ حسب ذیل ہے:

لشکر اسلام	لشکر کفار	تفصیل
۳۱۳	۹۵۰	افراد
۷۰	۷۰۰	اونٹ
۳	۱۰۰	گھوڑے
۸	۹۵۰	تلواریں
۶	۹۵۰	زرہیں

نوٹ:

۱- کفار کے لشکر میں کھانے پینے کا سامان بڑی کثرت سے تھا۔ روزانہ ۱۱/گیارہ اونٹ ذبح کر کے کھاتے تھے۔ جب کہ اسلامی لشکر میں زادِ راہ کی یہ حالت تھی کہ کسی کے پاس ۱/ایک صاع تو کسی کے پاس ۲/دو صاع کھجوریں تھیں۔

۲- کفار کے لشکر میں عیش وعشرت کا سامان بھی کافی تعداد میں تھا یہاں تک کہ کسی پانی کے کنارے پڑاؤ کرتے، تو خیمے نصب کرتے اور ان کے ہمراہ گانے والی طوائف اور آلات طرب تھے۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس ایک خیمہ تک نہیں تھا۔ صحابہ کرام نے کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں سے ایک عریش

(جھونپڑی) تیار کر کے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس میں ٹھہرایا۔ آج اس عریش کی جگہ مسجد بنی ہوئی ہے۔[مدارج النبوۃ، اُردو، ۲/ ۱۴۷]

کفار کے لشکر سے ۷۰/ستر آدمی قتل ہوئے جن میں ابو جہل تھا۔ علاوہ ازیں لشکر کفار سے ۷۰/ستر آدمی قید ہوئے۔ جن میں حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ جو بعد میں ایمان لے آئے۔ اسلامی لشکر سے چودہ حضرات شہید ہوئے تھے۔

جنگ احد ۳ھ کی مختصر کیفیت:

۱- قوم قریش نے دارالندوہ میں میٹنگ کر کے ۲۰/بیس ہزار مثقال سونا لشکر کی تیاری کے لئے جمع کیا اور مکہ سے ۴/چار شخصوں کو اطراف میں گشت کرنے پر مقرر کئے تاکہ وہ لوگوں کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لئے اُبھاریں اور کافی تعداد میں لشکر جمع ہو۔

۲- مکہ معظّمہ سے لشکر کفار ابوسفیان کی سرداری میں روانہ ہوا۔ لشکر میں ۳/تین ہزار آدمی تھے۔ جن میں سے ۷۰۰/سات سو زرہ پوش، ۲۰۰/دو سو گھوڑے اور ۳۰۰۰/تین ہزار اونٹ تھے۔ لشکر میں تیر اندازی میں مہارت رکھنے والے لوگ بکثرت تھے۔

۳- کافی تعداد میں تلواریں، نیزے، خنجر، برچھیاں، تیر، کمان وغیرہ آلات حرب تھے۔

۴- گانے بجانے والی عورتیں اور آلات طرب، نیز کھانے پینے و دیگر آسائش کے سامان سے لشکر کو آراستہ کر کے، مدینہ منورہ کو تاخت و تاراج کرنے کے فاسد ارادے سے مکہ سے لشکر کو روانہ کیا گیا۔

۵- ابوسفیان نے مدینہ منورہ سے ۵/پانچ میل کے فاصلے پر مقام ذوالحلیفہ میں لشکر کو ٹھہرایا اور وہاں ۳/تین دن قیام کیا۔

۶- لشکر کفار کے قیام کے دوران مشرکوں نے اپنے اونٹ اور گھوڑے کو مسلمانوں کے کھیت میں چھوڑ دیے۔ چنانچہ اونٹوں اور گھوڑوں نے کھیتیوں

کو روند کر پامال کر دیا اور تمام سبزہ چر گئے اور حالت یہ ہوئی کہ اطراف مدینہ کے تمام کھیتوں میں سے کسی بھی کھیت میں سبزہ باقی نہ رہا۔

۷- لشکر کفار حملہ کر کے اہل مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے آپہنچے، اس سے پہلے ہی ان کو روکنے اور ان کا مقابلہ کر کے ان کے شر و ضرر سے اہل مدینہ کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۱۰۰۰/ایک ہزار مجاہدین کو لے کر ان سے بمقام اُحد مقابل ہوئے۔ لشکر اسلام میں ایک بھی گھوڑا نہ تھا۔ صرف ایک سو مجاہدین زرہ پوش تھے۔ چند حضرات کے پاس تیر اور کمان تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور نیزے تھے۔ یعنی لشکر کفار کے مقابل اسلامی لشکر تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے بہت ہی قلیل اور بے سر و سامان تھا۔

(۸) اسلامی لشکر سے ۷۰/ستر حضرات شہید ہوئے جن میں حضرت حمزہ بن عبد المطلب، حضرت حنظلہ غسیل الملٰئکہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت سعد بن ربیع، حضرت نعمان بن مالک وغیرہ تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(۹) کفار کے لشکر سے ۳۰/تیس آدمی جہنم رسید ہوئے اور ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ لہذا ابوسفیان لشکر کو لے کر روانہ ہو گئے اور جاتے وقت یہ دھمکی دی کہ اب ہماری اور تمہاری ملاقات آئندہ سال بدر میں ہوگی۔[مدارج النبوۃ اردو-۱/ ۱۹۱ تا ۲۲۱ ملخصا)

جنگ احزاب (غزوۂ خندق) ۵ھ

۱- خیبر سے قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں کا وفد مکہ معظّمہ جا کر ابوسفیان سے ملا اور طے پایا کہ ہم سب متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ ابوسفیان مکہ سے قریش کا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ سوار تھے۔

۲- خیبر کے یہودیوں نے اپنے ساتھ قبیلہ قیس کے لوگوں کو برانگیختہ کر کے

لڑنے کے لئے ساتھ لیا۔

۳۔ عرب کے دیگر قبائل اسلم، اشجع، ابومرّہ، کنانہ، فرازہ اور غطفان سے بھی بڑی تعداد میں لوگ لشکر قریش میں آکے شامل ہوگئے۔ ان سب کی مجموعی تعداد دس ہزار ہوگئی۔

۴۔ اسلامی لشکر کی تعداد تین ہزار تھی اور اسلامی لشکر میں صرف ۳۶ر چھتیس گھوڑے تھے۔

۵۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے مشرق کی جانب کوہ سلع کے قریب کھلے میدان میں خندقیں کھودوائیں تاکہ ظالم دشمن شہر کے باشندوں کو اذیتیں نہ پہنچا سکیں۔

۶۔ لشکر کفار نے چوبیس دنوں تک مدینہ کا محاصرہ کیا اور اہل شہر کو تنگ کیا۔

۷۔ اس غزوہ میں قتال واقع ہوا۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین کی مدد کے لئے ملائکہ کا لشکر بھیجا اور آسمان سے ایسی تیز آندھی چلی کہ مشرکین کے لشکر کے تمام خیمے منہدم ہوگئے، کھانا پکانے کے لئے دیگیں جو چولھوں پر چڑھی ہوئی تھیں، وہ زمین پر اُلٹ گئیں۔ تیز ہوا سے سنگریزوں نے اُڑ اُڑ کر ان کو شدید چوٹیں لگائیں اور لشکر کفار کے ہر گوشہ سے فرشتوں کی تکبیروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لہٰذا کفار خوف زدہ ہوکر اپنا مال اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ [مدارج النبوۃ - اُردو-۲/ ۲۸۹ تا ۳۰۱ ملخصا]

جنگ موتہ ۸ھ:

تین ہزار کے اسلامی لشکر کے سامنے ہرقل بادشاہ کی نصرانی فوج اور قبائل عرب کے مشرکین متحد ہوکر مقابل ہوئے تھے اور ان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ [مدارج النبوۃ، ۲/۴۵۳ تا ۴۵۷]

۱۔ موتہ ایک موضع کا نام ہے جو شہر بلقاء کے قریب بیت المقدس سے تقریبا ایک سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۲۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قاصد حضرت حارث بن عمیر

ازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ اپنا خط حاکم بصریٰ کے نام بھیجا تھا۔ راہ میں موتہ کے مقام پر موتہ کے حاکم شرحبیل بن عمر غسانی نے حضرت حارث کو بلا کسی قصور کے اور قاصد ہونے کے باوجود شہید کر دیا۔ حالانکہ بین الاقوامی قانون کے مطابق کسی بھی قاصد کو قتل کرنا ممنوع اور جرم تھا، دنیا کے ہر بادشاہ پر قاصدوں کی امان واجبی امر تھا۔

۳۔ حضرت زید بن حارثہ کو اسلامی لشکر کا سردار مقرر فرما کر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے موتہ کے حاکم شرحبیل پر لشکر کشی کا حکم فرمایا۔

۴۔ اسلامی لشکر کی تعداد صرف تین ہزار تھی جبکہ عیسائیوں کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ تھی۔

۵۔ اسلامی لشکر کے تین سردار (۱) حضرت زید بن حارثہ (۲) حضرت جعفر بن ابی طالب اور (۳) حضرت عبد اللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ چوتھے سردار کی حیثیت سے حضرت خالد بن ولید نے جب علم تھاما، تب مشرکین نے اسلامی لشکر کے مجاہدوں کو اپنے نرغہ میں لے لیا تھا اور قریب تھا کہ اسلامی لشکر کو ہزیمت سے دوچار ہوجائے۔

۶۔ حضرت خالد نے اسلامی لشکر کے مجاہدوں میں نیا جوش پیدا کر کے پلٹ کر یکبارگی حملہ کیا۔ مشرکین کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

۷۔ اس جنگ میں حضرت خالد بن ولید کی شجاعت و دلیری کو نوازتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو ''**سیف اللہ**'' یعنی ''اللہ کی تلوار'' کے معزز خطاب سے نوازا۔

مذکورہ جنگوں کے علاوہ دیگر جنگوں میں بھی اسی قسم کے تفاوت پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم نے صرف چار مشہور ومعروف جنگوں کا سرسری خاکہ پیش کیا ہے۔ الحاصل رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ضرورتاً اور دفع ضرر کے لئے ہی قتال فرمایا ہے۔ اس قتال سے ظالم کے ظلم وستم کا استیصال فرما کر امن وامان قائم کرنا ہی مقصود تھا۔ کفر وشرک، ظلم وستم، جور وجفا، ناانصافی وزور جتائی اور انسانیت کش جرائم کا

پردہ چاک کرنے کے مستحسن عزم سے ہی آپ نے شمشیر دست اقدس میں تھامی۔ کسی پرزور یا دباؤ ڈالنے کے لئے آپ نے ہرگز تلوار نہیں اٹھائی۔

اسلام تلوار سے نہیں بلکہ حقانیت کی بنا پر ہی پھیلا ہے۔ کیونکہ اگر اسلام تلوار ہی کے بل بوتے پر پھیلا ہوتا تو اسلام کی جڑیں تا دیر مستحکم نہ رہتیں، بلکہ قلیل عرصہ میں ہی متزلزل ہو کر اکھڑ گئی ہوتیں۔ لیکن پندرہ سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اسلام اپنی شان و شوکت سے قائم و دائم رہتے ہوئے روز افزوں پھیل رہا ہے۔

اسلام تلوار سے پھیلا ہے، یہ الزام عائد کرنے والے متعصب عناصر کو دنداں شکن جواب دینے کے لئے ذیل میں کچھ اہم نکات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

اب ہم تاریخ کے حوالے سے چند ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ مخالفین کو بھی ناچار و مجبور ہو کر اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ محبوب رب العالمین، رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے ظاہری دنیوی سال کو باعتبار عیسوی تقابل کر کے پھر اس کے ضمن میں کچھ گفتگو کی جائے گی۔ حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ۶۳ سال کی عمر شریف اس دنیا میں بسر فرمائی۔ آپ کی ولادت باسعادت سے لے کر دنیا سے پردہ فرمانے تک ترسٹھ سال کا جو عرصہ ہے، اس عرصہ کے درمیان وقوع میں آئے ہوئے اہم واقعات، حالات، حوادث، امور، وغیرہ کو عیسوی سن کے اعتبار سے ٹٹولیں۔

حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات ظاہری:

پیدائش	دنیا سے پردہ فرمانا
۱۲ ربیع الاوّل شریف	۱۲ ربیع الاوّل شریف
ہجرت کے ۵۳ سال قبل ۵۷۱ء	۱۱ھ ۶۳۲ء

نوٹ: قمری سال کے اعتبار سے آپ کی عمر شریف ۶۳ سال اور شمسی سال کے اعتبار سے آپ کی عمر شریف ۶۱ سال ہوتی ہے۔

اب ہم شمسی سال کے اعتبار سے آپ کی حیات طیبہ دیکھیں:

۱- ولادت ۵۷۱ء ۵۳ سال قبل ہجرت
۲- اعلان نبوت ۶۱۰ء جب آپ کی عمر شریف قمری اعتبار سے چالیس سال تھی۔
۳- ہجرت ۶۲۲ء جب آپ کی عمر شریف قمری اعتبار سے ترپن سال تھی۔
۴- جہاد کا حکم ۶۲۳ء جب آپ کی عمر شریف قمری اعتبار سے ۵۵ سال تھی۔ (۲ھ)
۵- رحلت ۶۳۲ء جب آپ کی عمر شریف قمری اعتبار سے ۶۳ سال تھی۔ (۱۱ھ)

مذکورہ بالا تفصیل کو دو حصوں میں تقسیم کریں:

حصہ اوّل: ولادت ۵۷۱ء سے جہاد کا حکم نازل ہونا ۶۲۳ء یعنی ۲ھ تک
حصہ دوم: جہاد کا حکم ۶۲۳ء (۲ھ) سے رحلت ۶۳۲ء یعنی ۱۱ھ تک

نتیجہ: حصہ اوّل کی مدت: ۵۳ سال
حصہ دوم کی مدت: ۸ سال
۶۱ سال

یعنی قرآن مجید کی سورۂ حج کی آیت کریمہ "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا" ۶۲۳ء میں نازل ہوئی اور ۶۲۳ء (۲ھ) سے جہاد کا آغاز ہوا۔ ۶۲۳ء سے پہلے اسلامی تاریخ میں ایک بھی جنگ نہیں ہوئی۔ جس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جو یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کو تلوار سے پھیلانے کا آغاز ۶۲۳ھ سے ہوا۔ تو اگر اسلام تلوار ہی سے پھیلا ہوتا تو ۶۲۳ء سے پہلے اسلام کی نشر و اشاعت نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن ہم تاریخ کے شواہد و دلائل کی روشنی میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ۶۲۳ء سے پہلے ہی اسلام اپنی حقانیت کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں نقش ہو گیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاقی محاسن اور خصائص کبریٰ نے دنیا کو متاثر کر دیا تھا۔ آپ کے نور نبوت نے ظلمت کدہ میں بھٹکنے والوں کو ہدایت کی روشنی عطا فرما دی تھی۔

اب ہم قارئین کرام کی ضیافت طبع کی خاطر سرایا اور غزوہ کا فرق اور اس کی تفصیل پیش کر رہے ہیں۔

غزوہ اور سریہ کی تعریف:

غزوہ کے متعلق ارباب سیر کی اصطلاح یہ ہے کہ ہر وہ لشکر جس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنفس نفیس خود تشریف فرما ہوں، اسے غزوہ کہتے ہیں اور جس لشکر میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود موجود نہ ہوں بلکہ کوئی لشکر روانہ فرمایا ہوا سے بعثۃ یا سریہ کہتے ہیں۔ صحابہ کرام کی مقدس جماعت نے اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عشق میں سرشار ہو کر ایسی شجاعت و جاں نثاری کا مظاہرہ کیا کہ کفر و شرک کے ایوان منہدم ہو گئے اور اسلام کی جڑیں اور بنیادیں ایسی مستحکم ہو گئیں کہ قلیل عرصے میں اسلام کا پیغام حق ملک عرب کی سرحدیں عبور کر کے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا۔ ادیان باطلہ کے قلعے منہدم ہو کر ھباءً منثوراً کی طرح اُڑ گئے اور اُفق عالم پر اسلام کا پرچم حق لہرانے لگا۔

غزوات اور سرایا کی تفصیل:

☆ غزوات کی تعداد ۲۷/ستائیس ہے۔ ان میں سے صرف ۹/نو غزوات میں ہی قتال واقع ہوا۔ ۱۸/اٹھارہ غزوات میں قتال (جنگ) واقع نہ ہوا۔

جن ۹/نو غزوات میں قتال وقوع میں آیا وہ حسب ذیل ہیں:

۱- جنگ بدر ۲ھ — ۲- جنگ احد ۳ھ
۳- جنگ مریسیع (بنی المصطلق) ۵ھ — ۴- جنگ احزاب (جنگ خندق) ۵ھ
۵- جنگ بنو قریظہ ۵ھ — ۶- جنگ خیبر ۷ھ
۷- جنگ فتح مکہ ۸ھ — ۸- جنگ حنین (ہوازن) ۸ھ
۹- جنگ طائف ۸ھ

☆ جن ۱۸/اٹھارہ غزوات میں قتال واقع نہیں ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

نمبر	غزوہ	نمبر	غزوہ
(۱)	غزوۂ ابواء ۲ھ	(۱۰)	غزوۂ بنی نضیر ۴ھ
(۲)	غزوۂ بواط ۲ھ	(۱۱)	غزوۂ بدر صغریٰ ۴ھ
(۳)	غزوۂ عشیرہ ۲ھ	(۱۲)	غزوۂ دومۃ الجندل ۵ھ
(۴)	غزوۂ بدر اولیٰ ۲ھ	(۱۳)	غزوۂ ذات الرقاع ۶ھ
(۵)	غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ ۲ھ	(۱۴)	غزوۂ ذی قرد ۶ھ
(۶)	غزوۂ سویق ۲ھ	(۱۵)	غزوۂ بنولحیان ۶ھ
(۷)	غزوۂ قینقاع ۷ھ	(۱۶)	غزوۂ حدیبیہ ۶ھ
(۸)	غزوۂ غطفان ۳ھ	(۱۷)	غزوۂ وادی القریٰ ۷ھ
(۹)	غزوۂ نجران ۳ھ	(۱۸)	غزوۂ جیش العسرت (تبوک) ۹ھ

☆ سرایا کی تعداد ۴۷/سینتالیس اور بعض ۵۶/چھپن شمار کرتے ہیں۔

ان میں سے کچھ سرایا کے نام ذیل میں درج ہیں:

نمبر	سریہ	نمبر	سریہ
(۱)	سریہ دار ارقم ۲ھ	(۲)	سریہ سعد بن ابی وقاص بجانب وادی خرار ۲ھ
(۳)	سریہ عبداللہ بن جحش بمقام بطن نخلہ ۲ھ	(۴)	سریہ عمیر بن عدی ۲ھ
(۵)	سریہ سالم بن عمیر ۲ھ	(۶)	سریہ قردہ ۳ھ
(۷)	سریہ رجیع ۳ھ	(۸)	سریہ ابوسلمہ مخزومی بمقام موضع قطن ۳ھ

(۹) سریہ عبداللہ بن انیس بمقام بطن عریہ ۳ھ	(۱۰) سریہ بیر معونہ ۴ھ
(۱۱) سریہ ابوعبیدہ بن الجراح بجانب سیف البحر ۵ھ	(۱۲) سریہ محمد بن مسلمہ بجانب بنی کلاب ۶ھ
(۱۳) سریہ محمد بن مسلمہ بجانب بنی ثعلبہ ۶ھ	(۱۴) سریہ محمد بن مسلمہ بمقام نجد ۶ھ
(۱۵) سریہ عکاشہ بن محصن بجانب بنی اسد ۶ھ	(۱۶) سریہ زید بن حارثہ بمقام وادی القریٰ ۶ھ
(۱۷) سریہ زید بن حارثہ بمقام موضع جموم ۶ھ	(۱۸) سریہ زید بن حارثہ بمقام موضع عیص ۶ھ
(۱۹) سریہ زید بن حارثہ بجانب اُمّ قرفہ ۶ھ	(۲۰) سریہ زید بن حارثہ بسوئے چشمۂ طرف ۶ھ
(۲۱) سریہ زید بن حارثہ بجانب حِسمٰی ۶ھ	(۲۲) سریہ زید بن حارثہ بمقام وادی القریٰ (باردوم) ۶ھ
(۲۳) سریہ عبدالرحمٰن بن عوف بجانب بنی کعب ۶ھ	(۲۴) سریہ علی مرتضٰی بجانب فِدک ۶ھ
(۲۵) سریہ عبداللہ بن رواحہ بمقام خیبر ۶ھ	(۲۶) سریہ ابوبکر صدیق ۷ھ
(۲۷) سریہ عمر بن الخطاب ۷ھ	(۲۸) سریہ بشر بن سعد انصاری ۷ھ
(۲۹) سریہ غالب بن عبداللہ لیثی بجانب میفعہ ۷ھ	(۳۰) سریہ غالب بن عبداللہ جانب بنی الموح ۷ھ

(۳۱) سریہ غالب لیثی بسوئے کدید ۸ھ	(۳۲) سریہ فدک ۸ھ
(۳۳) سریہ موتہ ۸ھ	(۳۴) سریہ عمرو بن العاص بمقام ذات السَّلاسل ۸ھ
(۳۵) سریہ ابوعبیدہ بن الجراح بمقام الخبط ۸ھ	(۳۶) سریہ ابوعامر اشعری، جنگ اوطاس ۸ھ
(۳۷) سریہ حضرت علی مرتضٰی بجانب قبیلہ بنی طے ۹ھ	(۳۸) سریہ خالد بن ولید بجانب دومۃ الجندل ۹ھ
(۳۹) سریہ خالد بن ولید بجانب قبیلہ بنی حارث بن کعب ۱۰ھ	(۴۰) سریہ جریر بن عبداللہ بجلی بجانب ذی الکلاع بن کور۔ ملک طائف ۱۰ھ
(۴۱) سریہ اُسامہ بن زید بجانب بحر روم ۱۱ھ	

[مدارج النبوۃ، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اُردو ترجمہ، جلد دوم]

حکم جہاد سے پہلے قبول اسلام:

ذیل میں ہم چند ایسے واقعات اور امور کی طرف مختصراً اشارہ کرتے ہیں جن پر خوض وفکر کرنے سے واضح طور پر یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ اسلام ہرگز تلوار کے بل بوتے پر نہیں پھیلا بلکہ اسلام اپنی صداقت اور حقانیت کی بنا پر عالم گیر پیمانہ پر پھیلا ہے۔

☆ ۵۸۲ء: جب کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف صرف ۱۲/ بارہ سال تھی۔ یعنی کہ آیت قتال کے نازل ہونے کے ۴۳ سال پہلے، آپ نے اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ ملک شام کا سفر فرمایا۔ جب آپ کا قافلہ بصریٰ پہنچا، تو بصریٰ کے قریب ایک دیہات میں ایک صومعہ تھا۔ اس

صومعہ میں بحیرہ نام کا ایک راہب رہتا تھا، جو توریت، انجیل اور دیگر آسمانی کتابوں کا زبردست عالم تھا۔ اس کا شمار یہود اور نصاریٰ کے احبار میں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی عرب سے آنے والا قافلہ اس کے صومعہ کے قریب آکر ٹھہرتا، تو بحیرہ راہب اپنے صومعہ سے باہر آکر قافلے کے ہر شخص کو گھور گھور کر دیکھتا۔ گویا اُسے کسی کی تلاش تھی لیکن ہر مرتبہ وہ مایوس اور ناکام ہوتا اور اپنے صومعہ میں واپس لوٹ جاتا۔ ۵۸۲ء میں حضور اقدس، جانِ عالم ورحمت عالم وباعث تخلیق عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قریش کے قافلے کے ہمراہ اس صومعہ کے قریب آکر ٹھہرے۔ بحیرہ راہب نے اپنے صومعہ سے باہر آکر جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ بادل آپ پر سایہ کئے ہوئے ہے، ہر شجر وحجر آپ کو سلام کررہا ہے تو اس نے یقین کرلیا کہ مجھ کو جس کی تلاش تھی وہ ذات گرامی یہی ہے۔ بحیرہ راہب نے پورے قافلے کی دعوت کی۔ جب حضور اقدس بحیرہ راہب کے پاس تشریف لے گئے تو بحیرہ راہب نے آپ سے چند سوالات کیے اور تسلی بخش جوابات پائے۔ پھر اس نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شانۂ اقدس پر اس مہر نبوت کو بھی دیکھا، جس کا ذکر اس نے آسمانی کتابوں میں پڑھا تھا۔ بحیرہ نے مہر نبوت کو بوسہ دیا اور آپ پر ایمان لایا۔ بحیرہ ان میں سے ایک ہے جو حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر آپ کے اظہار نبوت سے پہلے ایمان لائے ہیں۔ [مدارج النبوۃ، ۲/۴۱]

☆ ۵۸۲ء میں بحیرہ راہب کا مذکورہ واقعہ جب پیش آیا، تب ملک شام کا ایک شخص باسیل بن منجائیل بھی بحیرہ راہب کے صومعہ میں موجود تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مذکورہ معاملہ دیکھا تھا پھر وہ شخص اپنے گھر چلا گیا۔ باسیل بن منجائیل کو پختہ یقین تھا کہ بحیرہ راہب حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ لہٰذا وہ بھی اسی وقت سے گرویدہ ہوگیا۔ پھر وہ شخص قسطنطنیہ چلا گیا۔ پھر وہاں سے قیساریہ جس کا پرانا نام Strato's Tower ہے وہاں چلا گیا۔ جب

باسیل بن منجائیل قیساریہ میں تھا، تب اس نے سنا کہ مکہ معظمہ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا ہے، تو وہ آپ پر ایمان لایا۔ باسیل بن منجائیل ملک شام کے شہر قلعہ صور کے حاکم ارمویل بن قسطہ کا چچازاد بھائی تھا۔ [فتوح الشام، للواقدی اُردو، ص ۴۱۵]

نوٹ: باسیل بن منجائیل نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ ۶۴۰ء (۱۹ھ) میں ملک شام میں قلعہ صور کی جنگ کے موقع پر انھوں نے اپنا ایمان ظاہر کیا اور اسلامی لشکر کی عظیم خدمات انجام دیں۔ جس کا تفصیلی بیان فقیر کی کتاب ''سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردان عرب'' میں فتوحات ملک شام کے ضمن میں ''فتح قلعہ صور'' کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ۶۱۰ء سے پہلے حضرت حبیب نجار اور اصحاب قریہ وغیرہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف جمیلہ اگلی آسمانی کتابوں میں پڑھ کر اعلان نبوت کے پہلے ایمان لائے تھے۔ [مدارج النبوۃ، ۲/۴۱]

☆ ۶۱۳ء یعنی اعلان نبوت کے پانچویں سال مکہ معظمہ سے کچھ مسلمان کفار مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ کیونکہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کا رہنا مشرکوں نے دوبھر کردیا تھا۔ لہٰذا رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اس ہجرت کو ہجرت اوّل کہتے ہیں۔ ہجرت کرنے والوں میں حضرت عثمان بن عفان، حضرت جعفر بن ابی طالب، وغیرہ جلیل القدر صحابۂ کرام تھے۔ جب مشرکین مکہ کو پتہ چلا کہ مسلمان ہجرت کرکے حبشہ گئے ہوئے ہیں تو انھوں نے ایک جماعت کو بحیثیت وفد بہت سارے ہدایا وتحائف کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا ہے۔ اس وقت کے نجاشی کا نام اَصحَمَہ تھا۔ کفار مکہ کے وفد نے نجاشی بادشاہ سے مسلمانوں کی

شکایتیں کیں اور زہر اُگل اُگل کر بادشاہ کے کان بھرنے کی بھرپور کوشش کی اور یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کو حبشہ سے نکال دیں۔ بادشاہ نجاشی اصحمہ نے کہا کہ مسلمانوں نے میرے ملک میں پناہ لی ہے لہذا میں جب تک ان سے روبرو بات چیت نہ کرلوں، ایسا کوئی حکم صادر نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مسلمان شاہی دربار میں طلب کئے گئے۔ بادشاہ نے مسلمانوں سے دین اسلام کے تعلق سے کچھ سوالات کئے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی احکام کی ایسی نفیس ترجمانی کی کہ بادشاہ کے دل پر رقت طاری ہوگئی۔ پھر نجاشی بادشاہ نے کہا کہ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہوا ہے، اس میں سے کچھ تلاوت کرو۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۂ مریم تلاوت کی۔ اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کو سن کر نجاشی بادشاہ اور اس کے اردگرد پادریوں کا جو گروہ تھا وہ تمام رونے لگے۔ تمام نے یک زبان کہا کہ ''خدا کی قسم! یہ کلام اور وہ کلام جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوا تھا، دونوں کلام ایک ہی مشکوٰۃ سے نکلے ہیں۔''

پھر نجاشی نے کہا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ وہ ذات گرامی ہے جن کی بشارت حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی ہے۔'' اس کے بعد نجاشی نے قریش مکہ کے تحفوں کو لوٹا دیا اور ان کو ذلیل ورسوا کرکے اپنے دربار سے نکال دیا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کا وفد خائب وخاسر ہوکر ناکامیاب واپس لوٹا۔ [مدارج النبوۃ، اُردو۲/۶۵]

مذکورہ تمام واقعات ۶۲۳ء میں جہاد کی آیت نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔ بحیرہ راہب، باسیل بن منجائیل، حبیب نجار اور اصحاب قریہ کے واقعات تو اعلان نبوت ۶۱۰ء کے پہلے کے ہیں۔ ان کا اعلان نبوت سے پہلے ایمان لانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ توریت، انجیل، اور دیگر کتب سماوی میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف جمیلہ اور دین اسلام کی صداقت وحقانیت مذکور تھی، جس کو

پڑھ کر انھوں نے جان لیا تھا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کن کن اوصاف کی حامل ہوگی اور جب انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف حاصل کیا تو انھوں نے حضور کو عین ان تمام اوصاف کے مطابق پایا جو اگلی کتابوں میں مرقوم تھے۔ لہذا انھوں نے بلا کسی تامل وتاخیر کے ایمان لانے میں سبقت کی۔ انھوں نے حق پڑھا، حق سنا، حق دیکھا، حق کو جانا، حق کو مانا اور حق کو قبول کیا۔ کوئی تلوار لے کر ان کے سر پر نہ کھڑا تھا کہ بحالت اکراہ ومجبوری انھوں نے کلمہ کا اقرار کیا۔ تلوار سے ان کی کوئی گردن اڑا دینے والا نہ تھا کہ اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ شہادت کا اعتراف کیا، بلکہ انھوں نے صدق دل سے، اسلام اور رحمت عالم کی حقانیت وصداقت کو اظہر من الشمس ظاہر وباہر دیکھ کر ایمان واسلام قبول کیا تھا۔

اسی طرح نجاشی بادشاہ کے قصے میں تو یہ حقیقت اور واضح ہوگئی کہ اسلام کو تلوار سے نہیں پھیلایا گیا۔ البتہ تلوار سے اسلام کو ختم کرنے کی ضرور کوشش کی گئی۔ نبوت کے پانچویں سال مکہ سے حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کا ہجرت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دین حق اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مکہ معظّمہ کے کفار مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ کتب سیر وتواریخ میں بے شمار واقعات اس قسم کے پائے جاتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والوں کو اسلام سے منحرف کرنے کے لئے کفار ومشرکین نے مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے اور ان کا جینا مشکل کردیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان امن وامان کو ترس گئے اور امن وامان اور چین وسکون کی تلاش وجستجو میں ہی انھوں نے مکہ معظّمہ سے حبشہ تک کا طویل سفر کیا تھا۔ ایک بڑی جماعت کا مکہ سے حبشہ تک ہجرت کرنا ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اسلام کی صداقت کو ایسا جانا اور مانا کہ تحفظ ایمان کی خاطر اپنے مادر وطن کو خیر آباد کہہ دیا۔ مکہ معظّمہ میں ان پر جو ظلم وستم ڈھائے گئے وہ صرف اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ہی ڈھائے گئے تھے۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو اسلام قبول کرنے والی ایک بڑی جماعت مکہ سے ہرگز ہجرت نہ کرتی۔ اسلام

نے تلوار نہیں اُٹھائی تھی بلکہ اسلام پر تلوار اٹھائی گئی تھی۔ اسلام کو تلوار سے نہیں پھیلایا جا رہا تھا بلکہ اسلام کو تلوار سے مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کفار مکہ کی اسلام دشمنی تشدد وتعصب کی حدیں عبور کر چکی تھی۔ لہٰذا مکہ معظّمہ سے ہجرت کرنے والوں کو حبشہ میں بھی پریشان کرنے کے فاسد ارادے سے کفار مکہ کا وفد مسلمانوں کے تعاقب میں حبشہ پہنچ گیا۔ حبشہ کے بادشاہ کو اپنا موافق بنانے کے لئے قیمتی تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے یعنی اسلام کو ختم کرنے کے لئے اپنا تن، من اور دھن سب خرچ کرنے لگے۔ تحائف اور ہدایا کے ذریعے شاہی دربار میں رسائی حاصل ہونے پر انھوں نے پہلی فرمائش مسلمانوں کو حبشہ سے جلا وطن کرنے کی کی۔ لیکن انصاف پسند بادشاہ نے مسلمانوں کو گفت وشنید کا موقع دیا۔ جس وقت مسلمان نجاشی بادشاہ کے دربار میں طلب کئے گئے تھے اس وقت مسلمان مظلومیت کی حالت میں تھے۔ ان پر شر انگیزی کا الزام تھا۔ بحیثیت ملزم وہ شاہی دربار میں کھڑے تھے۔ ان کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ جلا وطنی کی تلوار ان کے سروں پر لٹک رہی تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلوار نہ تھی۔ لیکن " اَلْحَق یَعْلُوْ وَلَا یُعْلیٰ " یعنی حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا، کے مطابق شاہی دربار میں حق کی صداقت کا پرچم لہرایا۔ یہاں تک کہ نجاشی بادشاہ نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا اور دولت ایمان سے مشرف ہوا۔ تو کیا شاہ حبشہ نجاشی نے تلوار کے خوف سے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ تلوار مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ بادشاہ کے تصرف میں تھی۔ بادشاہ کے ادنیٰ اشارے پر مسلمانوں کی گردنیں دھڑ سے الگ ہو سکتی تھیں۔ بادشاہ مختار تھا، مجبور نہ تھا۔ اس نے تلوار کے خوف سے اعتراف حق نہیں کیا تھا بلکہ کلام اللہ کی حقانیت نے اس کے دل کو حق پذیر کیا تھا۔

شاہ حبشہ نجاشی ان سعادت مندوں میں سے ہیں جن کی نماز جنازہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پڑھی۔ ۹ھ میں شاہ حبشہ نے رحلت کی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس دن شاہ حبشہ نجاشی نے وفات پائی نبی کریم

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ آج تمہارے بھائی مرد صالح اصحمہ نے وفات پائی۔ اُٹھو اور ان کی نماز جنازہ پڑھو اور اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ اس کے بعد ہم حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم نے عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھی۔ [حوالہ: مدارج النبوۃ، اُردو ۲/۶۳۷]

اسلام اپنی حقانیت کی وجہ سے پھیلا:

☆ ۶۱۴ء یعنی نبوت کے اعلان کے چھٹے سال مکہ معظّمہ میں قوم قریش کے سب سے زیادہ غیرت مند، شہ زور، شجاع اور بہادر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے۔ ان کے ایمان لانے کے تین روز کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے۔ حضرت عمر کے ایمان لانے کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے۔ ان کو پتہ چلا کہ ان کی بہن فاطمہ اور ان کے بہنوئی حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی بہن کے پاس گئے اور خوب پیٹا یہاں تک کہ وہ لہولہان ہو گئیں۔ ان کی بہن نے کہا کہ تم چاہو تو مجھے قتل کر دو لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ تھوڑے وقفہ کے بعد حضرت عمر فاروق نے اپنی بہن سے فرمایا کہ میں جب گھر میں داخل ہوا تو تم اور سعید بن زید کچھ پڑھ رہے تھے۔ مجھے دکھاؤ کہ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن نے کہا کہ تم ناپاک اور مشرک ہو اور ہم ایسی کتاب پڑھ رہے تھے کہ جس کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ حضرت عمر نے غسل فرمایا اور سورۂ طٰہٰ کو پڑھنا شروع کیا اور آپ پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ نے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ [مواہب لدنیہ، از علامہ احمد بن محمد المصری القسطلانی]

حضرت عمر فاروق اعظم اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں مکہ معظّمہ کے

بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ان دونوں کواسلام قبول کرنے پرکس نےتلوار دکھا کر مجبور کیا تھا؟ بلکہ حضرت عمر تو تلوار لے کر اپنی بہن اور بہنوئی کو مارنے گئے تھے لیکن قرآن مجید کی حقانیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ جس تلوار سے اپنے بہن بہنوئی کو مارنے گئے تھے اسی تلوار سے اپنے کفر کو کاٹ ڈالا اور ایمان کی لازوال دولت سے مالا مال ہوگئے۔

☆ ۶۱۹ءیعنی اعلان نبوت کے گیارہویں سال ایام حج میں مدینہ طیبہ کے قریبی علاقہ خزرج کا ایک وفد مکہ معظّمہ آیا۔اس وقت رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بمقام منیٰ عقبہ کے قریب تشریف فرما تھے۔وہ وفد حاضر خدمت اقدس ہوکر اسلام سے مشرف ہوکر مدینہ منورہ لوٹا۔مدینہ منورہ میں ہر گھر اور ہر مجلس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر ہونے لگا۔سال آئندہ مدینہ طیبہ سے ایک دوسرا وفد حاضر بارگاہ رسالت ہوکر ایمان سے مشرف ہوا اور اس وفد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔اس وفد کی خواہش پر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجا تاکہ وہ اہل مدینہ کو قرآن کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سکھائیں۔اسی سال مدینہ منورہ میں جمعہ کی نماز شروع ہوئی۔حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشاعت دین میں سعیٔ بلیغ فرمائی۔چنانچہ مدینہ منورہ میں نور ایمان کی ضیائیں پھیلنے لگیں۔اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔اسلام کی صداقت کا پھریرا مدینہ طیبہ میں لہرانے لگا۔[مدارج النبوۃ،اُردو۲/۸۴تا۸۶]

☆ ۶۲۱ءیعنی اعلان نبوت کے تیرہویں سال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار کی ایک کثیر جماعت لے کر حج کے زمانے میں مکہ معظّمہ آئے۔مدینہ طیبہ سے مشرکین بھی کافی تعداد میں بارادۂ حج مکہ معظّمہ آئے ہوئے تھے۔حضرت مصعب کے ساتھ قوم اوس اور قوم خزرج کے پانچ سو آدمی آئے ہوئے تھے۔یہ تمام لوگ مدینہ سے آئے ہوئے مشرکوں سے

چھپ کر عقبہ کے قریب پہاڑ پر جمع ہوئے وہاں حضور اقدس سید المرسلین تشریف لے گئے اور تمام کو بیعت اسلام سے مشرف فرمایا۔مدینہ سے آئے ہوئے اس وفد میں بارہ حضرات مدینہ کے رُؤسا اور اکابر تھے۔دولت ایمان سے سرفراز ہونے کے بعد ان میں ایسا ایمانی جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا کہ اس وفد میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو اس وقت منیٰ میں جو مشرکین جمع ہیں ہم ان کو تلوار کی دھار پر رکھ لیں اور قتل کر دیں۔حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے کہ تلوار سونتوں اور مشرکوں کے ساتھ جنگ کروں۔'' اس کے بعد انصار کا وہ قافلہ مدینہ منورہ لوٹا۔

مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ لوٹتے وقت انصار کے قافلے نے بارگاہ رسالت میں التماس وگزارش کی کہ یارسول اللہ! اگر آپ ہمارے ساتھ مدینہ طیبہ تشریف لے چلیں تو زہے سعادت! آپ جو بھی حکم فرمائیں گے ہم جان ودل سے تابع فرمان ہوں گے۔حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مجھے ابھی مکہ معظّمہ سے نکلنے کا حکم نہیں ہوا ہے اور میری ہجرت کے لئے کوئی مقام متعین نہیں کیا گیا ہے۔جس وقت بھی حکم ہوگا اور جہاں کے لئے بھی حکم ہوگا وہاں ہجرت کروں گا۔'' یہ فرما کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کے قافلے کو رخصت فرمادیا۔جب مکہ معظّمہ کے کفار کو پتہ چلا کہ انصار مدینہ کا قافلہ یہاں آیا تھا اور اسلام قبول کر کے واپس لوٹ گیا ہے تو وہ حسد کی آگ میں جل اٹھے۔حسرت ویاس سے سینہ پر ہاتھ مارنے لگے اور ذلت وندامت کی خاک سے اپنے سروں کو آلودہ کرنے لگے۔[مدارج النبوۃ،اُردو،۲/۸۷تا۹۰]

قارئین توجہ فرمائیں کہ مدینہ منورہ سے جوق در جوق مکہ معظّمہ آکر اسلام قبول کرنے کی لوگوں کو کس نے ترغیب دی؟ کس نے مستعد کیا؟ کس نے آمادہ کیا؟ صرف اور صرف اسلام اور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صداقت نے۔اسلام میں داخل ہونے والے ان شیدائیوں کو کسی نے تلوار دکھا کر ڈرایا تھا یا دھمکی دی تھی کہ

مسلمان ہوجاؤ ورنہ گردن کاٹ دی جائے گی؟ ہرگز نہیں، بلکہ ایمان لانے والے انصار کی جماعت کفار ومشرکین سے خوفزدہ تھی۔ اسی لئے تو خفیہ طور پر عقبہ کے قریب واقع ایک پہاڑ پر جمع ہوکر داخل اسلام ہوئے تھے۔ ان حضرات کو مسلمانوں کی تلواروں کا بالکل خوف نہ تھا۔ البتہ کفار ومشرکین کی متشدد شمشیروں سے ضرور خائف تھے۔ اسلام کے عالمگیر پیغام امن وامان کا تو انھوں نے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کرلیا کہ جب وفد میں سے ایک شخص نے کفار ومشرکین پر تلوار زنی کی اجازت طلب کی تو رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی۔

☆ ۶۲۲ء شجر اسلام کو پروان چڑھتا دیکھ کر کفار ومشرکین بوکھلا گئے۔ اسلام کی ہدایت کی روشنی کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لئے انھوں نے تمام ترکیبیں آزمالیں۔ لیکن ناکام ونامراد رہے۔ لہذا ترکش کا آخری تیر استعمال کرتے ہوئے مشرکین نے دارالندوہ میں شیخ نجدی کی رائے اور مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ آفتاب نبوت ورسالت کی روشنی کو بشکل اسلام پھیلنے سے ہم نہیں روک سکتے تو اب یہ کرو کہ آفتاب رسالت کو ہی غروب کردو۔ یعنی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کردو تاکہ نہ آفتاب رہے، نہ اس کی روشنی پھیلے۔ گویا کہ کفار نے ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' والی کہاوت پر عمل کرنے کا مصمّم اور پختہ ارادہ کرکے جانِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کفار کے فاسد ارادے سے مطلع فرمادیا اور آپ نے ۶۲۲ء میں مکہ معظّمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت فرمائی۔

جب اہل مدینہ کو رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہجرت کی اطلاع ملی تو مدینہ منورہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ فرط مسرت سے جھوم اُٹھے اور آپ کا شاندار استقبال کرنے کی غرض سے روزانہ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر منتظر رہتے۔ بالآخر وہ وقت بھی آپہنچا کہ آفتاب رسالت وماہتاب نبوت جان عالم ورحمت عالم صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے قدوم مَیمنت لزوم فرمایا۔ وہ دن دوشنبہ مبارکہ کا تھا اور اسی دن سے ہجری سن (قمری ہجری) لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رونق افروز ہونے کے بعد مسجد قبا شریف کی تاسیس وتعمیر فرمائی۔ یہ وہ پہلی مسجد ہے جو اسلام میں تعمیر کی گئی۔ یہ وہ پہلی مسجد ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔

مدینہ طیبہ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر اسلام لانے کے لئے لوگوں کا تانتا لگ گیا، اطراف کے علاقوں اور قرب وجوار کے دیہاتوں سے گروہ بندی سے لوگ آکر داخل اسلام ہونے لگے اور اسلام کو تقویت وغلبہ حاصل ہونا شروع ہوا۔ مدینہ منورہ مرکز اسلام کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہونے لگا۔ شمع رسالت کے پروانوں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہونے لگا۔ یہ تمام واقعات ۶۲۲ء یعنی ۱ ھ کے ہیں اور اس وقت تک رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اذن جہاد نہ ملا تھا۔ اس وقت تک کوئی بڑی جنگ تو درکنار بلکہ معمولی مقاتلہ بھی رونما نہ ہوا تھا۔ لیکن ہزاروں کی تعداد میں لوگ مشرف باسلام ہوچکے تھے۔ ان تمام کو کیا تلوار کے بل بوتے پر مسلمان بنایا گیا تھا؟ حَاشَا لِلّٰہِ حَاشَا لِلّٰہ ! رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلکش ومتوازن شخصیت، آپ کی شیریں مقالی، تواضع، انکساری، اخلاق محاسن اور اسلام کے حیات بخش اصولوں نے لوگوں کو ایسا گرویدہ اور فریفتہ کردیا تھا کہ اپنے آبائی باطل دین کو آن واحد میں ترک کرکے پرستاران حق میں شامل ہوگئے۔

☆ ۶۲۲ء/۱ھ:- یہاں ایک ضروری امر کی بھی وضاحت کرنا لازمی ہے کہ مدینہ منورہ میں جانِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر جو لوگ بشوق واشتیاق داخل اسلام ہورہے تھے۔ ان میں قوم کے ادباء، فضلاء، امراء، علماء، صلحاء، رؤساء اور حکماء بھی شامل تھے۔ وہ تمام صرف رواداری یا دیکھا دیکھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ انھوں نے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کو دیکھا، جانچا، ٹٹولا، پرکھا اور صداقت پر مبنی پاکر اقرارِ توحید ورسالت کیا تھا۔ یہاں تک

کہ اسلام کی سخت ترین دشمن قوم یہود کے جید اور مایہ ناز علماء وفضلاء نے بھی سابقہ کتب سماوی کی روشنی میں اسلام کو حق پایا اور دولت ایمان کی سعادت حاصل کی۔ مثلاً: حضرت عبداللہ بن سلام جو حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا شمار اکابر علمائے یہود میں ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں قدم رنجہ ہوئے اور لوگ آپ کی مجلس مبارک کی حاضری میں سبقت کرنے لگے تو میں بھی ان کے ہمراہ حضور کی بارگاہ میں باریابی سے مشرف ہوا۔ جب میری پہلی نظر آپ کے روئے انور پر پڑی تو میں نے جان لیا کہ یہ کذابوں یعنی جھوٹوں کا چہرہ نہیں ہے۔ پھر میں نے آپ کی زبان اقدس سے پندونصیحت کے کلمات سماعت کئے۔ بعدہٗ اپنے گھر لوٹ آیا۔ آپ کی گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ لہٰذا دوسری مرتبہ خلوت میں حضور کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت کی حاضری میں میں نے عالم ماکان وما یکون سے تین ایسے سوالات کئے جن کا جواب نبی کے سوا دوسرا کوئی نہیں دے سکتا۔ جب میں نے اپنے سوالوں کا شافی اور کافی جواب سنا، تو بآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہوگیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کرنے کے بعد عرض کیا: یارسول اللہ! یہود ایسی قوم ہے جو کذب وبہتان میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ باوجودیکہ وہ میرے علم، میری سیادت اور سرداری کے قائل ہیں۔ لیکن جب ان کو پتہ چلے گا کہ میں ایمان لے آیا ہوں تو وہ بہتان باندھیں گے۔ لہٰذا آپ میرا ایمان لانا ان پر پوشیدہ رکھ کر پہلے میرے بارے میں ان کی رائے دریافت فرمالیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو پوشیدہ مقام پر بٹھا دیا اور یہودیوں کی ایک جماعت کو بلاکر حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے شخص ہیں؟ تمام نے یک زبان ہوکر کہا کہ ”وہ ہمارے سردار، ہمارے سردار کے فرزند، ہم میں سب سے زیادہ عالم، ہمارے پیشوا، ہم میں بہترین، ہم میں دانا ترین ہیں۔“ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جماعت یہود سے بار بار حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق پوچھا۔ ہر مرتبہ

انھوں نے یہی جواب دیا اور ان کی تعریف وتوصیف کے پل باندھے۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن سلام باہر آؤ۔ حضرت عبداللہ بن سلام کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا اے گروہ یہود! ایمان لے آؤ۔ اس پر گروہ یہود نے کہنا شروع کیا کہ عبداللہ بن سلام ہم میں بدترین وجاہل ہیں اور بدترین اور جاہل ترین کے فرزند ہیں۔ [مدارج النبوۃ، اُردو۲/ ۱۰۷تا۱۱۳]

اس کو کہتے ہیں بغض وعناد۔ تھوڑی دیر پہلے جنھوں نے اپنی زبانوں سے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ جس کی تعریف میں آسمان وزمین کے قلابے ملادیئے تھے، وہی لوگ اُسی نشست میں، انھیں زبانوں سے چند لمحوں کے بعد حضرت عبداللہ بن سلام کی تذلیل میں آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔ صرف اسلام قبول کرنے کی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن سلام اپنی قوم کی نظروں میں مدح وثنا کے بجائے طعن وتشنیع کے سزاوار ہوگئے تھے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ قوم یہود کی افترا پردازی سے قطع نظر فرماکر صداقت وہدایت سے منحرف نہ ہوئے۔ کیا حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گردن پر تلوار کی دھار رکھ کر انہیں ایمان لانے پر مجبور کیا گیا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ ان کو اسلام سے منحرف کرنے کے لئے قوم یہود نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ مگر وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس لیے اسلام تلوار سے نہیں پھیلا البتہ سادہ مسلمانوں کو تلوار کے زور سے اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو اسلام لانے والے تلوار کے خوف سے اسلام سے پھر جاتے اور مرتد ہوجاتے لیکن تمام باطل طاقتیں متحد ہوکر بھی مسلمانوں کے اعتقاد ویقین میں تزلزل برپا نہ کرسکیں اور مسلمان دین حق پر ثابت قدم رہے اور رہیں گے۔

حکم جہاد کیوں نازل ہوا؟

اسلام کی بڑھتی ہوئی شان وشوکت دیکھ کر کفار ومشرکین کے ساتھ ساتھ یہود ونصاریٰ بھی حسد وعناد میں تلملا اُٹھے۔ قوم یہود ونصاریٰ کے عالم اسلام میں علی الاعلان داخل ہوئے مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام۔ اسی طرح حضرت سلمان

فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوکہ اصفہان کے رہنے والے تھے، انھوں نے دین کی تلاش میں دور دراز کی مسافت طے کی تھی۔ حضرت سلمان فارسی نے دین نصرانی اختیار کیا تھا اور انجیل کے زبردست عالم تھے۔ جب انھوں نے مدینہ منورہ میں رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، تو انھوں نے حضور اقدس میں وہ اوصاف جمیلہ پائے جو انھوں نے انجیل میں نبی آخر الزماں کی تعریف میں پڑھے تھے۔ لہذا وہ بھی ایمان لاکر اسلام میں داخل ہوگئے۔ علاوہ ازیں روزانہ گروہ کے گروہ امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح آتے اور شمع نبوت و رسالت پر پروانہ وار نچھاور ہوتے تھے۔ لہذا ادیان باطل کے سرغنہ کے سروں پر خون سوار ہوگیا۔ مدینہ منورہ کے مشرکین و یہود نے مکہ معظّمہ کے کفار و مشرکین سے رابطے بڑھائے اور اسلام دشمنی پر ہاتھ ملائے اور اسلام کی بیخ کنی کے لئے کمر بستہ ہوئے۔ مکہ معظّمہ، خیبر، وغیرہ مقامات پر فوجیں تشکیل دی جانے لگیں۔ جنگی ہتھیار بھاری تعداد میں جمع کئے جانے لگے۔ علاوہ ازیں سماجی اور معاشرتی زندگی میں انھوں نے مسلمانوں کو سخت اذیتیں دینی شروع کیں۔ ظلم و جفا کا بازار گرم کیا۔ بلکہ مسلمانوں پر ظلم کرنے میں فخر اور فلاح محسوس کرنے لگے۔ بچے بوڑھے، عورتیں، ضعیف، بیمار، اور ناتواں کو ستانے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مسلمان ان کے ظلم و تشدد کا آئے دن شکار ہوتے تھے۔ مجروح وزخمی ہوکر بارگاہ رسالت میں آتے اور ظالموں کے مظالم کی شکایتیں کرتے لیکن رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ مظلومین کو صبر کرنے کی تلقین فرماتے۔

حالات ایسے رُونما ہوگئے تھے کہ کفار و مشرکین کی جرأتیں دن بہ دن بڑھتی جارہی تھیں۔ اپنے مسلمان بھائیوں پر کئے جانے والے ظلم و ستم دیکھ کر صاحب استطاعت، شہ زور، شجاع اور ذی قوت مومنین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا۔ قوت ضبط وتحمل جواب دے جاتی، تب وہ بارہ گاہِ رسالت میں حاضر ہوکر جنگ و قتال کی اجازت طلب کرتے لیکن رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ یہی ارشاد فرماتے کہ مجھے جہاد کرنے کا حکم نہیں ملا۔ مسلمانوں کا صبر کرنا اور جواب نہ دینا محض رحمت عالم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تلقین صبر کی بنا پر تھا، حالانکہ اب مسلمان ایسی پوزیشن میں تھے کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر ظالموں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کو سر آنکھوں پر لیا اور جوابی کاروائی کی طرف التفات نہ کیا، جس کا کفار و مشرکین نے غلط مفہوم اخذ کیا کہ مسلمان ہم سے ڈرتے ہیں یا مسلمانوں میں ہمارا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ لہذا ان کے حوصلے خوب بلند ہوئے اور ظلم کی آگ کے شعلے مزید تیز بھڑکنے لگے۔ جب ظالموں کے ظلم کی کوئی انتہا نہ رہی اور پانی سر سے اونچا ہوگیا، تب مشیئت الٰہی نے ظالموں کی سرکوبی کے لئے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جہاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ۲ھ یعنی ۶۲۳ء میں جہاد کا حکم نازل ہوا۔

۲ھ میں جہاد کا حکم نازل ہونے کے بعد غزوات و سرایا کا آغاز ہوا۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جنگ بدر ۶۲۳ء میں شرکت فرمائی اور سب سے آخری غزوہ کہ جس میں آپ تشریف فرما تھے، وہ غزوہ جیش العسرت ۶۳۰ء (تبوک ۹ھ) ہے۔ یعنی آپ نے اپنی ظاہری حیات کے صرف آٹھ سال ہی غزوات میں شرکت فرمائی ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے جن جن غزوات میں شرکت فرمائی ہے وہ تمام غزوات دفع ضرر و طغیان کے لئے ہی تھے۔ آپ کی حیات طیبہ میں جو غزوات وقوع پذیر ہوئے، وہ ظلم ڈھانے کے لئے نہیں بلکہ عمارت ظلم ڈھانے کے لئے تھے۔ آپ نے مظلوم پر اُٹھنے والی ظالم کی تلوار کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائی تھی۔ ظلم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے سہارا مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے آپ نے تلوار اٹھائی، اور آپ نے ظلم کی ان زنجیروں پر تلوار کی کاری ضربیں لگا کر پاش پاش فرما دیا اور عالم دنیا کو یہ پیغام عنایت فرمایا ہے کہ ظالم کو ظلم کرنے سے روکنے میں دوہری بھلائی ہے۔ پہلی یہ کہ ظالم کو ظلم سے باز رکھنے میں اس کی بھلائی ہے اور مظلوم کو ظلم کا شکار ہونے سے بچانے میں مظلوم کی بھلائی ہے۔

اگر رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جہاد نہ فرماتے تو ظلم کی روک تھام نہ

ہوتی۔ بڑھتے ہوئے ظلم کو روکنا انسانیت کا اہم فریضہ وتقاضا ہے۔ظلم کے سامنے سینہ سپر ہوکر کھڑا ہونا اوراس کا دلیرانہ مقابلہ کرنا بہادری کی علامت ہے اوراس کے برعکس ظلم کو دیکھ کر گھٹنے ٹیک دینا اورسر پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بزدلی اور کاہلی ہے۔اس قسم کی بزدلی دکھانے سے ظالم کے حوصلے اور بڑھیں گے اور معاشرے سے امن وامان دائمی طور پر رخصت ہوجائے گا۔اپنی حقیقی دختر کو اپنے ہی ہاتھوں زندہ دفن کرنا،شراب کے نشے میں دُھت ہوکر کسی بھی شریف عورت سے بدسلوکی کرنا،عصمت دری کرنا، عورت کو دل بہلانے کا کھلونا سمجھ کر اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنا، چوری ڈکیتی، قزاقی،لُوٹ مار، خیانت، دغابازی،فریب کاری، دھوکہ بازی، جوا،شراب نوشی،زنا کاری،کسی کا مال ناجائز طور پر دبالینا، بے حیائی،عریانیت،فحش کلامی،تہمت وغیرہ افعال رذیلہ وشنیعہ سے معاشرے کو پاک وصاف کرنا انسانیت کا اوّلین اخلاقی فریضہ ہے۔ جب تک ان اُمورقبیحہ کو رخصت نہ کیا جائے گا، دختر پروری، پارسائی، دیانت داری پرہیزگاری، پاک دامنی، ہمدردی،راست کلامی،حیاداری،امانت داری،صدق گوئی، وغیرہ اخلاقی محاسن کی فضا قائم کرنا دشوار ہے۔رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عالَم دُنیا کوامن وامان کا ہی پیغام دیا ہے اور امن وامان کی بنیادیں مستحکم کرنے کے ارادے سے ہی آپ نے جہاد فرمایا ہے تاکہ ستم شعار اور ستم ظریف لوگوں کی ستم گری کی جڑیں اکھاڑ کر اس کا صحیح معنی میں استیصال کیا جائے۔

رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا تھا اور آپ کی رحمت عامہ سے پوری کائنات بہرہ مند ہوئی اور ہوتی رہے گی۔ لہٰذا آپ نے رحمت کا پہلو اختیار فرما کر ہی جہاد فرمایا تھا۔جسم کے چھوٹے عضو،مثال کے طور پر ہاتھ کی انگلی میں جذام(Leprosy) کا مرض لاحق ہوجائے اور طبیب حاذق کہے کہ اگر انگلی کاٹ کر جسم سے الگ نہیں کی گئی،تو یہ مرض پورے بدن میں پھیل جائے گا۔ایسی صورت میں ذی عقل شخص فوراً ہی طبیب حاذق کی رائے پر عمل پیرا ہوگا۔حکیم صاحب پر یہ الزام قطعاً عائد نہیں کیا جائے گا کہ حکیم جی ہاتھ کی انگلی کے پیچھے

پڑ گئے ہیں اور انگلی کو قتل کرنے کے درپے ہوئے ہیں۔یقیناً جذام سے موثر ہونے والی انگلی کٹنے سے جسم کو تھوڑی دیر کے لئے تکلیف ہوگی،لیکن اس کے نتیجہ میں پورا جسم مہلک مرض سے محفوظ رہے گا۔ اسی طرح کسی شریف آدمی کے مکان میں کوئی بدمعاش گھس جائے اور ننگی تلوار دکھا کر صاحب خانہ کی جوان بیٹی کی عزت وعصمت لوٹنا چاہے۔ایسی صورت میں اس شریف آدمی پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں تلوار تھامے اور اپنی نورچشم کی عصمت وعفت کی حفاظت کرے۔ اگر اس نے وقت کی نزاکت سے لااُبالی پن کیا اور میں شریف آدمی ہوں،تلوار ہاتھ میں لینا میرا کام نہیں، اس زعم وگمان میں رہا اور عزت لوٹنے والے کا مقابلہ نہیں کیا تو اس کی نظروں کے سامنے اس کے خاندان کی عزت ملیامیٹ ہوجائے گی۔اس کا خاندان،اس کا سماج اوراس کی وہ بیٹی کہ جس کی عزت لوٹی گئی ہے،وہ اس کی بزدلی پر ملامت کرے گی اور اس کو کبھی معاف نہیں کرے گی بلکہ خوداس کا ضمیر بھی اس پر زندگی کی آخری سانس تک لعن طعن کرتا رہے گا۔اگر اس نے اپنی بیٹی کی عزت بچانے کی خاطر تلوار اُٹھالی ہوتی ،تو اس کی شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے۔ کیونکہ اس وقت کا تقاضا یہی تھا کہ تلوار اُٹھا کر ظالم کے پنجۂ ستم سے مظلوم کی حفاظت کی جائے۔اس مثال کو ذہن نشین رکھتے ہوئے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غزوات پر منصفانہ اور عادلانہ نظر کر کے غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ آپ نے انسانیت کی عزت وآبرو بچانے کے لئے ظلم وجفا اور بربریت کے خلاف ہی تلوار اٹھائی تھی۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کا معاشی نظام

ملک شیر محمد خاں اعوان (پاکستان)

جن لوگوں نے تاریخ عالم کے انقلاب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام تاریخ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ انقلاب کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے بعد کی زندگی پیشتر کی زندگی سے بنیادی طور پر مختلف ہو جائے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام نے اپنے سے قبل کی زندگی میں واضح تفاوت پیدا کر دیا ہے، اسی لیے اہل عرب اسلام سے پیشتر کی زندگی کو زمانہ جاہلیت سے تعبیر کرنے لگے اور پھر یہ انقلاب زندگی کے کسی ایک گوشہ میں نہیں آیا بلکہ اس کی ہمہ گیری نے زندگی کے تمام گوشوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اخلاق و معاشرت، عبادت و معاملات، تہذیب و ثقافت، سیاست و عدالت اور معیشت و معاشرت کے تمام پہلو منقلب کر دیے۔ ان پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں عظیم ترین انقلاب برپا کیا لیکن آج کی دنیا میں معاشی اور اقتصادی مسائل زندگی کے تمام پہلوؤں پر غالب آ گئے ہیں اور مفکرین نے تمام نظامہائے افکار و اخلاق اور تمام مذاہب کو اسی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا ہے کہ علم المعیشت کے متعلق ان کے اصول و قوانین کیا ہیں۔ مغرب میں مذہب کے خلاف بغاوت ہوئی، اس کا صرف یہی سبب نہ تھا کہ مسیحیت کے تصورات الوہیت لوگوں کو بے بنیاد معلوم ہونے لگے تھے بلکہ ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ اشتراکی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ عیسائیت کا کلیسائی نظام محتاج کو محتاج اور غنی کو غنی رکھنے کا معاون ہے

اور وہ ناداروں کو فقط اس موہوم اطمینان کی افیون کھلاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں روٹی کو ترستے رہیں تو کوئی بات نہیں، اگلی دنیا کی بادشاہت ان کا مقدر ہے اور دولت مندوں کو جنت کی ہوا تک نہیں لگنے دی جائے گی اور امیروں کا جنت میں داخل ہونا اسی طرح ناممکن ہوگا جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا ناممکن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے یہی دلائل مغرب کے دماغ میں ہلچل پیدا کرنے لگے اور انہوں نے اگر اشتراکیت قبول نہیں کی تو کم از کم مذہب بیزاری ان کا مستقل ذہنی روگ بن کر رہ گئی ہے۔

آج جبکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور محنت و سرمایہ کی آویزش نے دنیا کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے، اس وقت دنیا مختلف اور متضاد نظریات و تحریکات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے، ہر تحریک اس امر کی مدعی ہے کہ موجودہ دور کی اجتماعی مشکلات کا حل اس کے دامن میں ہے لیکن اس کھلی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج ان نظریات کی افراط میں دنیا امن و سکون سے جس قدر دور جا پڑی ہے اور اس وقت اضطراب، بے چینی اور بدامنی کے جس قدر ہولناک طوفان اٹھ رہے ہیں، یہ سب دنیا کی تاریخ میں اس سے پیشتر کبھی نظر نہیں آئے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ جن لوگوں کی نگاہیں بین الاقوامی مسائل کا جائزہ لیتی رہتی ہیں، وہ اس امر پر متفق ہیں کہ دنیا کا موجودہ ہیجان براہِ راست معاشی و اقتصادی عدم توازن کا نتیجہ ہے۔ جب کسی ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ چند افراد ملک کی تمام دولت اور وسائل پر قابض ہو کر عیش و مسرت کی زندگی گزار رہے ہوں اور کروڑوں لوگ افلاس و تنگدستی سے دم توڑ رہے ہوں تو عوام میں لازماً ہیجان و اضطراب پیدا ہوگا۔

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم آج کے دور کا سلگتا ہوا موضوع ہے۔ مختلف معاشی نظریات کتابوں کی زینت بن رہے ہیں مگر عملاً ہر جگہ سرمایہ داری کا دور دورہ ہے۔ کیونکہ جو نظریات پیش کیے جاتے ہیں وہ ناقابل عمل ہوتے ہیں۔ آیئے ہم ان لادین نظریات کے پیچھے دوڑنے کے بجائے قابلِ عمل اور تجربہ شدہ اسلامی نظام کو اپنا کر ایک مثالی قوم بن جائیں اور اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت کے لیے مینارِ نور

بن کے اسے صحیح معاشی نظام سے روشناس کرائیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے اصول صرف کتابوں میں لکھے رہنے والے ناقابل عمل اصول نہیں بلکہ ریگزارِ عرب ان کی تجربہ گاہ رہی ہے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ جب یہ اصول برسرِ عمل تھے تو غربت و افلاس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ لوگ زکوٰۃ اٹھائے پھرتے تھے مگر لینے والا نہیں ملتا تھا۔ دنیا کا کوئی بے رحم اور متعصب مؤرخ بھی اس حقیقت کا آج تک انکار نہیں کر سکا۔

آج بھی مظلوم انسانیت کو اگر پناہ ملے گی تو اسلام کے دامن میں۔ اگر سیماب اور بے قرار دنیا کو سکون و اطمینان نصیب ہوگا تو اسلام کی چھاؤں میں۔ اگر مجروح و مضطرب سوسائٹی کی مرہم پٹی اور تسکین و تسلی ہوگی تو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الشفاء میں کیونکہ نسخۂ شفاء ان ہی کے پاس ہے۔

''اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' (کنزالایمان)

''اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں کی کی صحت۔'' (کنزالایمان)

یہ نسخۂ شفا دل و دماغ اور نفس و روح کی تمام بیماریوں کا مجرب نسخہ ہے اور یہی نسخۂ شفا کیمیا ہے ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے:

''اور اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعے اقوام (عالم) کو بامِ عروج پر پہنچائے گا اور اسی قرآن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو (قعرِ مذلّت میں) گرا دے گا۔'' (صحیح مسلم)

انسانیت جب تک غیر مسلم ممالک کی راہ تکے گی ٹھوکریں کھاتی رہے گی

اسے قرار و سکون نصیب ہوگا تو مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں۔ اسے امن و امان ملے گا تو آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانۂ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

سرورِ کائنات کے قدموں سے ہٹ کر کائنات کی حیات و ثبات ایک موہوم سی بات ہے۔ ترجمانِ حقیقت فرماتے ہیں ؎

دو جہاں وابستۂ ودنیش حیات — نیست ممکن جو جزبہ آئینش حیات

میں پوچھتا ہوں آخر وقت کے کون سے مسائل ہیں جن کے بارے میں آج غیر مسلم ممالک کی طرف دیکھا جاتا ہے اور سوسائٹی کی راہ میں کون سی مشکلات ہیں جن کے حل کرنے کے لیے اسلام پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پست کو بلند کرنے، گرے پڑے کو اٹھانے، مزدور کو روٹی دینے اور عوام کو خوشحال دیکھنے کا حسین تصور تو پہلی بار دنیا کے سامنے پیش ہی اسلام نے کیا ہے۔ اسلام تو خود سب سے بڑا غریب نواز ہے اور سب سے پہلا مزدور پرور ہے۔ اگر مزدور کی حوصلہ افزائی، بھوکے کی شکم پروری اور حاجت مند کی حاجت روائی کا نام کمیونزم ہے تو یہ کمیونزم اسلام کی نقالی ہے۔ اسلام نے یہی اور عین یہی تعلیم کارل مارکس اور اینجلز سے سوا ہزار سال پیشتر نہ صرف پیش کی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اگر تقسیم دولت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حوصلہ شکنی کا نام کمیونزم ہے تو پھر ہمارے کمیونسٹ دوستوں کو ماسکو کی بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فلسفہ پر اعتماد کرنا چاہیے جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو اس تعلیم سے روشناس فرمایا اور جن کا ایک ممتاز وصفی نام اجیر (مزدور) بھی ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی سوال ہے کہ کمیونزم اسلام کا حریف نہیں، اس سلسلہ میں سوویٹ روس صحیح حریف ہے تو سرمایہ دار امریکہ اور امپیریلیسٹ برطانیہ کا۔ کمیونزم دراصل یورپ کے ظالمانہ جفا کار از اور امپیریلزم کے سرمایہ دارانہ، خود غرضانہ، تعیّشانہ نظام کا جارحانہ ردِعمل ہے۔ اس لیے ملوکیت اور سرمایہ داری کو مظلوم اور زخم خوردہ

بھوکی پیاسی دنیا کمیونزم کے سراب کی طرف لپکے تو تعجب نہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان بھی اشتراکی نظام کی تعریف وتحسین میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل اسلام کی صحیح روح اور سچی شکل وصورت سے ناآشنائی اور صحیح اسلامی نظام ومعاشرہ سے عدم واقفیت کا افسوسناک نتیجہ ہے، ورنہ سوسائٹی کے اونچ نیچ کو جس کامیابی سے اسلام نے ہموار کیا۔ کمیونزم اس کے تصور سے بھی ناآشنا ہے۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام کے اساسی عناصر کیا ہیں اور وہ کیسا معاشی نظام ہے جو ہمیشہ کے لیے معاشی عدل کے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حصول معیشت اور اکتساب مال بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیلہ ہے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا۔ اسلام نے چونکہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب قرار دیا ہے اور اس حیثیت میں اس کو یہ منصب تفویض کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر خدا کی ذات وصفات سے قربت و مشابہت حاصل کرے اور اجتماعی حیثیت سے خدا کے قانون کو انسان کے خود ساختہ نظریات وقوانین پر بالاتر کرے، اس لیے وہ معاشی اصلاح کو اس نصب العین کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے اور انسان کے معاشی مسئلہ کو اسی حیثیت پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو نہ کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے، نہ وہ غریبوں کو دولت مند افراد سے رشک وحسد کرنا سکھاتا ہے اور نہ اسے بورژوا یا متوسط طبقہ سے نفرت ہے۔ وہ معاشی اصلاح کے ذریعے دولت کو محدود ہوجانے سے روکتا ضرور ہے لیکن اس کا مقصد انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا بیدار اور قوی کردینا ہے کہ ہر فرد اخوت وہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہوجائے اور دوسروں کے مصائب وتکالیف میں ان کی مالی اعانت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرے۔ نہ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں دولت سمٹ کر ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں چلی جائے بلکہ وہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان پھیلے اور گردش کرے۔ اس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

''جو غنیمت دلائی اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے وہ اللہ اور رسول کی

ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے کہ تمہارے اغنیا کا مال نہ ہوجائے۔'' (کنزالایمان- پارہ۲۸۰-رکوع۴۰)

آیت کے آخری جزو میں اس نے صاف طور پر فرمادیا ہے کہ وہ اجتماعی دولت کو صرف دولت مندوں کا حق نہیں سمجھتا ہے بلکہ اس تقسیم میں ہر طبقہ کے افراد کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے جو دولت کو حاصل کرنے میں بڑی حریص ہے لیکن اس کے صرف کرنے میں بے حد تنگ دل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم دولت کما سکتے ہو لیکن یہ حق نہیں رکھتے کہ اس کے انبار لگاتے رہو یا صرف اپنی راحت وآسائش پر اسے صرف کرتے رہو۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد کلام مجید میں شاید ہی کسی اور بات کو اتنی بار دہرایا گیا ہو جتنا اس بات کو کہ دولت خدا کی راہ میں صرف کرتے رہنا چاہیے یہاں تک کہ ان لوگوں کو سختی سے متنبہ کیا گیا ہے جو دولت جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ارشاد ہوا ہے:

''اور وہ جو جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔'' (کنزالایمان۔ پارہ۱۰۔ رکوع ۱۱) ایک اور جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان نیکی حاصل نہیں کرسکتا ہے جب تک اپنی دولت کو راہِ خدا میں صرف نہ کرے: ''تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہِ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔'' (کنزالایمان۔ پارہ۴۔ رکوع۱)

دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرنے کی غرض سے اسلام نے خاندانی نظام کو باقی رکھنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ خاندان انسانی زندگی اور تمدن کی ایک قدرتی اکائی ہے اور دنیا کے تمام خارجی نظامات میں سب سے زیادہ محکم اور بھروسہ کے قابل ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی انقلاب کی آندھیاں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم بدلتی رہتی ہے لیکن خاندان اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہے گا۔ اشتراکی اور دوسرے خیال پرستوں کے باوجود انسانی تمدن پر وہ دور کبھی نہیں آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ جب انسان خاندانی رشتوں اور بندھنوں سے اپنا پیچھا

چھڑا سکے۔ جہاں بھی دس بیس آدمی بسیں گے، شادی بیاہ ہوگا۔ شوہر بیوی، ماں باپ، بھائی بہن، داماد اور خسر کے رشتے ہوں گے اور انسان الفتوں اور قرابتوں کے ایک پھیلے ہوئے سلسلہ میں منسلک رہے گا۔ انسانی زندگی کی اس فطری وحدت کو اسلام اپنے اخلاقی اور معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس باہمی امداد و معاونت کے جذبہ پر جو فطرتاً خاندان کے افراد میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتا ہے، مذہبی فرض و احساس کی مہر لگا دیتا ہے تاکہ انسان نفس پرستی اور خود غرضی کی کیسی ہی شدید حالت سے گزر رہا ہو، کم از کم ایک محدود دائرہ میں وہ دوسروں کی امداد پرورش کا ذریعہ بنا رہے۔ اسی غرض سے اسلام نے خاندان کی زندگی کو چھوٹے پیمانہ پر امداد باہمی کا ادارہ بنا دیا ہے اور اہل خاندان کے حقوق و فرائض پر مذہبی احکام کا وزن ڈال دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ذوی القربیٰ کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور غیر مستطیع اقربا کی امداد کو انسان کی پہلی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ ایک نہایت بلیغ انداز میں یہ حکم سنایا گیا ہے:

''بیشک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کے دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بری بات اور سرکشی سے۔'' (کنزالایمان پارہ۱۴۔رکوع۱۹)

اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وراثت افراد خاندان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر تقسیم ہو۔ اس بارے میں اگر اس کا مقابلہ مغربی ممالک کے مماثل قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا مسلمانوں میں دولت اس طرح ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوسکتی جیسے کہ مغرب میں وہ ایک خاص حلقہ میں منجمد رہتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کا سنگ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وہ رقم ہے جو صاحب استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کی کوئی رقم ہے جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا سے وصول کرتی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے جتنے ٹیکس عوام سے وصول کیے جاتے ہیں وہ ان منافع اور فوائد کے معاوضہ میں لیے جاتے ہیں جو عوام کو حکومت کی سرپرستی سے حاصل ہوتے ہیں لیکن زکوٰۃ وہ ٹیکس ہے جو محض غیر مستطیع افراد کی مالی اعانت کے لیے وصول کیا جاتا

ہے اور اس کے معاوضہ میں محصول دہندگان کو کوئی دوسرا فائدہ کسی اور شکل میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف معین کر دیے گئے ہیں یعنی زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں کی مالی اعانت میں صرف کی جاسکتی ہے لیکن دوسرے مصرف میں نہیں لگائی جاسکتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام نہ تو خالص اشتراکی ہے اور نہ خالص سرمایہ داری بلکہ ان دو انتہاؤں کے درمیان وہ ایک اعتدال پیدا کرتا ہے، وہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کرتا ہے کہ وہ معاشی استحصال کا ذریعہ نہ بننے پائے۔

صحیح اسلامی نظام کے اندر رقوم کا کوئی فرد بھوکا نہیں رہتا اور کمیونزم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلافتِ راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب کی دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری نے شام میں قرآن حکیم کی اس آیت کے مطابق:

''اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔'' (کنزالایمان۔ پارہ۱۰۔رکوع۱۱)

یہ فتویٰ دیا کہ دولت جمع کرنا حرام ہے (مسند احمد بن حنبل جلد۵) تو حضرت ابوذر کی یہ آواز عوام پسند نہ ہوسکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کرسکی کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ ہی جاری تھا۔ (سیرت النبی۔۵/۲۶۱) اس آواز کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگ آسودہ حال تھے اول تو کوئی بھوکا پیاسا نہیں تھا اور جو تھے تو عہد عثمانی میں ان کا کھانا بیت المال سے مقرر تھا بلکہ عہد صدیقی میں اسی قسم کا انتظام شروع ہوگیا تھا۔ (طبری۔ص۳۸۴)

اہل حیرہ سے حضرت ابوبکر کا جو معاہدہ ہوا اس میں یہ شرط تھی کہ کوئی ذمی، بوڑھا (اپاہج) اور مفلس ہوجائے گا تو وہ جزیہ سے بری کر دیا جائے گا نیز بیت المال اس کا کفیل ہوگا۔ (کتاب الخراج۔ص۷۲)

حقیقت یہ ہے بھوک کا علاج صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلام نے فقیر کو

امیر، نادار کو مالدار بنا دیا اور بھوکے ابو ہریرہ کو بحرین کا گورنر اور دس ہزار روپے نقد کا مالک بنا دیا۔ (اصابہ بحوالہ مہاجرین۔۲/۵۰)

حضرت ابو ہریرہ نے کتان کے رنگے ہوئے کپڑے سے ناک صاف کر کے کہا واہ ابو ہریرہ! آج تم کتان سے ناک صاف کرتے ہو حالانکہ کل منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ کے درمیان غش کھا کر گرتے تھے اور گزرنے والے تمھاری گردن پر پیر رکھ کر کہتے تھے کہ ابو ہریرہ کو جنون ہو گیا ہے، حالانکہ تمہاری یہ حالت صرف بھوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔ (بخاری بحوالہ مہاجرین۔ص ۶۶)

اسی طرح حضرت علی مرتضی نے فرمایا ایک زمانہ وہ تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا اور آج میرا یہ حال ہے کہ چالیس ہزار سالانہ میری زکوٰۃ کی رقم ہوتی ہے۔ (مسند احمد بن حنبل۔۱/۱۵۹)

آج ہر طرف بھوک ہی بھوک ہے۔ مشینی دور کی برکت سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث ایک جگہ زر وجواہر کے قارونی انبار ہیں اور ایک جگہ نانِ جویں تک میسر نہیں۔ سرمایہ کی اس غیر متوازن تقسیم نے مزدور کو سرمایہ دار کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ بھوکا مزدور بھوکے بال بچوں کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھ کر کمیونزم کا نعرہ بلند کرتا ہے اور دنیا تنکے کی طرح کمیونزم کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے۔ اے کاش کہ وہ یہ دیکھتی کہ اس درد کی دوا تو اسلام کے پاس ہے۔ اسلام ہی بے ٹھکانوں کا ملجا وماوی ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی برکت سے کوئی بھوکا رہتا ہے، نہ کوئی ننگا۔ بیت المال سے سب کی کفالت ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں جتنے اپاہج تھے، سب کے نام درج رجسٹر تھے۔ ان سب کو وظیفہ ملتا تھا۔ (اصابہ۔۵/۵۰)

قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کے لیے یہ بھی ایک مد تھی۔ شیر خوار بچوں کے وظائف مقرر تھے۔ ایک عام لنگر خانہ تھا جس سے فقرا ومساکین کو کھانا ملتا تھا۔ (طبقات ابن سعد۔۵/۲۸۱)

اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام نے کسی کو بھوکا، ننگا اور محتاج وفقیر رہنے ہی نہیں

دیا۔ سب کو غنی اور مالدار بنا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وقت ملک کے طول و عرض میں افلاس کا نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ مہاجر بن زید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ تقسیم کرتے تھے۔ ایک سال کے بعد دوسرے سال وہ لوگ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دوسروں کو صدقہ دینے لگے تھے۔ (طبقات ابنِ سعد۔۵/۲۵۶)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی صرف اڑھائی سال کی حکومت کی مختصر مدت میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ لوگ ان کے عمال کے پاس فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے صدقہ کا مال لے کر آتے تھے لیکن کوئی صاحبِ حاجت نہ ملتا تھا اور وہ مال واپس لے جانا پڑتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سب کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ کوئی شخص حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا۔ (فتح الباری۔۶/۴۵۱)

متذکرہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں تمام افراد کو زندگی کی اساسی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں اور کوئی فرد کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

(اقبال)

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی روشن کتاب نے حیات انسانی کے ہر تاریک گوشہ اور شعبہ کو منور فرمایا اور بنی نوع انسان کو ایسا جامع ضابطۂ حیات عطا فرمایا جو تا قیامِ قیامت لازوال رہے گا۔ ؎

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام — شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام
ہاتھ جس سمت اٹھا غنی کر دیا — موجِ بحرِ سخاوت پہ لاکھوں سلام

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کا درسِ کسب وتجارت

علامہ محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات، جامعہ اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ

تخلیق انسانی کا مقصد رب کائنات کی معرفت اور اس کی عبادت ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ [1]

اور میں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت کریں۔

مگر انسانی زندگی کی بقا اور حفاظت کے لیے خورد ونوش، لباس و پوشاک اور خانہ ومسکن ضروری ہے اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی نہ کسی حد تک سرمایہ ومال ہونا لابدی ہے۔ اور سرمایہ ومال کا حصول کسی ذریعہ وسبب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے عقلی طور پر انسان اپنی زندگی میں حصول مال کا ذریعہ اپنانے کا محتاج ہے۔ شریعت اسلامیہ نے بھی انسان کی اس محتاجی کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لیے کوئی ذریعۂ کسب اپنانا فرض قرار دیا ہے۔ لیکن اس باب میں اسے آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ جہاں سے چاہے، جب چاہے اور جیسے چاہے سرمایہ حاصل کرتا جائے خواہ کسی پر زیادتی ہو، کسی کی ایذا رسانی ہو، کسی کی حق تلفی ہو، یاد الٰہی سے غفلت ہو، عبادتیں فوت ہوں، کچھ پروانہ کرے، بس زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کرنے کی دھن میں لگا رہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جس طرح کھانے پینے، پہننے رہنے سہنے کے معاملہ میں بندوں

کو بہت سے آداب اور حدود و قیود کا پابند بنایا ہے، اسی طرح کسب کے معاملہ میں بھی بہت سے آداب اور حدود و قیود سے آشنا کیا ہے۔ اسی سے ایک مومن اور ایک غیر مومن کے طرزِ فکر اور انداز حرکت وعمل میں حدِ فاصل قائم ہوتی ہے اور دونوں کی زندگیوں میں خطِ امتیاز کھنچتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ ساری تعلیمات وحی ربانی کے تحت ہیں اور رب جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے کون سا نظام نفع بخش ہے اور کون سا نظام ضرر رساں ہے۔

اسلام دراصل خدا اور رسول کی اطاعت وفرماں برداری کا نام ہے۔ اس لیے بندۂ مسلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس سے پہلے خدا اور رسول کی رضا اور خوشنودی کو دیکھے، جس کام میں اپنے جسم و جان کے خالق و مالک جل جلالہ اور اپنے ایمان وعمل کے ہادی ومربی علیہ الصلاۃ والسلام کی رضا دیکھے اس کی بجا آوری کرے اور جس میں ناراضی وغضب کی بو پائے اس سے دور بھاگے۔ یہی شانِ ایمان ہے، یہی تقاضاے اسلام ہے۔ دنیاے فانی کی رعنائیوں اور حیات ناپائدار کی لذتوں پر فریفتہ ہونا اُس کا کام ہے جس کے فکر و خیال میں اِس جہان کے سوا کوئی جہان نہیں اور جس کی نظر میں اِس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ بندۂ مومن تو اُس جہان کی آباد کاری کے لیے فکر مند رہتا ہے جس کا ایک دن یہاں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے، اُس کا مطمحِ نظر اُس حیات کی رعنائیاں ہوتی ہیں جسے زوال نہیں، وہ اُس گھر کی ویرانی سے لرزتا ہے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔

چوں کہ تفصیل کی مہلت نہیں اس لیے اس اجمالی تمہید سے میں نے ان لوگوں کا جواب دینا چاہا ہے جو اسلامی قوانین کو خالقِ کائنات کے غیر متزلزل اور لافانی دستور کی حیثیت سے دیکھنے کے بجاے اپنی آوارہ خواہشات کے آئینے میں دیکھتے ہیں، خدا اُنھیں عقلِ سلیم دے اور صراطِ مستقیم نصیب فرمائے۔

اب آئیے دیکھیں کہ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے کسب اور طلبِ رزق کے باب میں اپنے ماننے والوں کو کیا ہدایات دی ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

۱- طَلَبُ کَسَبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ۔ ۲
حلال کمائی طلب کرنا فرض ہے، فرائض کے بعد۔

۲- طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ۔ ۳
حلال کی تلاش ہر مسلمان پر لازم ہے۔

ان حدیثوں سے جہاں طلبِ رزق اور کسب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے روزی کی جستجو اور طلبِ معاش کو حلال کی قید سے مقید کر دیا ہے۔ یہیں سے دینی اور لادینی نقطۂ نظر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ روزی کمانے کی تاکید تو فرماتی ہے مگر انسان کو آزاد نہیں چھوڑتی بلکہ اسے جائز اور بے ضرر راہوں کا پابند بناتی ہے۔ انسان کم سے کم تر حاصل کرے یا زیادہ سے زیادہ لیکن ذریعہ جائز و حلال اور مقصد پاکیزہ و طیب ہونا چاہیے۔ خبیث اور ناجائز طریقوں سے جمع کی ہوئی دولت ربِ جلیل کے یہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی، نہ ہی فاسد اور خبیث مقاصد کے لیے کمایا ہوا مال اُس تاکید و ترغیب کے تحت آتا ہے جو آقائے دو عالم ﷺ نے اپنی احادیث کریمہ میں دی ہے۔

اسلام طیب ہی طیب ہے، اس لیے وہ مقصد، ذریعہ اور مصرف تینوں کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ مال جمع کرنے کا مقصد اچھا ہے مگر تحصیلِ مال کا جو ذریعہ اپنایا وہ خراب ہے، یا ذریعہ تو بہت اچھا ہے مگر مقصد ناپاک ہے، یا ذریعہ اور مقصد دونوں پاکیزہ تھے مگر جب مال ہاتھ میں آ گیا تو بہت سارا مال ناپاک جگہوں یا لایعنی اور فضول راہوں میں صرف کر دیا، یہ تینوں صورتیں اسلام کی نظر میں مذموم ہیں اور ان پر صاحبِ مال سے مواخذہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ عبادات اور دیگر معاملات کی طرح کسب اور طلبِ رزق کے باب میں بھی ربِ جلیل کے نزدیک ہر طرح کی پاکیزگی ہی محمود و مطلوب ہے۔ اسی سے اسلامی نظریہ اور خود ساختہ پیمانوں اور اصولوں کا فرق عیاں ہو جاتا ہے۔

اب تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کچھ احادیث کریمہ پیش کی جاتی ہیں، جن سے مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے لائے ہوئے دین اور ان کی بے بہا تعلیمات کا عادلانہ

اور پاکیزہ مزاج سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پہلے چند آیاتِ کریمہ ملاحظہ ہوں۔ قرآن فرماتا ہے:

۱- یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ ۴
ترجمہ: اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اس کے پرستار ہو۔

۲- یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ ۵
ترجمہ: اے ایمان والو! حرام نہ ٹھہراؤ وہ ستھری چیزیں کہ اللہ نے تمھارے لیے حلال کیں اور حد سے نہ بڑھو۔ بے شک حد سے بڑھنے والے اللہ کو ناپسند ہیں اور کھاؤ جو کچھ تمھیں اللہ نے روزی دی حلال پاکیزہ، اور ڈرو اللہ سے جس پر تمھیں ایمان ہے۔

۳- وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ۔ ۶
ترجمہ: اور وہ رسول ستھری چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔

۴- وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ ۷
ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال جان بوجھ کر ناجائز طریقے پر کھا لو۔

۵- یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا۔ ۸
ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ

کہ کوئی سودا تمھاری باہمی رضامندی کا ہو اور اپنی جانیں قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔

دست کاری اور کسب حلال:

حدیث

۳- مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانَ یَاکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ۔ ۹

ترجمہ: اس کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں جس کو کسی نے اپنے ہاتھوں سے کام کر کے حاصل کیا ہے اور بے شک اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنی دستکاری سے کھاتے تھے۔

۴- قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِهٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٍ۔ ۱۰

ترجمہ: عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون سا کسب زیادہ پاکیزہ ہے؟ فرمایا، آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور اچھی بیع۔

بیع مبرور (اچھی بیع) وہ جس میں خیانت اور دھوکا نہ ہو یا یہ کہ وہ بیع فاسد نہ ہو۔ ۱۱

۵- اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَرِفَ۔ ۱۲

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ایسے بندۂ مومن کو پسند فرماتا ہے جو کوئی حرفت اور پیشہ رکھتا ہو۔

۶- اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی عَبْدَهٗ تَعِبًا فِیْ طَلَبِ الْحَلَالِ۔ ۱۳

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رزقِ حلال کی طلب میں محنت اور مشقت کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

۷- اِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ: یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا

وَقَالَ تَعَالٰی: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ۔
ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلَی السَّمَآءِ یَا رَبِّ یَا رَبِّ، وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ، وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ۔ ۱۴

ترجمہ: بے شک اللہ پاک ہے اور پاک ہی کو قبول فرماتا ہے اور بے شک اللہ نے مومنین کو بھی اسی کا حکم دیا ہے جس کا رسولوں کو حکم دیا۔ اس نے رسولوں سے فرمایا: اے رسولو! پاک چیزوں سے کھاؤ اور اچھے کام کرو۔ اور مومنین سے فرمایا: اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاک چیزوں سے کھاؤ۔

پھر ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے پراگندہ حال، غبار آلود ہے (یعنی ایسی حالت ہے کہ جو دعا کرے قبول ہو) وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہتا ہے (دعا کرتا ہے) مگر حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور حرام غذا سے پرورش پائی، پھر اس کی دعا کیسے قبول ہو۔

۸- اِنْ کَانَ خَرَجَ یَسْعٰی عَلٰی وُلْدٍ صِغَارٍ فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاِنْ کَانَ خَرَجَ یَسْعٰی عَلٰی اَبَوَیْنِ شَیْخَیْنِ کَبِیْرَیْنِ فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاِنْ کَانَ خَرَجَ یَسْعٰی عَلٰی نَفْسِهٖ یُعِفُّهَا فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاِنْ کَانَ خَرَجَ یَسْعٰی رِیَاءً وَّمُفَاخَرَةً فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ الشَّیْطَانِ۔ ۱۵

ترجمہ: (۱) اگر اپنے کم سن بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ ہے۔ (۲) اگر سن رسیدہ بوڑھے ماں باپ کے لیے کوشش رزق میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ میں ہے (۳) اور اپنے کو (سوال کی ذلت اور محتاجی کی کلفت سے) عفت و پارسائی میں رکھنے کے لیے کوشش میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ میں ہے (۴) اور اگر ریا و نمود اور مفاخرت کے لیے مال جمع کرنے کی کوشش میں نکلا تو وہ شیطان کی راہ میں ہے۔

۹- مَا کَسَبَ الرَّجُلُ کَسْبًا اَطْیَبَ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ، وَمَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَاَهْلِهٖ وَوُلْدِهٖ وَخَادِمِهٖ فَهُوَ صَدَقَةٌ۔ ۱۵

ترجمہ: اپنے ہاتھ سے محنت کی کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں، اور آدمی جو کچھ اپنے اوپر اور اپنے بال بچوں اور خادموں پر صرف کرے وہ صدقہ ہے۔

۱۰— طَلَبُ الْحَلَالِ مِثْلُ مُقَارَعَةِ الْاَبْطَالِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ بَاتَ عَيِيًّا مِنْ طَلَبِ الْحَلَالِ بَاتَ وَاللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ رَاضٍ۔ ۱۶

ترجمہ: رزق حلال کی طلب اللہ کی راہ میں بہادروں سے نبرد آزمائی کی طرح ہے اور جو طلبِ حلال کی محنت سے تھکا ہوا رات بسر کرے وہ خدائے تعالیٰ کی رضا میں رات بسر کرنے والا ہے۔

۱۱— طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ۔ ۱۷

ترجمہ: رزقِ حلال کی طلب ایک جہاد ہے۔

۱۲— لَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ اِلَّا وَقَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى النَّارِ اِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَنَّ اَحَدًا مِّنْكُمْ لَنْ يَّخْرُجَ مِنَ الدُّنْيَا حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهٗ، فَلَا يَطْلُبُهٗ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يُنَالُ فَضْلُهٗ بِمَعْصِيَتِهٖ۔ ۱۹

ترجمہ: جو چیز بھی تمھیں جنت سے قریب کرنے والی ہے اس کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے اور جو چیز بھی تمھیں دوزخ سے قریب کرنے والی ہے اس سے میں نے تمھیں روکا ہے۔ بے شک روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ ہرگز کوئی شخص دنیا سے نہ جائے گا جب تک اپنا مقررہ رزق پورا پورا نہ پا جائے۔ تو آدمی اپنا رزق اللہ کی نافرمانی کے ساتھ نہ طلب کرے اس لیے کہ اللہ عزوجل کا فضل اس کی نافرمانی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاتا۔

۱۳— يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَنْ يَّمُوْتَ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهٗ، فَلَا تَسْتَبْطِئُوا الرِّزْقَ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ، وَخُذُوْا مَا حَلَّ وَدَعُوْا مَا حَرُمَ۔ ۲۰

اے لوگو! ہرگز کسی کو اس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک اپنا رزق پورا پورا نہ پا جائے تو رزق ملنے میں دیر ہونے کا خیال نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور رزق کی

طلب میں عمدگی اختیار کرو، جو حلال ہو اسے لو اور جو حرام ہو اسے چھوڑ دو۔

آدابِ کسب:

۱۴— اِذَا فَتَحَ اللّٰهُ لِاَحَدِكُمْ رِزْقًا مِّنْ بَابٍ فَلْيَلْزَمْهُ۔ وفی روایۃ۔ فَلَا يَدَعُهٗ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ لَهٗ۔ ۲۱

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے ایک جہت سے کوئی رزق کھول دے تو اسے پکڑے رہے، چھوڑے نہیں، یہاں تک کہ اس کے حق میں وہ بدل جائے۔

۱۵— قَالَ عُمَرُ: مَنِ اتَّجَرَ فِيْ شَيْءٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يُصِبْ فِيْهِ فَلْيَتَحَوَّلْ اِلٰى غَيْرِهٖ۔ ۲۲

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص تین مرتبہ کسی چیز کی تجارت کرے پھر بھی اس میں کامیاب نہ ہو تو کسی اور تجارت کی طرف منتقل ہو جائے۔

۱۶— اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِيْ خَبَايَا الْاَرْضِ۔ ۲۳

ترجمہ: زمین کی پوشیدہ جگہوں میں رزق تلاش کرو۔

۱۷— اَلتَّاجِرُ الْجَبَانُ مَحْرُوْمٌ وَالتَّاجِرُ الْجَسُوْرُ مَرْزُوْقٌ۔ ۲۴

ترجمہ: اندیشہ کرنے والا بزدل تاجر نامراد رہتا ہے، ہمت کرنے والا دلیر تاجر رزق پاتا ہے۔

۱۸— اِذَا صَلَّيْتُمُ الْفَجْرَ فَلَا تَنَامُوْا عَنْ طَلَبِ اَرْزَاقِكُمْ۔ ۲۵

ترجمہ: جب نمازِ فجر پڑھ لو تو اپنے رزق کی تلاش سے غافل ہو کر سو نہ جاؤ۔

۱۹— مَنِ اسْتَبْطَأَ الرِّزْقَ فَلْيُكْثِرْ مِنَ التَّكْبِيْرِ، وَمَنْ كَثُرَ هَمُّهٗ وَغَمُّهٗ فَلْيُكْثِرْ مِنَ الْاِسْتِغْفَارِ۔ ۲۶

ترجمہ: جو رزق ملنے میں دیر محسوس کرے تو تکبیر زیادہ کہے اور جس کا رنج و غم زیادہ ہو تو استغفار زیادہ کرے۔

۲۰— مَا يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ اِذَا عَسُرَ عَلَيْهِ اَمْرُ مَعِيْشَتِهٖ اَنْ يَّقُوْلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ

بَيْتِہٖ: بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِىْ وَمَالِىْ وَدِيْنِىْ اَللّٰهُمَّ اَرْضِنِىْ بِقَضَائِكَ، وَبَارِكْ لِىْ فِيْمَا قُدِّرَلِىْ، حَتّٰى لَا اُحِبَّ تَعْجِيْلَ مَا اَخَّرْتَ، وَلَا تَا خِيْرَ مَا عَجَّلْتَ۔ ۲۷

ترجمہ: جب تم میں سے کسی کو معاش کی دشواری ہو تو اس کے لیے اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ دعا کرنے سے کیا مانع ہے؟ اللہ کے نام سے، میرے، نفس، مال اور دین پر، اے اللہ مجھے اپنی قضا سے راضی کر اور میرے لیے جو مقدر ہے اس میں برکت عطا فرما کہ میں اس کی جلدی نہ چاہوں جسے تو نے موخر رکھا ہے اور اس کا موخر ہونا نہ چاہوں جسے تو نے جلد رکھا ہے۔

۲۱- كَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَادَخَلَ السُّوْقَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِهَا، وَخَيْرِ مَا فِيْهَا، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا، وَشَرِّمَا فِيْهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُكَ اَنْ لَّااُصِيْبَ فِيْهَا يَمِيْنًا فَاجِرَةً، وَصَفْقَةً خَاسِرَةً۔ ۲۸

ترجمہ: نبی کریم ﷺ جب بازار میں داخل ہوتے تو کہتے: اے اللہ میں تجھ سے اس کی خیر، اور جو کچھ اس میں ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور تجھ سے اس کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ لیتا ہوں۔ اے اللہ! تجھ سے میرا سوال ہے کہ اس میں کوئی جھوٹی قسم اور خسارے والا سودا نہ پاؤں۔

ترکِ کسب اور مانگنے کی مذمت:

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف کسب کی ترغیب دی ہے اور اس کے آداب بیان فرمائے ہیں۔ دوسری طرف کسب چھوڑ کر مانگنے کا عمل اپنانے کی سخت مذمت کی ہے اور اس پر وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ یہاں چند احادیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:

۲۲- سوال ایک قسم کی خراش ہے کہ آدمی سوال کر کے اپنے منہ کو نوچتا ہے، جو چاہے اپنے منہ پر اس خراش کو باقی رکھے اور جو چاہے چھوڑ دے۔ ہاں اگر

صاحبِ سلطنت سے اپنا حق مانگے یا ایسے امر میں سوال کرے کہ اس سے چارہ نہ ہو تو جائز ہے۔ ۲۹

۲۳- جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرے تو وہ جہنم کا گرم پتھر ہے۔ اب اسے اختیار ہے چاہے تھوڑا مانگے یا زیادہ مانگے۔ ۳۰

۲۴- جو شخص بغیر حاجت سوال کرتا ہے گویا وہ انگارا کھاتا ہے۔ ۳۱

۲۵- جو شخص سوال کرے حالاں کہ اس کے پاس اتنا ہے کہ وہ سوال سے بے نیاز ہے تو وہ آگ کی زیادتی چاہتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: وہ کیا مقدار ہے، جس کے ہوتے ہوئے سوال جائز نہیں؟ فرمایا: صبح و شام کا کھانا۔ ۳۲

۲۶- قَبِیْصہ بن مُخَارِق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ مجھ پر تاوان لازم آیا، میں نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا۔ فرمایا: ٹھہرو، ہمارے پاس صدقہ کا مال آئے گا تو تمھارے لیے حکم فرمائیں گے۔

پھر فرمایا: اے قبیصہ سوال حلال نہیں مگر تین باتوں میں۔ (۱) کسی نے ضمانت لی ہو (یعنی کسی قوم کی طرف سے دیت کا ضامن ہوا، یا آپس کی جنگ میں صلح کرائی اور اس پر کسی مال کا ضامن ہوا) تو اسے سوال حلال ہے، یہاں تک کہ وہ مقدار پائے پھر باز رہے۔ (۲) یا کسی پر آفت آئی کہ اس کے مال کو تباہ کر گئی تو اسے سوال حلال ہے یہاں تک کہ بسر اوقات کے لیے پا جائے۔ (۳) یا کسی کو فاقہ پہنچا اور اس کی قوم کے تین عقل مند شخص گواہی دیں کہ فلاں کو فاقہ پہنچا ہے (تین کی گواہی کا حکم بطور استحباب ایسے شخص کے لیے ہے جس کا مال دار ہونا معلوم و مشہور ہو ورنہ صرف اس کا بیان کافی ہے) تو اس کے لیے سوال حلال ہے اور ان تینوں باتوں کے سوا اے قبیصہ سوال کرنا حرام ہے کہ سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔ ۳۳

۲۷- کوئی شخص رسی لے کر جائے اور پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لا کر بیچے اور سوال کی ذلت سے اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو بچائے یہ اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے کہ لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔ ۳۴

۲۸- فِراسی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، کیا میں سوال کروں؟ فرمایا: نہیں! اور اگر چارۂ کار نہ ہو تو صالحین سے مانگو۔ ۳۵

مولانا علی قاری علیہ الرحمہ نے مرقاۃ میں اس کی کئی وجہیں بیان فرمائیں۔

(۱) صالح شخص دے گا تو مالِ حلال سے دے گا۔ (۲) وہ کریم اور مہربان ہوگا۔ (۳) پردہ دری نہ کرے گا، تمھاری محتاجی اور اپنی بخشش کا راز اِفشا نہ کرے گا۔ (۴) تمھارے لیے دعاے خیر کرے گا جو مقبول ہوگی۔

۲۹- عبداللہ ابن الساعدی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے صدقہ کا عامل بنایا۔ جب میں نے صدقہ وصول کرلیا اور انھیں لاکر دیا تو انھوں نے میرے لیے اجرت دینے کا حکم فرمایا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ میں نے خدا کے لیے یہ کام کیا ہے اور میرا اجر اللہ کے کرم پر ہے۔ فرمایا: جو دیا جارہا ہے اسے لے لو، اس لیے کہ میں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ کام کیا تھا۔ سرکار نے میرے لیے اجرت کا حکم دیا تو میں نے ایسی ہی بات کہی جو تم نے کہی، اس پر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: جب مانگے بغیر تمھیں ملے تو لے لو، پھر کھاؤ اور صدقہ کردو۔ ۳۶

۳۰- ایک انصاری نے سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہوکر سوال کیا، ارشاد فرمایا: کیا تمھارے گھر میں کچھ نہیں ہے؟ عرض کیا: ہے تو۔ ایک ٹاٹ ہے جس کا ایک حصہ ہم اوڑھتے ہیں اور ایک حصہ بچھاتے ہیں اور ایک لکڑی کا پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: میرے پاس دونوں چیزیں حاضر کرو۔ وہ حاضر لائے۔ سرکار نے اپنے دستِ مبارک میں لے کر ارشاد فرمایا: انھیں کون خریدتا ہے؟ ایک صاحب نے کہا ایک درہم کے عوض میں خریدتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دیتا ہے؟ دو یا تین بار فرمایا۔ ایک اور صاحب نے عرض کیا: میں دو درہم میں لیتا ہوں۔ سرکار نے انھیں یہ دونوں چیزیں دے دیں اور درہم لے لیے پھر انصاری کو دونوں

درہم دے کر ارشاد فرمایا: ایک کا غلہ خرید کر گھر ڈال آؤ اور ایک کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ وہ حاضر لائے۔ سرکار نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں بینٹ ڈالا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹو اور بیچو، اور یہاں تم پندرہ دن تک نظر نہ آنا۔ وہ گئے۔ لکڑیاں کاٹ کر بیچتے رہے۔ پندرہ دن کے بعد حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ چند درہم کا کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال تمھارے منہ پر چھالا ہوکر آتا۔ سوال درست نہیں مگر تین شخصوں کے لیے (۱) ایسی محتاجی والے کے لیے جو اسے زمین پر لٹا دے۔ (۲) یا ایسے تاوان والے کے لیے جو اسے رسوا کردے۔ (۳) یا خون (دیت) والے کے لیے جو اسے تکلیف پہنچائے۔ ۳۷

۳۱- حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

مَكْسَبَةٌ فِيهَا بَعْضُ الدَّنَاءَةِ خَيْرٌ مِنْ مَسألة النّاس۔ ۳۸

ایسا ذریعۂ کسب جو کچھ نیچا شمار ہوتا ہو، لوگوں سے مانگنے سے بہتر ہے۔

۳۲- حدیث پاک میں ہے:

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَّلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ۔ ۳۹

صدقہ حلال نہیں مال دار کے لیے، نہ ایسے شخص کے لیے جو توانا وتندرست ہو۔

مذمت سوال سے متعلق احادیث بکثرت ہیں۔ پچیس حدیثیں بہارِ شریعت پنجم میں صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے ذکر فرمائی ہیں۔ مندرجہ بالا اکثر حدیثوں کا ترجمہ معمولی فرق کے ساتھ میں نے وہیں سے لیا ہے۔ مزید احادیث وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

کسب حرام کی مذمت:

۳۳- لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلَ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكَ لَهُ فِيهِ وَلَا يَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ اِلَّا كَانَ زَادَهُ اِلَى النَّارِ ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُوا لسَّيِّئَ بِا لسَّيِّئِ وَلَا كِنْ يَمْحُوا لسَّيِّئَ بِالْحَسَنِ،

اِنَّ الْخَبِیْثَ لَا یَمْحُوْ الْخَبِیْثَ۔ ۴۰

اگر کوئی بندہ مالِ حرام کمائے پھر اس سے صدقہ کرے تو وہ مقبول نہیں، اس سے خرچ کرے تو اس میں برکت نہ ہو اور اپنے بعد چھوڑ مرے تو جہنم میں اسے لے جانے کا سامان ہو (یعنی مال کی تین حالتیں ہیں اور حرام مال کی تینوں حالتیں خراب ہیں) اللہ تعالیٰ برائی سے برائی کو نہیں مٹاتا، ہاں نیکی سے برائی کو محو فرماتا ہے، بے شک خبیث کو خبیث نہیں مٹاتا۔

۳۴- لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ، وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِہٖ۔ ۴۱

جو گوشت حرام سے اگا ہے جنت میں نہ جائے گا (یعنی ابتداءً نہ جائے گا) اور جو گوشت حرام سے اگا ہے جہنم اس کا زیادہ حق دار ہے۔

۳۵- مَنْ لَّمْ یُبَالِ مِنْ اَیْنَ کَسَبَ الْمَالَ لَمْ یُبَالِ اللّٰہُ مِنْ اَیْنَ اَدْخَلَہُ النَّارَ۔ ۴۲

جسے یہ پروا نہ ہو کہ مال کہاں سے حاصل کیا اس سے متعلق خدا کو بھی پروا نہیں کہ اسے کہاں سے جہنم میں داخل کرے۔

۳۶- مَنِ اشْتَرٰی سَرِقَۃً وَھُوَ یَعْلَمُ أَنَّھَا سَرِقَۃٌ فَقَدْ شَرِکَ فِیْ عَارِھَا وَاِثْمِھَا۔ ۴۲

جس نے چوری کا مال خریدا یہ جانتے ہوئے کہ چوری کا مال ہے تو اس کے عار اور گناہ میں وہ بھی شریک ہے۔

تجارت اور دیگر انواعِ کسب:

۳۷- اِنَّ اَطْیَبَ الْکَسْبِ کَسْبُ التُّجَّارِ الَّذِیْنَ اِذَا حَدَّثُوْا لَمْ یَکْذِبُوْ، وَاِذَا ائْتُمِنُوْا لَمْ یَخُوْنُوْا، وَاِذَا وَعَدُوْا لَمْ یُخْلِفُوْا، وَاِذَا اشْتَرَوْا لَمْ یَذُمُّوْا، وَاِذَا بَاعُوْا لَمْ یُطْرُوْا، وَاِذَا کَانَ عَلَیْھِمْ لَمْ یَمْطُلُوْا، وَاِذَا کَانَ لَھُمْ لَمْ یُعَسِّرُوْا۔ ۴۳

سب سے پاکیزہ ان تاجروں کی کمائی ہے جو بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، انھیں امانت دی جائے تو خیانت نہ کریں، وعدہ کریں تو اس کی خلاف ورزی نہ کریں، جب دوسرے سے خریدیں تو برائی نہ بیان کریں اور اپنی چیز بیچیں تو اس کی تعریف میں مبالغہ نہ کریں۔ ان پر کسی کا آتا ہو تو ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کریں اور ان کا دوسرے پر آتا ہو تو سختی نہ کریں۔

۳۸- اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ۔ ۴۴

راست باز، امانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔

۳۹- اُوْصِیْکُمْ بِالتُّجَّارِ خَیْرًا فَاِنَّھُمْ بُرُدُ الْاٰفَاقِ وَاُمَنَاءُ اللّٰہِ فِیْ الْاَرْضِ۔ ۴۵

میں تم لوگوں کو تاجروں سے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ آفاقِ عالم کے قاصد اور زمین میں اللہ کے امین ہیں۔

۴۰- اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتٰی جَمَاعَۃً مِّنَ التُّجَّارِ، فَقَالَ: یَا مَعْشَرَ التّجار! فَاسْتَجَابُوْا لہ، وَمَدُّوْا اَعْنَاقَھُمْ، فَقَالَ: اِنَّ اللّٰہَ بَاعِثُکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃ فُجَّارًا، اِلَّا مَنْ صَدَقَ وَوَصَلَ وَفِیْ لفظ، وَبَرَّ وَاَدَّی الْاَمَانَۃَ۔ ۴۶

رسول اللہ ﷺ ایک جماعتِ تجار کے پاس تشریف لائے۔ فرمایا: اے گروہِ تاجراں! سب نے لبیک کہی اور اپنی گردنیں دراز کرلیں۔ فرمایا: بے شک اللہ قیامت کے دن تمھیں بدکار اٹھائے گا مگر وہ جو سچ بولے، رشتہ جوڑے، نیک سلوک کرے اور امانت ادا کردے۔

۴۱- عَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ غَرَزَۃ قال: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَبِیْعُ فِیْ السُّوْقِ، وَنَحْنُ نُسَمَّی السَّمَاسِرَۃَ، فَقَالَ یَا مَعْشَرَالتُّجَّارِ اِنَّ سُوْقَکُمْ ھٰذِہٖ یُخَالِطُھَا اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْہ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّدَقَۃَ اَوْ مِنْ صِدَقِہٖ۔ ۴۷

حضرت قیس بن ابی غرزہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ ہم پر جلوہ افروز ہوئے جب ہم بازار میں بیع کررہے تھے۔ ہم تاجروں کو پہلے "سماسرہ" کہا جاتا تھا۔

سرکار نے فرمایا: اے تاجرو! تمھارے اس بازار میں لغو اور قسم کی آمیزش ہوتی ہے تو تم کچھ صدقہ کی آمیزش کیا کرو (یعنی راہِ خدا میں کچھ دیتے رہو تا کہ تجارت کی خامیوں کی تلافی ہوا کرے)۔

۴۲- عَلَيْكَ بِالْبَزِّ، فَاِنَّ صَاحِبَ الْبَزِّ يُعْجِبُهُ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ بِخَيْرٍ وَّ فِيْ خِصْبٍ۔ ۴۸
پارچہ فروشی اختیار کرو اس لیے کہ کپڑوں کا تاجر یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ خیر اور شادابی کے ساتھ رہیں۔

۴۳- عَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ الرِّجَالِ الْخِيَاطَةُ، وَعَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ النِّسَاءِ الْغَزْلُ۔ ۴۹
نکوکار مردوں کا کام خیاطی ہے اور نکوکار عورتوں کا کام سوت کاتنا ہے۔

۴۴- اُحْرُثُوْا، فَاِنَّ الْحَرْثَ مُبَارَكٌ وَاَكْثِرُوْا فِيْهِ مِنَ الْجَمَاجِمِ۔ ۵۰
کاشت کرو، اس لیے کہ کاشت کاری میں برکت ہے اور کھیت میں (نظر بد کے دفعیہ کے لیے جانوروں کی) کھوپڑیاں زیادہ نصب کرو۔

۴۵- اِتَّخِذُوْا غَنَمًا، فَاِنَّهَا تَرُوْحُ بِخَيْرٍ وَتَغْدُوْا بِخَيْرٍ۔ ۵۱
بکریاں پالو، اس لیے کہ وہ خیر کے ساتھ شام کو آتی ہیں اور خیر کے ساتھ صبح کو نکلتی ہیں۔

۴۶- لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْمَعِيْشَةَ جَعَلَ الْبَرَكَاتِ فِيْ الْحَرْثِ وَالْغَنَمِ۔ ۵۲
جب اللہ تعالیٰ نے اسباب معاش پیدا کیے تو کھیتی اور بکریوں میں برکتیں رکھیں۔

۴۷- خَيْرُ مَالِ الْمَرْءِ مُهْرَةٌ مَّامُوْرَةٌ اَوْسِكَّةٌ مَّابُوْرَةٌ۔ ۵۳
آدمی کا بہتر مال سدھایا ہوا گھوڑے کا بچہ ہے یا گابھ لگی ہوئی کھجوروں کی قطاریں۔

۴۸- اَحَلُّ الْكَسْبِ مَا مَشَتْ فِيْهِ هَاتَانِ، يَعْنِى الرِّجْلَيْنِ، وَمَا عَمِلَتْ فِيْهِ هَاتَانِ، يَعْنِىُ اليدين، وَمَا عَرِقَتْ فِيْهِ هٰذِه يعنى الجبين۔ ۵۴
حلال ترین کمائی وہ ہے جس میں یہ دونوں چلیں یعنی دونوں پیر، اور جس میں یہ دونوں کام کریں یعنی دونوں ہاتھ اور جس میں یہ عرق آلود ہو، یعنی پیشانی۔

آدابِ معاملت:

۴۹- رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمِحًا اِذَا بَاعَ، وَاِذَا اشْتَرٰى، وَاِذَا اقْتَضٰى۔ ۵۵
خدا اس پر رحم فرمائے جو نرمی کا رویہ رکھے جب بیچے، جب خریدے اور جب تقاضا کرے۔

۵۰- تم میں سے پہلے کے لوگوں میں ایک شخص تھا، اس کے پاس موت کا فرشتہ روح قبض کرنے آیا۔ اس سے کہا گیا، کیا تم نے کوئی کارِ خیر کیا ہے؟ عرض کیا: میں نہیں جانتا، فرمایا گیا: غور کرو، عرض کیا: میں تو اپنا کوئی کارِ خیر نہیں جانتا بجز اس کے کہ دنیا میں لوگوں سے خرید وفروخت کرتا تھا تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا مال دار کو مہلت دیتا اور تنگ دست سے درگزر کرتا۔ یہ حضرت حذیفہ کی روایت ہے۔ (بخاری ومسلم) اس کے ہم معنی حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت ابو مسعود انصاری سے امام مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ، تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِىْ۔ عفو ودرگزر کا میں تم سے زیادہ حق دار ہوں، اے فرشتو! میرے بندے سے درگزر کرو۔ ۵۶

۵۱- كَانَ رَجُلٌ يُّدَايِنُ النَّاسَ، فَكَانَ يَقُوْلُ لِفَتَاهُ: اِذَا اَتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنَّا، فَلَقِىَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ۔ ۵۷
ایک شخص لوگوں سے دَین کا معاملہ کرتا تھا تو اپنے غلام سے یوں کہتا تھا کہ جب تم کسی تنگ دست کے پاس جاؤ تو اس سے درگزر کر دیا کرو، شاید اللہ ہم سے درگزر فرمائے۔ بعد موت وہ خدا سے ملا تو رب تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔

۵۲- مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْوَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ ۵۸

جو کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا دین معاف کر دے تو خدا قیامت کے کرب و غم سے اس کو نجات دے گا۔

۵۳- مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْم، فَاِذَا اُتْبِعَ اَحَدُکُمْ عَلٰی مَلِیٍٔ فَلْیَتْبَعْ۔ ۵۹
دینے میں مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ جب کوئی مدیون تم میں سے کسی کو مال دار کے پیچھے لگائے (دین کی ادائیگی اس کے حوالے کرے) تو وہ اس مال دار سے تقاضا کرے۔

۵۴- عَنْ جَابِرٍ قَالَ : قَضَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَزَادَنِیْ۔
حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے میرا قرض واپس کر دیا اور مجھے زیادہ دیا۔

۵۵- مَنْ کَانَ لَہٗ عَلٰی رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَہٗ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ یَوْمٍ صَدَقَۃٌ۔ ۶۰
جس کا کسی پر حق آتا ہو پھر وہ اسے ادائیگی میں مہلت دے دے تو ہر روز اتنا مال صدقہ کرنے کا ثواب اسے ملے۔

۵۶- بَاکِرُوْا فِیْ طَلَبِ الرِّزْقِ وَالْحَوَائِجِ فَاِنَّ الْغُدُوَّ بَرَکَۃٌ وَنَجَاحٌ۔ ۶۱
رزق اور حاجتوں کی طلب میں صبح سویرے نکلو، اس لیے کہ صبح کو نکلنے میں برکت اور کامیابی ہے۔

۵۷- اِذَا وَزَنْتُمْ فَارْجَحُوْا۔ ۶۲
(اے بیچنے والو!) جب تم تولو تو جھکا ہوا تولو۔

۵۸- عَنْ عُمَرَ قَالَ: لَا یَبِعْ فِیْ سُوْقِنَا ھٰذَا اِلَّا مَنْ تَفَقَّہَ فِی الدِّیْنِ۔ ۶۳
امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمارے اس بازار میں وہی شخص بیع کرے جو دین میں فقاہت رکھتا ہو۔

خیارِ شرط:

"بائع و مشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعی طور پر بیع نہ کریں بلکہ عقد میں یہ شرط کر دیں کہ اگر منظور نہ ہوا تو بیع باقی نہ رہے گی۔ اسے خیارِ شرط کہتے ہیں۔

اور اس کی ضرورت طرفین کو ہوا کرتی ہے، کیوں کہ کبھی بائع اپنی ناواقفی سے کم داموں میں چیز بیچ دیتا ہے۔ یا مشتری اپنی نادانی سے زیادہ داموں میں خرید لیتا ہے، یا چیز کی اسے شناخت نہیں، ضرورت ہے کہ دوسرے سے مشورہ کر کے صحیح رائے قائم کرے اور اگر اس وقت نہ خریدے تو چیز جاتی رہے گی۔ یا بائع کو اندیشہ ہے کہ گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں شرع مطہر نے دونوں کو یہ موقع دیا ہے کہ غور کر لیں۔ اگر نا منظور ہو تو خیار کی بنا پر بیع کو نا منظور کر دیں۔" ۶۴

اب اس عنوان پر چند احادیث ملاحظہ ہوں:

۵۹- اَلْمُتَبَایِعَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِہٖ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا اِلَّا بَیْعَ الْخِیَارِ۔ ۶۵
بائع و مشتری میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہے جب تک جدا نہ ہوں (یعنی جب تک عقد میں مشغول ہوں عقد تمام نہ ہوا ہو) مگر بیع خیار (کہ اس میں بعد عقد بھی اختیار رہتا ہے۔ بہار شریعت ۱۱/۳۶)

۶۰- اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا، فَاِنْ صَدَقَا وَ بَیَّنَا بُوْرِکَ لَھُمَا فِیْ بَیْعِھِمَا ، وَاِنْ کَتَمَا وَکَذَبَا مُحِقَتْ بَرَکَۃُ بَیْعِھِمَا۔ ۶۶
بائع و مشتری کو اختیار حاصل ہے جب تک جدا نہ ہوں۔ اگر وہ دونوں سچ بولیں اور عیب کو ظاہر کر دیں تو ان کے لیے بیع میں برکت ہوگی اور اگر عیب کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔

۶۱- اَلْخِیَارُ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ۔ ۶۷
خیار تین دن تک ہے۔

۶۲- اِذَا بَایَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَۃَ ، ثُمَّ اَنْتَ بِالْخِیَارِ فِیْ کُلِّ سِلْعَۃٍ اِبْتَعْتَھَا ثَلَاثَ لَیَالٍ، فَاِنْ رَضِیْتَ فَاَمْسِکْ، وَاِنْ سَخِطْتَ فَارْدُدْ۔ ۶۸
جب تم کسی سے بیع کا معاملہ کرو تو یہ کہہ دو کہ "دھوکا نہیں" پھر جو سامان بھی خریدو، اس میں تمھیں تین دن اختیار ہوگا۔ اگر پسند ہو تو رکھو، ناپسند ہو تو واپس کر دو۔

خیارِ رُؤیت:

خیارِ رُؤیت کیا ہے؟ اس سے متعلق مصنف بہارِ شریعت علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چیز کو بغیر دیکھے بھالے خرید لیتے ہیں اور دیکھنے کے بعد وہ چیز ناپسند ہوتی ہے، ایسی حالت میں شرعِ مطہر نے مشتری (خریدار) کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر دیکھنے کے بعد چیز کو نہ لینا چاہے تو بیع کو فسخ کردے۔ اس کو خیارِ رویت کہتے ہیں۔ ۱؎

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

۶۳- مَنِ اشْتَرٰی شَیْئًا لَّمْ یَرَہٗ فَھُوَ بِالْخِیَارِ اِذَا رَاٰہُ اِنْ شَاءَ اَخَذَہٗ ، وَاِنْ شَاءَ تَرَکَہٗ۔ ۲؎

جس نے ایسی چیز خریدی جس کو دیکھا نہ ہو تو دیکھنے کے بعد اسے اختیار ہے، لے یا چھوڑ دے۔

بیہقی و دار قطنی نے اسے بسندِ ضعیف روایت کیا ہے مگر اس حدیث کو خود امامِ اعظم ابوحنیفہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

اس کی مزید تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ایک زمین بصرہ میں تھی۔ وہ انھوں نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو بیچ دی، کسی نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے کہا اس بیع میں آپ کا نقصان ہے۔ انھوں نے کہا یہ زمین میں نے بغیر دیکھے ہوئے خریدی ہے، اس لیے مجھے اس بیع میں خیار حاصل ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی کسی نے کہا کہ اس بیع میں آپ کا گھاٹا ہے۔ انھوں نے بھی فرمایا: میں نے اپنی زمین دیکھے بغیر بیچ دی ہے، اس لیے اس بیع میں مجھے خیار حاصل ہے۔ دونوں حضرات نے اس معاملے میں جُبَیر بن مُطعِم رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا۔ انھوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے لیے خیار حاصل ہونے کا فیصلہ کیا۔

یہ واقعہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے ہوا کسی نے اس پر انکار نہ کیا تو گویا واقعہ کے وقت موجود تمام صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا کہ کوئی چیز بغیر دیکھے خرید لی تو خریدار کو خیار

رویت حاصل ہوگا۔ ۳؎

یہ واقعہ امام طحاوی و بیہقی نے حضرت علقمہ بن وقّاص لیثی سے روایت کیا۔ ۴؎

خیارِ عیب:

عرفِ شرع میں عیب جس کی وجہ سے بیع کو واپس کر سکتے ہیں وہ ہے جس سے تاجروں کی نظر میں چیز کی قیمت کم ہو جائے

مبیع میں عیب ہو تو اس کا ظاہر کر دینا بائع پر واجب ہے چھپانا حرام و گناہِ کبیرہ ہے۔ یوں ہی ثمن کا عیب مشتری پر ظاہر کر دینا واجب ہے۔ اگر بغیر عیب ظاہر کیے چیز بیع کر دی تو معلوم ہونے کے بعد واپس کر سکتے ہیں۔ اس کو خیارِ عیب کہتے ہیں۔

خیارِ عیب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وقتِ عقد یہ کہہ دے کہ عیب ہوگا تو پھیر دیں گے، کہا ہو، یا نہ کہا ہو بہر حال عیب معلوم ہونے پر مشتری کو واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

لہذا اگر مشتری کو نہ خریدنے سے پہلے عیب پر اطلاع تھی، نہ وقتِ خریداری اس کے علم میں یہ بات آئی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں عیب ہے۔ تھوڑا عیب ہو یا زیادہ، خیارِ عیب حاصل ہے کہ مبیع کو لینا چاہے تو پورے دام پر لے لے، واپس کرنا چاہے تو واپس کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ واپس نہ کرے بلکہ دام کم کر دے۔

ہاں اگر بائع نے یہ کہہ دیا ہو کہ میں اس کے کسی عیب کا ذمہ دار نہیں تو خیارِ عیب ثابت نہ ہوگا۔ ۵؎

اب اس مضمون سے متعلق چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:

۶۴- مَنْ بَاعَ عَیْبًا لَمْ یُنَبِّہْ لَمْ یَزَلْ فِیْ مَقْتِ اللّٰہِ ، اَوْ لَمْ تَزَلِ الْمَلٰئِکَۃُ تَلْعَنُہٗ۔ ۶؎

جس نے عیب والی چیز بیع کی اور اس کو ظاہر نہ کیا وہ ہمیشہ اللہ کی ناراضی میں ہے، یا فرمایا کہ ہمیشہ فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

۶۵- اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی صُبْرَۃِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ یَدَہٗ فِیْھَا، فَنَالَتْ اَصَابِعُہٗ بَلَلًا فَقَالَ مَا ھٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟ قَالَ:

اَفَلَا جَعَلْتَهٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰی یَرَاهُ النَّاسُ۔ مَنْ غَشَّنِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ ۷۷
حضور اقدس ﷺ ایک غلہ کی ڈھیری کے پاس گزرے، اس میں ہاتھ ڈال دیا، حضور کو انگلیوں میں تری محسوس ہوئی، ارشاد فرمایا: اے غلہ والے یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اس پر بارش کا پانی پڑ گیا تھا۔ ارشاد فرمایا: تو نے بھیگے ہوئے کو اوپر کیوں نہ کر دیا کہ لوگ دیکھتے جو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔

۶۶- لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔ ۷۸
نہ خود نقصان میں پڑے، نہ دوسرے کو نقصان میں ڈالے۔

۶۷- لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔ مَنْ ضَارَّ ضَارَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ شَاقَّ شَقَّهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ۔ ۷۹
نہ خود ضرر اٹھائے، نہ دوسرے پر ضرر ڈالے، جو ضرر پہنچائے گا اللہ اس کو ضرر پہنچائے گا، جو کسی کو مشقت میں ڈالے گا اللہ اس کو مشقت میں رکھے گا۔

۶۸- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بشیر نامی ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ وہ تین دن تک حاضر بارگاہ نہ ہوئے۔ پھر آئے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ سرکار نے فرمایا: بشیر! تمھارا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ عرض کیا: میں نے ایک اونٹ خریدا تھا وہ بھاگ نکلا، میں اسی کی تلاش میں تھا، میں نے اسے خریدتے وقت کوئی شرط نہ رکھی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: البعیرُ الشَّرُوْدُ یُرَدّ منه۔ بھگوڑا اونٹ اسی عیب کی وجہ سے واپس کیا جا سکتا ہے (پہلے سے شرط ہونا ضروری نہیں)۔ ۸۰

۶۰ حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ جس نے کپڑے میں کوئی عیب پایا اسے واپس کر دے۔ ۸۱

۷۰- مَخْلَد بن خُفَاف کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا تھا اور اس کو کسی کام سے لگا کر اس سے کچھ آمدنی بھی حاصل کر لی تھی، پھر میں نے اس کے عیب پر اطلاع پائی میں نے اس کا مقدمہ عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے پاس پیش کیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں غلام واپس کر دوں، اور اس کے

ذریعہ جو آمدنی ہوئی ہے وہ بھی واپس کر دوں۔ پھر میں حضرت عروہ سے ملا اور ان کو واقعہ سنایا، انھوں نے کہا: شام کو میں عمر بن عبد العزیز کے پاس جا کر انھیں بتاؤں گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے معاملے میں یہ
فیصلہ فرمایا کہ ''الخراج بالضمان'' آمدنی ضمان کے ساتھ ہے۔ (یعنی جس کی ذمہ داری میں کوئی چیز ہو وہی اس کی آمدنی کا مستحق ہے،، مبیع جب تک واپس نہ ہو خریدار ہی کی ضمان میں ہے) حضرت عروہ نے عمر بن عبد العزیز کے پاس شام کو جا کر یہ بتایا تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آمدنی مجھے واپس ملے۔ ۸۲

اِقالہ:

کبھی آدمی کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کے بعد افسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ معاملہ ختم ہو جائے اور میری چیز پھر سے مجھے واپس مل جائے۔ مگر تنہا وہ بیع ختم نہیں کر سکتا، جب تک دوسرا راضی نہ ہو۔ حدیث پاک میں اس کی ترغیب آئی ہے کہ کوئی اپنے معاملہ پر پشیمان ہے، اس کی خاطر داری کے لیے دوسرے نے بھی موافقت کر کے معاملہ ختم کر دیا تو رب تعالیٰ کے یہاں ثواب کا مستحق ہوگا۔ دو شخصوں کے درمیان پہلے جو عقد ہوا اسی کے ختم کر دینے کو اِقالہ کہتے ہیں۔ سرکار ارشاد فرماتے ہیں:

۷۱- مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ ۸۳
جو کسی مسلمان سے اقالہ کرے اللہ اس کی لغزش بروزِ قیامت معاف فرمائے گا۔

دیگر ذرائع کسب:

حصولِ مال، یا تحصیلِ مال کے باب میں اور بھی ذرائع ہیں مثلاً: وراثت، ھبہ، صدقہ، قرض، اجارہ، شرکت، مضاربت وغیرہا۔ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نے ہر ایک سے متعلق ہدایات دی ہیں۔
اسی طرح بیع و شرا، اجارہ وغیرہ کی بہت سی صورتیں اور دیگر بہت سے ذرائع

کو اسلام نے حرام و ناجائز قرار دیا ہے یا مکروہ و ناپسند رکھا ہے ۔ مثلاً: سود ، غصب، باطل و فاسد یا دھوکے والی بیعیں ،لوگوں کی حاجت کے وقت غلہ روک رکھنا ، اذانِ جمعہ کے بعد خرید وفروخت میں مشغول ہونا۔ان سب سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فقہاے اسلام کی تشریحات موجود ہیں،جن کی تفصیل کثیر صفحات اور اطمینان وسکون کے اوقات کی طالب ہے۔

ارادہ تھا کہ سب پر تھوڑی تھوڑی گفتگو کر دی جائے گی مگر بروقت اس کی بھی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے مختصراً عرض ہے کہ رحمۃ للعالمین ﷺ نے اپنے ارشادات میں ان حقائق کی تعلیم دی ہے:

۱- مال اللہ کا عطیہ ہے۔اس کی تحصیل اور اس کے خرچ میں وہی طریقہ اپناؤ جو رب نے پسند فرمایا ہے اور جس کی اس نے اجازت دی ہے۔ وہی تمھارا خالق و مالک ہے ۔ وہی ہر لمحہ تمھاری پرورش کرنے والا ہے۔تمھارا جسم،تمھاری جان،تمھارا مال،تمھاری صحت،تمھاری قوت سب اسی کا عطیہ ہے۔تھوڑی مدت اور قلیل عرصۂ حیات کے لیے اس نے تمھیں مختار بنا دیا تو اپنے آغاز وانجام کو فراموش کر کے رب کی نافرمانی میں نہ پڑو ورنہ اس جہانِ فانی چند روزہ کے بعد ایک اور جہان ہے جو غیر فانی اور جاودانی ہے......

۲- ہر اس ذریعہ سے بچو جس میں خدا کی ناراضی اور اس کا غضب ہو۔

۳- باہمی ہمدردی ، ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، فرائضِ الٰہیہ کی بجا آوری،خلقِ خدا پر شفقت ورحمت اور تنگ دستوں کی اعانت کبھی نہ بھولو۔ اسی سے خلق اور خالق کے یہاں تمھیں وقار واعتبار حاصل ہوسکتا ہے۔

۴- کسی پر ظلم ، کسی کے ساتھ غدر و بدعہدی ہرگز نہ کرو، پڑوسیوں ، قرابت داروں اور حاجت مندوں سے بے پروائی نہ برتو۔فریب اور دھوکے والا معاملہ کبھی نہ کرو۔

۵- نزاعی معاملات کا تصفیہ اس اصول پر ہو کہ ’’لَا ضَـرَرَ وَلَا ضِـرَارَ‘‘ ۔نہ خود

ضرر اٹھانا ہے نہ کسی اور کو ضرر میں ڈالنا ہے۔

۶- تم پر کسی بندے کا حق کا آتا ہے تو ادائیگی یا صاحبِ حق کی معافی کے بغیر دنیا تو دنیا قیامت میں بھی چھٹکارا نہ ہوگا۔اس لیے دنیا سے جاؤ تو اس حال میں جاؤ کہ تمھاری گردن کسی کے دَین اور کسی کے حق میں پھنسی ہوئی نہ ہو۔

۷- تمھارا کسی پر حق آتا ہو تو نرمی وچشم پوشی سے کام لو۔ ہو سکے تو معاف کر دو یا کچھ کمی کر دو، یا کچھ عرصہ کے لیے مہلت ہی دے دو۔سخاوت اور کشادہ دلی خدا کو محبوب ہے۔بخل اور تنگ دلی رب کو ناپسند ہے اور تمھیں دنیا کا سارا مال و منال چھوڑ کر اسی کے حضور حاضر ہونا ہے،اس لیے اس کے یہاں سرخ روئی کی فکر کرو اور وہاں کی رسوائی سے ڈرو۔

و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سید المرسلین ، رحمۃ للعالمین، افضل الھادین، اکرم الاولین والآخرین وعلیٰ الہ و صحبہ اجمعین۔

حوالے

۱ القرآن الحکیم، سورۂ ذاریات ،آیت ۵۶

۲ معجم کبیر للطبرانی، شعب الایمان للبیهقی بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال۔ علاء الدین علی متقی ہندی (م۹۷۵ھ) ج۴ص۴ حدیث ۳۸ طبع دوم طباعت و اشاعت: دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء۔

۳ مسند الفردوس للدیلمی بروایت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ کنز العمال علی متقی ج۴ص۲ حدیث۱۱۔

۴ سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۲

۵ سورۂ مائدہ۔آیت ۸۷–۸۸

۶ سورۂ اعراف۔ ت۱۵۷

۷ سورۂ بقرہ۔ ت۱۸۸

۸ سورۂ نساء۔ ت۲۹

۹ صحیح بخاری بروایت مِقدَام بن مَعْدِ یُکَرَب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ج۲ ص۲۷۸، اصح المطابع ، دھلی۔

۱۰ مسند امام احمد، معجم کبیر طبرانی مستدرك حاکم بروایت رافع بن خَدِیُج ، ومعجم کبیر طبرانی بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھم ، کنز العمال ۔ علی متقی ج٤ ص١ حدیث٣، مشکوٰۃ المصابیح بروایت مسند امام احمد ص٢٤٢

۱۱ حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح ص٢٤٢ و بھار شریعت یازدھم ص٥ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی

۱۲ حکیم ترمذی ،معجم کبیر طبرانی، شعب الایمان بیھقی ، ابن عدی، ابن النجار بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما، کنز العمال ج٤ ص١ و٥ حدیث ٦ و ٤٦

۱۳ مسند الفردوس للدیلمی، بروایت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال ج٤ ص٢ حدیث ٧

۱۴ صحیح مسلم بروایت ابو ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۔ مشکوٰۃ المصابیح ص٢٤١ مجلس برکات مبارك پور

۱۵ معجم طبرانی کبیر ، بروایت کعب بن عُجْرَہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال ج٤ ص٣ حدیث ١٧

۱۶ سنن ابن ماجہ بروایت مقدام بن معد یکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ،کنز العمال ج٤ ص٤ حدیث ٣٦

۱۷ سنن سعید بن منصور ، شُعَب الایمان بیھقی، بروایت السکن ،کنز العمال ج٤ ص٤ حدیث ٣٤

۱۸ مسند شھاب قضاعی، بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما، حلیۃ الاولیاء ، ابو نُعیم بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما،کنز العمال ج٤ ص٢ حدیث ١٢

۱۹ نسائی و مستدرك حاکم، بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال ج٤ ص٤احدیث ١٢٣—١٢٤

۲۰ مستدرك حاکم و سنن بیھقی، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنھما ،کنز العمال ج٤ ص١٣ حدیث ١٢٢ وبمعناہ عن عدۃ من الصحابۃ

۲۱ مسند امام احمد و سنن ابن ماجہ ، شعب الایمان للبیھقی ، مسند امام احمد بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال۔ علاء الدین علی المتقی(م٩٧٥ھ) ج٤ ص١٢ و ١٤ حدیث ١٠٨، ١٠٧، ١٢٦ طبع دوم ، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد ۔ اشاعت ١٣٧٣ھ/١٩٥٣ء۔ ونحوہ عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عند البیھقی فی الشعب ۔ ایضاً۔ حدیث ٩٣و١٢٧

۲۲ مصنَّف ابن ابی شیبہ و دینوری فی المجالسۃ بروایۃ الحسن کنز العمال علی المتقی ٤/٧٠ حدیث ٦٧٢

۲۳ مسند ابو یعلی، معجم کبیر طبرانی، شعب الایمان بیھقی، دار قطنی فی الافراد بروایت صدیقہ رضی اللہ عنھا ، تاریخ دمشق لابن عساکر بروایت عبد اللہ بن ابی عیاش بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کنز العمال ٤/١٢ حدیث ١٠٩—١١٠

۲۴ مسند شھاب قضاعی بروایت سیدنا انس بن مالك رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز العمال ٤/١١ حدیث ١٠٠

۲۵ معجم طبرانی کبیر ، بروایت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما ، کنز العمال ٤/١١ حدیث ١٠٦

۲۶ مسندا لفردوس للدیلمی، بروایت سیدنا انس بن مالك رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، کنز العمال ٤/١٥ حدیث ١٣٢

۲۷ ابن السُنّی، عمل الیوم و اللیلۃ ، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنھما ، کنز العمال ٤/١٥ حدیث ١٣٠

۲۸ ابو حامد یحيٰ بن بلال بزاز بروایت بُرَیْدَہ رضی اللہ عنہ ، کنز العمال ٤/٧١ حدیث ٦٧٤

۲۹ امام احمد ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن حِبَّان، بروایت، سَمُرَہ بن جُنْدُب رضی اللہ

تعالیٰ عنه، کنز العمال ٦/٢٧٧ و ٢٧٨ حديث ٢١١٨ و ٢١١٩۔

۳۰ صحیح ابن حبان ، الترغيب فی الذكر لابن شاهين، فوائد تمام، سنن سعيد بن منصور ، بروايت سيدنافاروق اعظم رضی الله تعالیٰ عنه، کنز العمال ٦/٢٨٣ حديث ٢١٧١

۳۱ مسند امام احمد، صحيح ابن خزيمه ، مختارۂ ضيا مَقْدَسِی ، شعب الايمان للبيهقی ، بروايت حُبْشِی بن جُناده رضی الله تعالیٰ عنه ، کنز العمال ٦/٢٧٧ حديث ٢١١٣ و ص ٢٨١ حديث ٢١٤٩

۳۲ مسند امام احمد، صحيح ابن حبان ، سنن ابو داؤد، مستدرك حاكم ، بروايت سهل ابن الحنظليه رضی الله تعالیٰ عنه ، کنز العمال ٦/٢٧٩ حديث ٢١٣٥

۳۳ مسند امام احمد، صحيح مسلم، سنن ابو داؤد ، سنن نسائی، بروايت قَبِيْصَه ابن مُخَارِق رضی الله تعالیٰ عنه کنز العمال ٦/٢٧٩ حديث ٢١٣٣

۳۴ مسند امام احمد ، صحيح بخاری ، سنن ابن ماجه، بروايت سيدنا زبير بن العوّام رضی الله تعالیٰ عنه کنز العمال ٦/٢٧٨ حديث ٢١٢٢

۳۵ سنن ابو داؤد ، سنن نسائی ، مشكوٰة المصابيح ص١٦٣

۳۶ سنن ابو داؤد ، مشكوٰة المصابيح ص١٦٣

۳۷ سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجه(بجز حصۂ اخير: سوال درست نهيں ـ الخ)مشكوٰة المصابيح ص ١٦٣

۳۸ كتاب وكيع بروايت بَكْر بن عبد الله مُزَنی، کنز العمال ٤/٦٨ حديث ٦٦١

۳۹ سنن ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن دارمی بروايت عبد الله بن عمرو رضی الله تعالیٰ عنهما ، مسند امام احمد ، سنن نسائی ، سنن ابن ماجه، بروايت ابو هريره رضی الله تعالیٰ عنه ، مشكوٰة المصابيح ص١٦١

۴۰ مسند امام احمد، شرح السنة، بروايت سيدنا عبد الله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه، مشكوٰة المصابيح ص٢٤٢، مجلس بركات مبارك پور

۴۱ مسند امام احمد،سنن دارمی، شعب الايمان للبيهقی ، بروايت جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنهما ، مشكوٰة المصابيح ص٢٤٢

۴۲ مسند الفردوس للديلمی،بروايت عبد الله بن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما، کنز العمال ج٤ ص٩ حديث ٧٨

۴۳ مستدرك حاكم و سنن بيهقی ، بروايت ابو هريره رضی الله تعالیٰ عنه،کنز العمال ج٤ ص٧ حديث ٦٥

۴۴ شعب الايمان بيهقی، بروايت سيدنا معاذ بن جبل رضی الله تعالیٰ عنه،کنز العمال ج٤ ص١٧ حديث ١٤٧

۴۵ سنن ترمذی، مستدرك حاكم، بروايت ابو سعيد خدری رضی الله تعالیٰ عنه،کنز العمال ج٤ ص٣ حديث ٢٥

۴۶ مسند الفردوس للديلمی، بروايت عبد الله بن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما،کنز العمال
ج٤ ص٦ حديث ٥١

۴۷ تهذيب الآثار ابن جرير طبری، معجم كبير طبرانی، بروايت عبد الله بن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما، کنز العمال ٤/٧١ حديث ٦٧٦، ونحوه عن غيره ، مشكوٰة المصابيح ص٢٤٤

۴۸ مصنف عبد الرزاق، کنز العمال ٤/٧١ حديث ٦٧٧ و ابو داؤد، ترمذی، نسائی ، ابن ماجه، مشكوٰة المصابيح ص٢٤٣، لولی الدين عبد الله الخطيب التبريزی، تصنيف ٧٣٧ھ اشاعت: مجلس بركات، جامعه اشرفيه مبارك پور

۴۹ تاريخ خطيب بغدادی، بروايت ابو هريره رضی الله تعالیٰ عنه ، کنز العمال ٤/١٨ حديث ١٥٣

۵۰ فوائد تمام،تاريخ بغداد للخطيب ، مكارم الاخلاق ابن لال ، تاريخ ابن عساكر ، بروايت سهل بن سعد ساعدی رضی الله تعالیٰ عنه، کنز العمال ٤/١٨ حديث ١٥٤

۵۱ مراسیل ابو داؤد بروایت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال ٤/١٨ حدیث ١٥٥

۵۲ مسند امام احمد بروایت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کنز العمال ٤/١٨ حدیث ١٥٧

۵۳ مسند الفردوس للدیلمی، بر وایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز العمال ٤/١٨ حدیث ١٦١

۵۴ مسند امام احمد ، معجم کبیر طبرانی، بروایت سُوَیْد بن ھُبَیْرَہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز العمال ٤/١٨ حدیث ١٥١

۵۵ مسند الفردوس دیلمی، بروایت حکیم بن حِزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال ٤/١٩ حدیث ١٦٤

۵۶ صحیح بخاری، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مشکوٰۃ المصابیح ص٢٤٣

۵۷ بخاری و مسلم، مشکوٰۃ المصابیح ص٢٤٣

۵۸ صحیحین بخاری و مسلم، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوٰۃ المصابیح ص٢٥١

۵۹ صحیح مسلم، بروایت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوٰۃ المصابیح ص٢٥١ و نحوہ عن ابی الیسر عند مسلم

۶۰ بخاری و مسلم بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشکوٰۃ المصابیح ص٢٥١

۶۱ مصنَّف عبد الرزاق، کنز العمال ٤/٨٧، حدیث ٧٦٧، سنن ابو داؤد مشکوٰۃ المصابیح ص٢٥٣

۶۲ مسند امام احمد بروایت عمران بن حُصَین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکاۃ المصابیح ص٢٥٣

۶۳ معجم اوسط طبرانی، بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کنز العمال ٤/٢٧ حدیث٢٥٢

۶۴ سنن ابن ماجہ و مختارۃ الاحادیث،للضیاء المقدسی، بروایت جابربن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ، کنز العمال ٤/٢٧ حدیث ٢٤٩

۶۵ جامع ترمذی، کنز العمال، ٤/٧٠حدیث ٦٧١

۶۶ بہارِ شریعت یازدہم، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی ص٣٦،٣٧ عکس طبع آگرہ

۶۷ صحیح بخاری و صحیح مسلم، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ،
مشکوٰۃ المصابیح ص٢٤٤

۶۸ صحیحین، بروایت حکیم بن حِزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکاۃ المصابیح ص:٢٤٤

۶۹ سنن بیہقی۔ بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ، کنز العمال ٤/٥١ حدیث ٤٩٢

۷۰ سنن بیہقی۔ بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ، کنز العمال ٤/٥٢ حدیث ٥٠٩

۷۱ بہارِ شریعت، مولانا امجد علی اعظمی ١١/٤٩

۷۲ سنن بیہقی و دارقطنی، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال ٤/٥٢حدیث ٥١٠

۷۳ بہارِ شریعت ، مولانا امجد علی اعظمی ١١/٤٩—٥٠ بہ تلخیص۔ ھدایہ ، برھان الدین علی بن ابی بکر فَرغانی مَرغِینانی(م٥٩٣ھ)٣/٢٠

۷۴ حاشیہ ہدایہ ، مولانا عبد الحیّ فرنگی محلی، بحوالہ تخریج زیلعی ٣/٢٠

۷۵ بهارِ شریعت، صدر الشریعه مولانا امجد علی اعظمی ١١/٦٠–٦١ به تلخیص

۷۶ سنن ابن ماجه بروایت واثله بن اسقع رضی الله تعالیٰ عنه، مشکوٰة المصابیح ص٢٤٩

۷۷ صحیح مسلم بروایت ابو هریره رضی الله تعالیٰ عنه، مشکوٰة المصابیح ص٢٤٨

۷۸ مسند امام احمد ، سنن ابن ماجه بروایت عبد الله بن عباس ، و ابن ماجه بروایت عُبادة بن صامت رضی الله تعالیٰ عنهم ، کنز العمال ٤/٣٣ حدیث ٣٠٥

۷۹ امام مالك بروایت عمرو بن یحییٰ مازنی مرسلا ، و دار قطنی و حاکم و بیهقی بروایت عمرو عن ابی سعید الخدری مسندا ، کنز العمال ٤/٣٥حدیث ٣٢٥

۸۰ ابن النجار، حسن بن سفیان ، ابن شاهین، ابن مَرْدُوَیه، ابو نعیم ، کنز العمال ٤/٨٦ حدیث ٧٦٠–٧٦١

۸۱ مصنَّف عبد الرزاق ، کنز العمال ٤/٨٥ حدیث ٧٥٦

۸۲ شرح السنة للبغوی ، مشکاة المصابیح ص٢٤٩

۸۳ سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجه، بروایت ابو هریره رضی الله تعالیٰ عنه ، مشکاة المصابیح ص٢٥٠

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ اور حقوق انسانی

مفتی محمد نظام الدین رضوی
پرنسپل، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

انسانیت کے محسن اعظم، مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس عالم رنگ وبو میں تشریف آوری ساری کائنات عالم کے لیے رحمت اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے احسانِ عظیم ہے۔ کیوں کہ آپ نے حق تلفی، نا انصافی، چوری، غارتگری، قمار بازی، سودخوری، عصمت دری، آبرو ریزی، ہوس پرستی، شراب خوری، خودکشی، خونریزی، بے رحمی اور اس طرح کی دوسری لعنتوں سے انسانیت کو نجات دے کر انہیں سارے انسانی رشتوں کے حقوق اور ایک دوسرے کے ساتھ بہتر سلوک، اور سب کی خیر خواہی کی تعلیمات دیں۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حقوق انسانی کے تعلق سے عالم انسانیت کو جو ہدایات اور تعلیمات دی ہیں، انھیں چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- ہر انسان پر اس کی ذات اور اعضا کے حقوق
۲- انسانی برادری کے باہمی حقوق
۳- رشتہ داروں اور ہمسایوں کے باہمی حقوق
۴- راعی اور رعایا کے حقوق۔

اب ہم ان حقوق پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں تا کہ ان کی اہمیت اور

افادیت اجاگر ہوکر سامنے آسکے۔

ہر انسان پر اس کی ذات اور اعضا کے حقوق:

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وحیِ ربّانی کے ذریعہ ہمیں جو ہدایات دی ہیں ان سے بجا طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات اور اعضاء اس کی اپنی ملک نہیں ہیں بلکہ یہ سب ان کے خالق خدائے عزیز وقدیر کی ملک ہیں جو حضرت انسان کے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ اس لیے کوئی بھی انسان اپنی ذات یا اعضا کے تعلق سے ایسا کوئی تصرف نہیں کر سکتا جسے عقل سلیم امانت میں خیانت تصور کرے۔

قرآن حکیم میں ہے:

”إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُلًا“

بے شک کان، آنکھ دل ہر ایک کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (سورہ الاسراء، ۳۶)

بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے اور دن بھر روزے رکھتے ہو؟ تو انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، بات سچ ہے، تو حضور نے فرمایا:

(ایسا نہ کرو) ایسا کرنے سے آنکھیں دھنس جائیں گی، روشنی پر اثر پڑے گا اور تمہارا جی تھک جائے گا۔ (بخاری شریف ۱/ ۲۶۵)

دوسری روایت میں سرکار علیہ التحیۃ والثنا کے ارشاد میں مزید وضاحت ہے:

ایسا نہ کرو۔ روزہ بھی رکھو اور چھوڑو بھی، رات میں نوافل بھی پڑھو اور سوؤ بھی، کیوں کہ تجھ پر تیرے جسم کا بھی حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ (بخاری شریف ۱/ ۲۶۵)

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وان لنفسك وأهلك عليك حقا

بے شک تیرے نفس اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ (بخاری شریف ۱/ ۲۶۵)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعلق سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ وہ رات میں نوافل پڑھتے، دن میں روزے رکھتے اور بیوی سے لاتعلق رہتے ہیں تو انھوں نے حضرت ابو دردا کو یہ نصیحت فرمائی:

”بے شک تجھ پر تیرے رب کا بھی حق ہے اور تیرے نفس کا بھی حق ہے اور تیری بیوی کا بھی حق ہے۔ تو ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ پھر وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور قصہ بیان کیا تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ”صدق سلمان“ سلمان نے سچ کہا۔“ (بخاری شریف ۱/ ۲۶۴)

کتاب وسنت کے یہ نصوص شہادت دے رہے ہیں کہ انسان پر اس کے نفس، جسم، آنکھ سب کا حق ہے۔ لہٰذا سب کے حقوق کی رعایت کرے اور انھیں عادت جاریہ کے خلاف ایسی تکلیف نہ دے جس سے ان کی منفعت پر اثر پڑے۔ یہاں سے حقوق نفس کے تعلق سے کئی ایک مسائل معلوم ہوئے۔

(الف) خودکشی حرام ہے کہ یہ اللہ کی امانت کے ساتھ نہ صرف خیانت، بلکہ اس کا اتلاف و پامالی ہے۔ حضرت ثابت بن ضحّاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی چیز سے خودکشی کی، قیامت کے دن اسی چیز سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم شریف ۱/ ۷۲،)

دوسری حدیث میں اس کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی ہتھیار سے خودکشی کی، وہ قیامت کے دن اسی ہتھیار سے ایک لمبے عرصے تک جہنم میں اپنے شکم کو زخمی کرتا رہے گا۔ اور جس نے زہر پی کر خود کو قتل کر ڈالا وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں ایک مدت دراز تک زہر پیتا رہے گا۔ اور جس نے پہاڑ سے گر کر خودکشی کی وہ نار جہنم میں ایک زمانہ تک بلندی سے گرتا رہے گا۔ (ایضاً)

(ب) نسبندی حرام ہے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہے جو بلاشبہ اس کی امانت میں خیانت ہے۔قرآن حکیم میں ہے:

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ شیطان نے دھمکی آمیز لہجے میں اپنے رب سے کہا: اور میں ضرور انھیں (یعنی اللہ کے بندوں) کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی چیز بگاڑ دیں گے۔

(ج) ایک انسان کے بدن سے کوئی عضو کاٹ کر دوسرے کے بدن میں جوڑنا حرام ہے کہ یہ تو اللہ عزوجل کی امانت میں بڑی خیانت ہے۔ عام چیزوں میں خیانت کی تلافی ممکن ہے مگر کٹے ہوئے عضو کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی۔ساتھ ہی یہ انسانی تکریم کے منافی بھی ہے،فقہ حنفی کی معتمد کتاب بدائع الصنائع میں ہے:

''جو افعال ضرورت اور اکراہ کی صورت میں بھی مباح نہیں ہوتے، ان میں ایک قتل ناحق ہے خواہ اکراہ تام ہو یا ناقص۔اور دوسرے انسان کے اعضا میں سے کسی عضو کو کاٹنا اور ہلاکت خیز پٹائی ہے۔(ص ۱۷۷،ج ۷)بدائع وغیرہ کے دوسرے مسائل سے عیاں ہوتا ہے کہ اگر صاحب عضو انسان کاٹنے کی اجازت دیدے تو بھی کاٹنا جائز نہیں، وجہ وہی ہے کہ کسی کی امانت میں تصرف کرنے کے لیے اجازت صحیح نہیں ہوتی۔

(د) دوسرے کے لیے اپنی آنکھ، دل، پھیپھڑے، گُردے وغیرہ کا عطیہ، ہبہ اور خرید وفروخت حرام ہے کہ بندہ جب ان چیزوں کا مالک نہیں تو اسے ان اعضا میں تصرفِ مالکانہ کا قطعا کوئی حق نہیں پہونچتا، اور بلاشبہ یہ بھی اپنے رب کی امانت میں خیانت ہے۔

(ہ) یوں ہی جو کام باعث ہلاکت ہو، اسے کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

(و) مذکورۃ الصدر آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ'' کان، آنکھ، دل سب کے بارے میں پوچھا جائے گا''اس سے معلوم ہوا کہ انسان پر ان اعضاء کا حق یہ بھی ہے کہ وہ انھیں گناہ کے کاموں میں استعمال نہ کرے، یہی حال زبان اور دوسرے اعضاء کا بھی ہے۔ لہٰذا دل میں کسی سے کینہ، حسد، بغض، بدگمانی رکھنا، زبان سے گالی گلوج، غیبت، بدگوئی وغیرہ کرنا بھی حرام وگناہ ہے کہ یہ فی الواقع ان اعضا کی حق تلفی ہے۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان کے سامنے عاجزی کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ تو خدا سے ڈر، کہ ہم سب تیرے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اگر تو سیدھی رہی تو ہم سب سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم سب ٹیڑھے ہوجائیں گے۔(ترمذی شریف)

یہ حقوق انسانی کا وہ شعبہ ہے جسے آج کی ترقی پسند دنیا تقریباً پس پشت پھینک چکی ہے بلکہ انھیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ اس کا بھی حقوق انسانی سے کوئی رشتہ ہے لیکن اسلام نے قدم قدم پر اس کی بھی نگہداشت کی ہے۔

انسانی برادری کے باہمی حقوق:

انسانی برادری کے باہمی حقوق میں پانچ امور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے:

۱- مذہب کا تحفظ ۲- جان کا تحفظ

۳- مال کا تحفظ ۴- عقل کا تحفظ

۵- نسب کا تحفظ

یعنی پوری انسانی برادری پر مشترکہ طور پر یہ حقوق عائد ہوتے ہیں کہ ہر ایک کا مذہب، جان، مال، عقل، نسب دوسرے کے ہاتھوں محفوظ رہے اور کوئی اس کے ان حقوق پر دست درازی نہ کرے۔مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں پر بھی ان حقوق کا لحاظ واجب ہے۔جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ

دنیا کی حکومتوں کے قوانین میں تھوڑے فرق کے ساتھ پانچوں حقوق کو نمایاں مقام حاصل ہے اور ہر ملک کے باشندے وہاں کے ملکی قوانین کے پابند عہد ہوتے ہیں، تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پر اپنے عہد کا ایفا لازم ہے کیوں کہ کتاب وسنت میں ایفاے عہد کی بار بار تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً کتاب الٰہی میں یہ ارشاد ربانی ہے:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ

اے ایمان والو اپنے عہد پورا کرو۔ (المائدہ، ۵)

نیز ارشاد خداوندی ہے: اور عہد پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں سوال ہوگا۔ (الاسراء:۱۷)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں چار خصلتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ایک خصلت ہوگی، اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے:

۱- جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
۲- اور جب معاہدہ کرے تو توڑ دے۔
۳- اور جب کسی سے وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔
۴- اور جب کسی سے جھگڑا ہو تو گالی گلوچ کرے۔ (صحیح مسلم شریف ۱/۵۶)

اس سے بڑی بات ایک مسلمان کے لیے نہیں ہوسکتی کہ عہد شکنی کرنے پر اسے ''خالص منافق'' کہا جائے، اس سے اسلام میں ''عہد'' کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مذہب کا تحفظ:

اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا جو حق کسی بھی ملک کے دستور نے دیا ہے، ہم اس میں چھیڑ چھاڑ نہ کریں گے بلکہ ہم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں گے جیسا کہ مسلم ریاست کے تمام باشندوں کو یہی حکم ہے۔ وہاں بھی

سب ایک مقررہ دستور کے پابند عہد ہوتے ہیں اور آج کے دور میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس حیثیت سے درج ذیل آیات سے بھی اس نظریئے کی تائید ہوتی ہے قرآن حکیم میں ہے: تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین (الکافرون ۶)

نیز ارشاد باری ہے:

دین میں کچھ زبردستی نہیں بے شک نیک راہ گمراہی سے خوب جدا ہوچکی ہے۔ تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (البقرہ: ۲۵۶)

اسلام نے اپنی ریاست کے تمام باشندوں کو مذہبی آزادی عطا فرمائی ہے اور معاملات میں بھی انہیں وہ تمام حقوق دیے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں سوائے اس کے کہ شراب وخنزیر کی خرید وفروخت سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے اور غیر مسلموں پر اس بارے میں کوئی پابندی نہیں عائد کی گئی، کیوں کہ وہ ان کے مذہب میں حلال ہیں۔ قانون اسلامی کی بڑی معتمد ومستند کتاب الہدایۃ میں یہ ''دفعہ'' اس طرح مذکور ہے:

غیر مسلم ذمی خرید وفروخت (وغیرہ) کے معاملات میں مسلمانوں کی طرح ہیں اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا ''انھیں بتادو کہ جو معاملات مسلمانوں کے لیے حلال ہیں، وہ ان کے لیے بھی حلال ہیں، اور جو معاملات مسلمانوں پر حرام ہیں، وہ ان پر بھی حرام ہیں۔'' اور اس لیے بھی کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح سے مکلّف وحاجت مند ہیں۔ البتہ خاص طور پر شراب وخنزیر کے سلسلے میں ان کا حکم مسلمانوں سے الگ تھلگ ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک شراب کی خرید وفروخت مسلمانوں کے شیرۂ انگوری کی خرید وفروخت کی طرح ہے اور ان کے یہاں خنزیر کی خرید وفروخت مسلمانوں کے بکری خریدنے بیچنے کی طرح ہے کیوں کہ شراب وخنزیر ان کے اعتقاد میں مال ہیں اور شریعت اسلامی نے ہمیں حکم دیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدہ ومذہب پر آزاد چھوڑ دیں۔ (ہدایہ ۳/۸۶)

مذہبی آزادی کے حقوق میں یہ امر بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ کسی مذہب کے

مرجعِ طاعت وعبادت کو نشانۂ طعن وتنقید نہ بنایا جائے۔ قرآن حکیم میں خدائے ذو الجلال کا یہ فرمان ہے:

اور انھیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں زیادتی اور جہالت سے بےادبی کریں گے۔ (آیت ۱۰۹، سورۃ الانعام ۶)

اس قانون نے کسی بھی مذہب کو جو تحفظ دیا ہے، اس پر آج بھی مسلمان پورے طور پر کاربند ہے۔ وہ کسی مذہب اور اس کے مرجع طاعت وعقیدت کو گالی نہیں دیتا، لیکن اس کے برخلاف آج کی غیر مسلم دنیا اس اہم قانون کو پامال کرتی نظر آرہی ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ آج براہ راست مذہب اسلام کو ''دہشت گردی'' کی گالی دی جارہی ہے۔ کہیں کسی مسلمان یا نام نہاد مسلمان سے کوئی انتقامی کاروائی یا زیادتی سرزد ہوتی ہے تو فوراً اسے ''اسلامی دہشت گردی'' کا عنوان دے کر مسلمانوں کی دل آزاری کی جاتی ہے، انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جو دہشت پھیلائے صرف اس کی طرف اس کا انتساب کیا جائے جیسا کہ غیر مسلم دہشت گردوں۔ مثلاً اُلفا، ماؤ وادی، نکسلی، ایل ٹی ٹی وغیرہ کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ کبھی ان کے مذہب کے ساتھ ان کی بدی کو نہیں جوڑا گیا، حتی کہ کسی مذہب کے ماننے والوں کی طرف بھی عمومی طور پر نہیں منسوب کیا گیا۔ یا زیادہ سے زیادہ چند افراد کے اس فعل کو ''مسلم دہشت گردی'' کہا جاتا تاکہ اس گالی کا نشانہ صرف مسلمان بنتے، مذہب کا تقدس پامال نہ ہوتا۔ کیا اس فرق کو ہمارے سربراہان مملکت اور ان کے وزرا اور دوسرے ارباب علم ودانش نہیں سمجھتے؟ اگر نہیں سمجھتے ہیں تو پھر اپنے اور پرائے اور مسلم وغیر مسلم میں یہ امتیاز کیسے روا رکھا گیا؟ ایک زمانہ میں سکھ قوم اس کے لیے کافی مشہور تھی، جب اسے ''اوگروادی'' کا ٹائیٹل دیا گیا تھا مگر اس وقت بھی اسے کسی قوم نے مذہب سے نہیں جوڑا، پھر اسلام اور مسلمانوں پر ہی یہ عنایت کیوں ہے؟

سب جانتے ہیں کہ جس کام کو ''دہشت گردی'' کہا جاتا ہے، اس کا ارتکاب مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ کرتے ہیں، سوئے اتفاق کہ کسی کے ظلم وعدوان،

یا اپنی بےرحمی وسخت دلی کے باعث کچھ مسلمان کہلانے والے بھی اس گناہ میں شریک ہیں جن کی تعداد پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہوسکتی مگر ان کی بنیاد پر تمام مسلمانوں بلکہ خود اسلام کو ہی ہدف ملامت بنایا جارہا ہے۔ کیا یہی انصاف ہے؟ افسوس یہ ہے کہ یہ کارنامہ وہ لوگ انجام دے رہے ہیں جو اپنے آپ کو حقوق انسانی (ہیومن رائٹس) کا علمبردار کہتے ہیں۔ اور اب تو حد ہوچکی کے رسولوں کے سردار، نبیوں کے خاتم، پیغمبر اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں برملا گستاخی کی جاتی ہے، گستاخانہ کارٹون شائع کیے جارہے ہیں اور اس کے خلاف احتجاج کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ''ہر شخص کو آزادیٔ گفتار کا حق حاصل ہے''، رومن کیتھولک عیسائیوں کے اُسقف اعظم نے اسلام وپیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعلق سے ۱۲؍ستمبر کو جو دل آزار بیان دیا ہے، اس پر مسلمانوں کی برہمی کے جواب میں یہ عذر پیش کردیا گیا کہ یہ بات میری نہیں، چودھویں صدی کے ایک عیسائی بادشاہ مینوئل دوم کی ہے یعنی دوسرے کی مجرمانہ بات کو اپنی تقریر میں نقل کرنا جرم نہیں ہے۔ یہ فہم وفراست ہے دنیا ے عیسائیت کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا پاپائے اعظم کی۔

یہ چند اشارے اس لیے پیش کردیے ہیں تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اسلام نے مذاہب عالم کو جو حق عطا کیا ہے اور اس تعلق سے اپنے ماننے والوں کو اپنی کتاب ہدایت میں جو حکم دیا ہے، وہ بہت ہی اہمیت کا حامل اور دنیا کے لیے مشعل راہ ہے۔ کہتے ہیں:

''الأشیاء تعرف بأضدادها'' چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں

جان کا تحفظ:

اس کا مطلب ہے ''جیو اور جینے دو'' یہ ہر انسان کے بنیادی حقوق سے ہے کہ اس کی زندگی کی نعمت کسی ظلم وعدوان کے ذریعہ چھینی نہ جائے اور اسے جینے کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کی روشن ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ قتلِ ناحق سخت حرام وگناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب عرصۂ دراز تک جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا۔ زنا اور قتل کے مجرمین کے تعلق سے قرآن پاک میں یہ وعید آئی ہے:

اور جو یہ کام کرے وہ سزا پائے گا، اسے چند در چند عذاب دیا جائے گا اور وہ اس میں مدتوں ذلت کے ساتھ رہے گا۔

اسلام کی نگاہ میں ایک نفس محترم کا قتل سارے انسانوں کا قتل ہے۔ ارشاد باری ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًاط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا O

جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ کسی جان کا بدلہ لیا جائے یا زمین میں فساد مچانے کی سزا دی جائے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب جانوں کو زندہ رکھا۔

ناحق کسی انسان کا قتل حقیقت میں انسانیت کا قتل ہے، اس حیثیت سے وہ سارے ہی انسانوں کا قاتل ہوا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے خون ناحق کے بارے میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا۔ (صحیح بخاری شریف وصحیح مسلم شریف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا اور بے شک جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک پہونچتی ہے۔ (صحیح بخاری شریف)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا آج کے زمانے میں ہر ملک کے باشندے اپنے ملک کے دستور کے پابند عہد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے سب ایک دوسرے کی طرف نسبت کرتے ہوئے معاہد ہوئے اور مسلم ریاست میں جب معاہد کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ غیر مسلم ہوتے ہیں جو وہاں سکونت اختیار کرتے ہیں یا ویزا لے کر کچھ دنوں کے لیے کسی غرض سے وہاں چلے جاتے ہیں اور بہر حال ہر ملک کے دستور میں

جان کا تحفظ بھی شامل ہے۔ اس لیے اس حدیث نبوی سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ کسی بھی ملک کا ہر باشندہ دوسرے باشندے کی جان کی حفاظت کرے اور بالخصوص مسلم ریاست کے غیر مسلم باشندوں کے تعلق سے تو ہر مسلم باشندے کی یہ ذمہ داری اور زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قانون اسلامی کی معتمد کتاب ''الدر المختار'' میں ہے:

ظلم الدابة أشد من الذمي وظلم الذمّي أشد من المسلم

ترجمہ! چوپائے پر ظلم غیر مسلم معاہد پر ظلم سے زیادہ سخت ہے اور غیر مسلم معاہد پر ظلم مسلمان پر ظلم سے زیادہ سخت ہے۔

(الدر المختار فوق رد المختار ص٦ ٧ ۴ج و باب الاستبراء من کتاب الحظر والاباحة)

اور خاص حفاظت جان و مال کے تعلق سے ''نور الانوار'' میں یہ حدیث منقول ہے: دمائهم كدمائنا وأموالهم كأموالنا ان کا خون ہمارے خون کی طرح ہے اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے۔ (ص۶۴) یعنی دونوں کی یکساں حفاظت کی جائے۔

ہاں کچھ آیات کریمہ میں کچھ غیر مسلموں کے قتل کر ڈالنے کا حکم ہے جن کو بنیاد بنا کر آج واویلا مچایا جاتا ہے مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ وہ حکم کیسے حالات اور کیسے فسادیوں کا ہے۔ جن حالات میں دنیا کا کوئی مہذب ملک اور امن کا قانون فسادی کو دیکھتے ہی گولی مار دینے اور اس کا قصہ تمام کر دینے کا فرمان جاری کرتا ہے، اسی طرح کے حالات میں ویسے ہی افراد کے لیے اگر اسلام وہی فرمان صادر کرتا ہے تو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

مال کا تحفظ:

زندگی کی بقا کے لیے مال کا کسب وتحفظ انتہائی ضروری ہے اس لیے اسلام نے اس کے تحفظ پر بھی بہت زور دیا ہے۔ وہ انسان کو اکل حلال کی ترغیب دیتا ہے اور اسی کا خوگر بنانا چاہتا ہے تاکہ انسان دوسرے کے مال کی طرف نگاہ ہی نہ اٹھائے، پھر ڈاکہ زنی، غصب، چوری، رشوت، سود، قمار بازی، ناپ تول میں کمی، خیانت، سامان

میں ملاوٹ حتی کہ فضول خرچی تک سے ممانعت فرماتا ہے۔ ساتھ ہی ان جرائم پر سزا اور عذاب جہنم کی دھمکی بھی دیتا ہے جیسا کہ ذیل کی احادیث سے عیاں ہوگا۔

۱- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال کمائی کی تلاش بھی فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔ (شعب الایمان بیہقی)

۲- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ مال حرام حاصل کر کے اگر اس کو صدقہ کرے تو مقبول نہیں اور خرچ کرے تو اس کے لیے اس میں برکت نہیں اور اپنے بعد چھوڑ مرے تو جہنم کو جانے کا سامان ہے۔ (مسند احمد بن حنبل)

۳- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کی زمین سے کچھ بھی ناحق لے لیا قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔ (بخاری شریف)

۴- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

زانی جس وقت زنا کرتا ہے پورا مومن نہیں رہتا اور چور جس وقت چوری کرتا ہے پورا مومن نہیں رہتا اور شراب نوش جب شراب پیتا ہے پورا مومن نہیں رہتا اور کسی کی بیش بہا چیز، جس کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھیں، جب کوئی لوٹتا ہے تو پورا مومن نہیں رہ جاتا۔ (صحیح مسلم شریف ص ۵۵ ج ۱، باب بیان نقصان الایمان)

۵- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک روایت میں ارشاد رسالت کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے: اور جس وقت تم میں سے کوئی خیانت کرتا ہے مومن نہیں رہتا، اس لیے ان معاصی سے بچو، بچو (صحیح مسلم شریف ص ۵۶ باب نقصان الایمان)

۶- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ وہ ساتوں چیزیں کیا کیا ہیں؟ ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک، نفس محترم کا ناحق قتل، یتیم کا مال کھانا، اور سود کھانا وغیرہ (آخر تک) (صحیح مسلم شریف ۱/۶۴)

۷- ارشاد رسالت ہے: رشوت دینے والا بھی جہنمی ہے اور رشوت لینے والا بھی جہنمی ہے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ)

۸- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم غلہ منڈی سے گزر رہے تھے، غلے کی ایک ڈھیری میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں بھیگ گئیں، حضور نے غلہ والے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے تو سرکار علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: تو تم نے اسے غلے کے اوپر کیوں نہیں رکھا تا کہ لوگ دیکھ لیتے۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ (صحیح مسلم شریف ۱/ ۷)

یہ چند احادیث نبویہ ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کا مال ناحق لینے سے سخت ممانعت فرمائی ہے اور لوگوں کو اس سے روکنے کے لیے جو دھمکی دی ہے اور جو سخت لہجہ اختیار فرمایا ہے، وہ ایک صاحب ایمان کو باز رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اور اس مضمون کی کثیر آیات واحادیث ہیں جن میں کسی بھی طور پر دوسروں کا مال لینے یا دبا لینے سے روکا گیا ہے، ساتھ ہی اس کی سخت سے سخت سزا بھی مقرر کی گئی ہے۔

یہ نصوص عمومی طور پر مال کا تحفظ عطا کر رہے ہیں اور خاص طور پر اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے لیے یہ حدیث ہے جو پہلے گزر چکی۔

أموالهم كأموالنا ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے۔

عقل کی حفاظت:

عقل بدن کا سلطان ہے، یہ سلامت ہے تو انسان حقیقت میں انسان ہے

ورنہ حیوان ہے، بلکہ اس سے بھی برا ہے اس لیے اسلام نے عقل کو بے کار کرنے کے تمام اسباب کو اختیار کرنے سے روک دیا ہے، خاص طور پر شراب نوشی سے سختی سے روکا ہے۔قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

اے ایمان والو شراب اور جوا اور تیروں سے فال نکالنا یہ سب ناپاکی اور شیطان کے کاموں سے ہیں، تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ۔شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کی وجہ سے تمہارے اندر عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے تو کیا باز آتے ہو؟ (مائدہ:۱۲)

اس آیت کریمہ میں شراب سے دور رہنے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک یہ کہ وہ ''ناپاک ہے'' اور ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الطبع انسان ناپاک چیز نہیں پی سکتا جیسے کوئی پیشاب پینا پسند نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ ''وہ شیطانی کام ہے'' اور شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، اس لیے کسی مسلمان بلکہ انسان کو بھی اس سے نفرت کرنا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ''شراب کی وجہ سے شیطان لوگوں کے درمیان بغض اور عداوت ڈال دیتا ہے'' کیوں کہ آدمی جب شراب کے نشے میں بدمست ہو کر عقل وہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو گالی گلوج، مار پیٹ، لڑائی جھگڑا حتی کہ قتل اور خودکشی تک کا مرتکب ہو جاتا ہے ع

ہوش میں جو نہ ہو وہ کیا نہ کرے

چوتھا سبب یہ ہے کہ ''شراب ذکر الٰہی اور نماز سے روک دیتی ہے'' ظاہر ہے کہ جو عقل وہوش سے بے گانہ ہوگا وہ ذکر الٰہی اور نماز میں مشغول ہوگا یا شیطان رجیم کے اشاروں پر رقص کرے گا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس لوگوں پر لعنت فرمائی۔(۱) شراب بنانے والا (۲) بنوانے والا (۳) پینے والا (۴) اٹھانے والا (۵) اور جس کے پاس اٹھا کر لائی گئی (۶) پلانے والا (۷) بیچنے والا (۸) اور اس کے دام کھانے والا (۹) اور خریدنے

والا (۱۰) اور جس کے لیے خریدی گئی۔(ترمذی شریف ۱/۱۵۵)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شراب سے بچو کہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔(حاکم)

ابن حبان و بیہقی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ فرماتے ہیں: اُمُّ الخبائث (شراب) سے بچو کہ گزشتہ زمانے میں ایک عابد شخص تھا جو لوگوں سے الگ رہتا تھا، ایک عورت اس پر فریفتہ ہوگئی۔اس نے اس کے پاس ایک خادمہ کو بھیجا کہ گواہی کے لیے اسے بلا کر لا، وہ بلا کر لائی، جب یہ مکان کے دروازوں میں داخل ہوتا گیا، خادمہ بند کرتی گئی۔ جب اندر کے مکان میں پہونچا، دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے اور اس کے پاس ایک لڑکا ہے اور ایک برتن میں شراب ہے، اس عورت نے کہا میں نے تجھے گواہی کے لیے نہیں بلایا ہے بلکہ اس لیے بلایا ہے کہ اس لڑکے کو قتل کر یا مجھ سے زنا کر یا شراب کا ایک پیالہ پی، اگر تو ان باتوں سے انکار کرتا ہے تو میں شور کروں گی اور تجھے رسوا کردوں گی۔ جب اس نے دیکھا کہ مجھے ناچار کچھ کرنا ہی پڑے گا، کہا ایک پیالہ شراب کا مجھے پلادے جب ایک پیالہ پی چکا تو کہنے لگا اور دے، جب خوب پی چکا تو زنا بھی کیا اور لڑکے کو قتل بھی کیا۔لہٰذا شراب سے بچو! خدا کی قسم ایمان اور شراب کی مداومت مرد کے سینہ میں جمع نہیں ہوتے، قریب ہے کہ ان میں کا ایک دوسرے کو نکال دے۔(بہار شریعت ۹/۹۸)

گرد، ہیروئن اور عقل میں فتور پیدا کرنے والی دوسری اشیا بھی شراب کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان سے بھی احتراز ضروری ہے۔

عقل پر غالب آنے والی ایک چیز غصہ بھی ہے، اس لیے اسلام نے اس سے بھی ممانعت فرمادی۔قرآن حکیم میں اچھے مسلمانوں کی یہ مدح کی گئی ہے:

اور وہ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں۔(آل عمران:۱۴)

حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت جاریہ بن قدامہ وغیرہ متعدد صحابۂ

کرام سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی، یارسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا:

غصہ مت کرو، اس نے بار بار وہی سوال کیا، آپ نے ہر بار یہی فرمایا: کہ غصہ مت کیا کرو۔ (بخاری شریف، مسند احمد بن حنبل و مسند ابن جہان وطبرانی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر کے بعد صحابۂ کرام کو کچھ نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ آپ نے فرمایا:

۱- بعض لوگوں کو غصہ جلد آتا ہے اور جلد جاتا رہتا ہے تو دوسری بات سے پہلی بات کی اصلاح ہوجاتی ہے۔

۲- اور بعض کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر میں جاتا ہے۔ یہاں ایک بات اچھی ہے اور دوسری بری، ادلا بدلا ہوجاتا ہے۔

۳- اور تم میں بہتر وہ ہیں جنھیں دیر میں غصہ آئے اور جلد چلا جائے۔ اور بدتر وہ ہیں جنھیں جلد غصہ آئے اور دیر میں جائے۔ غصہ سے بچو کہ وہ آدمی کے دل پر ایک انگارا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں، اور آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص غصہ محسوس کرے لیٹ کر زمین سے چپٹ جائے۔ (جامع ترمذی شریف)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوتا ہے اور آگ پانی سے ہی بجھائی جاتی ہے۔ لہٰذا جب کسی کو غصہ آئے تو وضو کرلے۔'' (سنن ابوداؤد شریف)

ان احادیث نبویہ کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اپنی عقل کی بھی حفاظت کرنی چاہیے اور دوسروں کی عقل کی بھی۔ لہٰذا نہ خود شراب پیے، نہ دوسروں کو پلائے یونہی نہ خود غصہ میں آئے، نہ دوسروں کو غصہ دلائے، ساتھ ہی اپنے اور کسی کے بھی سر پر چوٹ

پہونچانے سے بچے۔

نسب کا تحفظ:

نسب ہی تمام نسبی رشتوں کی بنیاد ہے۔ اگر یہ محفوظ نہیں تو پیدا ہونے والے بچے کا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن، نہ دادا، نہ دادی، ہاں اس کی ماں ہوتی ہے لیکن عموما ایسی مائیں یا تو شرمندگی کے باعث یا سماجی بائکاٹ کے خوف سے ناجائز تعلقات سے پیدا ہونے والے بچے کو کہیں پھینک دیتی ہیں پھر تو اس کی نگاہوں میں ساری دنیا تاریک ہوتی ہے۔ یا اسپتال میں چھوڑ آتی ہیں جہاں یقیناً اسے ماں کی شفقت، باپ کا پیار، بہن، بھائی کی محبت نہیں مل سکتی اور بہرحال انسانوں کی اس دنیا میں اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا، ایک ذراسی ہوس پرستی نے ایک بے گناہ کی دنیا اجاڑ دی۔ اور اب تو ایڈس کے جراثیم خود ایسے ہوس پرستوں کی ہی دنیا اجاڑ رہے ہیں، اسلام نے اس کے انسداد کے لیے بدکاری پر سختی کے ساتھ قابو پانے کی کوشش کی اور اس کے لیے عبرت ناک سزا کا اعلان فرمادیا، ارشاد ربانی ہے:

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ (النور:۱)

اور اگر دونوں شادی شدہ ہوں تو انھیں سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ ان احکام کی برکت سے انسانی معاشرہ بدکاری کی آلودگی سے بہت حد تک پاک ہوچکا تھا۔

کیوں کہ اسلام نے اس کے لیے صرف سزا سنادینے پر بس نہ کیا، بلکہ اس کے لیے ذہن سازی اور کردار سازی پر بھی بہت زور دیا قرآنی آیات اور فرمودات نبوی میں بار بار عفت و پاکیزگی کی تعلیم دی گئی ہے، نکاح کا حکم دیا گیا ہے، اس کی رغبت دلائی گئی ہے، اس کے فوائد وثمرات سے روشناس کرایا گیا ہے پھر بھی اجنبی مرد اور اجنبی عورتوں سے نگاہیں جھکائے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور اگر عورت کو باہر نکلنا ہو تو پردہ کے ساتھ نکلنے کا پابند کیا گیا ہے اور دوسروں کے گھروں میں کسی بھی اجنبی

کو بے اجازت داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ سورۂ نور میں ہے:

اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں مت جاؤ، جب تک خبر نہ کرلو اور ان کے گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (نور:۴)

نیز ارشاد باری ہے:

اے نبی، ایمان والوں سے فرما دیجیے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اپنے شرمگاہ کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے بے شک اللہ اس سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (نور:۴)

اے محبوب! ایمان والی عورتوں سے فرما دیجیے کہ اپنی نگاہیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں اور بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں مگر جو عادۃً کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں) پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ ظاہر کریں مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے (آخر تک)

یہی وہ تعلیمات ہیں جس نے دنیا کو عفت و پاکبازی کا بڑا ہی پاکیزہ اور ستھرا معاشرہ عطا کیا تھا اور آج جیسے جیسے ان تعلیمات سے دنیا دور ہو رہی ہے اسی قدر اس کا ماحول گندہ، پراگندہ اور بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے، جس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ دنیا آہستہ آہستہ ''ایڈس'' اور ''ایچ، آئی، وی'' جیسے مہیب وخطرناک مرض کے لپیٹ میں آتی جا رہی ہے۔ اور نام نہاد ترقی پذیر ممالک میں تو یہ بیماری عالمی وبا کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ پوری دنیا میں تقریباً چالیس ملین لوگ ایچ آئی وی اور ایڈس وائرس کا شکار ہیں اور ہر سال چھہتر ملین لوگ ایڈس کی بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری شرمگاہوں کی حفاظت نہ کرنے سے وجود میں آئی اور اب اس کے جراثیم ماں کے دودھ میں بھی سرایت کر چکے ہیں، بتایا جاتا ہے کہ تقریباً ساڑھے تین فیصد ایڈس وایچ آئی وی مریضوں کی ایسی تعداد ہے جن کو ایڈس رحم مادر، پیدائش اور ماں کا دودھ پینے سے ہوتا ہے اگر قرآن مقدس کی ہدایت ''یحفظوا فروجھم'' اور

''یحفظن فروجھن'' پر عمل کیا گیا ہوتا تو آج انسانی سماج کو ایسی تباہ کاریوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس مرض سے حفاظت کے لیے کنڈوم استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور ماؤں کو یہ صلاح دی جاتی ہے کہ شیر خوار کو اپنا دودھ نہ پلائیں اور اگر پلانا ہی چاہیں تو پہلے دودھ نکال کر ابالیں یا پھر بچے کو باہر کا دودھ اور کھانے کی کسی قسم کی کوئی چیز نہ دیں مگر حال وہی ہے جو کسی نے کہا ہے۔

مریض عشق پر لعنت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس خطرناک مرض سے حفاظت کا سیدھا سادہ نسخہ ہے ''حفاظت فروج'' کاش کہ ہیومن رائٹس کے علمبردار یہ نسخۂ کیمیا بھی حقوق انسانی کی فہرست میں شامل کر لیتے۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات میں حفاظت عقل ونسب کو انسان کے بنیادی حقوق سے شمار کیا گیا ہے جب کہ آج بھی ترقی یافتہ دنیا اس کے برخلاف شراب نوشی اور جنسی اختلاط کا اذن عام دے رہی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام سے بھاگنے والے آج کے عہد ترقی میں بھی اسلام کی حق شناسی کے مقابل چودہ صدی پیچھے ہیں اور نہ جانے کبھی انھیں ان حقوق کی عظمتوں کا احساس اور ان کی پاسداری کا پاس ہوگا یا نہیں۔

انسانی برادری کے باہمی حقوق میں یہ پانچوں امور: دین، جان، مال، عقل، نسب، بہت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں ''کلیات خمس'' کہا جاتا ہے۔ ان کے سوا اور بھی بہت سے حقوق ہیں مثلاً عفو و درگذر، تواضع وانکساری، احسان، باہمی تعاون، خوش کلامی، ہر ایک کے مرتبے کا لحاظ، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب وغیرہ۔

رشتہ داروں اور ہم سایوں کے حقوق:

یہاں رشتہ کا لفظ ہم نے ایک عام معنی میں استعمال کیا ہے جو نسبی، سببی، رضاعی، دینی تمام رشتوں کو شامل ہے:

(الف) نسبی رشتے میں ماں، باپ، اولاد، دادا، دادی وغیرہ اور بھائی، بہن، بھتیجے،

بھتیجیاں، چچا، اوران کی اولاد اور نانا، نانی وغیرہ۔

(ب) سببی رشتے میں شوہر، بیوی، استاذ، شاگرد، پیر، مرید شامل ہوں گے۔

(ج) رضاعی رشتہ کسی عورت کا دودھ شیر خواری کی مدت میں پینے سے پیدا ہوتا ہے اور احکام میں نسبی رشتے کی طرح ہے۔ یہ رشتہ بھی رضاعی ماں، باپ، اولاد، بھائی، بہن وغیرہ کو عام ہے۔

(د) دینی رشتے سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں۔ اس کے عموم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو درج بالا کسی قسم کے عموم میں نہیں آتے مثلاً محتاج، بیمار، بیوہ، یتیم، مہمان اور عام مسلمان۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان تمام رشتوں کے حقوق تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور کتب سیرت وکتب فقہ میں موجود ہیں۔ آپ کی تعلیمات سے بخوبی یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ دنیا کے ان رشتوں میں سب سے بڑا حق ماں باپ کا اولاد پر عائد ہوتا ہے پھر ان دونوں ہستیوں میں ماں کا حق باپ سے تین درجے زیادہ ہے۔ استاذ اور پیر کا درجہ باپ کے مساوی شمار کرنا چاہیے۔

ہم سایہ سے مراد پڑوسی ہیں۔ کتاب وسنت میں اس کے حقوق کے تعلق سے بھی بار بار ہدایت فرمائی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ماں، باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسایہ اور دور کے ہمسایہ اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنے باندی غلام سے۔ بے شک اللہ کو کوئی اترانے والا، بڑائی مارنے والا پسند نہیں۔ (النساء:٦)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق بھی کچھ کچھ بیان فرمادے ہیں اور بہت سے اُن بندوں کے بھی جن کا تعلق درج بالا اصناف سے ہے۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک

کے تعلق سے بڑی بیش بہا ہدایات دی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا:

تمہیں معلوم ہے کہ پڑوسی کا کیا حق ہے۔ یہ کہ جب وہ تم سے مدد مانگے مدد کرو اور جب قرض مانگے قرض دو، اور جب محتاج ہو تو اُسے مال دو اور جب بیمار ہو عیادت کرو، اور جب اُسے خیر پہنچے تو مبارک باد دو اور جب مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو، اور مرجائے تو جنازہ کے ساتھ جاؤ اور بغیر اجازت اپنی عمارت بلند نہ کرو کہ اس کی ہوا روک دو اور اپنی ہانڈی سے اس کو ایذا نہ دو مگر اس میں سے کچھ اُسے بھی دو اور میوے خریدو تو اس کے پاس بھی ہدیہ کرو، اور اگر ہدیہ نہ کرنا ہو تو چھپا کر مکان میں لاؤ اور تمہارے بچے اُسے لے کر باہر نہ نکلیں کہ پڑوسی کے بچوں کو رنج ہوگا۔ تمھیں معلوم ہے پڑوسی کا کیا حق ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، پورے طور پر پڑوسی کا حق ادا کرنے والے تھوڑے ہیں، وہی ہیں جن پر اللہ کی مہربانی ہے۔ برابر پڑوسی کے متعلق حضور وصیت فرماتے رہے، یہاں تک کہ لوگوں نے گمان کیا کہ پڑوسی کو وارث کردیں گے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں۔ بعض کے تین حق ہیں، بعض کے دو اور بعض کا ایک حق ہے۔ جو پڑوسی مسلم ہو اور رشتہ والا ہو اس کے تین حق ہیں۔ حق جوار، اور حق اسلام اور حق قرابت، پڑوسی مسلم کے دو حق ہیں۔ حق جوار، اور حق اسلام، اور پڑوسی کافر کا صرف ایک حق جوار ہے۔ ہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! ان کو اپنی قربانیوں میں سے دیں، فرمایا کہ مشرکین کو قربانیوں میں سے کچھ نہ دو۔ (سنن بیہقی)

صرف اس ایک حدیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں پڑوسی کے حقوق کی کتنی اہمیت ہے۔ قربانی کا تعلق باب عبادات سے ہے، باب احسانات سے نہیں ہے۔ مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرما کر کہ ”مشرکین کو قربانیوں میں سے کچھ نہ دو“ یہ اشارہ فرمایا ہے کہ غیر مسلم پڑوسی سے ہمارا رشتہ احسانات میں ہے، عبادات میں نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ہماری عبادات کا قائل نہیں ہے۔

راعی اور رعایا کے حقوق:

''راعی'' کا معنی ہے چرواہا، نگہبان، محافظ، حاکم، بہت الفت کرنے والا۔ اور ''رعیّۃ'' وہ ہے جس کی وہ حفاظت کرے، جسے چرائے اور جس سے خوب الفت ومحبت سے پیش آئے۔ ان معانی کے لحاظ سے ''راعی'' کا لفظ مویشی کے نگہبان، چرواہا کسی بھی معمولی سے معمولی کام کا ذمہ دار، افسر، حکومت کی انتظامیہ، عدلیہ، مقنّنہ، وزیر اعظم، صدر مملکت، بادشاہ، خلیفہ سب کو عام ہے اور ان کے ماتحت، ان کے دائرۂ اختیار تک کے لوگ ان کی رعایا ہیں۔ ساتھ ہی یہ معانی اس بات کا ذہن دے رہے ہیں کہ راعی ایسا شخص ہونا چاہیے جو اپنے رعایا کی نگہبانی بڑی شفقت ومحبت کے ساتھ کرے۔ احادیث نبویہ میں بھی معنی لغوی کے عموم کی رعایت کی گئی ہے اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے ذمہ دار پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگاہ ہو جاؤ، تم میں سے ہر ایک راعی ونگہبان ہے اور سب سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ تو بادشاہ لوگوں کا راعی ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص ورعایا کے متعلق باز پرس ہوگی، آدمی اپنے گھر والوں کا راعی ہے، اس سے ان کے بارے میں پرسش ہوگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بال بچوں کی نگراں وراعی ہے، اس سے ان کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی اور غلام یا نوکر، خادم اپنے آقا کے مال واسباب کا نگہبان ہے، اس سے اس کا محاسبہ ہوگا۔ تو باخبر رہو، تم میں کا ہر شخص راعی ونگہبان ہے اور سب سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہوگا۔

(صحیح البخاری، ص۱۰۵۷ ج۲ کتاب الاحکام، وص۳۲۴ ج۱ کتاب فی الاستقراض)

''امام'' کا لفظ صدر مملکت، سلطان، خلیفہ سب کو عام ہے۔

اس حدیث پاک میں مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بادشاہ، وزیر، عورت، نوکر چاکر، غلام سب کو اپنے اپنے دائرۂ اختیار کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور

ساتھ ہی اس امر سے بھی آگاہ فرمادیا ہے کہ کل میدانِ قیامت میں سب کو خدائے جبّار وقہّار کے حضور جواب دہ ہونا ہوگا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ پھر ہر شخص کو اپنی ذمہ داری پوری دیانت کے ساتھ ادا کرنی چاہیے کیوں کہ اللہ عزوجل سب کے کاموں کو دیکھ رہا ہے اور وہ سب کی جزا وسزا کا مالک ہے۔

صحابیٔ رسول حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرضِ وفات میں بصرہ کا حاکم عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کے لیے آیا تو آپ نے فرمایا:

میں تجھ سے ایک حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے کسی قوم کا حاکم ونگہبان بنائے اور وہ ہر طرح ان کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔ (صحیح البخاری ۲/ ۱۰۵۸)

دوسری روایت میں فرمان نبوت کے الفاظ یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جسے رعایا کا حاکم ونگہبان بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اپنی رعایا کے ساتھ غدّاری کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام فرمادے گا۔ (صحیح مسلم شریف ص۸۱ ج۱ باب استحقاق الوالی الفاش الرعیۃ النار من کتاب الایمان)

''رعایا کا غدّار'' وہ ہے جو ان کے حقوق کی نگہبانی نہ کرے اور ان کے دشمنوں سے انھیں نہ بچائے، ان کے ساتھ عدل وانصاف نہ کرے یا اپنے اور پرائے میں امتیاز کرے۔ جب کہ حاکم کی ایک بہت بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے پرائے، امیر غریب سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ قرآن حکیم میں اس تعلق سے یہ واضح ہدایت ہے:

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا ط اعدلوا قف هو اقرب للتقوىٰ

اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

رعایا کی حفاظت وخیر خواہی میں ان کے دین، جان، مال، عقل، نسب وغیرہ حقوق کثیرہ کی حفاظت ونگہبانی شامل ہے جس کی ذمہ داری براہِ راست ان کے راعی وحاکم کے سرہی عائد ہوتی ہے اور اس کے لیے نظام عدل کا قیام، اپنے پرائے، امیر وغریب سب کے ساتھ مساوی سلوک، اپنے فرائض میں دھوکہ، فریب، بدعہدی، خیانت سے احتراز، اعلیٰ ظرفی خیر خواہی رفق ولطف اور حلم وبردباری ضروری ہے۔ اگر آج کا حکمراں طبقہ صرف نظام عدل قائم کردے تو ساری دنیا سے دہشت گردی، انتہا پسندی اور ظلم وعدوان کا خاتمہ ہو جائے۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حقوق انسانی کے تعلق سے دنیائے انسانیت کو جو ہدایات جاری فرمائی ہیں، یہ ان کا ایک مختصر خاکہ ہے جن کی شرح وبسط کے لیے دفتر درکار ہے تاہم اس خاکے سے بھی اسلام کی عظمت کا احساس واعتراف ہر دل بینا کرسکتا ہے اور آج دنیا کے پاس حقوق انسانی کی جو کچھ پونجی پائی جاتی ہے، وہ سب صدقہ ہے محسن انسانیت مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کا جنھیں خدائے رحیم وکریم نے سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا۔ سچ ہے ۔

تیرے آنے سے پہلے کب تھی ایسی بات دنیا میں
بہار آئی نہیں، لائی گئی معلوم ہوتی ہے
مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ - منبع تصوف

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، حیدرآباد

تصوف (ضرورت واہمیت):

شریعت مطہرہ نے انسان کی صلاح وفلاح اور دنیا وآخرت میں اس کی کامیابی وکامرانی کے لیے اسے دوقسم کے احکام دیئے ہیں: اِن احکام کی ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کے جسم اور قالب سے ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کے روح وقلب سے ہے۔ پھر قلب وقالب دونوں سے متعلق احکام مزید دودو قسموں میں منقسم ہیں: اوامر اور نواہی۔

جسم سے متعلق اوامر ہیں: نماز، زکاۃ، روزہ اور حج وغیرہ؛ نواہی ہیں: چوری، شراب نوشی اور زنا وغیرہ۔ اسی طرح قلب سے متعلق اوامر میں اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں، آسمانی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانا وغیرہ شامل ہے۔ صدق و توکل رضا اور شکر وغیرہ بھی اوامر قلبیہ کا حصہ ہیں۔ جبکہ قلب سے متعلق نواہی میں کفر، نفاق، کبر، بغض، ریا، حسد اور خود پسندی وغیرہ داخل ہیں۔

نجات کے لیے قلب وقالب دونوں کی اصلاح ضروری ہے، اور شرعا دونوں سے متعلق احکام کی بجاآوری مطلوب ہے۔ لیکن احکام قلبیہ- اوامر ہوں یا نواہی-اس حیثیت سے زیادہ اہم ہیں کہ انھیں پر جسم کے اعمال کی صحت وقبولیت کا دارومدار ہوتا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"إن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد کله، و إذا فسدت فسد الجسد کله، ألا و هي القلب" (۱)

(بلاشبہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر یہ درست ہے تو پورا جسم درست ہے اور اگر یہ فاسد ہے تو پورا جسم فاسد ہے، ہشیار رہو یہ ٹکڑا دل ہے۔)

جسم میں یہی وہ ٹکڑا ہے جو رب تعالیٰ کا محل نظر ہے، ارشاد نبوی ہے:

"إن الله لا ینظر إلی أجساد کم ولا إلی صور کم ولکن ینظرإلی قلوبکم"(۲)

(اللہ تعالیٰ نہ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے، لیکن وہ تمہارا دل دیکھتا ہے۔)

لہٰذا دنیا میں اعمال کی صحت اور آخرت میں نجات دونوں کا دار مدار دل کی اصلاح پر ہے۔ اس سے قلب اور اس سے متعلق احکام دونوں کی غیر معمولی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں قلب سے متعلق احکام کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جسم کے برخلاف دل کے امراض وعیوب بہت خفیہ اور باریک ہوتے ہیں، جن کا علم وادراک بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ہم اپنے دل کے عیب کو ہنر اور نقص کو کمال سمجھ لیتے ہیں۔ مثلا کوئی اپنے ٹوٹے ہوئے پیر کو صحیح نہیں سمجھتا، نہ ہی بخار اور سر درد کے شعور میں کبھی کوئی غلطی کرتا ہے، لیکن بے شمار لوگ ایسے ہیں جو تکبر کو عزت نفس، تملق کو احترام غیر، غیبت کو حق گوئی، اہانت ذات کو تواضع ، بزدلی کو حزم واحتیاط، تہور کو شجاعت اور بخل کو اقتصاد سمجھتے ہیں۔

تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق کے ذریعے دل کے تمام عیوب وامراض حتی کہ وساوس وخطرات کو بھی دور کیا جاسکتا ہے۔ اور دل سے متعلق احکام کی اچھی طرح سے بجاآوری کی جاسکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"قد أفلح من زکها" (الشمس:۹) یعنی کامیاب وہ ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔

تصوف اسی تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق کا نام ہے، جس کے ذریعے انسان اپنے ظاہر وباطن کی تعمیر کرسکتا ہے، تاکہ وہ ابدی سعادتوں سے ہمکنار ہوسکے۔ قاضی زکریا انصاری متوفی ۹۲۹ھ، تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"التصوف: علم تعرف به أحوال تزکیة النفوس و تصفیة الأخلاق و تعمیر الظاهر و الباطن لنیل السعادة الأبدیة" (۳)

(تصوف ایسا علم جس کے ذریعے نفوس کے تزکیہ، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال کو جانا جاتا ہے، تاکہ ابدی خوش بختی حاصل ہوسکے۔)

مختصر یہ کہ اعمال کا دار ومدار قلب پر ہے، اور وہی رب تعالیٰ کا محل نظر ہے، پھر قلب کی صلاح وفلاح تزکیہ پر موقوف ہے اور تزکیہ کے قواعد وسائل کی معرفت تصوف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ان واضح اور یقینی قضایا سے ہم اس واضح اور یقینی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: تصوف کی ضرورت واہمیت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

منبع تصوف:

دین کے تمام شعبوں کی طرح تصوف وتزکیہ کا منبع بھی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، بلکہ قرآن کریم تو تزکیہ کو انکی بعثت کا مقصد قرار دے رہا ہے:

"لقد من الله علی المومنین إذبعث فیهم رسولا من أنفسهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة" (آل عمران:۱۶۴)

(بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت فرماتا ہے، انکا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

تزکیہ ہی کی طرح تصوف کے جملہ اصول وفروع کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔ تصوف اور علم تصوف میں تمیز نہ کرنے والے حضرات زبردست غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور اکثر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ یہ عہد صحابہ میں کیوں نہ تھا؟ اگر ان کی مراد علم تصوف ہے تو بلاشبہ یہ قرون اولی میں نہیں تھا نہ اس وقت اس کی ضرورت تھی، بلکہ علم تفسیر اور دیگر علوم قرآن، علم حدیث، علم توحید وکلام اور علم فقہ واصول وغیرہ کوئی بھی علم اس مبارک ومسعود عہد میں نہیں تھا، اور نہ ان کی ضرورت تھی۔ اور اگر مراد تصوف ہے تو بلاشک وشبہ یہ اس عہد میں موجود تھا۔ خود مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام کا تزکیہ فرماتے تھے اور انھیں مجاہدۂ نفس یا ''جہاد اکبر'' کی تربیت دیتے تھے۔

شیخ محمد صدیق محدث غماری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''أما أول من أسس الطريقة فلتعلم أن الطريقة أسسها الوحي السماوي في جملة ما أسّس من الدين المحمدي، إذهي بلا شك مقام الإحسان الذي هوأحد أركان الدين الثلاثه التي جعلها النبي صلى الله عليه وآله وسلم، بعد مابينها واحدا واحدا، دينا بقوله: "هذا جبريل عليه السلام أتاكم يعلمكم دينكم" وهوالإسلام والإيمان والإحسان. فالإسلام طاعة وعبادة والإيمان نورو عقيده، والإحسان مقام مراقبة و مشاهدة''۔ (۴)

(رہا یہ کہ تصوف کی بنیاد کس نے ڈالی تو جان لو کہ اس کی بنیاد وحی آسمانی نے ڈالی ہے جس طرح کہ دین محمدی میں ہر چیز کی بنیاد وحی آسمانی نے ڈالی ہے۔ بلاشبہ تصوف وہی ہے جسے (حدیث شریف میں) احسان کہا گیا ہے۔ احسان دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کرکے بیان کیا اور انھیں دین قرار دیا، بایں طور کہ فرمایا: ''یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے''۔ یہ تینوں ارکان اسلام، ایمان اور احسان ہیں۔ اسلام اطاعت وعبادت ہے، ایمان نور وعقیدہ کا نام ہے، اور احسان مقام مراقبہ و

مشاہدہ ہے)۔

حدیثِ جبریل:

شیخ غماری نے جس حدیث شریف کی طرف اشارہ کیا ہے اور جسے انھوں نے تصوف کی بنیاد قرار دیا ہے، اصطلاح میں یہ حدیثِ جبریل کے نام سے مشہور ہے یہ حدیث نہ صرف تصوف بلکہ شریعت مطہرہ کی ایک اہم اصل ہے۔ یہ ایک صحیح ومشہور حدیث ہے۔ بے شمار اصحاب صحاح وسنن وآثار ومصنفات ومسانید نے اس کی روایت کی ہے۔ چونکہ یہ حدیث اہل تصوف کا بنیادی ماخذ ہے اور بقول صاحب فتح الباری یہ ''بغیۃ السالکین، کنز العارفین اور عمدۃ الصدیقین'' ہے، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے۔

امام مسلم اپنی الجامع الصحیح میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

''بينما نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم، إذ طلع علينا رجل شد يد بياض الثياب، شديد سواد الشعر، لايرى عليه أثر السفر، و لا يعرفه منا أحد، حتى جلس إلى النبي (صلى الله عليه وآله سلم) فأسند ركبتيه إلى ركبتيه، ووضع كفيه على فخذيه، وقال يا محمد! أخبرني عن الإسلام؟ فقال رسول الله:" الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، و تقيم الصلاة، و توتي الزكاة، و تصوم رمضان، و تحج البيت إن استطعت إليه سبيلا" قال: صدقت، قال: فعجبنا له يسأله ويصدقه، قال: فأخبرني عن الإيمان؟ قال: "أن تومن بالله، وملائكته، و كتبه، ورسله، واليوم الآخر، وتومن بالقدر خيره و شره"، قال: صدقت، قال: فأخبرني عن الإحسان؟ قال: "أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فانه يراك"، قال فأخبرني عن الساعة؟ قال: "ماالمسؤل عنها بأعلم من

السائل"، قال فأخبرني عن أماراتها؟ قال: "أن تلدالأمة ربتها، وأن ترى الحفاة العراة، العالة، رعاء الشاء، يتطاولون في البنيان"، قال: ثم انطلق، فلبثت مليا، ثم قال لي: "يا عمر! أتدري من السائل؟" قلت: الله ورسوله أعلم، قال: "فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم" (٥)

(ایک دن ہم لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں تھے کہ ہمارے درمیان ایک شخص آیا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال خوب کالے تھے نہ تو اس پر سفر کا کوئی اثر تھا نہ ہم میں سے کوئی اس سے واقف تھا۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا بایں طور کہ اس نے اپنے گھٹنوں کو حضور کے گھٹنوں سے ملا دیا اور اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر رکھ لیا۔ اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے؟ آپ نے فرمایا کہ: ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، زکاۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت ہو تو حج کرو''۔ اس شخص نے کہا: آپ نے سچ فرمایا: راوی (حضرت عمر) کہتے ہیں کہ: ہمیں اس شخص سے بہت تعجب ہوا کہ خود سوال کر رہا ہے اور خود ہی تصدیق کر رہا ہے، پھر اس شخص نے پوچھا مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا: ''کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور اچھی بری تقدیر پر''۔ اس شخص نے کہا: آپ نے صحیح فرمایا اور کہا کہ: مجھے احسان کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا کہ ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہ دیکھ سکو تو (یہ یقین رہے کہ) وہ تمھے دیکھ رہا ہے'' اس شخص نے کہا: مجھے قیامت کے بارے خبر دیجئے؟ فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا''۔ اس شخص نے عرض کیا: اچھا تو پھر اس کی نشانیوں کے بارے میں مطلع کیجئے؟ فرمایا: ''کہ باندی اپنی مالکن کو پیدا کرے گی، اور تم دیکھو گے کہ برہنہ پا و برہنہ بدن، دوسروں پر گزارا کرنے والے، بکریاں چرانے والے،

کوٹھیوں میں اترائیں گے''۔ راوی فرماتے ہیں کہ پھر وہ شخص چلے گئے، میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمر! کیا تم جانتے ہو کہ یہ سوال کرنے والا کون تھا؟'' میں نے عرض کیا: اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: ''یہ جبریل (علیہ السلام) تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے''۔)

یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمارہ ابن قعقاع اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ علاوہ ازیں اکثر روایتوں میں "أن تعبد الله" ہی آیا ہے البتہ بعض روایتوں میں "أن تعمل لله" (٦) (اللہ کے لیے یوں عمل کرو...) اور بعض دوسری روایتوں میں "أن تخشى الله" (٧) (اللہ سے ایسا ڈرو...) وارد ہوا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علماء و محدثین نے بڑے ایمانی و عرفانی نکات بیان کئے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر یہاں صرف ایک بات عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ایک نہایت مہتم بالشان امر کا بیان کروا رہا ہے، ارکان دین متین کی وضاحت کروا رہا ہے، لہٰذا اس مہتم بالشان امر کے شایان شان اہتمام بھی کیا جا رہا ہے، حضرت جبریل کو سائل بنا کر بھیجا جا رہا ہے تا کہ حدیث شریف میں بیان کردہ امور کی قدر و شان کا اندازہ ہو سکے۔ اس حدیث میں حضرت جبریل نے تین سوالات کئے: اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ اور احسان کیا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سوالوں کے جواب مرحمت فرمائے اور پھر فرمایا کہ: ''یہ جبریل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے''۔ اس طرح یہ حقیقت آفتاب نیم روز کی طرح واضح، اور اس امر میں ظاہر بلکہ نص ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان دین محمدی کے تین ارکان ہیں جن میں سے کسی ایک کے بغیر دین مکمل نہیں ہے۔ اور کسی ایک کا بھی انکار دین کا انکار ہے۔

احسان و تصوف:

حدیث جبریل میں جیسے احسان کہا گیا ہے بعد میں اسی کا نام تصوف ہو گیا

ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: احسان یہ ہے کہ ''أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك ''یعنی خدا کی بندگی یوں کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اس کا مشاہدہ کر رہے ہو، اور اگر تمھیں یہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یوں اس کی بندگی کرو جیسے وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ پہلا مرحلہ مرحلۂ مشاہدہ ہے جو اعلی درجے کا ہے یہی تصوف کی منزل ہے، یہی سالکین طریقت کی منہائے آرزو ہے۔ اور دوسرا مرحلہ مرحلۂ مراقبہ ہے یعنی اس تصور کے ساتھ عبادت کرو کہ تمھاری نگرانی ہو رہی ہے۔ اور مراقبے کا یہ مسلسل تصور کبھی بھی اخلاص کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ تصوف اِنھیں دونوں مرحلوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے کہ تصوف نام ہے سلوک اور وصول کا، صوفی یا تو سالک ہوتا ہے یا پھر واصل ہوتا ہے۔ سلوک: راستہ (طریقت) و مراقبہ ہے، اور وصول: منزل و مشاہدہ ہے۔

شارح مسلم امام نووی، ابوزکریا یحی بن شرف متوفی ۶۷۶ھ، فرماتے ہیں کہ:

"قوله صلى الله عليه و سلم: (الإحسان أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك) هذا من جوامع الكلم التى أوتيها صلى الله عليه و سلم، لأنا لو قدرنا أنّ أحد نا قام فى العبادة و هو يعاين ربه سبحانه تعالى لم يترك شيئاً ممايقدر عليه من الخضوع و الخشوع و حسن الصمت"۔(۸)

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کہ: ''احسان یہ ہے کہ تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر اسے نہ دیکھ سکو تو یوں گویا وہ تمھیں دیکھ رہا ہے''۔ یہ ان جوامع الکلم میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہم اندازہ کریں کہ ہم سے کوئی اس حال میں عبادت کے لیے کھڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے رب سبحانہ تعالی کا مشاہدہ کر رہا ہو، تو وہ خضوع و خشوع اور جمالِ سکینۂ و وقار میں سے حسب مقدور کوئی چیز ترک نہیں کر سکتا ہے۔)

اس حدیث کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جسے امام نووی نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

"وهذا الحديث قد اشتمل على شرح جميع وظائف العبادات الظاهرة والباطنة من عقود الإيمان و أعمال الجوارح وإخلاص السرائر، و التحفظ من آفات الأعمال حتى أن علوم الشريعة كلها راجعة إليه، و متشعبة منه، قال: وعلى هذا الحديث وأقسامه الثلاثه ألفنا كتابنا الذى سميناه بالمقاصد الحسان فيما يلزم الإنسان، إذ لا يشذ بشئ من الواجبات و السنن والرغائب و المحظورات و المكروهات عن أقسامه الثلاثه والله أعلم"۔(۹)

(یہ حدیث شریف ایمان کے ارکان، اعضاء کے اعمال، باطن کے اخلاص اور عمل کی آفتوں سے حفاظت غرض یہ کہ جملہ اعمال ظاہر و باطن کے شرح و بیان پر مشتمل ہے۔ یہ تمام شرعی علوم کی اصل ہے اور سارے علوم اس کی شاخیں ہیں۔ ہم نے اس حدیث میں مذکور تینوں ارکان دین پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''المقاصد الحسان فيما يلزم الانسان ''رکھا ہے، کیونکہ واجبات، سنن، مستحبات، ممنوعات اور مکروہات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان تینوں قسموں سے باہر ہو۔)

امام ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، حدیث جبریل میں مذکور احسان اور اس کی تعریف کو دین کا رکن رکین اور تصوف کی اصل متین قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

''وهذا القدر من الحديث الشريف أصل عظيم من أصول الدين وقاعدة مهمة من قواعد المسلمين ـ وهوعمدة الصديقين، و بغية السالكين، و كنزالعارفين، ودأب الصالحين ـ وهومن جوامع الكلم التى أوتيها رسول الله صلى الله عليه و سلم" ـ (۱۰)

(حدیث شریف کا یہ حصہ (أن تعبد الله كانك...) دین کے اصول میں سے ایک عظیم اصل ہے اور مسلمانوں کے قاعدوں میں سے ایک اہم قاعدہ ہے۔ یہ صدیقین کا معتمد علیہ، سالکین طریقت کا ہدف و مقصد، عارفین باللہ کا خزانہ اور صالحین کا طریقہ ہے۔ یہ ان جوامع الکلم میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

دیئے گئے ہیں۔)

نووی وعسقلانی رحمہما اللہ کی طرح تمام علمائے حق کا اجماع ہے کہ حدیث جبریل میں مذکور احسان- جو دین کے تین رکنوں میں سے ایک رکن ہے-تصوف ہی ہے۔ اور مرتبۂ احسان کا حصول علم تصوف کے ذریعے ہی ہوتا ہے، کیونکہ جیسے دین کے رکن اول ایمان کی تفسیر علم کلام نے کی ہے، رکن ثانی کی تفصیل و بیان کا کام فقہ نے کیا ہے، ویسے ہی رکن اخیر یعنی احسان کی شرح وبسط اوراس کی عقدہ کشائی کا عمل علم تصوف نے انجام دیا ہے۔ اوران تینوں کا مصدر ومنبع رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات وستودہ صفات ہے، ان کی لائی ہوئی کتاب ہے، ان کی سنت و سیرت ہے، اوران کی تعلیم وہدایت ہے۔

ذیل میں تصوف کے عملی منہج کے اہم اورضروری عناصر کے ساتھ ساتھ سلوک الی اللہ کے چند احوال ومقامات کا کتاب وسنت سے ثبوت پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ تصوف پر عجمیت کا بہتان لگانے والی یا اسے عیسائیت، بدھزم یا ہندومت سے ماخوذ قرار دینے والی نام نہاد ''دانشوری'' کو مجال سخن نہ رہے۔ واضح رہے کہ یہ ایک محدود وسرسری جائزہ ہے، جس میں نہ پورے نظام تصوف کا احاطہ ممکن ہے، اور نہ سارے احوال ومقامات کے ذکر کی گنجائش ہے۔ یہاں تو صرف اس بات کا اثبات مطلوب ہے کہ جس طرح اصل تصوف یعنی احسان کا مصدر سنت نبویہ ہے، اسی طرح اس کے تمام اہم فروع اور سلوک الی اللہ کے تمام مراحل اور احوال ومقامات کا منبع بھی کتاب وسنت ہے۔ لہٰذا مقالے میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ نہ منطقی دلائل پیش کئے جائیں نہ، عقلی حجتوں سے تعرض کیا جائے، نہ فقہی، کلامی، تفسیری اور تاریخی روایتوں پر اعتماد کیا جائے اور نہ صوفی یا غیر صوفی کسی بھی غیر معصوم کے قول کو سند بنایا جائے، بلکہ صرف اور صرف حجتِ معصومہ پر اکتفا کیا جائے۔ محض اللہ عزوجل کی کتاب اور سنت صحیحہ ثابتہ کو ہی دلیل بنایا جائے۔ تاکہ یہ ایک طرف اہل تصوف کے لیے حجت ہو، اور دوسری طرف معارضین تصوف کے لئے عبرت ونصیحت ہو۔

منہج عملی:

۱- صحبت:

صالحین کی صحبت سالکین طریقت کی پہلی منزل ہوتی ہے، حکم ربانی ہے:

"یاایھا الذین آمنو ااتقوالله و کونوامع الصادقین" (التوبۃ:۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔)

صحبت کی اہمیت وضرورت کا بیان، سورۃ الاحزاب:۲۳، الکہف:۲۸، ۶۶، ۶۷، لقمان:۱۵، الفرقان:۲۷، ۲۸، ۲۹، ۵۹، اور الزخرف:۶۷، میں بھی ہوا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحبت کے اثرات کو لازمی قرار دیتے ہوئے بے حد دلکش اور یقین افروز مثال پیش فرماتے ہیں:

"إنما مثل جليس الصالح و جليس السوء كحامل المسك و نافخ الكير، فحامل المسك إما أن يحذيك، وإما أن تبتا ع منه، وإما أن تجد منه ريحا طيبة، و نافخ الكير، إماأن يحرق ثيابك و إما أن تجد منه ريحا منتنة" (۱۱)

(اچھے اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے مشک رکھنے والا، اور لوہار کی دھونکنی دھونکنے والا، مشک رکھنے والا یا تو تمھیں ہدیہ دے گا یا تم اس سے خریدوگے یا اس سے اچھی خوشبو پاؤگے، اور دھونکنی والا یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا یا تم اس سے بری بدبو پاؤگے۔)

یعنی صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے چنانچہ اچھوں کی صحبت سے فائدہ ضرور ہوتا ہے کم ہو یا زیادہ اسی طرح بروں کی صحبت سے نقصان ضرور ہوتا ہے کم ہو یا زیادہ۔ بلکہ ایک دوسری حدیث میں تو آپ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ لوگ اپنے دوستوں کے عقیدہ و مذہب پر ہوتے ہیں، چنانچہ امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، اور امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الرجل علی دین خلیله فلینظر أحدکم من یخالل"(۱۲)

(ہر شخص اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے لہٰذا تم میں سے ہر ایک غور کرے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔)

۲- بیعت:

سالک وصوفی ابتدائے سلوک میں شیخ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام کر نیکیوں کے التزام اور گناہوں کے اجتناب کا عہد کرتا ہے۔ اسی عہد کا نام بیعت ہے۔ تصوف میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ اس بیعت کی ضرورت اور اس کا مقصد وطریقہ سب کچھ کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

"إن الذین یبایعونك إنما یبایعون الله، ید الله فوق أیدیهم، فمن نکث فإنما ینکث علی نفسه، و من أوفی بما عاهد علیه الله فسیؤتیه أجرا عظیما"(الفتح:۱۰)

(جو لوگ آپ کی بیعت کر رہے ہیں درحقیقت وہ اللہ کی بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، تو جس نے بیعت کو توڑا اس کا وبال اسی پر ہوگا اور جس نے اللہ سے کئے گئے عہد کو پورا کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جلد ہی بڑا اجر دے گا۔)

سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں اخذ بیعت اور حصول عہد کی متعدد صورتیں ملتی ہیں، جیسے مردوں کی بیعت، عورتوں کی بیعت، فرد واحد کی بیعت، پوری جماعت کی بیعت وغیرہ، یہاں تک کی نابالغ بچوں کی بیعت بھی سنت صحیحہ میں ملتی ہے۔

امام بخاری علیہ رحمۃ الباری متوفی ۲۵۶ھ، حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کرتے ہیں کہ، ارشاد نبوی ہے:

"بایعونی علی أن لاتشرکوا بالله شیئاً، و لا تزنوا، و لا تقتلوا أولادکم و لاتأتوا ببهتان تفترونه بین أیدیکم وأرجلکم، و لا تعصوا فی

المعروف، فمن وفّی منکم فأجره علی الله، و من أصاب من ذلك شیئاً فعوقب فی الدنیا فهو کفارة له، و من أصاب من ذلك شیئاً ثم ستره الله فهو إلی الله إن شاء عفا عنه و إن شاء عاقبه، فبا یعناه علی ذلك" (۱۳)

(اس شرط پر میری بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے، بہتان کے ذریعے کھلی افتراء پردازی نہیں کرو گے، بھلائی میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ پس تم میں سے جو بھی عہد کو پورا کرے گا اس کی جزاء اللہ کے ذمہ ہے، اور جس سے ان میں سے کوئی چیز سرزد ہوگئی پھر دنیا میں اسے سزا مل گئی تو وہ سزا اس کے لیے کفارہ ہوگی، اور جس سے ان میں سے کوئی گناہ سرزد ہوا پھر اللہ نے اسے پوشیدہ رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چاہے گا تو معاف کردے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا۔ پھر ہم نے اسی پر آپ کی بیعت کی۔)

۳- مجاہدہ:

جہاد کی طرح مجاہدہ بھی فعل: ''جاھد/ یجاھد'' کا مصدر ہے: جیسے ''عاقب/ یعاقب/ معاقبۃ وعقابا''، البتہ عام استعمال میں مجاہدہ: جہاد بالنفس کے لیے، اور جہاد: ظاہری دشمن سے مجاہدہ بالسلاح کے لیے بڑی حد تک مخصوص ہو گیا ہے۔ لیکن اصل معنی کی رعایت میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ بھی خوب استعمال ہوتے ہیں۔ مجاہدے کی تین قسمیں ہیں: ۱- ظاہری دشمن سے مجاہدہ، ۲- شیطان سے مجاہدہ اور ۳- نفس سے مجاہدہ۔ اور مجاہدے کی یہ تینوں قسمیں شرعاً مطلوب ہیں لیکن آخر الذکر یعنی مجاہدۂ نفس کو بقیہ دونوں قسموں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ جو لوگ مجاہدۂ نفس کی منزل سے گزر چکے ہوتے ہیں وہی صحیح معنوں میں ظاہری دشمن سے مجاہدے (جہاد) کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے مجاہدۂ نفس کو ''جہاد اکبر'' کہا گیا ہے۔ آج امت اسلامیہ غیر مزکی نفوس کے جہاد سے جس قدر آزردہ اور جس طرح اقوام عالم کے سامنے مہتم ہے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اگر گزشتہ ۲۰/۲۵ سالوں میں ان نام نہاد

مجاہدوں کی ''پروگریس رپورٹ'' دیکھیئے تو ان کے ہاتھوں سے مرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کی تعداد سے ہزاروں گناہ زیادہ ہے صرف ایک الجزائر میں لاکھوں مسلمانوں اس ''جہادی جنون'' کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان مظلوموں کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ ائمہ کی تقلید کرتے تھے اور تصوف کی تائید کرتے تھے۔

مجاہدۂ نفس بھی کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ آیت کریمہ " وجاهدوا في الله حق جهاده "(الحج:۷۸) یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حکم ہے۔ اور آیت کریمہ: "وجاهدوا بأموالكم وأنفسكم في سبيل الله " (التوبۃ:۴۱) یعنی اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، ان آیتوں میں ظاہری دشمن، شیطان اور نفس تینوں سے جہاد شامل ہے۔ یعنی یہ آیتیں جہاد کی تینوں قسموں کا احاطہ کئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب جہاد کی تین قسمیں ہیں تو کتاب وسنت میں جہاں جہاں جہاد کا حکم ہوگا اس میں یہ تینوں قسمیں داخل ہوں گی ہاں اگر کسی آیت یا حدیث میں ایسا کوئی قرینہ ہو جو اسے ایک ہی قسم میں محدود کردے تو وہاں قرینے کے مطابق جہاد کی وہی مخصوص قسم مراد ہوگی۔ مثلاً اگر قتال کے شروع ہونے سے قبل اور جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے کسی آیت میں جہاد کا حکم ہے تو یہ ایک قرینہ ہے کہ یہاں جہاد سے مراد مجاہدۂ نفس ہے: جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا " (العنکبوت:۶۹)

(جنھوں نے ہماری رضا کی طلب میں مجاہدہ کیا ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھائیں گے)۔

یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور قتال کا حکم مدینے میں فرض ہوا لہٰذا یہ بات طے ہے کہ آیت میں مجاہدے سے مراد مجاہدۂ نفس یا مجاہدۂ شیطان ہے۔ مفسرین کرام نے بھی اس کی تائید کی ہے، امام قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد متوفی ۶۷۱ھ، فرماتے ہیں:

"قال السدى وغيره إن هذه الآية نزلت قبل فرض القتال" (۱۴)

(امام سدی اور دوسرے ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت جہاد کی فرضیت سے قبل نازل ہوئی۔)

شیخ ابو محمد عبدالحق اندلسی متوفی ۵۴۶ھ، اپنی کتاب ''المحرر الوجیز فی تفسیر کتاب اللہ العزیز'' میں فرماتے ہیں کہ آیت میں جہاد ومجاہدہ سے مراد ہے:

"مجاهدة النفس في طاعة الله عزوجل وهو الجهاد الأكبر"(۱۵)

(اللہ کی اطاعت میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہے، اور وہی جہاد اکبر ہے۔)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، فرماتے ہیں:

"أى من جاهد بالطاعة هداه سبل الجنة" (۱۶)

(جس نے اطاعت و بندگی کے ساتھ مجاہدہ نفس کیا تو اللہ نے جنت کے راستوں کی جانب اس کی ہدایت کی۔)

علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی متوفی ۱۲۷۰ھ، لکھتے ہیں کہ:

"قال ابن عطا: أى الذين جاهدوا في رضانا لنهدينهم إلى محل رضانا" (۱۷)

(ابن عطا فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی ہے کہ جن لوگوں نے ہماری رضا کے حصول کے لیے مجاہدہ نفس کیا ہم انھیں مقام رضا تک ضرور پہنچائیں گے۔)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مجاہدہ نفس کو جہاد کی تینوں قسموں میں سب سے افضل قرار دیا ہے۔ اور اپنی امت کو اس کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"الجاهد من جاهد نفسه في الله" (حقیقی مجاہد وہ ہے جو راہ خدا میں مجاہدۂ نفس کرے۔) امام ترمذی نے کتاب فضائل الجہاد میں اس کی تخریج کی ہے اور فرمایا ہے:"حديث حسن صحيح"۔ (۱۸)

بعض روایتوں میں 'للہ' یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مجاہدۂ نفس کرے، بھی آیا

ہے۔(۱۹)

۴- ذکر:

قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے کبھی یہ کتاب اللہ کے معنی میں آیا ہے (إنا نحن نزلنا الذکر)، کبھی نماز جمعہ کے لیے استعمال ہوا ہے (فاسعوا إلی ذکر الله)، تو کبھی علم کے معنی میں استعمال ہوا ہے (فاسألوا أهل الذکر) لیکن بایں ہمہ کتاب اللہ میں اس لفظ کا غالب استعمال اسی معنی میں ہوا ہے جس معنی میں اہل تصوف کے یہاں یہ لفظ رائج ہے۔ یعنی تسبیح وتہلیل وتکبیر وحمد وثنا اور درود وسلام وغیرہ، ارشاد ربانی ہے:

"یا أیها الذین آمنوا اذکروا الله ذکرا کثیرا و سبحوه بکرة و أصیلا" (الاحزاب:۴۱،۴۲)

(اے ایمان والوں اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کیا کرو اور صبح وشام اس کی پاکی بیان کیا کرو)

اس کے علاوہ بے شمار آیات میں ذکر الٰہی کی اہمیت، فضیلت اور ثمرات کا ذکر ملتا ہے مثلا: البقرہ:۱۵۲، ال عمران ۴۱، ۱۹۱، الاحزاب ۳۵، الرعد:۲۸، البقرہ:۱۱۴، النور، ۳۶، ۳۷، المنافقون:۹، اورالاحزاب:۳۵، وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم سنت نبوی کی طرف دیکھیں تو اس میں تصوف کا ''ذکر'' (یاد کرنا) بھی ملتا ہے ''تذکیر'' (یاد کرانا) بھی ملتی ہے، ''مذاکرہ'' (شیخ پر احوال قلب کو پیش کرنا) بھی ملتا ہے اور ''حلقہ ہائے ذکر'' کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

ا- ذکر:

مذکر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مثل الذی یذکر ربه والذی لایذکر ربه مثل الحی والمیت" (۲۰)

(اپنے رب کا ذکر کرنے والے اور اپنے رب کا ذکر نہ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ)

یعنی ذکر کرنے والا ہی حقیقت میں زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے، شاید اسی لیے تصوف میں ذکر الٰہی کو روح کی غذا کہتے ہیں جس کے بغیر روح زندہ نہیں رہتی ہے۔

ب- تذکیر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وذکر فإنّ الذکری تنفع المومنین" (الذاریات:۵۵)

(یاد کرائیے اس لیے کہ یاد کرانا مومنین کو منع نفع پہنچاتا ہے)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی متعدد مقام پر تذکیر کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کا شوق دلایا ہے۔ حدیث قدسی ''أنا عند ظن عبدی بی'' (میں اپنے بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے) میں اللہ رب العزت جل جلالہ فرماتا ہے: "وإن ذکرنی فی فلأ ذکرته فی مَلأ خیرمنه" (اگر میرا بندہ ایک گروہ میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے بہتر گروہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور مجمع میں ذکر الٰہی کرنا، یا لوگوں کو ذکر سنانا اور انھیں ذکر کرانا یہ سب تذکیر ہے۔

ج- مذاکرہ:

اہل ذکر سے سوال واستفسار مذاکرہ کہلاتا ہے، آیت: "فاسألوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون" (الفرقان:۵۹) اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: "المستشار مؤتمن" (۲۲) یعنی مشورہ کرنے والا اماموں رہتا ہے، مذاکرے کو بھی شامل ہیں۔ مذاکرہ سالک کا اپنے شیخ سے مشورہ ہی ہوتا ہے۔

امام مسلم بن حجاج نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ، اپنی الجامع الصحیح، کتاب التوبہ میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مجھے ملے تو پوچھا کہ: اے حنظلہ کیسے ہو؟ میں

نے کہا کہ: حنظلہ تو منافق ہوگیا، کہا: سبحان اللہ! کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ جب
ہم رسول اللہ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت و دوزخ کی تذکیر (یاد)
کراتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب ہم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے نکلتے ہیں تو ہم بیوی بچوں اور روزی میں
لگ جاتے ہیں اور بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم
مجھے بھی اس طرح پیش آتا ہے۔ تو ہم دونوں چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے پاس آئے اور میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ حنظلہ تو منافق ہوگیا، فرمایا کہ: وہ
کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ
ہمیں جنت و دوزخ کی یاد کراتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھ
رہے ہیں، اور جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو گھر والوں اور کاروبار میں لگ
جاتے ہیں اور بیشتر باتیں فراموش کر دیتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر تم لوگ جس حالت میں
میرے پاس اور ذکر کے وقت ہوتے ہو اسی پر ہمیشہ باقی رہو تو فرشتے تمہارے
بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ وقت
وقت کی بات ہوتی (یہ تین بار فرمایا)‘‘(۲۳)

الحمدللہ کہ اس حدیث شریف میں ذکر، تذکیر اور مذاکرہ تینوں کا ثبوت موجود
ہے۔ حضرت حنظلہ نے اپنے دل کے خیالات کو جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے سامنے پیش کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں جس طرح جواب مرحمت
فرمایا۔ اس کو تصوف میں مذاکرہ کہتے ہیں۔

د- حلقۂ ذکر:

حلقۂ ذکر کا انعقاد صوفیاء کے معمولات کا اہم حصہ ہے۔ اس کا مرجع بھی
نبوی تعلیمات ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”إذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا“، قالوا: و ما ریاض الجنة ؟
قال: ”حلق الذکر“ (۲۴)

(جب تم جنت کی کیاریوں سے گزرو تو چرلیا کرو یعنی اس سے استفادہ کرلیا
کرو، عرض کیا یارسول اللہ جنت کی کیاریاں کیا ہے؟ فرمایا حلقہ ہائے ذکر۔)

امام ترمذی رحمہ اللہ کی تخریج کردہ یہ حدیث جسے انھوں نے ”حسن“ کہا
ہے، نہ صرف حلقۂ ذکر کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے بلکہ اس میں حلقہ ذکر میں
شرکت کرنے کی زبردست ترغیب بھی ہے۔ اسی طرح ذکر الٰہی کی تمام دوسری قسمیں
جیسے: سری و جہری، لسانی و قلبی، حرکی و سکونی، فردی و اجتماعی وغیرہ تمام معمولات صوفیا کا
ذکر احادیث میں ملتا ہے۔

۵- خلوت:

تصوف میں خلوت کی بڑی اہمیت ہے۔ ظاہر بیں لوگ اسے صوفیا کی بدعت
سمجھتے ہیں لیکن صوفیائے کرام اس کا التزام اپنے رب کی اطاعت اور اس کے حکم کی بجا
آوری میں کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

”واذکر اسم ربك و تبتّل إلیه تبتیلا“ (المزمل:۸)

(اپنے رب کے نام کا ذکر کیجئے اور پوری طرح سب سے علاحدہ ہو کر اسی
کے ہو جائیے۔)

اس آیت میں خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، لیکن
اس میں موجود خلوت کا حکم سبھی کے لیے عام ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو کوئی حکم دیا جائے لیکن آپ کے ساتھ اس کے مخصوص ہونے کی کوئی
دلیل نہ ہو تو پوری امت سے اس حکم کی بجا آوری مطلوب ہوتی ہے۔

حکم ربانی کی پیروی کے ساتھ ساتھ صوفیاء کی خلوت نشینی رحمت عالم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے اتباع میں ہوتی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ روایت کرتے
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”جاورت بحراء شهرا“

(۲۵) یعنی میں نے ایک ماہ غار حرا میں خلوت نشینی کی۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ابتدا سوتے وقت رویائے صالحہ سے ہوئی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ دن کی مانند واضح طور پر پیش آتا تھا۔ مزید فرماتی ہیں کہ:

''ثم حبب إليه الخلاء ويخلو بغار حراء، فيتحنث فيه ــ وهو التعبد ــ الليالي ذوات العدد'' (۲۶)

(پھر آپ کو خلوت نشینی محبوب کر دی گئی، اور آپ کئی کئی رات غار حراء میں خلوت نشیں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔)

احوال مقامات

۱- **توبہ:**

شرعاً قابل مذمت سے لائق ستائش کی طرف رجوع کرنے اور لوٹنے کا نام توبہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا تُوْبُوْ اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَصُوْحًا (التحریم:۸)

(اے ایمان والو! اللہ تعالی سے سچی اور کھری توبہ کرو۔)

توبہ واستغفار کا ذکر قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ قلب سالک کا پہلا مقام ہے لہٰذا تصوف میں توبہ کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ صحیح توبہ پر ہی سلوک کی اگلی منزلوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفیا کے یہاں توبہ کا بہت اہتمام ملتا ہے، اور اسے فاتح باب سلوک مانا جاتا ہے۔ خود ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''يا أيها الناس توبوا إلى الله، فإني أتوب في اليوم إليه مائة مرة'' (۲۷)

(اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو، میں بھی ہر روز اس سے سو بار توبہ کرتا ہوں۔)

۲- **محاسبہ:**

نفس سے حساب لینے اور اس کی نگرانی کرنے کو محاسبہ کہتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

''ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ'' (التکاثر:۸)

(پھر اس دن تم سے ضرور ضرور نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔)

چنانچہ صوفیا آخرت کے حساب سے پہلے ہی ہمہ وقت نفس کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں، تاکہ آخرت میں محاسبہ کے وقت شرمندگی نہ ہو، اور یہی سچی دانائی ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''الكيس من دان نفسه، وعمل لما بعد الموت'' (۲۸)

(عقلمند اور دانا وہ ہے جو اپنے نفس کا اچھی طرح محاسبہ کرے، اور مرنے کے بعد کے لیے عمل کرے۔)

۳- **خوف:**

مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز کی توقع کی وجہ سے جو قلبی تکلیف ہوتی ہے اسے خوف کہتے ہیں۔ تصوف میں خوف کا درجہ بہت بلند ہے۔ کیوں کہ یہ عرفان خداوندی کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ'' (فاطر:۲۸)

(بے شک اللہ سے خوف کرنے والے اس کے عالم بندے ہی ہیں۔)

خوف خداوندی ایمان کی نشانی ہے:

''وَخَافُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ'' (آل عمران:۱۷۵)

(اگر ایمان والے ہو تو مجھ سے ڈرو۔)

خوف کا یہ مقام ہے کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرنے والوں کے لیے دو دو جنتیں ہیں دنیا میں جنت معارف، اور عقبیٰ میں جنت زخارف، ارشاد الٰہی ہے:

''وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتَانِ'' (الرحمان:۴۶)

(جو اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔)

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''من خاف أدلج و من أدلج بلغ المنزل ألا إن سلعة الله الغالية ألا إنَّ سلعة الله الجنة'' (۲۹)

(جس نے خوف کیا وہ اندھیرے منھ چل پڑا، اور جو اندھیرے منھ چل پڑا وہ منزل پر پہنچ گیا۔ یاد رکھو! متاعِ الٰہی بہت گراں ہے، یاد رکھو! متاعِ الٰہی جنت ہے۔)

۴- رجاء (امید):

یہ مقام مقامِ خوف کا متمم اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ: الإیمان بین الخوف و الرجاء'' یعنی ایمان امید وبیم کے درمیان ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ'' (الزمر: ۵۳)

(کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے خود پر ظلم کیا ہے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کی مغفرت فرماتا ہے، وہ بڑی مغفرت اور نہایت مہربانی کرنے والا ہے۔)

اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں رجاء و امید رکھنی چاہیے اس لیے کہ وہ فرماتا ہے کہ:

''وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ'' (الاعراف: ۱۵۵)

(یعنی میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔)

امام بیہقی نے سعید ابن مسیّب سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر مریض ہوئے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے، اور پوچھا: ''اے عمر خود کو کیسا پا رہے ہو؟'' عرض کیا: امید بھی رکھتا ہوں اور ڈرتا بھی ہوں، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ماا جتمع الرجاء و الخوف فی قلب مومن إلا أعطاه الله الرجاء و آمنه (من) الخوف (۳۰)

(جب بھی کسی مومن کے دل میں امید اور خوف اکٹھا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ

اس مومن کی امید پورا فرماتا ہے اور اسے اس خوف سے امن رہتا ہے۔)

۵- صدق:

صدق سیر الی اللہ کا ایک اہم مقام اور احوالِ قلب میں سے ایک بلند مرتبت حالت ہے۔ صوفیاء کے نزدیک صدق کا تعلق عوام کی طرح صرف زبان سے نہیں ہوتا ہے بلکہ دل، اعمال اور احوال سے بھی ہے۔ تصوف میں صدق کی فضیلت واہمیت کتاب وسنت کا ہی اثر ہے۔ اللہ کی کتاب میں صدیقین کا درجہ انبیاء کے فوراً بعد آیا ہے (النساء: ۶۹) اور مومنین کو صادقین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (التوبہ: ۱۱۹)

شیخین رحمہما اللہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

''إن الصدق یهدی إلی البر و إن البر یهدی إلی الجنة'' (۳۱)

بیشک صدق نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لیجاتی ہے۔)

۶- اخلاص:

اخلاص خدا اور بندے کے درمیان ایسا راز ہے جس پر کوئی مطلع نہیں ہوتا ہے۔ تصوف میں اخلاص کا بلند مقام سنت وکتاب ہیں، اس کے بلند مقام کا ہی پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ'' (الزمر: ۱۱)

(کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کروں خالص اسی کا ہو کر۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''إن الله لا یقبل من العمل إلا ما کان له خالصا'' (۳۲)

(اللہ تعالیٰ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لیے ہو۔)

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث ہے کہ:

''إن الله لا ینظر إلی أجسامکم و لا إلی صورکم ولکن ینظر إلی قلوبکم''(۳۳)

(اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے وہ بس تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔)

اخلاص اعمال کی روح ہے جس طرح کوئی جسم روح کے بغیر زندہ نہیں رہتا اسی طرح کوئی عمل اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا ہے۔

۷- صبر:

اللہ کے سوا کسی سے بھی تکلیف و مصیبت کی شکایت نہ کرنا صبر کہلاتا ہے، صبر وہ کسوٹی ہے جو سالکین طریقت کو کندن بناتی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں صبر کی فضیلت کا بیان ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ صبر سے مدد مانگنے کا حکم دے رہا ہے، تو کہیں صابرین کے ساتھ اپنی معیت کا ذکر کر رہا ہے (البقرہ:۱۵۳)؛ کہیں صابروں کو بشارت دینے کا حکم دے رہا ہے (البقرہ:۱۵۶)، تو کہیں صابروں سے اپنی محبت کا تذکرہ فرما رہا ہے (آل عمران: ۱۴۵)؛ کہیں صابروں کے بے حساب اجر دینے کا وعدہ کر رہا ہے (الزمر:۹)، تو کہیں انھیں سچا اور متقی ہونے کا تمغہ عطا کر رہا ہے۔ (البقرہ:۱۷۶)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے فرمایا:

''ما أعطی أحد من عطاء خیراً و أوسع من الصبر'' (۳۴)

(صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع عطیہ کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔)

۸- ورع:

حرام میں مبتلا ہونے سے خوف سے شبہات سے بھی بچنے کا نام ورع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بغیر بندہ متقی نہیں ہوسکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''لایبلغ العبد أن یکون من المتقین حتی یدع مالا بأس به حذرا مما به بأس''(۳۵)

(بندہ اس وقت تک متقیوں میں شامل نہیں ہوسکتا ہے جب تک وہ حرج والی چیزوں کے خوف سے غیر حرج والی چیزوں کو نہ چھوڑ دے۔)

صوفیا کے لیے اس سے بڑی کوئی سند اور مقام ورع کے لیے اس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں ہوسکتی کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے بلند مرتبہ عبادت قرار دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ:

''یا أبا هریره کن ورعا تکن أعبد الناس'' (۳۶)

(اے ابو ہریرہ ورع اختیار کرو تو سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔)

حضور کی انھیں تعلیمات کا اثر ہے کہ صوفیا کی کتابوں اور ان کے اعمال دونوں میں ورع کو بے حد نمایاں اور امتیازی مقام حاصل ہے۔

۹- زہد:

دل کو دنیا کی خواہش و محبت سے خالی کر کے اسے اللہ کی محبت و معرفت سے آباد کرنے کا نام زہد ہے۔ زہد کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کو ناقابل اعتناء سمجھے۔

مادہ پرستی کی یلغار اور اس کے تسلط کے اس دور میں کچھ لوگوں نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حقیر و ناقابل التفات سمجھنے کے صوفی رویے کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ اور اس کا رشتہ عیسائی رہبانیت اور عجمی تقشّف سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ساری تگ و دو کتاب و سنت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں دنیا کی تحقیر اور بے ثباتی کا ذکر ہے۔ کئی مقام پر دنیا کے مال و متاع کو دھوکہ، فتنہ اور لہو ولعب قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: سورۃ الروم:۶۰، العنکبوت:۶۴، الکہف:۴۷، وغیرہ۔

دوسری طرف شارع علیہ السلام کی تعلیمات میں نظری طور پر اور ان کی حیات طیبہ میں عملی طور پر دنیا ومتاع دنیا کی تحقیر ومذمت ملتی ہے۔ دراصل صوفیا کا زہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا کردہ انھیں نظری وعملی نمونوں سے ماخوذ ہے۔

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ سے کہتے ہیں: ''فاتقوا الدنیا '' (۳۷) یعنی دنیا سے ڈرو، تو کبھی آپ حضرت ابن عمر کو دنیا میں اس طرح جینے کی تلقین کرتے ہیں جیسے مسافر ہوتا ہے: ''کن فی الدنیا کأنك غریب أو عابر سبیل'' (۳۸) کہیں دنیا کی بے وقعتی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''لو کانت الدنیا تعدل عند الله جناح بعوضة ماسقی کافرا منها شربة ماء'' (۳۹) یعنی اگر دنیا اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے بھی برابر ہوتی تو کسی کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی نہ ملتا؛ کبھی ننگی چٹائی پر لیٹنے سے جسم مبارک پر اثر ظاہر ہو جاتے تھے جب صحابہ عرض کرتے کہ: اے اللہ کے رسول آپ اس پر کوئی گدا وغیرہ کیوں نہیں ڈال لیتے تو مالک کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں یہ جواب دیتے:

''مالی والدنیا، ما أنا فی الدنیا إلا کراکب استظل تحت شجرة ثم راح وترکها'' (۴۰)

(مجھے دنیا سے کیا لینا دنیا، میں تو دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو کسی درخت کے نیچے سایہ لینے کو رکتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔)

۱۰- رضا:

تقدیر وقضا کی سختی پر دل کے سکون واطمینان کا نام رضا ہے۔ یہ مقام مقامِ صبر سے بلند ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں یہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عطا ہے۔ باری تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَسَاکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (التوبہ:۷۲)

یعنی مالک جنت کی رضا جنت سے افضل ہے اور رضائے الٰہی پانے کے لیے پہلے اس کی قضا سے راضی ہونا پڑتا ہے۔ ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' (البینۃ:۸)۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رضا کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے۔ اہل طائف نے جب آپ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا تو آپ اپنے رب کو مخاطب کر کے انتہائی گریہ وزاری سے عرض کرتے ہیں:

''إن لم تکن ساخطا علی فلا أبالی'' (۴۱)

(اے رب اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے۔)

ارشاد نبوی ہے:

''وارض بما قسم الله لك تکن أغنی الناس'' (۴۲)

(جو اللہ نے تمہاری قسمت میں لکھا ہے اس سے راضی ہو جاؤ تو سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔)

نبوی تعلیم کے مطابق اللہ سے راضی رہنے میں ہی انسان کی سعادت وخوش بختی ہے۔

''من سعادة ابن آدم رضاه بما قضی الله له'' (۴۳)

(ابن آدم کی خوش بختی اس میں ہے کہ وہ اپنے لیے اللہ کی بنائی تقدیر سے راضی رہے۔)

واضح رہے کہ تصوف میں رضا کا مطلب ترک اعتراض ہے، ترک کوشش نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں شام میں طاعون پھیلا تو آپ نے اسلامی فوجوں کو شام میں داخل ہونے سے منع کر دیا اس پر حضرت ابوعبیدہ نے کہا: "أفرارا من قدر الله" کیا آپ قضا وقدر سے بھاگ رہے ہیں۔ تو حضرت عمر نے کہا: اے ابوعبیدہ کاش کہ یہ بات آپ کے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی: نحن نفر من قدر الله إلی قدره" یعنی ہم تو اللہ کی تقدیر سے اس کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ (۴۴)

۱۱- توکل:

توکل سیر الی اللہ کا ایک اعلیٰ مقام اور طریقت وتصوف کی بلند مرتبت منزل

ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ رحمان کے نزدیک شرط ایمان ہے۔

''وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ'' (المائدہ:۲۳)

(اگر تم مومن ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔)

اللہ تعالیٰ متوکلین سے محبت کرتا ہے (آل عمران:۱۵۹) اور اس نے متوکلین کی کفالت کا وعدہ کیا ہے۔ (الطلاق:۲۳)

ارشاد نبوی ہے:

''لو توكلتم على الله حق توكله لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصا وتروح بطانا'' (۴۵)

(اگر تم لوگ اللہ پر کما حقہ توکل کرتے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسے کہ پرندوں کو رزق دیتا ہے، جو صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔)

امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کی شروطوں پر صحیح ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ (۴۶)

واضح رہے کہ صوفیا کے یہاں توکل کا یہ معنی نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کیوں کہ سعی وعمل اور جد وجہد توکل کے منافی نہیں ہے۔ صوفیائے کرام کا توکل یہ ہے کہ ان کے لیے جو اللہ کے پاس ہے اسی پر بھروسہ ہو اور جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہو اس سے پوری طرح سے مایوسی ہو۔ تصوف میں ترک اسباب اور کوشش کو توکل نہیں بلکہ اسے ''تواکل'' کہتے ہیں جو اسلام کے منافی اور ایک مذموم صفت ہے۔ اگر کسی نے تصوف کے نام پر ''تواکل'' کو اپنایا ہے تو تصوف اس سے بری ہے۔

امام قشیری فرماتے ہیں:

''التوكل محله القلب، والحركة بالظاهر لا تنا في التوكل'' (۴۷)

(توکل کا محل قلب ہے یعنی توکل دل سے ہوتا ہے اعضائے ظاہرہ کی حرکت وکوشش توکل کے منافی نہیں ہے۔

بلاشبہ توکل کا یہ مفہوم حدیث نبوی ''اعقلها وتوكل'' (۴۸) یعنی اونٹ کو باندھ کر پھر اللہ پر توکل کرو سے ماخوذ ہے۔

۱۲- شکر:

دل سے منعم کی محبت، اعضائے بدن سے اس کی اطاعت اور زبان سے اس کی ثناء ومدحت کا نام شکر ہے۔ اور شکر کی یہ تینوں قسمیں تصوف نے کتاب وسنت سے پائی ہیں۔

الف- شکر لسان:

ارشاد ربانی ہے:

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱) یعنی اور اپنے رب کی نعمت تو اسے بیان کیجیے، اور ارشاد نبوی ہے: ''التحدث بنعمة الله شكر'' (۴۹) یعنی ذکر نعمت شکر نعمت ہے۔

ب- شکر ارکان:

اعضائے بدن سے اطاعت کر کے شکر ادا کیا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

''اِعْمَلُوا آلَ دَاوٗدَ شُكْرًا'' (سبا:۱۳) یعنی اے آل داؤد بطور شکر عمل کرو۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات میں اس قدر طویل قیام کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آجاتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں، آپ تو مغفرت یافتہ ہیں تو آپ نے فرمایا: ''أفلا أكون عبدا شكورا'' (۵۰) یعنی کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

ج- شکر جنان:

دل کا شکر یہ ہے کہ رویت نعمت رویت منعم کے لیے حجاب نہ بننے پائے، یعنی دل نعمت کے سبب منعم سے غافل نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے

''وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ'' (النحل:۵۳) تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

"اللهم ما أصبح بی من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لا شريك لك" (۵۱)

(اے اللہ جو نعمت مجھے یا تیری کسی مخلوق کو ملی وہ سب منتہا اور بلا شرکت غیرے تیری ہی ہے۔)

یہ سرسری اور عاجلانہ مطالبہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ صوفیا اپنے تمام افکار و معمولات میں کتاب وسنت کے پیرو ہیں۔ تصوف کا منہج عملی اور سلوک کے تمام منازل منبع تصوف مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے ہی ماخوذ ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ کتاب وسنت سے اس قدر قریب اور اس کی روح سے اتنا ہم آہنگ نہیں ہے جتنا کہ صوفیائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ بقول امام غزالی:

"إن الصوفية هم السالكون لطريق الله خاصة وإن سيرتهم أحسن السير، وطريقتهم أصوب الطرق، أخلاقهم أحسن الأخلاق، ..... فإن جميع حركاتهم وسكناتهم فی ظاهرهم وباطنهم مقتبسة من نور مشكاة النبوة، و ليس وراء نور النبوة على وجه الأرض نور يستضاء به "(۵۲)

(بے شک صوفیا ہی صحیح معنوں میں اللہ کے راہ پر چلنے والے ہیں ان کی سیرت سب سے بہتر سیرت ہے، انکا راستہ سب سے صحیح راستہ ہے، اور ان کا اخلاق سب سے بہتر اخلاق ہے،........ کیوں کہ ان کے ظاہر و باطن کی تمام حرکات وسکنات مشکاۃ نبوت کے نور سے ماخوذ ہیں، اور نور نبوت کے سوا دنیا میں کوئی ایسا نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جاسکے۔

مصادر ومراجع

۱- صحیح البخاری، بارسوم؛ بیروت: دار ابن کثیر، ۱۹۸۷ء، ۱:۲۸، وصحیح مسلم، بیروت: داراحیاء التراث العربی، غیر مورخ (تحقیق: محمد فواد عبدالباقی)، ۳:۱۲۱۹۔

۲- صحیح مسلم، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ۴:۱۹۸۶۔

۳- شرح الرسالہ القشیریہ، مصر، مصطفیٰ بابی جلبی، غیر مورخ، ص/ ۷۔

۴- الانتصار لطریق الصوفیہ، مصر: مطبعہ دار التالیف، غیر مورخ، ص/ ۶۔

۵- صحیح مسلم، ۱:۳۷؛ وصحیح البخاری، ۱:۲۷، ۴:۱۷۹۳؛ وسنن الترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی متوفی ۲۷۹ھ، بیروت: داراحیاء التراث العربی، غیر مورخ (تحقیق: احمد محمد شاکر وغیرہ) ۵:۶؛ وسنن ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی متوفی ۲۷۵ھ، بیروت، دار الفکر، غیر مورخ، ۱:۲۴، ۱:۲۵؛ ومسند ابوداؤد طیالیسی بصری متوفی ۲۰۴ھ، بیروت: دار المعرفہ، غیر مورخ، ۱:۵؛ وسنن النسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب متوفی ۳۰۳ھ، باردوم؛ حلب: مطبوعات اسلامیہ، ۱۹۸۶ء (تحقیق: عبدالفتاح ابوعذہ)، ۸:۱۰۲؛ وصحیح ابن حبان، محمد بن حبان تمیمی بستی متوفی ۳۵۴ھ، باردوم؛ بیروت: مؤسستہ الرسالہ، ۱۹۹۳ء ۱:۳۷۵؛ وصحیح ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق متوفی ۳۱۱ھ، بیروت: المکتب الاسلامی، ۱۹۷۰ء، ۴:۵؛ ومصنف ابن ابی شیبہ، ابوبکر عبداللہ بن محمد متوفی ۲۳۵ھ، باراول؛ ریاض: مکتبۃ الرشید، ۱۴۰۹ھ، ۶:۱۵۷؛ ومسند احمد بن حنبل شیبانی متوفی ۲۴۱ھ، مصر مؤسسہ قرطبہ، غیر مورخ، ۱:۵۱، ۱:۳۱۹، ۲:۴۲۶، ۴:۱۲۹، ۱۶۱؛ ومسند البزار، ابوبکر احمد بن عمرو متوفی ۲۹۲ھ، بیروت: موسستہ علوم القرآن، ۱۴۰۹ھ ۹:۴۱۹؛ والسنن الصغری للبیہقی، ابوبکر احمد

بن حسین متوفی ۴۵۸ھ، مدینہ منورہ: مکتبۃ الدار، ۱۹۸۹ء ، ۱:۲۴ ؛ وموارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی ،علی بن ابی بکر متوفی ۸۰۷ھ، بیروت : دارالکتب العلمیہ ، غیر مورخ ۱:۳۵؛ ومجمع الزوائد للہیثمی ، قاہرہ: دارالریان للتراث، ۱۴۰۷ھ، ۱:۳۸؛ ومسندابی حنیفہ للاصبہانی، ابونعیم، باراول؛ ریاض مکتبۃ الکوثر، ۱۴۱۵ھ، ۱:۱۵۲۔

۶- مسندابی حنیفہ،۱:۱۵۲۔

۷- السنن الکبری للنسائی، بار اول ؛ بیروت : دارالکتب العلمیہ ، ۱۹۹۱ء ، ۳:۴۴۶؛ ومسندابی داؤدطیالسی،۱:۵۔

۸- شرح النووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف متوفی ۶۷۶ھ، بارسوم؛ بیروت: دار احیاءالتراث العربی،۱۳۹۲ھ،۱:۱۵۷۔

۹- شرح النووی،۱:۱۵۸۔

۱۰- فتح الباری، بیروت : دارالمعرفہ، ۱۳۷۹ھ (تحقیق فوادعبدالباقی وغیرہ)، ۱:۱۲۰۔

۱۱- صحیح البخاری، کتاب الذبائح، ۵: ۲۱۰۴؛وصحیح مسلم ، کتاب البروالصلہ ، ۴:۲۰۲۶عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ عنہ۔

۱۲- سنن الترمذی، کتاب الزھد،۴:۵۸۹؛وسنن ابی داؤد،سلیمان بن الاشعث سجستانی ،متوفی ۲۷۵ھ، کتاب الادب، بیروت : دارالفکر، غیر مؤرخ، (تحقیق:محمدمحی الدین عبدالحمید)،۴:۲۵۹۔

۱۳- صحیح البخاری، کتاب الایمان،۱:۱۵۔

۱۴- تفسیر قرطبی، باردوم، قاہرہ: دارالشعب،۱۳۷۲ھ،۱۳:۳۶۴۔

۱۵- بیروت: دارالکتب العلمیہ،۱۹۹۳ء(تحقیق:عبدالسلام عبدالشافی)،۴:۳۲۶۔

۱۶- التفسیرالکبیر، باراول؛ بیروت: دارالکتب العلمیہ،۲۵:۸۳۔

۱۷- روح المعانی، بیروت: داراحیاءالتراث، غیرمورخ،۲۱:۱۶۔

۱۸- ۴:۱۶۵۔

۱۹- صحیح ابن حبان،۱۰:۴۸۴۔

۲۰- صحیح البخاری، کتاب الدعوات عن ابی موسی الاشعری،۵:۲۳۵۳۔

۲۱- صحیح مسلم، کتاب الذکر،۴:۲۰۶۱؛وصحیح البخاری، کتاب التوحید،۶:۲۶۹۴؛و سنن الترمذی، کتاب الدعوات،۵:۵۸۱۔

۲۲- سنن الترمذی،۴:۵۸۳۔

۲۳- ۴:۲۱۰۶۔

۲۴- سنن الترمذی،۵:۵۳۲۔

۲۵- صحیح مسلم، کتاب الایمان،۱:۱۴۴۔

۲۶- صحیح البخاری، باب کیف کان بدءالوحی،۱:۴۔

۲۷- صحیح مسلم،۴:۲۰۷۵۔

۲۸- سنن الترمذی،عن شداد بن اوس،۴:۶۳۸۔

۲۹- سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامہ،عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ،۴:۶۳۳۔

۳۰- بیہقی،شعب الایمان،باراول،بیروت:دارالکتب العلمیہ ۱۴۱۰ھ،۲:۵۔

۳۱- صحیح البخاری، کتاب الادب ۵:۲۲۶۱ (واللفظ لہ)وصحیح مسلم، کتاب البرو الصلۃ،۴:۲۰۱۳۔

۳۲- سنن النسائی،۶:۲۵۔

۳۳- صحیح مسلم،۴:۱۹۸۶۔

۳۴- ۲:۴۲۹۔

۳۵- سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامہ،۴:۶۳۴؛وسنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، ۲:۱۴۰۹۔

۳۶- سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد،۲:۱۴۱۰۔

۳۷- صحیح مسلم، کتاب الذکر،۴:۲۰۹۸۔

۳۸- صحیح البخاری، کتاب الرقاق، ۵: ۲۳۵۸۔

۳۹- سنن الترمذی، کتاب الزہد، ۴: ۵۶۰۔

۴۰- سنن الترمذی، کتاب الزہد، عن ابن مسعود، ۴: ۵۸۸۔

۴۱- الاحادیث المختارہ، ابومحمد عبدالواحد مقدسی، متوفی ۶۴۳ھ، بار اول؛ مکہ المکرّمہ، مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، ۹: ۱۸۱۔

۴۲- سنن الترمذی، کتاب الزہد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ۴: ۴۵۱۔

۴۳- سنن الترمذی، کتاب الزہد عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ۴: ۴۵۵۔

۴۴- صحیح البخاری، کتاب الطب، ۵: ۲۱۶۳؛ وصحیح مسلم، کتاب السلام، ۴: ۱۷۴۰۔

۴۵- سنن الترمذی، کتاب الزہد، عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ۴: ۵۷۳۔

۴۶- ابوعبداللہ محمد نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ، المستدرک علی الصحیحین، بار اول؛ بیروت: دارالکتاب العلمیہ، ۱۹۹۰ء، ۴: ۳۵۴۔

۴۷- الرسالۃ القشیریہ، قاہرہ، مصطفیٰ بابی حلبی، ۱۳۳۰ھ، ص/ ۷۶۔

۴۸- سنن الترمذی، عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، ۴: ۶۶۸۔

۴۹- مسند احمد، عن النعمان بن بشیر، ۴: ۲۶۸۔

۵۰- صحیح مسلم، کتاب صفۃ المنافقین ۴: ۲۱۷۲؛ وصحیح البخاری، ۵: ۲۳۷۵؛ وسنن الترمذی، ۲: ۲۶۸۔

۵۱- سنن ابی داؤد، عن عبداللہ بن غنام، ۳: ۳۱۸۔

۵۲- المنقذ من الضلال، مصر: مطبعہ صبیح واولادہ، ۱۳۷۱ھ، ۱۳۲۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ - پیغمبر امن وسلامتی

مولانا ذیشان احمد مصباحی (الہ آباد)

۱۲ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو رومن کیتھولک عیسائیوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا پوپ بینڈکٹ ۱۶ نے روزن برگ یونیورسٹی جرمن میں وہاں کے طلبہ وطالبات اور اسکالرز کے سامنے مذہبیات پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا بعض حصہ میڈیا کے ذریعہ آناً فاناً مشرق ومغرب میں پھیل گیا اور وجہ تنازع بن گیا۔ اس حصے میں پوپ بینڈکٹ نے اسلام اور تعلیمات اسلام پر زبردست کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی اور یہ بات ان کے عہدے اور ذمہ داری سے فروتر تھی۔ پوپ نے ۱۴ویں صدی کے متعصب عیسائی حکمراں مینوئل دوم کے یہ الفاظ بھی دہرائے تھے:

Show me just what Mohammed brought that was new, such as his command to spread by the sword the faith he preached.

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ لائے مجھے بتاؤ اس میں نیا کیا تھا؟ سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات کو بزور شمشیر پھیلانے کا حکم دیا۔''

ایک غیر سنجیدہ حکمراں کے الفاظ کا سہارا لے کر ایک ذمہ دار مذہبی پیشوا نے اسلام پر جو یہ اوچھے وار کیے اس سے ان کی نیت اور ان کی دماغی بے اطمینانی واضح ہو گئی۔ عالم اسلام نے اس پر بہت ہی مہذب اور پرزور انداز میں احتجاج کیا۔ نتیجہ کے طور پر پوپ کو پہلے صفائی دینی پڑی اور پھر معافی مانگنی پڑی اور اس طرح مسئلہ طاق

نسیاں کی نذر ہو گیا۔

مبصرین کا ایک عام رجحان یہ ہے کہ مغربی دنیا کی پچھلے کچھ سالوں سے اسلام، پیغمبر اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی پر آمادگی ان کے ذہنی اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کا شاخسانہ ہے اور ایسا اس لیے کہ مغرب کے ہر خطے میں جہاں بہت تیزی سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے ہیں وہیں مسلم دعاۃ و مبلغین اب مغرب کے ہر ملک بلکہ ہر شہر میں تیزی کے ساتھ پہنچنے لگے ہیں اور اپنے اپنے طور پر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و تشہیر میں مصروف ہیں۔ بعض مغربی مفکرین نے اس صورت حال کے پیش نظر یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر اسلام اسی انداز میں پھیلتا رہا تو اگلے پچاس سالوں میں یورپ کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ میرے خیال میں اس طرح کے تجزیے حقیقت نمائی کی بجائے مسلمانوں کو مطمئن و آسودہ اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کے تعلق سے حساس، متفکر اور متنفر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

بہر کیف! آج ہمیں گفتگو اس پہلو پر کرنی ہے کہ اگر کوئی بھی غیر مسلم ہم سے یہ سوال کرے کہ اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟ تو ہمارا جواب کیا ہونا چاہیے۔ ایسا جواب جو معقول بھی ہو اور حقائق پر مبنی بھی ہو۔ اس سوال کا جواب ہر مسلم بچے کو معلوم ہونا چاہیے تاکہ اس کا ایمان محکم اور فکر پختہ رہے اور وہ اسلام کے حوالے سے کسی قسم کے تردد کا شکار نہ ہو۔ اسلام واحد مذہب ہے جس کی ساری تعلیمات تحریری شکل میں ہزاروں صفحات پر موجود ہیں، اس لیے انصاف تو یہ ہے کہ جس شخص کو بھی مذکورہ سوال کا جواب ڈھونڈنا ہو وہ ساری تعلیمات کا مطالعہ کرے۔ جب تک عبادات سے معاملات تک زندگی کے ہر موڑ پر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ نہ کر لیا جاتا، اس کے مقاصد اور حکمتوں پر نظر نہیں ڈال لی جاتی، صرف بعض تعلیمات سے اپنے مقصد کی باتیں لیکر نتیجہ اخذ کرنے سے کبھی بھی صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ ان چند صفحات میں اسلام کی ساری تعلیمات کو پیش نہیں کرسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہم

رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطبات، خطبۂ دعوت اور خطبۂ حجۃ الوداع کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خطبۂ دعوت بعثت نبوی کے بعد، من جانب اللہ اعلان حق کے بعد کا پہلا خطبہ ہے اور خطبۂ حجۃ الوداع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عرفات کی وادی میں دیا گیا وہ تاریخی خطبہ ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ شاید دوبارہ اس جگہ میں نہ مل سکوں۔ یہ دونوں خطبات اسباق اسلام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے انہیں کلیدی ہونا ہی چاہیے کہ کسی بھی آدمی کی پہلی بات اور آخری بات سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔

یہاں میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ آج بہت سے مسلم اسکالر اسلام کو معذرت کا مذہب سمجھنے لگے ہیں، ان کی کم علمیت یا مرعوبیت نے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی بجائے انگریزی مورخین، محققین، مصنفین کی تحقیقات کو بیساکھی بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ اسلام کو مخالفین اسلام کی تحریروں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجۃً اسلام کی ہر تعلیم کو پیش کرنے میں معذرت خواہانہ اسلوب اختیار کرنے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر لیت و لعل سے پرے، صرف یہ دیکھیے کہ جو مذہب اس برقی چمچماتی دنیا میں بھی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس کے ارباب فکر و دانش کو معذرت نہیں ادعائیت میں گفتگو کرنی چاہیے، کیوں کہ ان کے سامنے اس مذہب کی صداقت کتابوں کے دبیز صفحات سے نکل کر عالم محسوسات میں جلوہ گر ہے۔ وہ سر کی آنکھوں سے اپنے مذہب کی صداقت ملاحظہ فرما رہے ہیں ____ اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟ اس کا جواب میں ادعائی لب و لہجے میں دوں تو جواب یہ ہوگا: ''اسلام نے دنیا کو صحیح روحانی نظام اور معتدل مادی نظام عطا کیا۔''

دوسرے لفظوں میں اسے ہم دین و دنیا کا امتزاج بھی کہہ سکتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الدنیا مزرعة الآخرة" دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا کی یہ مختصر تعریف (Defination) ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟ "آخرة" کا تصور ایک صالح روحانی نظام کو بتاتا ہے جبکہ "مزرعة"

کا تصور، عمل، توازن، اعتدال، احتیاط، خیر پر مشتمل ایک مکمل عملی دنیاوی و مادی نظام کو پیش کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل دونوں خطبات کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے۔

خطبۂ دعوت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی اگست ۶۱۰ء میں نازل ہوئی، تین سالوں تک آپ اپنی دعوتی سرگرمیاں خفیہ طور سے انجام دیتے رہے۔ ۶۱۳ء میں آپ نے اعلانیہ دعوت دینا شروع کی۔ ایک دن آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے، سب سے اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوئے اور قریش کو آواز لگائی یا صباحاہ! (عرب کسی بڑے حادثہ سے مطلع کرنے کے لیے اس لفظ سے آواز لگاتے ہیں) آپ نے قریش کی ہر شاخ اور ہر قبیلے کو نام لے لے کر پکارا۔ جب لوگوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچی۔ کہنے لگے یہ کون ہے جو آواز لگا رہا ہے؟ اور جب یہ معلوم ہوا کہ محمد ابن عبداللہ ہیں، تو سب تیزی سے ان کی طرف دوڑتے ہوئے آئے، یہاں تک کہ جو خود نہیں آ سکے انہوں نے اپنے نمائندوں کو بھیجا تا کہ وہ سن کر آئیں کہ محمد کیا کہہ رہے ہیں، جب لوگ اکٹھا ہو گئے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے سوال کیا:

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟''

سب نے بہ یک زبان کہا: ہاں ہاں! کیونکہ آپ نے کبھی ہمارے ساتھ جھوٹ نہیں بولا، آپ کے ساتھ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ صادق اور امین ہیں۔

اس پر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: ''میں تمہیں آنے والے شدید عذاب سے ڈرا رہا ہوں۔ میری اور تمہاری مثال ایسے ہی جیسے کوئی آدمی دشمن کی فوج دیکھ لے اور وہ اپنی قوم کو اس سے مطلع کرنے لگے۔'' پھر آپ نے سب کو حق کی دعوت دی، عمومی طور پر بھی اور خصوصی طور پر بھی۔ آپ نے کہا:

اے جماعت قریش: تم خدا سے اپنی جانوں کا سودا کر لو، اپنے آپ کو جہنم کی

آگ سے بچاؤ، کیونکہ میں تجھے خدا کے حضور نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہوں اور نہ کچھ نقصان، میں خدا سے تمہیں کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے بنی کعب بن لوئ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، میں تمہارے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں۔ اے بنی مرہ بن کعب! اپنے نفس کو عذاب نار سے بچاؤ۔ اے قبیلۂ بنی قصی! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، میں تمہارے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں۔ اے قبیلہ بنی عبد مناف! اپنی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، میں خدا کی جناب میں تمہیں کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ میں خدا کی گرفت سے بچا سکتا ہوں۔ اے بنی عبد شمس! جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنی ہاشم! اپنے وجود کو عذاب دوزخ سے بچاؤ۔ اے قبیلہ بنی عبد المطلب! اپنی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، میں تمہارے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں، نہ خدا کے حضور میں تمہیں کچھ فائدہ دے سکتا ہوں۔ میرے مال سے جو چاہو مانگو، لیکن میں خدا کے یہاں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ اے عباس ابن عبد المطلب! میں آپ کو خدا سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے صفیہ بنت عبد المطلب! [رسول اللہ کی پھوپھی] میں تجھے خدا سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد رسول اللہ! میرے مال سے جو چاہو مانگو، پر اپنی جان کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ میں تمہارے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں اور نہ میں تجھے خدا سے بچا سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ تم لوگوں کے ساتھ میرا خاص رشتہ ہے، جس کو حسب استطاعت قائم رکھوں گا۔''

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تقریر کر چکے تو لوگ منتشر ہو کر اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ تاریخ میں ان کا کوئی خاص رد عمل نہیں ملتا، سوائے اس کے کہ ابولہب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدتمیزی کی، اس نے کہا: ''تمہارا سارا دن خراب ہو، کیا اسی کے لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟'' ابولہب کی اس بدتمیزی سے قلب محبوب رنجور ہوا جس کی تسکین کے لیے آیت کریمہ تبت یدا ابی لھب نازل ہوئی۔

(البداية والنهاية ،سوم،باب الامر بابلاغ الرسالة، ملخصاً)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے سامنے یہ پہلا اعلانیہ خطبہ

ہے، پورا خطبہ یقین، خوف خدا، ہمدردی، رواداری، مدارات اور محبت قوم پر مبنی ہے۔اس خطبہ میں جو پیغام ہے وہی اسلام کی اساس ہے جو بنیادی طور پر اہل مکہ کے فکر وعقیدہ سے متصادم ہے۔اس پہلو سے غور کیجیے کہ ایک ایسی قوم کے سامنے جو اقرار وانکار کے سوا کچھ اور نہیں جانتی، فکری طور پر اپنے موقف پر سختی سے کاربند اور اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے والی ہے۔ایسی قوم کو اس کے تمام موروثی عقاید ونظریات کے خلاف دعوت دینا اور اس کے لیے آبادی سے باہر پہاڑی پر سب کو جمع کر کے اعلانیہ طور سے سب کو اپنے مذہب، اپنی روایت اور اپنی ثقافت سے دستبردار ہونے کی دعوت دینا کتنی بڑی بات ہے، کتنے جگر کی بات ہے۔اگر پیغمبر اسلام کی دعوت تشدد کی دعوت ہوتی، غیر انسانی تعلیمات کی دعوت ہوتی، تو اس دعوت کے لیے یکا وتنہا، بغیر کسی تیاری کے، بغیر کسی ساز و سامان اور فوج ولشکر کے بھلا وہ کیوں کر کھڑے ہو جاتے؟ انہیں تو اس کے لیے خفیہ طور سے ایک فوج تیار کر کے رکھنا چاہیے تھی، معاونین کی ایک ایسی جماعت تیار کرنی تھی جو قوم کے انکار کرنے پر اس پر ٹوٹ پڑے، اگر قوم بدتمیزی پر آمادہ ہو تو اسے سبق سکھائے، مگر پیغمبر نے ایسا کچھ نہیں کیا، کیا یہ اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ آپ اپنی تعلیم، اپنی دعوت طاقت کے زور پر اور براہ تشدد نہیں دینا چاہتے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعوت کے لیے پیشگی طور پر جس چیز کی تیاری کی تھی، وہ تھی ان کی راست گفتاری اور امانت داری۔اپنے خطاب کے لیے آپ نے تمہید اسی کو بنایا، آپ کے اس سوال پر کہ اے میری قوم! اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک فوج ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟ پوری قوم بہ یک زبان بولی: نعم، ماجربنا علیك كذباً، ماجربنا عليك الا صدقاً (ہاں ہاں! کیوں نہیں کہ آپ نے کبھی ہم سے جھوٹ نہیں بولا، آپ کے ساتھ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ آپ کو صادق پایا)

پیغمبر دو جہاں علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ سوال اور اہل مکہ کا یہ جواب اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ پیغمبر نے صدق وامانت کو بنیاد بنا کر اپنی دعوت کا آغاز کیا جو کسی مذہب

، کسی قوم یا کسی فرد کے نزدیک غیر انسانی نہیں اعلی انسانی اقدار ہیں۔

اس دعوت کے پس منظر پر غور کریں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو ادوار نظر آئیں گے۔ ایک قبل بعثت کا چالیس سالہ دور اور دوسرا بعد بعثت کا ۲۳ر سالہ دور۔اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو طاقت کے زور پر غیر انسانی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانا ہوتا، تو اس کا ایک گونہ مزاج آپ کی زندگی کے ان دونوں ادوار میں ضرور ملتا۔ کیوں کہ انسان بڑا ہو کر جو کچھ کرتا ہے، اس کی طبعیت میں اس کی طرف یک گونہ میلان بچپن سے ہی ہوتا ہے۔ پہلے سے جو کسی کا مزاج ہو، وہ مکمل تبدیل ہو جائے اور اس کی افتاد طبع یکسر بدل جائے۔ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال خود پوپ بنیڈکٹ ۱۶ر کی زندگی میں موجود ہے۔ پوپ اعظم عیسائی دنیا کا سب سے بڑا مذہبی رہنما ہوتا ہے، جو سیاست اور تشدد سے پرے مذہبی مراسم اور ذمہ داریوں سے کام رکھتا ہے۔وہ کسی مذہب کے خلاف اشتعال انگیز بیان نہیں دیتا اور نہ کسی قوم کے جذبات کو بھڑکاتا ہے لیکن اس کے برخلاف آج کے اس نازک دور میں جب ہر چہار جانب Clash تناؤ اور تنازع کا ماحول ہے، پوپ مذہبی رواداری کی تعلیم دینے کی بجائے ایسی بیان بازی کر رہے ہیں جس سے مشرق اور مغرب کی دوریاں بڑھ رہی ہیں، اسلام ومسیحیت کی خلیج وسیع تر ہو رہی ہے اور دونوں قوموں میں نفرت اور جنگ کا مزاج پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ پوپ کے اس رویے کی جہاں بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، وہاں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آں جناب ایک زمانے تک تاریخ کے سب سے بدنام اور متشدد حکمراں ہٹلر کی فوج میں رہ چکے ہیں۔آخر کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے تو ہوتے ہی ہیں۔

قبل بعثت کا دور پیغمبر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا اس انداز میں گزرا کہ پوری قوم آپ کو صادق وامین کے لقب سے پکارا کرتی تھی۔ایک ایسی قوم جو جنگ، شراب، زنا، فحاشی کی خوگر تھی، اس میں رہ کر آپ اس سے الگ رہے اور عزت واحترام کی نظر سے دیکھے گئے۔مولانا اکبر خان نجیب آبادی نے اپنی کتاب تاریخ اسلام اول

میں مشہور انگریز خاتون مسز اینی بیسنٹ کا یہ قول نقل کیا ہے جو ہر موافق ومخالف کو اپیل کرنے والا ہے، محترمہ لکھتی ہیں:

''پیغمبر اعظم کی جس بات نے میرے دل میں ان کی عظمت وبزرگی قائم کی ہے، وہ ان کی وہ صفت ہے جس نے ان کے ہم وطنوں سے الامین کا خطاب دلوایا۔ کوئی صفت اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی اور کوئی بات اس سے زیادہ مسلم وغیر مسلم دونوں کے لیے قابل اتباع نہیں۔ ایک ذات جو مجسم صدق ہو، اس کے اشرف ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ ایسا ہی شخص اس قابل ہے کہ پیغام حق کا حامل ہو'' (ص:۹۵)

قبل بعثت کے جو واقعات مشہور ہیں ان میں ایک سفر شام ہے، یہ خالص تجارتی سفر تھا، اس وقت آپ کی عمر ۱۲ر سال تھی۔ بحیرا راہب کا واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، جس میں راہب نے ابوطالب سے بھتیجے کی نبوت کی پیش گوئی کی اور اس کے ہمراہ یہود کے علاقوں میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ چنانچہ ابوطالب وہیں اپنا سامان تجارت فروخت کر کے واپس ہوگئے۔ اس سفر میں ابوطالب کو بہت زیادہ نفع حاصل ہوا، اب رفتہ رفتہ پیغمبر علیہ السلام کا شہرہ ایک اچھے تاجر کی حیثیت سے بھی ہونے لگا۔ خدیجہ جو مکہ کی ایک دولت مند خاتون تھیں اور اپنے کارندوں کے ذریعہ اپنی تجارت کی۔ کرتی تھیں، انہوں نے اپنی تجارت کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کیا، حضرت نے چچا ابوطالب سے مشورے کرنے کے بعد اپنی رضا مندی ظاہر کردی اور مال واسباب لے کر خدیجہ کے غلام میسرہ اور ایک عزیز خزیمہ ابن حکیم کے ساتھ شام کے لیے دوبارہ روانہ ہوئے۔ اس میں نسطورا راہب کا واقعہ پیش آیا جو آسمانی کتابیں کھول کر پڑھتا اور پیغمبر علیہ السلام کے اندر پیغمبر آخر الزماں کی علامتوں کا مشاہدہ کرتا۔ اس سفر سے بھی کافی منافع کے ساتھ آپ واپس ہوئے، اس کے بعد خدیجہ اور متاثر ہوئیں اور انہوں نے نکاح کی پیش کش کی، اس وقت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال تھی، آپ نے منظور فرمالیا، ابوطالب بھی تیار ہوگئے، بلکہ نکاح بھی خود پڑھایا، آپ نے نکاح کا جو خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ بھی تھے:

ان ابن أخي محمد ابن عبدالله لا يوزن به رجل الا رجح به شرفا ونبلاً وفضلاً وعقلاً و هو والله بعد هذا له نباء عظيم وخطر جليل ۔ (بے شک میرے بھتیجے محمد ابن عبداللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے یہ شرافت، عظمت، فضل اور دانش مندی میں اس سے فائق ہوگا۔ اور بخدا اس کا مستقبل عظیم ہے اور یہ بلند مرتبے کا مالک ہوگا)

قبل بعثت کا ایک اہم واقعہ حلف الفضول میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کی شرکت بھی ہے۔ حرب فجار عرب کی ایک تاریخی اور روایتی جنگ ہے جس کے کئی ادوار ہیں، چوتھی اور آخری بار یہ جنگ ۵۸۶ء میں لڑی گئی جب پیغمبر دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۱۶/ ۱۸ سال تھی۔ اس جنگ میں خود آپ بھی شریک تھے، یہ جنگ صلح پر اختتام پذیر ہوئی، جنگ سے واپسی پر آپ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر ایک امن وامان کا معاہدہ حلف الفضول کے نام سے تیار ہوا جس میں قریش کے دیگر افراد کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، مولانا اکبر خان نجیب آبادی لکھتے ہیں:

''بعض اشخاص نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوکر قسم کھائی کہ ہم ہمیشہ ظالم کا مقابلہ اور مظلوم کی مدد کریں گے۔ اس قسم میں آں حضرت صلعم بھی جو اس زمانے میں لڑکے ہی تھے، شریک تھے۔ اب جبکہ آپ جوان ہوگئے تو آپ نے اکثر قبیلوں کے سرداروں اور سمجھ دار لوگوں کو ملک کی بدامنی، مسافروں کے لٹنے، ضعیفوں اور غریبوں پر زبردستوں اور امیروں کے ظلم کرنے کا حال بیان فرما کر ان سب باتوں کی اصلاح کے لیے آمادہ کیا۔ بالآخر ایک انجمن قائم ہوگئی جن میں بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب، بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تمیم شامل ہوئے۔ مگر اس انجمن کے ہر ایک ممبر کو یہ اقرار کرنا پڑتا تھا کہ (۱) ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے (۳) غریبوں کی امداد کیا کریں گے (۴) زبردستوں کو ظلم کرنے سے روکیں گے۔'' (تاریخ اسلام ۱/ :۹۶)

یہ انجمن بہت کامیاب اور خلق خدا کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ پیغمبر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد بھی اس معاہدے کا ذکر فرمایا کرتے اور کہا کرتے کہ اس معاہدے کے بدلے اگر مجھے کوئی سرخ اونٹ دیتا، جب بھی میں اسے قبول نہ کرتا اور اگر آج بھی اس طرح کا معاہدہ ہو تو میں اس میں شرکت کروں گا۔

اعلان حق سے پہلے کی زندگی کا دوسرا دور بعثت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ۴۰ سال کی عمر میں جب آپ پر حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور اس کے بعد آپ گھر لوٹے تو کافی حیران و پریشان نظر آ رہے تھے، جسم کانپ رہا تھا، پیشانی سے پسینے ٹپک رہے تھے، آپ نے اپنی شریک حیات ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کو چادر اڑھانے کو کہا۔ جب آپ نے ام المومنین خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا سے نزول وحی کا پورا واقعہ سنایا تو حضرت خدیجہ نے تسلی دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

کلا واللہ ! ما یخزیك اللہ أبدا ، انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقری الضيف وتعين علی نوائب الخلق(بخاری ومسلم)

ہرگز نہیں، اللہ آپ کو کبھی بھی نامراد نہ فرمائے گا، آپ رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں کو کھلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ کے اس ردعمل میں جہاں تسلی وتسکین کی بات ہے، وہیں اس میں ذات گرامی کی حقیقی تصویر بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ یقین بھی کہ ایسے شخص پر خدا کے فضل واحسان اور رحمت وبرکت کا ہی نزول ہوسکتا ہے عتاب کا نہیں۔ ایسے عظیم انسان کو خدا کسی بڑے کام کے لیے ہی چن سکتا ہے اور اس کے کاندھوں پر کوئی غیر معمولی ذمہ داری ہی ڈال سکتا ہے۔ اس جواب سے صاف طور سے واضح ہے کہ قبل بعثت ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم برتر اخلاقیات کے مالک تھے، اعلی انسانی قدروں کے حامل تھے اور نبوت سے قطع نظر بھی خدا کے قرب، لوگوں کے احترام اور قوموں کی تعمیر کے بجا طور سے مستحق تھے۔ بعثت کے بعد اعلان نبوت تک اس تین سالہ مدت میں

خفیہ طور سے نہایت خلوص اور لگن کے ساتھ خدا کے دین کو اس کے بندوں تک پہنچاتے رہے۔ ایسا انسان جس کو تشدد کی بنیاد پر اپنی دعوت عام کرنی تھی وہ اس عرصے میں ضرور پارٹی بناتا، سازش کرتا، قریش کو زیر کرنے کی تدبیریں سوچتا، ان میں اختلاف وانتشار ڈالنے کی کوشش کرتا مگر کچھ بھی تو نہیں کیا میرے سرکار نے۔

پیغمبر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل بعثت کی زندگی کی یہ نمایاں جھلکیاں ہیں جن سے پیغمبر کی طبیعت، مزاج اور سرشت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ قبل بعثت کی پوری زندگی میں جہاں آپ بتوں سے دور رہے، برائیوں سے کنارہ کش رہے، شراب وزنا سے متنفر وبیزار رہے، وہیں آپ کی اہل مکہ کے ساتھ سماجی زندگی، اعلی انسانی اقدار کی اعلی مثال رہی۔ آپ نے سچ بولا، جھوٹ نہیں، امانت داری اختیار کی بے ایمانی نہیں، حق کا علم بلند کیا، صلح کا علم بلند کیا، جنگ کا نہیں، امن کے معاہدے کیے، تشدد کے نہیں، مظلوم کی داد رسی اور ظالم سے لڑنے کی قسمیں کھائیں، لوگوں کو بار بار اس کے لیے تیار کیا، خانہ کعبہ کی تعمیر میں جب قبائل قریش میں حجر اسود نصب کرنے کے سلسلے میں اختلاف ہوا تو آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے نزاع ختم کر ڈالا۔ وہ چاہتے تو بنی ہاشم کا سپورٹ کر دیتے، پارٹی بندی کرا دیتے اور اپنی جس حکیمانہ سیاست کو صلح کے لیے استعمال کیا، اسے جنگ کے لیے استعمال کر دیتے اور مکہ کے ایک ممتاز لیڈر بن جاتے۔

اعلان حق سے پہلے پہلے تک پیغمبر کی اپنے ہم وطنوں کے بیچ جو ہر دلعزیزی تھی، یہ ان کے لیے لیڈر بننے، اپنے ہم نوا تیار کرنے اور دوسرے لیڈروں کو زیر کرنے کے بے شمار مواقع فراہم کر رہی تھی، بلکہ خود اعلان حق کے بعد سرداران مکہ، مکہ کی سیادت وقیادت آپ کے قدموں میں لے کر آئے لیکن آپ نے اسے ٹھکرا دیا اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی بجائے خدائے واحد کے حضور سجدہ ریز ہونے کی دعوت دی۔ وہ جس متکبرانہ انداز کی زندگی گزار رہے تھے، اس سے دست بردار ہو کر خدائے واحد کے حضور جھک جانے کی منت وسماجت کی۔

کیا ایسے شخص کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا کہ اس نے دنیا کو تشدد اور

غیر انسانی باتوں کا درس دیا؟ تشدد کے لیے اقتدار حاصل کیا جاتا ہے اقتدار کو ٹھوکر نہیں مارا جاتا۔ انسان کی جو ذاتی سوچ ہوتی ہے، جو فکر ہوتی ہے، جو روش ہوتی ہے وہ دوسروں کو اسی کی دعوت دیتا ہے پیغمبر اسلام نے دنیا کو وہی تعلیمات دی جن پر وہ خود عمل پیرا تھے۔ اب چشم بینا دیکھے کہ پیغمبر کی اس مثالی زندگی میں رحمت، رواداری، محبت، امن، صلح تعاون اور انصاف ہے یا تشدد اور غیر انسانی تعلیمات؟

خطبۂ حجۃ الوداع:

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فروری ۶۳۲ء/ ۹ر ذی الحجہ ۱۰ ہجری میں اپنا پہلا اور آخری حج ادا کیا۔ اس وقت پورا عرب آپ کے زیر نگیں تھا، بلکہ عرب کے باہر کے خطوں میں بھی اسلام پہنچنے لگا تھا۔ اس حج میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان آپ کے ہم رکاب تھے۔ جو ہر وقت آپ پر جان چھڑکنے کے لئے تیار تھے۔ اگر اسلام کے مزاج میں ذرہ برابر تشدد یا ظلم وتعدی کا عنصر ہوتا تو پیغمبر اس جم غفیر کے سامنے دنیا کو زیر نگیں کرنے اور دشمن قوموں پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیتے، کیوں کہ اس وقت ان کی حیثیت صرف ایک پیغمبر کی نہ تھی، ایک فاتح حکمراں اور خطۂ عرب کے ایک ایسے بادشاہ کی تھی جس پر پورا عرب نہ صرف اعتماد رکھتا تھا بلکہ اس کے اشارۂ ابرو ہر پل مر مٹنے کے لئے تیار تھا۔ مگر اس کے برخلاف پیغمبر نے جو کچھ کہا، آج انسانی حقوق کی وکالت کے نام پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ پیغمبر کا یہ تاریخی خطبہ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حاضر ہے۔

حضرت ابن اسحاق کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضہ حج ادا کیا، لوگوں کو مناسک حج کر کے دکھایا، انہیں حج کے طریقے بتائے اور ان کے سامنے وہ مشہور خطبہ دیا جس میں بڑی اہم باتیں بیان کیں۔ پہلے خدا کی حمد وثنا کی، پھر فرمایا:

اے لوگو! میری بات سنو! میں نہیں جانتا، شاید اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر دوبارہ نہ مل سکوں، تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر حرام ہے،

یہاں تک کہ تم اپنے مالک سے ملو۔ یہ ایسے ہی حرام ہیں جیسے یہ دن اور یہ مہینہ حرام ہیں۔ تم جب اپنے پروردگار سے ملوگے تو وہ تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے گا اور میں اپنی بات پہنچا چکا ہوں۔ جس کے پاس بھی کسی کی امانت ہو، وہ صاحب امانت کو ادا کر دے۔

سارا سود مٹا دیا گیا، لیکن رأس المال تمہارے لئے جائز ہے، تا کہ نہ تم پر ظلم ہو اور نہ تم اوروں پر ظلم کرو۔ خدا نے فیصلہ کر دیا کہ اب کوئی سود نہیں اور میں عباس بن عبدالمطلب کا سارا سود مٹاتا ہوں۔

جاہلیت کا سارا خون مٹا دیا گیا اور سب سے پہلا خون جسے میں اپنے پیروں سے مٹاتا ہوں، ابن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔ بنی لیث میں اس کی پرورش ہو رہی تھی کہ ہذیل نے اسے قتل کر دیا۔ تو جاہلیت کے خون مٹانے کا آغاز میں اسی کے خون سے کرتا ہوں۔

اے لوگو! شیطان تمہاری اس زمین میں پوجے جانے سے اب مایوس ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اس کے علاوہ دوسری بداعمالیوں کے چکر میں رہے گا اور وہ تمہاری بد اعمالیوں سے خوش ہوگا۔ اپنے دین کے سلسلے میں اس سے محتاط رہو۔

اے لوگو! مہینے کو آگے پیچھے کرنا کفر میں بڑھنا ہے۔ اہل کفر اسی سے بے راہ ہوئے۔ وہ جس مہینے کو ایک سال حلال کرتے، اسی کو دوسرے سال حرام کر دیتے اور اس طرح سے وہ خدا کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کرتے اور اس کے لیے خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے، وقت پلٹ کر اپنی اسی حالت میں آ گیا جس حالت میں زمین وآسمان کی تخلیق ہوئی تھی، خدا کے نزدیک مہینوں کی تعداد ۱۲ر ہے۔ ان میں ۴ر حرمت والے مہینے ہیں جن میں تین پے در پے ہیں اور ایک منفرد ماہ رجب ہے جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے بیچ ہے۔

اے لوگو! تمہاری بیویوں پر تمہارے حقوق ہیں اور تم پر ان کے حقوق ہیں۔ تمہارا حق ان کے اوپر یہ ہے کہ وہ ایسے مردوں سے نہ ملیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو،

ان کے اوپر یہ بھی واجب ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کی باتوں سے بچیں۔ اگر وہ یہ کرتی ہیں تو خدا تمہیں اجازت دیتا ہے کہ تم انہیں اپنے بستر سے جدا کر دو، انہیں مارو مگر ایسے نہیں کہ انہیں سخت اذیت پہنچے، پھر اگر وہ اپنی روش سے باز آجائیں تو بھلائی کے ساتھ ان کا کھانا، کپڑا جاری کر دو۔

عورتوں کے لیے اچھی وصیت کرو، وہ تمہارے بیچ تمہاری معاون ہیں، وہ اپنے لیے خود کچھ نہیں رکھتیں، تم نے ان کو خدا کی امانت میں لیا ہے اور کلمات الٰہی کے ساتھ وہ تمہارے لیے حلال ہوئی ہیں، اے لوگو! میری بات سمجھو میں اپنی بات پہنچا چکا ہوں۔

میں تمہارے بیچ دو ایسی چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم انہیں تھامے رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے، ایک خدا کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔

اے لوگو! میری بات سنو اور اسے سمجھو۔ جان لو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی کے لیے اپنے بھائی کا مال جائز نہیں مگر جو کچھ کہ وہ خوش دلی سے اسے دے دے۔ پس تم اپنے اوپر ظلم مت کرو۔ خدایا! کیا میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا؟ حاضرین نے جواب دیا: ہاں! بے شک آپ نے پہنچا دیا۔

عمرو ابن خارجہ کہتے ہیں کہ مجھے عتاب ابن اسید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقام عرفات میں کھڑے تھے، میں حاضر ہوا، پھر حضور کی اونٹنی کے نیچے کھڑا ہو گیا اس طور سے کہ اس کی لگام ٹھیک میرے سر کے اوپر تھی۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوے سنا: اے لوگو! خدا نے ہر حق دار کا حق ادا کر دیا، کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ شوہر کا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہے۔ جو اپنے آپ کو دوسرے باپ یا دوسرے آقاؤں کی طرف منسوب کرے، اس پر خدا کی، فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہو۔ اللہ نہ اس کا فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔ مسند امام احمد میں یہ الفاظ بھی

ہیں: اے لوگو! سن لو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ آگاہ! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت تو صرف تقوی سے ہے۔ (۴۱۱/۵)

اس خطبے کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھیے تو یہ چند واضح نتائج سامنے آئیں گے:

(۱) اس خطبے کے آغاز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموش لفظوں میں یہ فرما دیا تھا کہ یہ میرا آخری خطبہ ہے اور اسی لیے اس میں اپنی ہر بات آپ نے زور اور تاکید کے ساتھ کہی، اس طرح ہم اس خطبے کو اسلامی تعلیمات کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کہی گئی باتوں کو بنیاد بنا کر اسلام کی تعلیمات کے انسانی یا غیر انسانی ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) پورے خطبہ میں عام خطاب ہے، حضور نے ایها الناس کا استعمال کیا ایها المؤمنون کا نہیں، اس سے جہاں اس دور میں حضور کی وسعت نظر ظاہر ہو رہی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا یہ پر امن منشور دنیا کے ہر فرد بشر کے لیے ہے۔

(۳) پورے خطاب میں کہیں بھی اپنی عظمت و بڑائی کا ذکر نہیں کیا، اگر کوئی ہوس اقتدار کا بندہ ہوتا یا جابر حکمراں ہوتا یا آپ کی تعلیمات میں تشدد کا کچھ بھی عنصر ہوتا تو آج دل کی بات کچھ نہ کچھ زبان پر آ ہی جاتی۔

(۴) خطبے کے پہلے حصہ میں جنگ و جدال اور خون ریزی کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور امن، بھائی چارے اور پیار و محبت کی دعوت دی۔

(۵) امانت ادا کرنے اور بد دیانتی سے گریز کرنے کی تاکید کی۔

(۶) خدا کا خوف دلایا کہ تمہیں اپنے ہر عمل کے سلسلے میں خدا کے حضور جواب دہ ہونا ہے، یہ دعوت احتساب ہے اور انسان احتساب نفس کے بعد اور اپنے ہر عمل کے تعلق سے خدا کے حضور جوابدہ ہونے کا یقین کرنے کے بعد، دوسروں پر ظلم کرنے اور دوسروں کی حق تلفی کرنے کے وقت سو بار سوچے گا۔

(۷) سودی نظام ساہوکاروں کو غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ آج بھی جو چشمِ بینا رکھتے ہیں، وہ دیکھ رہے ہیں کہ سودی نظام کے ذریعہ دولت چند مٹھیوں میں سمٹتی جارہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ اس نظام کو مٹا دیا بلکہ اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلب کا سود مٹا کر غیر سودی نظام کو عملاً نافذ بھی کر دیا۔

(۸) انتقام کا جذبہ عہدِ جاہلیت میں سماج کو مسلسل جنگ کی آگ میں جھونک دیتا اور یہ بات صرف عرب ہی نہیں، پوری عالمی تاریخ کے تناظر میں کہی جاسکتی ہے۔ پیغمبر نے اس خونی دور، انتقام کو مسترد کر کے ختم کر دیا۔ آپ نے پیش آمدہ دور میں قصاص کو برقرار رکھا ہے جو فی الواقع زندگی کا تحفظ ہے۔

(۹) شرک کے تعلق سے پیغمبرِ اسلام مطمئن تھے کہ اس کی آلائش عرب میں دوبارہ نہیں آسکتی، لیکن اس کے علاوہ دوسرے خرافات، بداعمالیوں، شرانگیزیوں، بدعنوانیوں، وغیرہ کا خدشہ تھا، اس کا اظہار کیا اور نہایت نفرت کے ساتھ اظہار کیا جو مستقبل کی نسل کو امن و رواداری کی دعوت تھی۔

(۱۰) عرب جنگ کرنے کے لیے حرمت والے مہینوں کو آگے پیچھے کیا کرتے تھے، رسول نے اس عمل کو غلط قرار دے کر بند کر دیا جو بالواسطہ جنگ کا ہی خاتمہ ہے۔

(۱۱) پیغمبر نے مردوں کو عورتوں کے حقوق اور عورتوں کو مردوں کے حقوق یاد دلائے اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا اور اگر وہ بے حیائی، فحاشی کریں تو انہیں ''ضرب غیر مبرّح'' (ایسی مار جو اذیت ناک نہ ہو کہ جس کے اثرات جسم پر اتر جائیں) لگانے کا حکم دیا۔ آج جو ''ضرب'' کو اصلاً مسترد کر رہے ہیں، وہ بدلتے سماج میں بے مہار آزادیٔ نسواں کی ہولناکیوں پر نظر ڈالیں اور جو ''ضرب'' کو مطلق اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں وہ ''غیر مبرح'' کی قید پر نظر رکھیں۔

(۱۲) بات سننے اور اسے سمجھنے کی دعوت دی۔ یہ تعقلیت کی دعوت اس دور کی ہے

جب پوری دنیا تاریکی میں بھیڑوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔

(۱۳) اس آخری اور اہم ترین خطبے میں کہیں بھی جنگ وجدال کی بات نہیں لائی۔ بلکہ خطبے کا ہر حصہ اپنے اندر امن کی دعوت لیے ہوئے ہے۔ یہ چیز اس بات کی دلیل بھی فراہم کر رہی ہے کہ اسلام کی ترجیح صلح و امن ہے، نہ کہ جنگ وجدال۔

(۱۴) مساوات کا جو واضح تصور دیا ہے، اس تک چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی خدا بیزار فکریں نہیں پہنچ سکی ہیں- تقوی کو بڑائی کی بنیاد بنا کر ساری عصبیتوں اور ہر قسم کے تفاخر کو مٹا دیا اور ہر انسان کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اپنی شرافت، خوفِ خدا اور عملِ خیر کے ذریعہ عظمت و بڑائی حاصل کر لے-

تشدد کہاں ہے؟

مذاہبِ عالم کا مطالعہ کیجیے تو ایک بات سب میں مشترک نظر آئے گی کہ سب نے دلوں پر بلکہ روحوں پر حکومت کی۔ یہ بات سب سے زیادہ اس عہد کے حکمرانوں کو بری لگی، یہ دیکھ کر وہ اندر سے کڑھ اٹھے، جل اٹھے کہ آخر دنیا ایسے شخص کی ٹھوکروں پر کیوں گری جارہی ہے جس کے پاس نہ مال ہے، نہ دولت، نہ طاقت ہے نہ قوت، نہ فوج ہے نہ محافظ، اور بالآخر وہ خدا کی ان پاکیزہ ہستیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ ڈھانے لگے۔ خلاصہ کہ مذہب کا امن کا علم بردار ہونا، صرف اسلام کی خصوصیت نہیں، ہر مذہب کا لازمہ ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کچھ نفس پرست مفکروں نے مذہب کو توڑنے کے لیے اسے جنگ سے منسوب کر دیا اور آہستہ آہستہ یہ بات مشہور ہوگئی، حالاں کہ طلوعِ تاریخ سے آج تک کسی عہد میں بھی مذہب کے نام پر بہت کم خون بہایا گیا ہے۔ یہ ایک دعویٰ نہیں حقیقت ہے جس پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس کا یقین کیا جاسکتا ہے۔ مذہب مخالفین کی تلواروں سے ہر عہد میں خون کے دھارے بہے ہیں۔ مذہب مخالف بندگانِ مفکروں نے تشدد کو مذہب اسلام سے جوڑتے وقت ایک بڑی چالاکی یہ کی کہ مسلم حکمرانوں، مسلمان ڈاکوؤں اور لٹیروں کی

تلواروں سے بہنے والے خون کو بھی اسلام سے منسوب کر دیا، حالاں کہ اگر یہی عمل وہ مسیحیت، یہودیت، ہندومت وغیرہ کے ساتھ کریں تو نتیجہ یکسر پلٹ جائے گا۔

اگر ہم یہ کہیں کہ امن ورواداری مذہب کی خمیر میں شامل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ حضرت نوح سے ابراہیم تک اور حضرت موسیٰ سے عیسیٰ تک، جس عہد کو بھی پڑھیے تو نہتھے مذہبی، جابر حکمرانوں کی اذیتیں جھیلتے ہوئے اور ہر ظلم کا مقابلہ صبر سے کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ہمیشہ یہی ہوا۔ مکہ میں وہ کمزوروں کا بوجھ اٹھا رہے ہیں اور مکہ والے ان کی راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں، مکہ والوں کی اذیت رسانیوں سے تنگ آکر وہ شہر چھوڑ رہے ہیں اور ان کی فلاح دارین کی دعا کر رہے ہیں اور جب انہیں فتح مکہ نصیب ہوتی ہے تو ماضی میں اہل مکہ کی طرف سے کی گئی تمام زیادتیوں، شرارتوں اور مصیبتوں کا جواب عام معافی سے دے رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے مدینہ کے یہودیوں کو شہر بدر کر دیا تھا، یار لوگوں نے یہ یاد رکھا، لیکن انہیں اس سے پہلے کے واقعات اور اس کا پس منظر یاد نہیں رہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ میثاق یاد نہیں رہا جس میں انہوں نے مدینہ کے یہود ومشرکین کو شہری حقوق دیے تھے اور نہ رسول رحمت کی بارگاہ میں پیش کیے گئے وہ مقدمے یاد رہے جن میں مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کے حق میں فیصلے دیے گئے اور نہ انہیں یہود مدینہ کی شرارتیں یاد رہیں جن کا صحابہ بار بار ذکر کرتے اور آپ ہر بار نظر انداز کر دیتے، شرارت اس حد تک بڑھی کہ پیغمبر کو دھوکے سے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، معاہدے توڑے، اہل مکہ سے ساز باز کیے، تجدید معاہدہ سے انکار کیا حتی کہ آمادہ پیکار ہوئے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی ایسا عاقل ہوگا جو یہ کہے کہ اس حال میں بھی ان کی گوشمالی واجب نہیں تھی؟

جب سارے مذاہب امن وسلامتی کے خواہاں ہیں اور اسلام بھی انہیں میں شامل ہے بلکہ اس وصف میں اپنی انفرادیت اور امتیاز رکھتا ہے، تو پھر بھلا ایسا کیوں ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں سے حتی کہ پیغمبر اسلام سے تشدد اور ظلم کو

منسوب کیا جا رہا ہے؟ حتی کہ مذہبی وروحانی پیشوا یا بھی اس بہتان کے لیے اپنی زبانیں کھول رہے ہیں؟

میرے خیال میں اس کی صرف ایک وجہ ہے، مغرب کی ''مادی فکر''۔ بظاہر یہ عجیب بے جوڑ جواب ہے، مگر اس کی ٹھوس بنیادیں موجود ہیں:

(۱) دنیا کے مٹھی بھر یہودی جو بوالعجبیوں اور حیرت انگیزیوں پر یقین رکھتے ہیں اور جہل مرکب کا شکار ہیں، انہیں مسیحیت واسلام سے یکساں بیر ہے۔ مادیت و لادینیت مسیحیوں میں انہی کی پھیلائی ہوئی وبا ہے جس نے مسیحیت کو ''چرچ'' کے اندر محدود کر دیا ہے اور اب یہ وبا ''اسلام'' کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ یہ بات شاید اس تناظر میں زیادہ سمجھی جا سکتی ہے کہ ہر آزاد خیال یہودی مفکر اپنے مذہب کے سلسلے میں بہت ہی مقید ہوتا ہے۔

(۲) مسیحیت کو یہ لادینی مادیت یہودیوں نے سائنس کے توسط سے عطا کی۔ سائنس جو اصلاً تلاش مظہر ذات واحد کا منبع وسرچشمہ ہے، مادی سوچ نے اسے خدا بیزاری اور مذہب بیزاری کا ذریعہ بنا دیا، اور اس طرح پورا مغرب (مٹھی بھر بکھرے ہوئے یہودیوں کے علاوہ) مذہب بیزار ہو گیا۔

(۳) مذہب بیزاری نے دلوں کے رشتے کو خالق سے توڑ دیا اور اس کے بعد مغرب کے ہر انسان کی حیثیت اس خشک پتے کی ہو گئی جو اپنی شاخ سے ٹوٹ گیا ہو۔ آج بھی سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور دولت کی بے انتہا فراوانی کے باوجود مغرب کی بے اطمینانیت کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

(۴) مغرب میں جب خالق ومخلوق کے بیچ کی ڈور ٹوٹ گئی تو بے نور انسان کی روح غیر شعوری طور پر نور فطرت کی روشنی تلاش میں سرگرداں ہو گئی۔ ایک مسیحی کا مسیحیت کی طرف پلٹنے کا کوئی معنی نہ تھا، یہودیت ایک نسلی برتری ہے جو کسی غیر یہودی کو حاصل نہیں ہو سکتی، گویا اس کا دروازہ اس کے لیے پہلے سے ہی بند تھا۔ دوسرے بڑے مذاہب میں ہندومت ہے جو اپنے

اوہام وخرافات، بھید بھاؤ اور بت پرستی کے سبب ان کے لیے ناقابل قبول تھا۔ دوسرا مذہب بودھ مت ہے جو دنیا بیزاری کی دعوت دیتا ہے، اور چونکہ وہ مذہب کی خاطر کسی قیمت پر صحرا نوردی کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے اس میں بھی ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا ''اسلام'' جو ایک ساتھ دین و دنیا کی دعوت دے رہا تھا اور جس میں دنیا کو بہتر طور سے برتنے سے ہی دین کے تقاضے پورے ہو رہے تھے۔

(۵) مغرب کے ہر سطح کے لوگ تیزی کے ساتھ دامن اسلام سے وابستہ ہونے لگے۔ یہ بات ان کو بھی ناگوار لگی جو ایک زمانے سے مذہب کے خلاف نعرے بلند کر کر کے اپنا گلا خراب کر چکے تھے اور ان کو بھی جو مغرب میں عام مذہب بیزاری کے سبب اپنی عبادت خانوں میں سمٹ گئے تھے۔

(۶) اتفاق کہیے کہ قدرت نے اسلامی ملکوں کو زمینی ذخائر سے بے پناہ نوازا ہے۔ مغرب کے مادی حریص جن کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت تھی، فوج تھی، وہ ان ملکوں پر بہانے تراش کر کے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹنے لگے، ان میں ایک اہم بہانہ یہ بھی تھا کہ اہل اسلام حقوق انسانی خصوصاً حقوق نسواں کی پامالی کر رہے ہیں، ان کے اندر تشدد ہے۔

(۷) اپنے ملکوں پر غیروں کا قبضہ دیکھ کر مسلم نوجوانوں میں ایک ساتھ قومی، وطنی اور مذہبی غیرت جاگ اٹھی اور وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی اس پرجوش حرکتوں کو بھی اسلام سے جوڑ دیا گیا۔ حالاں کہ ان کا یہ عمل مذہبی سے زیادہ سیاسی، قومی اور وطنی تھا۔

اسلام کو تشدد سے جوڑنے کی اس ''تعلیلی تسلسل'' سے بڑی کوئی اور وجہ نظر نہیں آتی، جس کا سرا کسی نہ کسی طور پر ''مادیت'' سے ہی ملتا ہے۔ اب آخر میں سیرت کے حوالے سے عالمی شہرت کے حامل ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کا یہ طویل مگر بامعنی وفکر انگیز اقتباس نذر قارئین ہے جو یقیناً میری تحریر کا حاصل ہے اور میرے ادعا ''اسلام نے دنیا کو صحیح روحانی

نظام اور معتدل مادی نظام عطا کیا۔'' کو واضح دلیل فراہم کرتا ہے:

''اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ فی الدنیا حسنةً و فی الآخرة حسنة'' (یعنی دنیا میں اچھے رہیں اور آخرت میں بھی) دیکھنا یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں آں حضرت کی سیرت اور طرز زندگی میں ہمارے لیے کیا سبق ہے؟

دنیا میں یک جہت بڑے لوگوں کی کبھی کمی نہ رہی، مثلاً اگر ہم سکندر اعظم، نپولین اور ہٹلر کو لیں تو ان کی زندگی ایک سپہ سالار اور فاتح کے لیے مفید مواد مطالعہ کے لیے پیش کر سکتی ہے۔ گوتم بدھ کی زندگی ریاضت وعبادت میں خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ ہومر صرف شاعر تھا۔ افلاطون وارسطو صرف حکیم وفلسفی تھے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔

اس کے برخلاف رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالیے تو اس کی ہمہ جہت حیثیت، قول وفعل کی یکسانیت، تعلیم میں ناقابل عمل سطحیت کی جگہ معتدل عملیت اور سب سے بڑھ کر زندگی ہی میں کامیابی ایک بے نظیر چیز ہے۔ سیاسی حیثیت سے لیجیے تو آپ نے دس سال کے قلیل عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے مزاج میں انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں زیادہ تر خودسر خانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگی رہا کرتی تھی، وہاں ایک بڑی مستحکم اور بڑی مملکت قائم کر دی۔ بحیثیت سپہ سالار آپ کی لڑائیوں میں بمشکل فریقین کے چند سو آدمی مارے گئے لیکن دس سال کے عرصہ میں قریباً ۱۲ ر لاکھ مربع میل کا رقبہ مطیع اور ماتحت ہو گیا اور عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسی حکومت قائم ہوئی جو پورے جزیرہ نما کو حلقہ بگوش بنا سکی۔ انتظامی حیثیت سے لیجیے تو جس ملک میں کبھی کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، اس میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے بعد آنحضرت نے جو دستور مرتب کیا اور نظام حکمرانی قائم فرمایا، اس پر عمل نہ صرف دنیا کی ایک عظیم الشان مملکت کے لیے کارآمد ثابت ہوا، بلکہ جب تک اس پر عمل رہا، وہ دنیا کی مہذب ترین حکومت بنی رہی۔ گاندھی جیسے کٹر ہندو بھی اسے انسانیت کا زریں دور سمجھتے اور کانگریسی حکومتوں کو مشورہ دیتے رہے کہ اس کو اپنے لیے

نمونہ بنائیں۔عمرانی حیثیت سے تقسیم وگردش دولت کا اصول رسول اکرم کے ہر مالی حکم میں نظر آتا ہے۔تقسیم ترکہ،تحدید وصیت،مخالفت سود،پس انداز دولت اور زکوۃ وغیرہ کی طرف اشارہ کافی ہے۔عورت ، مرد اور غلام کی حیثیت کے متعلق بھی پیغمبر اسلام کی تعلیم معتدل ہے اور اسی لیے مفید و قابل عمل ہونے میں بھی بے مثل ہے۔سماجی اور اخلاقی حیثیت سے آپ نہ صرف بہترین معلم اخلاق تھے بلکہ آپ اپنی تعلیم کی سب سے پہلے خود تعمیل کرتے اور دوسروں کو جتنا حکم دیتے،اس سے زیادہ خود عمل کر کے اوروں کے سامنے زندہ نمونہ پیش فرماتے تھے۔ایک باپ ، ایک شوہر، ایک دوست،ایک حاکم ،ایک تاجر اور ایک انسان کی حیثیت سے آپ کا کردار اتنا بے داغ ہے کہ دشمن بھی اس کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہ سب ایک طرح سے دنیوی پہلو تھے،اسلام کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کی بیک وقت بھلائی چاہتا ہے۔روحانی ترقی اور تزکیۂ نفس کے لیے توحید سے بڑھ کر کوئی وسیلہ تصور میں نہیں آتا۔اگر کوئی شخص خدا کو ایک مان لے اور خیر وشر میں اس کے سوا کسی اور کی قدرت نہ سمجھے اور حشر وحساب کو مان لے تو پھر اس سے دنیا میں گناہ کا سرزد ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ہر شخص کے ایمان کی پختگی اس کے اعمال میں ہویدا رہتی ہے۔نماز ، روزہ ، حج ، زکوۃ اور جہاد فی سبیل اللہ ایسے احکام ہیں جن سے انسان فرشتوں سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔یہی چیزیں نتیجہ ہیں سیرت پاک کے مطالعے کا اور یہی چیزیں ہیں جو سیرت پاک کے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں۔ (انسان کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسول عربی،ص:۱۳،۱۴)

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم - ماحی کفر وشرک

مولانا محمد حنیف خاں رضوی

امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف

حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے لے کر حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کی تشریف آوری تک ہر دور میں انسانوں کی رہ نمائی کے لئے حضرات انبیاء ومرسلین علیھم الصلوٰۃ والتسلیم کا مقدس قافلہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مبعوث ہوتا رہا اور لوگ ان کی تعلیمات سے راہ ہدایت پاتے رہے۔

حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ التحیۃ والثناء کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اس سلسلہ کی آخری کڑی صرف ایک ذات قدسی صفات رہ گئی تھی جس کو جملہ مخلوق کی رہنمائی کے لئے مبعوث ہونا تھا۔حضور بنی آخر الزماں خاتم پیغمبراں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل اس دنیا میں کفر وشرک کی تیز وتند آندھیاں چل رہی تھیں۔ہر طرف ظلمت کا دور دورہ تھا، دنیا کے وہ خطے جہاں کے باشندے اپنے آپ کو نہایت عقلمند اور دانشور گمان کرتے تھے،ان کی مذہبی فکر ونظر کی پستی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے مجبور ولاچار پتھروں کے سامنے جھکتے اور ان کو اپنا معبود گردانتے تھے،خاص طور پر اہل عرب جہاں اللہ رب العزت کا مقدس گھر کعبہ تھا وہاں بھی کور باطنوں نے اپنی من گھڑت سے سیکڑوں مجسموں کو اپنا معبود مان رکھا تھا۔

تاریک دور:

اولاد آدم جن کے لئے کائنات کی ہر چیز بنائی گئی، جس کے سر پر اشرف المخلوقات ہونے کا تاج سجایا گیا، ان کے لئے یہی شایاں تھا کہ اپنے شرف وفضل اور انعام واکرام کے شکریہ میں اپنے خالق ومالک کے دربار میں سجود نیاز لٹاتے، اسی کی بارگاہ میں اپنا سر جھکا کر اپنی نیاز مندی کا ثبوت پیش کرتے، لیکن اس کے بجائے انھوں نے ہر چیز کو اپنا الٰہ ومعبود بنالیا، بے جان پتھروں کے سامنے جھکنے لگے، درختوں کا طواف کرنے لگے، شمس وقمر کے آگے سجدہ ریز ہونے لگے، کبھی پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں دیکھ کر مرعوب ہوجاتے اوران کو پوجنے لگتے، اور کبھی جانوروں کو اپنا دیوتا مان کر ان کے پجاری بن جاتے۔

دنیا کے منظر نامے کا اس دور کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو ہر جگہ دو بڑی طاقتیں جن کو کسی اختلاف کے بغیر سب نے سپر پاور مان لیا تھا، وہ ایران اور روم کی سلطنتیں تھیں، باقی سب حکمراں انہیں کے زیرنگیں اور تابع شمار کیے جاتے تھے۔

ایران میں اس وقت زرتشتی مذہب کا دور دورہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا بانی زرتشت نامی ایک شخص تھا جس نے توحید کا علم بلند کیا، لیکن بعد کو اس کے پیروکاروں نے اس کی تعلیمات کو مسخ کر دیا اور اپنی طرف سے عقائد میں بہت سی چیزیں شامل کر دیں۔ اس وقت ان کا بنیادی عقیدہ آگ کی پرستش تھی، اس کو یہ لوگ نہایت مقدس مانتے، اس کے سامنے جھکتے اور ڈنڈوت کرتے۔

روم سلطنت کا علاقہ نہایت وسیع تھا اور یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت شمار ہوتی تھی۔ قومی اعتبار سے رومی دراصل یونانیوں کے جانشین تھے، مذہبی اعتبار سے یہاں مسخ شدہ عیسوی مذہب کا رواج تھا جو ایک خدا کے بجائے تین کے قائل تھے۔ یعنی دنیا کی یہ دونوں بڑی طاقتیں توحید سے دور شرک کی وادیوں میں بھٹک رہی تھیں۔

اس تناظر میں اہل عرب جو ان دونوں ممالک کے قرب وجوار میں آباد تھے،

وہ کب اس سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ لہذا خواہی نخواہی یہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہو گئے اور پھر شرک کے گڑھے میں ایسے گرے کہ ان سے دو ہاتھ آگے نظر آئے۔

عرب میں بُت پرستی:

اہل عرب جن کی ذہانت وفراست، شجاعت وسخاوت، ایفائے عہد وصدق وعد، قومی غیرت وحمیت اور فصاحت وبلاغت کا شہرہ ہر چہار جانب تھا، وہ اپنے مذہب وعقیدہ میں بھی نہایت پاکباز تھے۔ دین ابراہیمی کے نہایت سختی سے پابند تھے۔ لیکن شرک کی وادی میں یہ کس طرح جا پڑے اس کا واقعہ یوں ہے کہ عمرو بن عامر لحی خزاعی جس نے بنو جرھم کو شکست دے کر خانہ کعبہ کی تولیت پر قبضہ جمایا تھا۔ اس کو خطرناک قسم کا کوئی مرض لاحق ہوا، کسی نے اسے بتایا کہ ملک شام میں ایک جگہ گرم پانی کا چشمہ ہے جس سے غسل کر کے تم صحت یاب ہو جاؤ گے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور شفایاب ہوا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ لوگ بتوں کی پوجا کر رہے ہیں، اسے یہ طریقہ اچھا لگا اور اس نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی ان میں سے چند بت دیدو۔ لہذا یہ وہاں سے متعدد بت لے کر آیا اور مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کے اردگرد نصب کر دیے۔ اسی دن سے اہل عرب میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون لکھتے ہیں:

عمرو بن عامر لحی وہ پہلا شخص ہے جس نے دین اسماعیل کو تبدیل کیا اور بتوں کی پرستش شروع کی اور اہل عرب کو ان کی عبادت کا حکم دیا۔ [تاریخ ابن خلدون-۲/۲۵۱]

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس خبیث مردود کے کرتوت اور انجام کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے اور یہ سب سے پہلا شخص ہے جو بتوں کے نام بیلوں کو چھوڑتا تھا اور پھر ان کے نام پر ہی ان جانوروں کو ذبح کرتا تھا۔ [بخاری شریف ۱/۴۹۹]

اس ایک شخص کی وجہ سے اہل عرب اس فتنہ میں کس طرح مبتلا ہوئے، اس کی وضاحت علامہ علی بن برہان الدین اس طرح فرماتے ہیں:

عمرو بن لحی اہل عرب کے لیے مربی بن گیا، دین میں جس نئی بات کا وہ آغاز کرتا تھا لوگ اسے دین سمجھ لیتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ موسم حج میں لوگوں کو کھانا کھلاتا، لباس پہناتا اور بسا اوقات موسم حج میں دس ہزار اونٹ ذبح کرتا اور دس ہزار ناداروں کو لباس پہناتا تھا۔ یہی پہلا شخص ہے جس نے دین ابراہیمی کو بدلا [السیرۃ الحلبیۃ-۱/۱۰]

اس کی عمر نہایت طویل ہوئی، یعنی تین سو چالیس سال تک زندہ رہا، اس نے اپنی اولاد میں ایک ہزار جنگ جو لڑکوں کو دیکھا، اس کے خاندان کی حکومت پانچ سو سال تک رہی۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں حضرت قصی بن کلاب نے بنوخزاعہ کو شکست دے کر مکہ سے نکال دیا اور حکومت پر قبضہ کرلیا، قصی قریش کے عالم تھے اور یہ قریش کو ہر جمعہ کے دن جمع کرتے جس کو اس زمانہ میں ''یوم العروبہ'' کہا جاتا تھا۔ آپ ان کو وعظ ونصیحت کرتے اور اصنام پرستی سے روکتے، ساتھ ہی حضور نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد کی خوشخبری بھی سناتے تھے۔

بت پرستی چونکہ اہل عرب کی خو بو بن چکی تھی اور ان کی رگ وپے میں سما گئی تھی، لہٰذا خال خال ہی کوئی اس سے محفوظ رہتا، ہر قبیلہ کا بت علیحدہ تھا۔ بلکہ سفر وحضر، شام وسحر، اور روز وشب کے بت علیحدہ تھے، ان سب میں بڑا ''ہُبل'' تھا، اور پھر چھوٹے بڑوں کی شمار قطار نہ تھی، حد تو یہ ہے کہ ''اِساف ونائلہ'' نام کے دو یمنی مرد وعورت کعبہ معظّمہ میں بدفعلی کی وجہ سے مسخ کر دیئے گئے اور پتھر بنا دیئے گئے تھے تو لوگوں نے ان پتھروں کو سر عام رکھ دیا تھا کہ لوگ ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں اور کعبہ کا تقدس پامال نہ کریں، لیکن بعد میں لوگ ان کو بھی پوجنے لگے، بت پرستی کی ایسی گندی گھنونی مثال شاید ہی کوئی اور ملے۔

غرض کہ خانہ کعبہ جس کا تقدس ان بت پرستوں کو بھی معلوم تھا لیکن ان عقل کے اندھوں نے بتوں کی آلائش سے اس کو بھی پامال کر رکھا تھا۔ ہر طرف کفر وشرک کی تاریکیاں مسلط تھیں، اور الحاد وبے دینی کے اندھیروں نے ہر طرف اپنا بسیرا کرلیا تھا۔ ساری دنیا ایک ظلمت کدہ تھی اور بالخصوص اہل عرب ان اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ ایسے ماحول میں ضرورت تھی کہ کوئی ہدایت کا آفتاب طلوع ہو اور کفر وشرک کی تنی ہوئی دبیز چادروں کو چاک کر دے تاکہ عالم منور ہو جائے اور گمراہی کے بادل چھٹ جائیں۔

بعثت مصطفیٰ:

اسی ماحول میں دعائے ابراہیم، تمنائے کلیم اور بشارت روح اللہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ یعنی وہ ہستی تشریف لائی جس کے ذریعہ کفر کی تاریکیوں کو مٹنا تھا، شرک کے اندھیروں کو کافور ہونا تھا اور الحاد وبے دینی کی گھٹاؤں کو چھٹنا تھا۔ یعنی نبی آخر الزماں، خاتم پیغمبراں، فخر آدم وآدمیاں، چارہ ساز دردمنداں، انیس بیکساں، سید رسل، مولائے کل، ماحی کفر وضلالت، قاطع شرک وبدعت، روحی فداہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، جن کی آمد پر ہر طرف خوشی وشادمانی کی لہر دوڑ گئی، کعبہ میں رکھے ہوئے بت اوندھے منہ گر پڑے، کسریٰ کا ایوان لرز گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے، ایران کا مرکزی آتش کدہ جو ہزار سال سے بھڑک رہا تھا، اچانک بجھ گیا۔ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے بعد سب سے پہلے جو اعلان فرمایا وہ یہ تھا: لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ مُحمَد رسُولُ اللّٰہ ۔

اس ایک کلمہ میں ان تمام معبودوں کو باطل قرار دے دیا گیا جن کو اللہ کے سوا پوری دنیا میں پوجا جارہا تھا۔ آپ نے صاف طور پر اعلان فرما دیا کہ عبادت کی مستحق صرف ایک اللہ رب العزت کی ذات ہے، باقی یہ تمام معبود جھوٹے ہیں۔ کفر وشرک کو مٹانے کا یہ سب سے پہلا اعلان تھا جو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکہ کی

سرزمین پر لوگوں کو سنایا، اس اعلان کو سن کر اہل مکہ نے جو ردعمل ظاہر کیا وہ پوشیدہ چیز نہیں۔

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ پیغام سن کر سعید روحوں نے تو اس کا استقبال کیا، ایمان وتصدیق سے اپنے دلوں کو منور کیا، لیکن عام طور پر لوگ مخالفت پر اتر آئے، عداوت ودشمنی کی انتہا کردی، ظلم وستم کے ایسے پہاڑ توڑے گئے جس کی مثال دور سابق میں نہیں ملتی، اپنے ہی خاندان کے لوگوں نے سوشل بائیکاٹ کیا اور ظالم ظلم کرتے کرتے جب تھک گئے تو قتل کرنے اور اس نور الٰہی کو بجھانے کے لئے کمر بستہ ہو کر گھروں سے نکل آئے لیکن اللہ رب العزت نے ان سب کو خائب وخاسر فرمایا اور صاف ارشاد فرمایا:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَه وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [التوبۃ:۳۲-۳۳]

چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ نہ مانے گا مگر اپنے نور کا پورا کرنا، پڑے برا مانیں کافر، وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، پڑے برا مانیں مشرک۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرَهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ [الصّف:۸] چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونھوں سے بجھا دیں اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے۔ پڑے برا مانیں کافر۔

لہٰذا اللہ کے اس نور کو سب مل کر بھی نہ بجھا سکے اور تمام کفار ومشرکین کے علی الرغم اللہ کا رسول اور ان کا ابدی پیغام لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا اور حجت الٰہیہ قائم ہو کر رہی۔

ماحی کفر وشرک:

اللہ کے محبوب، دانائے غیوب، ماحی کفر وشرک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لِيْ خَمْسَةُ أَسْمَاءَ، أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدُ وَأَنَا الْمَاحِيْ الَّذِيْ يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمَيَّ وَأَنَا الْعَاقِبُ، [بخاری شریف-۱/۵۰۱]

میرے خاص طور پر پانچ نام ہیں، میں محمد واحمد اور میں ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر وشرک کو مٹائے گا اور میں حاشر ہوں کہ میرے قدموں پر لوگوں کا حشر ہوگا اور میں عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خبر دی کہ میں ماحی کفر وشرک ہوں، لہٰذا اب کفر وشرک کی طغیانی ختم ہوگی، الحاد وبے دینی کی ظلمتیں کافور ہوں گی، اور اب ایمان وعرفان کے اجالے پھیلیں گے، اسلامی تعلیمات کی کرنیں خاکدان عالم کی تاریکیوں کا پردہ چاک کر کے اپنے انوار وتجلیات کی روشنیاں بکھیریں گی۔

چنانچہ چند سال کے عرصہ میں دنیا نے دیکھا کہ جس رسول کی دنیا مخالف تھی، جس کے لوگ درپے آزار تھے، حتی کہ ان کو اپنا محبوب دیار اور اللہ کا مقدس گھر چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی پھر بھی دشمنوں نے ان کو سکون سے نہ رہنے دیا اور سیکڑوں میل دور جا کر بھی ان سے لڑتے رہے اور ہر ممکن کوشش کر کے ان کے وجود مسعود کو مٹانے کی کوشش میں شب وروز مصروف رہے لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ یہ سب اسی رسول خدا کے سامنے اسی شہر مقدس مکہ مکرمہ میں مجرم ہیبت زدہ بنے کھڑے تھے اور اپنی بے بسی پر ماتم کناں تھے۔ اللہ کا آخری رسول حرم کعبہ میں ان سب سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے مسلسل بیس سال سے زیادہ جو میرے ساتھ سلوک کیا، اب اس کے پیش نظر تمہیں مجھ سے کیا امید ہے؟ سب خاموش تھے، ڈرے سہمے کھڑے تھے، لرزہ براندام تھے اور کسی کو بولنے کی سکت نہ تھی، پھر خود ہی ارشاد فرمایا اور ان کی جاں بخشی کا مژدہ سناتے ہوئے اعلان عام فرمایا: اِذْهَبُوْا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ [بیہقی-۹/۱۱۸]

اللہ اللہ، اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ یہ حسن اخلاق، یہ فراخدلانہ سلوک، یہ بخشش وعطا، یہ جود وسخا، تاریخ عالم میں چشم فلک نے کبھی ایسا نظارہ نہ کیا ہوگا۔

جزیرۂ عرب سے بت پرستی کا خاتمہ:

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا میں ان لوگوں کو مٹانے نہیں آئے تھے جو کفر وشرک کی وادیوں میں سرگرداں تھے، بلکہ ان لوگوں کے کفر وشرک کو مٹانے آئے تھے۔ لہذا کفر وشرک مٹ گیا اور توحید ورسالت کا سورج نصف النہار پر نظر آنے لگا۔ وہی لوگ جو نور خدا کو مٹانے کے لئے مدت العمر سر دھڑ کی بازی لگاتے رہے، ان سب نے کلمہ توحید ورسالت پڑھا اور حلقہ بگوش اسلام ہوکر بتوں کی آلائش ونجاست سے خانہ کعبہ اور حرم محترم کے چپہ چپہ کو پاک وصاف کر دیا اور اب اللہ رب العزت اور اس کے محبوب مختار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعلان عام سنایا:

يَـٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ، فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا، وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ [التوبۃ:۲۸]

اے ایمان والو مشرک نرے ناپاک ہیں تو اس برس کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں اور اگر تمہیں محتاجی کا ڈر ہے تو عنقریب اللہ تمہیں دولت مند کر دے گا اپنے فضل سے اگر چاہے، بے شک اللہ علم وحکمت والا ہے۔

اور حدیث کا ارشاد ہے: ہماری اس مسجد میں اس سال کے بعد کوئی مشرک نہ آنے پائے [مسند امام احمد-۴/۳۸۶] فتح مکہ کے بعد جب ہر طرف روشنی پھیلنے لگی، کفر وشرک کی تاریکیاں مٹنے لگیں اور ماحی کفر وشرک رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے ہر علاقہ کے بتوں کو توڑ دیا گیا اور پورا جزیرۂ عرب بت پرستی سے آزاد ہوگیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لئے یہ مژدہ جانفزا سنایا:

بیشک اب شیطان مایوس ہوگیا اس بات سے کہ جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت ہو۔ [مسلم شریف-ص۳۷]

یعنی جزیرۂ عرب شرک کی گندگی سے اب پاک ہوگیا ہے، یہاں اب بت پوجنے کوئی نہیں آئے گا اور شیطان کی سب سے بڑی خواہش اصنام پرستی اب کبھی یہاں پوری نہ ہوگی۔ لہذا دجال لعین کے خروج کے وقت بھی یہ علاقہ محفوظ رہے گا۔

عالمی سطح پر انقلاب:

اس کے بعد اسلام کی شعائیں عرب کے ریگزاروں سے نکل کر چار دانگ عالم کو روشن کرتی چلی گئیں، ماحی کفر وشرک نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیغام حق وصداقت لے کر آپ کے اعوان وانصار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جس طرف گئے، کفر وشرک کے اندھیرے چھٹتے گئے اور جہاں انہوں نے اپنے نبی رحمت، رسول برحق کی تعلیمات پیش کیں تو انصاف پسند لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا، دیکھتے دیکھتے عالمی منظر نامہ تبدیل ہوگیا، دنیا کی سپر طاقتیں ایران وروم بھی حق وصداقت کی اس آواز کو نہ دبا سکیں، بلکہ بادۂ توحید کے متوالوں سے ٹکرانے کی کوشش کی تو خود پاش پاش ہوگئیں۔

صحابہ کرام نے اپنے رسول سے جو درس حاصل کیا تھا، اس کی روشنی میں وہ کفر وشرک کو مٹاتے ہوئے آگے بڑھے اور بڑھتے ہی چلے گئے، ان کے نیزہ وتلوار سے لوگوں نے اطاعت قبول کی تو اس سے کہیں زیادہ ان کے کردار وگفتار اور عادات واطوار سے متاثر ہوئے جو نبوی اسوۂ حسنہ کا آئینہ تھے اور کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر ایمان واسلام کے اجالے میں آتے چلے گئے۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل حق ہے کہ اسلام کی روشنی تلوار سے کم اخلاق نبوی سے زیادہ پھیلی۔ کفر وشرک کو مٹانے کے لئے جو طریقے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ قائم فرمائے تھے، ان کی بدولت ہی اسلام کو عروج وارتقا حاصل ہوا اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ اللہ رب العزت کے ایسے بندے ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے جو تعلیمات رسول اور اسوۂ نبوی کی

روشنی میں کفر وشرک کی تاریکیوں کو مٹاتے رہیں گے اور توحید ورسالت کی شمع فروزاں رکھیں گے، اللہ کے محبوب دانائے غیوب علیہ التحیۃ والثناء ارشاد فرماتے ہیں:

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا، ان کو وہ لوگ نقصان نہیں پہونچا سکیں گے جو رسوا کرنا چاہیں گے اور نہ کسی کی مخالفت سے کوئی فرق پڑے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم (قیامت) آجائے گا اور وہ اس پر قائم رہیں گے۔ [بخاری شریف-۱/۴۳۹]

اسی طرح ہر قرن وصدی میں ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب اللہ جل جلالہ اپنے دین کو مکمل طور پر غالب فرمادے گا، اور یہ زمانہ وہ ہوگا جب حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ والصلوٰۃ والتسلیم دین اسلام اور شریعت اسلامیہ مصطفویہ کی ترویج واشاعت کے لئے آسمان سے نزول اجلال فرمائیں گے اور پھر ساری دنیا کا ایک دین ''دین اسلام'' ہوگا۔ اس دن آیت کریمہ ''لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' اور حدیث مبارک ''وَأَنَا الْمَاحِی الَّذِیْ یَمْحُو اللّٰهُ بِیَ الْکُفْرَ'' کا مظاہرہ بابلغ وجوہ اور کامل طور پر ہوگا جس کا نظارہ سب اپنی نگاہوں سے کریں گے۔ یہ سب آپ کی عظمت کا اظہار اور آپ کے معجزہ کا ظہور ہوگا۔

آپ کی بعثت مبارکہ سے لے کر اس آخری دور تک کے احوال وکوائف، کفر وشرک کا مختلف ادوار میں مختلف بلاد سے مٹنا اور پھر بالکل نیست ونابود ہو جانا سب آپ کے ''ماحی کفر وشرک'' ہونے کے مفہوم میں داخل ہے جس کی صراحت کتب تفاسیر واحادیث میں موجود ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی داعیانہ زندگی

مولانا صدر الوری قادری برکاتی

استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

اس خاکدان گیتی پر خورشید رسالت کی جلوہ گری سے پہلے کائنات عالم کفر وضلالت کے ظلمت کدوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بت پرستی، ظلم وزیادتی، فحاشی کا دور دورہ تھا، قتل وغارت گری، زنا کاری، سودخوری کو عرب کے معاشرہ میں کوئی عیب تصوّر نہیں کیا جاتا تھا۔ جہالت ایسی عام تھی کہ حقوق انسانی کا کوئی پاس ولحاظ نہ تھا، طاقت ور کمزور پر مظالم کے پہاڑ توڑتا، محصن وعفت مآب عورتوں کی عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، ان کی قلبی قساوت اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ بچیوں کا پیدا ہونا اپنے لیے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے جس کے نتیجے میں وہ انہیں زندہ درگور کر دیتے۔ یتیموں، بیواؤں، بے سہارا عورتوں کے زخموں پر کوئی مرہم لگانے والا نہ تھا، مظلوم وبے کس افراد کی سسکیوں پر رحم نہیں کھاتا، غرض یہ کہ پورے عرب کے ماحول پر جہالت ایسی خیمہ زن تھی کہ انہیں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ تھی، قبائلی عصبیت اس انتہا کو تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو برداشت نہیں کرتا، معمولی معمولی باتوں پر جنگ کا جو آتش فشاں بھڑکتا تو برسہا برس اس کے شعلے سرد نہیں ہوتے بلکہ کئی نسلوں تک انتقام وخونریزی کا جذبہ دلوں میں باقی رہتا اور نفرت وعداوت کا سلسلہ ختم نہ ہوتا۔ نسبی تفاخر ایسا عام تھا کہ عرب کے مشہور بازاروں میں دور دراز سے نامور شعرا اکٹھا ہو کر اپنے آبا واجداد کی شان میں فخریہ قصیدے پڑھ پڑھ کے سناتے۔

ایسے تاریک ماحول میں ضرورت تھی کسی محسن انسانیت کی جو نوع انسانی ہی نہیں بلکہ سارے جہان کے لیے سراپا رحمت ہو، جو دعوت وتبلیغ اور انذار وتبشیر کے ذریعہ کفر وسرکشی سے لوگوں کی نجات کا سامان بھی فراہم کرے اور مظلوم و بے سہارا افراد پر پڑی ہوئی ظلم و بربریت کی زنجیروں کو ہٹا کر ان کی فریادرسی بھی کرے۔ کفر وشرک کی ظلمتوں میں ساری کائنات منتظر تھی کسی ایسے نیر اعظم کی جس کی کرنوں سے افق عالم پر چھائی ہوئی تاریکیاں کافور ہو جائیں اور پورا عالم ایمان وعمل کی روشنی سے جگمگا اٹھے، جو داعی الی اللہ ہو اور سارے بنی آدم کا بشیر ونذیر اور پوری امت کے لیے رؤف بھی ہو، جو اپنے ارشادات کے ذریعہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت وبندگی کی طرف دعوت وتبلیغ کرے اور صداقت وعفت و پاکدامنی کا درس بھی دے۔ سارا عالم مشتاق تھا ایسے نبی کی آمد کا جو پوری کائنات کو راہِ حق سے آگاہ کرے اور جس کی بعثت ایسے دینِ حق کے ساتھ ہو جو تمام ادیان کے لیے ناسخ ہو۔ بلاشک وشبہ وہ ذات ہے ہمارے نبی مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ والسلام کی ہے جن کی داعیانہ شان قرآن حکیم نے جابجا بیان فرمائی۔ کہیں ارشاد فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.[سورہ احزاب ۴۵،۴۶]

اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر وناظر اور خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب۔

کہیں جنوں کی حکایت کے طور پر یوں ارشاد فرمایا:

یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءُ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (سورہ احقاف ۳۱،۳۲)

اے ہماری قوم اللہ کے منادی کی بات مانو اور اس پر ایمان لاؤ کہ وہ

تمہارے کچھ گناہ بخش دے اور تمہیں دردناک عذاب سے بچالے اور جو اللہ کے منادی کی بات نہ مانے وہ زمین میں قابو سے نکل کر جانے والا نہیں اور اللہ کے سامنے اس کا کوئی مددگار نہیں، وہ کھلی گمراہی میں ہیں۔

شاہ حبشہ نجاشی کے شاہی دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے گئے تو داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ اور کفار قریش کے جور وظلم کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

ترجمہ! اے بادشاہ ہم جاہلیت والے لوگ تھے بت پرستی کرتے، مردار کھاتے، بے حیائی کا کام کرتے، قطع رحم کرتے، پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کرتے، ہم میں کا طاقتور کمزور کو کھا جاتا۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا جن کے نسب، سچائی، امانت داری اور پاکدامنی کو ہم جانتے ہیں۔ انھوں نے ہم کو اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اس کو ایک مانیں، اس کی عبادت کریں اور اس کے سوا ہم اور ہمارے باپ دادا جو پتھروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے، اس سے ہم بالکل ہی کنارہ کش ہو جائیں اور ہمیں راستی گفتار اور امانت کے ادا کرنے اور صلہ رحمی اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، اور حرام چیزوں اور ناحق خون سے رکنے کا حکم دیا اور بے حیائی کے کام، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورت پر تہمت لگانے سے منع کیا اور ہمیں نماز، زکوۃ، روزے کا حکم دیا تو ہم نے ان کو سچا مانا اور ان پر ایمان لائے اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لے کر آئے، ہم نے اس پر ان کی پیروی کی تو ہم نے ایک اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا اور جو کچھ انہوں نے ہم پر حرام کیا، اسے ہم نے حرام قرار دیا اور جو ہمارے لیے حلال کیا، اسے ہم نے حلال جانا تو ہماری قوم نے ہم پر زیادتی کی، ہمیں عذاب میں ڈالا ہم کو ہمارے دین سے ہٹانے کے لیے ہمیں آزمائش میں مبتلا کیا تا کہ وہ خدا پرستی سے بت پرستی کی جانب لوٹا دیں اور جن خبیث چیزوں کو ہم پہلے حلال سمجھتے تھے انہیں دوبارہ حلال جانیں، جب انھوں نے ہم پہ قہر ڈھایا، ہم پر ظلم

کیا اور ہم پر سختی کی، ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہو گئے تو ہم آپ کے شہر میں نکل کر آئے اور ہمیں آپ کا پڑوس اختیار کرنے کی خواہش ہوئی اور ہم اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ آپ کے یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔[سیرت ابن ہشام۔۱/۳۳۶]

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ ایمان افروز تقریر سننے کے بعد نجاشی نے کہا کہ جو کتاب اللہ کی طرف سے آپ کے نبی پر نازل ہوئی ہے کیا اس کا کچھ حصہ آپ کو یاد ہے؟۔حضرت جعفر نے فرمایا ہاں یاد ہے۔نجاشی نے کہا اسے پڑھ کر سنایئے؟۔حضرت جعفر نے کھیعص (سورہ مریم) کی ابتدائی آیتوں کی تلاوت شروع کی۔اس وقت شاہ حبشہ کے دربار میں اس کے امرا اور مذہبی پیشوا سبھی اپنی سجی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔حضرت جعفر کی زبان سے تلاوت قرآن سنتے ہی نجاشی اور اس کے قائدین اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں تر بتر ہو گئیں۔ان کے مصاحف بھیگ گئے۔پھر نجاشی نے کہا:

ترجمہ! یہ کلام اور جو عیسی لے کر آئے دونوں ایک ہی چراغ دان سے نکلتے ہیں۔

داعی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ تدریجاً آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ہر چہار جانب اسلام کا بول بالا ہوا۔حجۃ الوداع شریف کے موقع سے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام نے میدان عرفات میں اکٹھا ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کا دیدار کیا۔سلسلۂ دعوت کی درجہ بندی اور اس کے مختلف ادوار ذیل کی سطروں میں ملاحظہ فرمائیں۔

دعوت اسلامیہ کا پہلا دور : بعثت اور اعلان نبوت

دعوت اسلامیہ کا دوسرا دور : قریبی رشتہ داروں کو انذار وتبشیر

دعوت اسلامیہ کا تیسرا دور : کھلے طور پر سر عام دعوت وتبلیغ

دعوت اسلامیہ کا پہلا دور:

بعثت کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تین سال تک خفیہ طور سے اسلام کی دعوت وتبلیغ کرتے رہے۔ان ایام میں بہت خاص خاص لوگوں تک تبلیغی سرگرمیاں محدود رہیں اور ان میں ایسی جلیل القدر ہستیوں نے اسلام قبول کیا جنہوں نے حبیب کبریا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کر دی۔اپنے خون جگر سے شجر اسلام کی ایسی آبیاری کی جس پر بادِ خزاں کے جھونکے کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے اور اسلام کی نصرت وحمایت میں ایسے ایسے نمایاں کارنامے انجام دیے جن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور صفحۂ ہستی پر وہ انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی فراموش ہونے والے نہیں ہیں۔

انہیں عظیم الشان ہستیوں میں ایک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں جنہوں نے خواتین میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔اور ہر طرح سے محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت کی۔جب خاطر اقدس پر کوئی شئی بار بنتی تو اپنی تسلّی آمیز گفتگو سے وہ بار ہلکا فرماتیں اور سنگین مواقع پر بارگاہ رسالت میں اپنا مال خرچ کرنے میں دریغ نہیں کرتیں۔جس وقت پہلی وحی نازل ہوئی اور اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دھڑکتے دل کے ساتھ کاشانۂ نبوت واپس ہوئے اور واقعہ کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''لقد خشیت علی نفسی'' میں اپنی جان کو ڈر گیا ہوں

اس وقت ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تسلّی آمیز لہجے میں عرض کیا:

''ایسا ہرگز نہ ہوگا، بخدا اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں اور سچ بولتے ہیں اور لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو وہ چیز عطا

فرماتے ہیں جوان کے پاس نہیں اور مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہِ حق میں پیش آنے والے مصائب میں مدد فرماتے ہیں[بخاری شریف۔ بدء الوحی]

پھر فوراً ہی ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں، جس کی تفصیل کتب احادیث میں ہے۔

مشہور تاریخ نگار ابن اثیر لکھتے ہیں:

''اللہ کی ساری مخلوق میں سب سے پہلے خدیجہ اسلام لائیں مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آپ سے پہلے نہ کوئی مرد اسلام لایا اور نہ کوئی عورت[الکامل۔۲/۳۷]

علامہ ابن ہشام اپنی سیرت میں فرماتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر حضرت خدیجہ بنت خویلد ایمان لے آئیں، حضور کی تصدیق کی اور رسالت کی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں حضور کی ڈھارس بندھائی۔ آپ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں، حضور کی تصدیق کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ اپنے محبوب نبی کا بوجھ ہلکا کیا۔ جب مخالفین حضور کے ساتھ تلخ کلامی کرتے یا جھٹلاتے تو حضور کو بہت دکھ ہوتا لیکن حضور جب گھر تشریف لاتے تو ام المومنین ایسی گفتگو کرتیں کہ غم کے بادل چھٹ جاتے۔ وہ حضور کو ثابت قدمی پر ابھارتیں، اس غم کو ہلکا کرتیں، حضور کی تصدیق کرتیں، اس طرح لوگوں کی مخالفتوں سے دل کو جو ملال پہونچتا اس کا ازالہ کر دیتیں۔ اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمتیں نازل ہوں[سیرت ابن ہشام۔۱/۲۴۰]

انہیں اہل صدق ووفا میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں جنھوں نے آزاد مردوں میں سب سے پہلے کلمہ حق کا اقرار کیا اور دل کی گہرائیوں سے اس کی تصدیق کی۔ بعثت سے پہلے ہی نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ ایک دوسرے کے پاس آمدورفت رہا کرتی تھی اور ہر اہم معاملے میں باہم مشورہ اور تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سفر، حضر میں سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کے اوصاف وکمالات کا مشاہدہ اپنے سر کی آنکھوں سے کر رکھا تھا اور ایک خواب بھی دیکھا تھا جسے بہت سے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے چنانچہ علامہ علی بن برہان الدین حلبی شافعی اپنی کتاب ''انسان العیون'' المعروف ب ''السیرۃ الحلبیہ'' میں لکھتے ہیں:

ایک رات سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں چاند اترا ہے اور اس کی روشنی پورے شہر میں پھیل گئی ہے اور اس کا ایک ایک ٹکڑا ہر گھر میں داخل ہو گیا ہے، پھر وہ بکھرے ہوئے ٹکڑے یکجا ہو کر پورا چاند میری گود میں آ گیا ہے۔

اہل کتاب کے کسی عالم غالبا بحیرا سے یہ خواب بیان کیا تو اس نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ وہ نبی جن کی آمد کا سارا زمانہ منتظر ہے، ان کے ظہور کی گھڑی آ چکی ہے اور آپ ان کی اطاعت وفرماں برداری کریں گے اور اس کی برکت سے تمام لوگوں میں آپ سعید ترین ہوں گے اور ان کی ظاہری حیات میں ان کے وزیر ہوں گے۔[ج۱ص۲۷۴]

اس کے علاوہ علمائے اہل کتاب خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد کا برملا اعلان کرتے تھے اور ان کے اوصاف وکمالات سے لوگوں کو آگاہ بھی کرتے رہتے اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ اوصاف وکمالات دیکھ بھی لیے تھے اور اہل کتاب نبی آخر الزماں کی جو علامات بتاتے تھے ان علامات کا بھی مشاہدہ کر لیا تھا۔ اس طرح اعلانِ نبوت سے پہلے ہی ان کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت بیٹھ چکی تھی۔ صرف اعلان نبوت کا انتظار تھا کہ جیسے ہی اعلان نبوت ہو فوراً ہی یہ حلقۂ بگوش اسلام ہو کر نورِ نبوت کا اجالا ساری دنیا میں پھیلائیں۔

چنانچہ جیسے ہی حبیب کبریا علیہ التحیہ والثنا پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اس کے بعد ہی نبوت کا اعلان ہوا، فوراً ہی آپ نے دعوت اسلام بسر وچشم قبول کی اور اللہ کے رسول کی دعوت پر بلا کسی تأمل وتردد کے دل کی گہرائیوں سے لبیک کی صدا بلند کی۔

ایک دن کا واقعہ ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن حکیم بن حزام کے یہاں رونق افروز تھے۔ اتنے میں حکیم بن حزام کی ایک آزاد کردہ لونڈی آئی اور آتے ہی اس نے کہا کہ آپ کی پھوپھی خدیجہ آج یہ کہہ رہی ہیں کہ ان کے شوہر موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی مرسل ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے نکل پڑے اور بارگاہ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور واقعہ نزول وحی کی تفصیل معلوم کی۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورا واقعہ بیان فرمایا اور اپنے بارے میں یہ بھی واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سننا تھا کہ فوراً ہی بلا کسی تامل وتردد کے دعوت حق قبول فرما کر عرض کیا:

''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ نے سچ فرمایا ہے اور آپ سچے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔'' [السیرۃ النبویۃ للسید احمد زینی دحلان ۱/۱۷۱]

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں:

''میں نے جس کو بھی اسلام کی دعوت دی تو اس نے توقف اور تردد کیا اور اس معاملے میں غور وفکر کیا سوائے ابوبکر کے۔ جس وقت میں نے ان سے اس کا ذکر کیا تو قبول کرنے میں نہ کچھ تاخیر کی اور نہ ہی انہیں کچھ تردد ہوا۔'' [البدایۃ والنہایۃ۔ ۳۶۵/۲]

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ گوناگوں اوصاف وکمالات کے جامع تھے، نسبی لحاظ سے آپ بڑے معزز تھے، نہایت کامیاب تاجر تھے۔ راست بازی، دیانت داری آپ کا شیوہ تھا۔ غربا ومساکین کی امداد، یتیموں اور بیواؤں کی فریادرسی، مظلوموں کی غم خواری اس طرح کی ساری چیزیں آپ کے معمولات میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ دورِ جاہلیت کی گندگیوں سے بھی آپ کا دامن پاک وصاف تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ غایت درجہ آپ کی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور آپ کی

مجلسوں میں بیٹھنا بہت بڑا شرف تصور کرتے تھے۔ السیرۃ الحلبیہ میں آپ کے یہ اوصاف وخصائل درج ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کشادگی مال اور حسن اخلاق کے ساتھ سردارانِ قریش کی طرف سے قریش میں باعظمت اور ان کے مشیر خاص اور پاک دامن لوگوں میں سے تھے فیاض طبیعت معزز رئیس تھے۔ مال کی قربانی دیتے اپنی قوم میں ہر دل عزیز تھے۔ اچھی نشست وبرخاست رکھتے اور خواب کی تعبیر کے واقف کار لوگوں میں سے تھے۔

ان عظیم مناصب کے پیش نظر آپ نے دعوت حق قبول کرنے کے ساتھ اپنے دوستوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت شروع فرمادی اور بہت سی عظیم شخصیات نے آپ کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔ ان میں سے حضرت زبیر بن العوام، حضرت عثمان بن عفّان، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ یہ وہ جاں نثارانِ اسلام ہیں جنھوں نے کلمۂ اسلام کی سربلندی کی خاطر جان ومال سب کچھ قربان کردیا اور داعیٔ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایسی نصرت وحمایت کی جس کی مثال دیگر مذاہب میں نہیں ملتی۔ یہ وہ مقدس نفوس ہیں جن کو دنیا ہی میں مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان صدق پر جنت کی بشارت ملی اور عشرہ مبشرہ کی پرنور جماعت میں شامل ہوئے۔ یہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یقیناً بہت عظیم کارنامہ ہے جسے تاریخ اسلام میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں فدا کاران اسلام میں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، جو بچوں میں سب سے پہلے اسلام سے شرف یاب ہوئے۔ اعلان نبوت سے پہلے ہی آپ آغوش نبوت میں پہونچ چکے تھے اور آپ کی کفالت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود فرمائی۔ آپ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد فرماتی ہیں:

جب میرا بچہ پیدا ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا نام علی رکھا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور اپنی زبان مبارک اس مولود مسعود کو چوسنے

کے لیے اس کے منہ میں ڈال دی تو بچہ اسے چوستا رہا یہاں تک کہ سو گیا۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن یہ کاشانۂ نبوت پر حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں نماز پڑھ رہے ہیں۔عرض کیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’یہ اللہ کا دین ہے جسے اس نے اپنے لیے پسند کیا اور اس کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لاؤ اور اس کی عبادت کرو اور لات وعزیٰ کا انکار کرو۔‘‘

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یہ ایسی بات ہے جسے میں نے اب تک نہ سنا تھا، اس لیے اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ ابوطالب کے مشورہ کے بغیر نہیں کرسکتا ہوں۔ اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ اعلانیہ دعوت حق سے پہلے یہ راز افشا نہ ہو اس لیے ارشاد فرمایا: ’’اے علی اگر تم اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے تو اس راز کو فاش مت کرنا‘‘

یوں ہی ایک رات گزر گئی پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اسلام کی ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ دوسرے دن صبح سویرے بارگاہ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور حضور کے دست اقدس پر اسلام قبول کرلیا اور وہ دن منگل کا تھا۔

آخر کار یہ راز ایک دن فاش ہو ہی گیا۔ آپ کے والد ابوطالب کو آپ کا اسلام لانا معلوم ہوگیا۔ اپنے فرزند کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھ لیا، پوچھا اے بیٹے یہ کیسا دین ہے جو تو نے اختیار کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

اے میرے باپ! میں اللہ پر اور اللہ کے رسول پر ایمان لے آیا ہوں اور جو دین لے کر آئے ہیں، اس کی میں نے تصدیق کرلی ہے اور ان کے ساتھ میں نے نماز پڑھی ہے اور ان کی پیروی کی ہے، ابوطالب نے کہا انہوں نے تمہیں خیر ہی کی دعوت دی ہے، ان کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا۔[السیرۃ النبویۃ للدحلان۔۱/۱۷۸]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ جس وقت ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں تو انہوں نے حضرت زید بن حارثہ کو بارگاہِ رسالت میں پیش کیا تھا۔ اس طرح خفیہ طور پر تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشرہ مبشرہ کے ایک گروہ (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کو بارگاہِ رسالت کی حاضری سے شرف یاب کرنے کے بعد دوسرے گروہ کو بھی لے کر ہادیٔ کونین کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- حضرت ابوعبیدہ بن جراح ۲- ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد

۳- ارقم بن ابی الارقم ۴- عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہم

ان کے علاوہ جنہیں السابقون الاولون ہونے کی سعادت ملی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

عبیدہ بن حارث، سعید بن زید، ان کی اہلیہ فاطمہ، اسماء، عائشہ دختران صدیق اکبر، خباب بن الارت، عمیر بن ابی الوقاص، عبداللہ بن مسعود، مسعود بن القاری، سلیط بن عمر اور ان کے بھائی حاطب بن عمر، عیاش بن ربیعہ، ان کی اہلیہ اسماء، خنیس بن حذافہ، عامر بن ربیعہ، عبداللہ بن جحش اور ان کے بھائی ابواحمد، جعفر بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیس، حاطب بن الحارث، عثمان بن مظعون کے دو بھائی قدامہ اور عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

داعیٔ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دل نشیں خفیہ دعوت وتبلیغ اور آپ کے یار غار سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کوششوں سے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کی تعداد تیس تک پہونچ گئی ہے اور اسلام کا اجالا بڑھتا رہا۔ سلیم الطبع لوگوں کے دلوں پر اس کے اثرات مرتب ہوتے رہے۔ یہ چیز مشرکین مکہ کے لیے ناقابل برداشت رہی جس کے نتیجے میں پیغمبر اسلام اور مسلمانوں سے انہوں نے بغض وعداوت شروع

کردی۔مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دیے۔سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جس بے رحمی کے ساتھ اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا، وہ تاریخ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔حد یہ ہے کہ محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی وہ اپنی شقاوت سے ظلم وزیادتی کرنے لگے۔

ایک روز کا واقعہ ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صفا کے پاس تشریف فرما تھے۔ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا۔اس نے جیسے ہی حضور کو دیکھا تو اس کے سینے میں جو بغض وعناد کا لاوا سلگ رہا تھا، وہ پھٹ پڑا۔اس نے فوراً ہی سب وشتم اور اذیتوں کے تیر برسانا شروع کردیا۔سراقدس پر مٹی ڈال دی اور پے در پے ضربوں سے جسم اقدس لہولہان ہوگیا مگر اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صبر وتحمل کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور اف تک نہ کیا اور کاشانہ نبوت واپس تشریف لے گئے۔

عبداللہ بن جدعان کا گھر کوہ صفا کے پاس ہی تھا۔اس کی لونڈی یہ سارا منظر دیکھ اور سن رہی تھی۔تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ تلوار حمائل کیے شکار سے واپس لوٹے اور آپ کی عادت یہ تھی کہ بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کے بعد ہی گھر تشریف لے جاتے۔اس روز بھی حرم کعبہ کے ارادے سے صفا کے پاس سے آپ کا گزر ہوا۔اس لونڈی نے آپ کو دیکھتے ہی کہا:

اے ابوعمارہ! آج ابوجہل نے تیرے بھتیجے کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا ہے۔پہلے گالیاں دیں، جب حضور نے خاموشی اختیار فرمائی تو مسلسل ضربوں سے جسم اقدس کو لہولہان کردیا۔یہ سننا تھا کہ حضرت حمزہ کے جسم میں آگ لگ گئی۔ابو جہل کی تلاش میں نکل پڑے۔دیکھا کہ اپنی قوم میں بیٹھا ہوا ہے۔فوراً اس کی طرف بڑھے اور اپنی کمان سے اس کے سر پر اتنی مار ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور فرمایا

''اے ابوجہل تیری مجال کہ تو انہیں گالی دے۔میں تو ان کے دین پر ہوں۔ میں وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں۔اگر تیرے اندر کچھ دم خم ہے تو اس کا جواب دے۔''

ابوجہل کے قبیلے والوں نے جب اپنے سردار کی رسوائی دیکھی تو اس نے اپنی

قوم سے کہا:

''ابوعمارہ (حمزہ) کو کچھ نہ کہو۔بخدا میں نے ان کے بھتیجے سے سخت بدکلامی کی ہے۔[السیرۃ الحلبیۃ۔۱/۲۹۷]

اس واقعہ کے ذریعہ حضرت حمزہ نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان تو فرمادیا مگر جب گھر واپس لوٹے تو شیطان نے وسوسہ میں مبتلا کیا۔نفس امارہ نے کہا اے حمزہ! تم قریش کے سردار ہو۔تم نے اس صابی کی اتباع کرکے اپنے آباء واجداد کا دین ترک کردیا۔تمہارا مرجانا اس سے بہتر ہے جو کچھ تم نے کیا ہے۔مگر آپ نے صدق دل سے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی:

''یا اللہ جو کچھ میں نے کیا، اگر یہ رشد ہو تو میرے دل میں اس کا یقین پیدا فرما اور نہ جس معاملہ میں میں پڑا ہوں، اس سے میرے لیے نجات کی راہ پیدا فرما۔

پوری رات نہایت قلق واضطراب میں گزری ایسی رات سے کبھی اب تک سابقہ نہ پڑا تھا۔صبح ہوتے ہی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''اے میرے بھتیجے! میں ایک ایسی مشکل میں گرفتار ہوگیا ہوں جس سے نکلنے کا راستہ میں نہیں جانتا اور ایسی بات پر میرا قائم رہنا بڑا مشکل ہے جس کے بارے میں مجھے یہ علم نہیں کہ یہ ہدایت ہے یا گمرہی۔یہ سننا تھا کہ داعی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فوراً توجہ فرمائی وعظ وتذکیر کیا، عذاب جہنم سے ڈرایا، جنت کی بشارت سنائی۔ نگاہ نبوت پڑتے ہی سارے حجابات اٹھ گئے شیطانی وساوس کا نام ونشان نہ رہا عرض کی۔میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں تو اے میرے بھتیجے! اپنے دین کا اعلان فرمائیے۔[ایضاً ایضاً]

اسلام کی نشر واشاعت کا سلسلہ بڑھتا رہا۔اسلام کے عقیدت مندوں کی تعداد انتالیس تک پہونچ گئی۔چالیس کی تعداد قریب پوری ہونے والی تھی۔پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مذہب اسلام کی عزت وسربلندی کے لیے یہ دعا فرماتے:

اے اللہ ان دونوں آدمیوں ابوجہل، اور عمر بن خطاب میں جو تجھے پسندیدہ ہو، اس سے اسلام کو عزت عطا فرما۔[ترمذی۔۲/۲۰۹]

یہ عظیم دولت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نصیبے میں آئی۔ چنانچہ گھر سے اس ارادہ سے نکلے تھے کہ آج محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاتمہ کردیں گے مگر جب واپس لوٹے تو اپنی گردن میں مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غلامی کا پٹہ ڈالے ہوئے تھے۔ آپ کے اسلام لانے کا واقعہ بڑا ہی مشہور ہے۔ اسے یہاں ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔

بہر حال آپ کے ایمان لاتے ہی مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہونچ گئی۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام بارگاہ رسالت میں یہ آیت لے کر حاضر ہوئے:

يا ايها النبى حسبك الله و من اتبعك من المومنين

اے نبی کافی ہے آپ کو اللہ اور وہ مومنین جنھوں نے آپ کی پیروی کی۔

آپ کے اسلام لانے سے مذہب اسلام کو وہ عزت وسربلندی ملی کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر کا اسلام مسلمانوں کے لیے باعث عزت اور آپ کی ہجرت باعثِ نصرت اور آپ کی خلافت سراپا رحمت تھی۔ بخدا علانیہ طور پر کعبہ کے صحن میں ہمیں نماز پڑھنے کی طاقت نہ تھی یہاں تک کہ حضرت عمر نے اسلام قبول کیا۔[سیرت ابن ہشام۔۱/۳۴۲]

حضرت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

جب حضرت عمر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تو آپ نے بارگاہ نبوی میں عرض کی یارسول اللہ! اب یہ مناسب نہیں کہ اس دین کو چھپایا جائے حضور اپنے دین کو ظاہر فرمائیے۔ حضور مسلمانوں کے ساتھ دار ارقم سے باہر تشریف لائے۔ حضرت عمر اپنی تلوار لیے آگے آگے چل رہے تھے اور لا اله الا الله محمد الرسول الله کا اعلان کررہے تھے۔ یہاں تک کہ مسجد حرام شریف میں داخل ہوگئے۔ قریش نے آپ

کو دیکھ کر کہا: آج عمر بہت خوش آرہا ہے۔ پوچھا عمر! کیا خبر ہے؟ آپ نے فرمایا خبر یہ ہے لا اله الا الله محمد الرسول الله ۔خبردار اگر تم میں سے کسی نے کوئی جنبش کی تو میں اپنی تلوار سے گھائل کردوں گا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آگے آگے چلتے رہے۔ حضور طواف فرماتے اور حضرت عمر آپ کی حفاظت کررہے تھے، یہاں تک کہ طواف سے فارغ ہوگئے۔[شرح مواہب لدنیہ ۱/۲۷۱]

اس طرح اسلام کی تین سالہ خفیہ دعوت وتبلیغ میں ایسی نمایاں اور قابل قدر شخصیات نے دعوت اسلام کو اپنے گلے سے لگایا جن کے زریں کارنامے تاریخ اسلام کے صفحات پر لعل بدخشاں کی طرح چمک دمک رہے ہیں جنھوں نے اپنے لہو سے شجر اسلام کو ہرا بھرا کردیا۔ اعلائے کلمۂ حق کی خاطر جان ومال کی ایسی قربانیاں پیش کیں جن کی مثال نظر نہیں آتی۔

دعوت اسلام کا دوسرا دور:

تین سال تک اسلام کی خفیہ دعوت وتبلیغ کے بعد جبرئیل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ شعراء، ۲۱۴، ۲۱۵) اور اے محبوب اپنے قریب تر رشتہ داروں کو ڈراؤ اور اپنی رحمت کا بازو اپنے پیروکار مسلمانوں کے لیے بچھاؤ۔

اس حکم خداوندی پر عمل کرنا ضروری تھا مگر یہ کوئی آسان نہ تھا۔ جو قوم کفر وشرک کی خوگر تھی، بت پرستی ان کی رگ وپے میں سرایت کی ہوئی تھی، آباواجداد کے دین سے علیحدگی کسی طرح گوارا نہیں کرتے تھے، ان کے درمیان حق کی تبلیغ کرنا نہایت مشکل امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شانۂ نبوت میں گوشہ نشین ہوکر بیٹھ گئے، یہاں تک کہ حضور کی پھوپھیوں کو یہ گمان ہوگیا کہ حضور کی طبیعت ناساز ہے۔ عیادت کے لیے آئیں تو

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میری طبیعت بالکل ناساز نہیں، مکمل طور پر میں صحت مند ہوں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ اب میں سوچتا ہوں کہ بنی عبدالمطلب کو اکٹھا کر کے انہیں حق کی دعوت دوں۔ پھوپھیوں نے عرض کی: انہیں بلائیں مگر ان میں عبد العزی (ابولہب) کو شامل نہ کریں، وہ آپ کی دعوت نہیں قبول کرے گا۔

دوسرے دن صبح کو پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنی عبدالمطلب کو بلایا۔ وہ سب آئے۔ ان میں ابولہب بھی تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اپنا مدعا رکھا۔ اللہ تعالیٰ کا جو فرمان تھا اس سے آگاہ کیا اور کلام الٰہی پڑھ کر سنایا۔ اسے سنتے ہی ابولہب آگ بگولہ ہو گیا اور بڑی بدکلامی پر اتر آیا اور حضور کے تن اقدس پر حملہ کرنے کے لیے ایک پتھر ہاتھ میں لیا اور بولا: میں نے کسی کو نہ دیکھا ہو جو اپنے بھائیوں اور اپنی قوم کے پاس اتنا بدترین پیغام لایا ہو جو آپ لائے ہیں۔

ابولہب بڑبڑاتا رہا، حضور خاموش رہے اور اس مجلس میں کوئی گفتگو نہ کی۔

کچھ دنوں تک حضور ٹھہر گئے۔ دعوت وتبلیغ کا سلسلہ موقوف رہا پھر جبریل امین حاضر ہوئے اور فرمان خداوندی پہونچایا کہ حق کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس کے بعد پھر دوبارہ حضور نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اکٹھا فرمایا اور ان سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"قافلہ کا قائد اپنے قافلہ والوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ بفرض محال اگر میں دوسرے لوگوں سے جھوٹ بولوں تو بخدا میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بفرض محال اگر میں ساری دنیا کے ساتھ دھوکہ کروں تو تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں تمھاری طرف بالخصوص اور سارے انسانوں کی طرف بالعموم اللہ کا رسول ہوں۔ بخدا تم پر موت ایسے ہی طاری ہوگی جیسے نیند طاری ہوتی ہے اور قبروں سے زندہ یوں اٹھائے جاؤ گے جیسے سوکر بیدار ہوتے ہو اور جو تم عمل کرتے ہو، اس کا تم سے محاسبہ ہوگا۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے گا۔

بخدا اے فرزندان عبدالمطلب! بخدا میں کسی نوجوان کو نہیں جانتا جو اس سے بہتر پیغام اپنی قوم کے پاس لایا ہو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں۔ یقیناً میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔"

دوسرے لوگوں نے ان ارشادات کا مناسب جواب دیا مگر ابولہب نے کہا:

اے فرزندانِ عبدالمطلب! یہ چیز ہمارے لیے ذلت ورسوائی کا سبب بنے گی۔ تم لوگ اس کا ہاتھ پکڑ لو قبل اس کے کہ دوسرے لوگ اس کا ہاتھ پکڑیں۔ اگر تم لوگ اسے ان کے حوالے کر دو تو اس میں تمھاری ذلت ہے اور اگر اس کا دفاع کرو تو لوگ تمھاری گردنیں اڑا دیں گے۔

حضور کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب نے ابولہب کی بات سن کر فرمایا:

اے بھائی! کیا تمھیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تم اپنے بھتیجے کو بے یار ومددگار چھوڑ دو۔ بخدا اہل علم برابر یہ خبر دیتے رہے کہ عبدالمطلب کی نسل سے ایک نبی ظاہر ہوں گے، وہ نبی یہی ہیں۔

ابولہب نے کہا کہ یہ سب بے سروپا کی باتیں اور خوش فہمیاں ہیں اور پردہ نشین عورتوں کی لن ترانیاں ہیں۔ جب قریش کے سارے خاندان تمھارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، اس وقت ہمیں ان سے مقابلہ کی تاب نہ ہوگی۔ اس پر ابوطالب اٹھے اور برملا یہ اعلان کیا:

بخدا جب تک ہم اس روئے زمین پر باقی ہیں، ان کی حفاظت ہم کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد داعی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریش کے سارے قبیلے والوں کو اکٹھا فرمایا۔ اس وقت حضور صفا پہاڑی پر تشریف فرما تھے، پھر پورے قبائل قریش کو خطاب فرمایا۔ آغازِ کلام اس طرح سے کیا:

اے قریش کی جماعت اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کی جڑ سے ایک

لشکر نکل کر تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری یہ بات مانو گے؟ سب نے جواب دیا کہ اب تک ہم نے آپ سے کوئی خلاف واقعہ بات نہیں سنی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا:

یا معشر قریش انقذو انفسکم من النار فانی لا اغنی عنکم من الله شیئا انی لکم نذیر مبین بین یدی عذاب شدید انما مثلی و مثلکم کمثل رجل رأی العدو فانطلق یرید اهله فخشی أن یسبقوه الی اهله فجعل یهتف یا صباحاه یا صباحاه اتیتم اتیتم (السیرۃ الحلبیہ ۱/۸۵)

ترجمہ! اے گروہِ قریش! اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ میں عذاب شدید سے پہلے تمھیں واضح طور پر بروقت ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہوں، میری اور تمھاری مثال اس شخص کی طرح ہے جو دشمن کو دیکھ کر چل پڑا ہوتا کہ اپنے اہل خانہ کو دشمن کی آمد سے خبردار کرے، پھر اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں دشمن اس سے پہلے ہی نہ پہونچ جائے تو دور ہی سے یہ اعلان کرنے لگا جاگو جاگو۔ دشمن پہونچ گیا۔ دشمن پہونچ گیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نے خاص و عام ہر طریقے سے دعوت و تبلیغ کی۔ ارشاد فرمایا: اے کعب بن لوی کے بیٹو! آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے مرہ بن کعب کے فرزندو! جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنی ہاشم آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنی عبد شمس آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنی عبدالمطلب آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے فاطمہ آگ سے اپنے آپ کو بچا۔ اے صفیہ [محمد رسول اللہ کی پھوپھی] آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ میں اللہ تعالیٰ سے تمھارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں مگر یہ کہ تم لا الہ الا اللہ کہو۔

یہ سن کر ابولہب نے بارگاہ رسالت میں سخت گستاخی کی اور نہایت دریدہ دہنی سے بولا تبا لك سائر اليوم ألهذا جمعتنا تیرے لیے سارا دن بربادی ہو۔ کیا اسی لیے ہمیں اکٹھا کیا تھا؟ اس کے بعد رب غیور نے اس بدبخت کی مذمت میں سورہ تبت

يدا ابي لهب الخ نازل فرمادی۔ اس کے بعد حضرت جبریل امین علیہ السلام بارگاہ رسالت میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان لے کر حاضر ہوئے:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ.

اے میرے محبوب حق کو کھول کر بیان کیجیے اور مشرکین سے اعراض کیجیے

[سورہ حجر ۹۴]

دعوت اسلام کا تیسرا دور:

دوسرے دور میں حق کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ صرف قریبی رشتہ داروں تک ہی محدود تھا اور اب اس کا دائرہ بڑھا کر سارے انسانوں تک وسیع کر دیا گیا اور دیگر قبائل کی اہم شخصیتیں اسلام کے پرچم تلے آنے لگیں۔ کفار مکہ سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ انھوں نے سوچا کہ اس تحریک کا اگر بروقت سد باب نہ کیا گیا تو ایک وقت وہ آئے گا کہ معاشرہ میں ہمہ گیر انقلاب برپا ہو جائے گا۔ ہماری چودھراہٹ نیست و نابود ہو جائیگی۔ اس خیال سے وہ لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور کہنے لگے:

اے ابوطالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا کہا، ہمارے دین پر عیب لگایا: ہمیں بیوقوف اور خفیف العقل کہا، ہمارے باپ دادا کو گمراہ بتایا۔ اب دو ہی صورت ہے یا تو اسے روک لیں یا درمیان سے ہٹ جائیں، ہم خود اسے روک دیں گے۔ ابوطالب نے اس وقت انھیں کوئی مناسب جواب دے کر خوبصورتی سے ٹال دیا۔ وہ لوگ وہاں سے واپس ہو گئے۔

مگر داعی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب کہ کفار مکہ کے دلوں میں کفر و شرک رچا بسا تھا، توحید اور پیغمبر اسلام کی پیروی کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے پھر بھی اسلام کی شان و شوکت بڑھتی رہی، روز افزوں اس کا بول بالا ہوتا رہا۔ اب ہر طرف حضور کے خلاف باتیں ہونے لگیں، ایک دوسرے کو نبی رحمت کے خلاف بھڑکاتے رہے، جنگ اور مقاطعہ پر آمادہ کرنے لگے، پھر آپس

میں طے کیا کہ ایک بار اور ابوطالب کے پاس چل کر کوشش کرلیں۔اس مقصد سے وہ لوگ دوبارہ ابوطالب کے پاس آئے اور کہا:

اے ابو طالب! آپ ہم میں عمر دراز ہیں، ہمارے درمیان آپ کو قدر ومنزلت حاصل ہے،اس سے پہلے ہم آپ سے درخواست کر چکے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو منع فرمادیں مگر آپ نے منع نہیں کیا اور اب بخدا ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، وہ ہمارے باپ دادا کو برا کہتا ہے،ہمیں بیوقوف کہتا ہے، ہمارے خداؤں کی عیب جوئی کرتا ہے،آپ اسے روک دیں ورنہ ہم اس کے اور آپ کے خلاف جنگ کریں گے، یہاں تک کہ ہم میں کا ایک فریق اس دنیا سے رخصت ہوجائے۔ یہ کہہ کر وہ لوگ وہاں سے واپس چلے گئے۔ابوطالب کو ان کے اس انداز تکلم سے بڑا صدمہ پہونچا۔ پوری قوم سے دشمنی مول لینا ان پر نہایت گراں تھا مگر اس کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت سے کنارہ کشی بھی پسند نہیں کرتے تھے،ان مشاہدات سے دوچار ہونے کی وجہ سے حضور سے عرض کی:

اے بھتیجے آپ کی قوم کے لوگ میرے پاس آئے اور مجھ سے ایسا ایسا کہا تو مجھ پر اور اپنی ذات پر رحم کیجئے اور مجھے ایسے امر کا متحمل مت کیجئے جس کی مجھ میں طاقت نہیں۔

چچا کی یہ بات سن کر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ خیال آیا کہ شاید ابو طالب میری مدد سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور اب میری نصرت وحمایت کی ان کے اندر قوت نہیں رہی۔نہایت عزم وحوصلہ کے ساتھ ارشاد فرمایا:

اے چچا! بخدا اگر وہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور شرط یہ رکھیں کہ میں اس امر (دعوت حق) کو ترک کردوں تو میں اسے ترک نہیں کرسکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غلبہ دے دے یا میں اس راستے میں اپنی جان دے دوں۔

حضور نے یہ جملہ ارشاد فرمایا اور آنکھوں سے موتیوں کے اشک جاری

ہوگئے پھر اٹھے اور وہاں سے واپس چل دیے۔ابوطالب نے دوبارہ بلا کر عرض کیا۔

اے بھتیجے آپ کا دل جو چاہے وہ کہیے،قسم خدا کی میں آپ کو ان کے حوالے ہرگز نہیں کرسکتا۔اور چند اشعار کہے جن میں سے ایک یہ ہے ۔

واللہ لن یصلوا الیك بجمعهم   حتی اوسد فی التراب دفینا

بخدا یہ سب مل کر آپ تک نہیں پہونچ سکتے یہاں تک کہ زیر زمین مجھے دفن کردیا جائے[السیرۃ الحلبیہ ۱/۲۸۷]

اس طرح کفار مکہ کی یہ بھی کوشش ناکام ہوگئی۔اب اس کے بعد کھلے طور پر ظلم وتشدد پر اتر آئے۔ابوجہل،ابولہب،عتبہ بن ابی معیط وغیرہ جو سب سے بڑے دشمن اسلام تھے،ان لوگوں نے پیغمبر اسلام اور آپ کے صحابہ پر ظلم ڈھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔عین حالت نماز میں جسم اطہر پر اونٹنی کی گندی اوجھ ڈال دی، کاشانۂ نبوت کے دروازے پر گندگیاں پھینکتے، راستے میں کانٹے ڈال دیتے، گلا گھونٹنے کی کوشش کی، طائف کے تبلیغی سفر میں قدم رسالت کو لہولہان کیا،جسم نبوت کو دھکے دیا،سر اقدس کو پتھر سے کچلنے کا ناپاک اقدام کیا۔

ایک روز نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان نماز پڑھ رہے تھے۔اس وقت قبلہ بیت المقدس تھا،ابوجہل ایک سازش کے تحت سر اقدس کو کچلنے کے لیے ہاتھ میں پتھر لے کر آیا صحن کعبہ میں کفار قریش کی مجلسیں جمی ہوئی تھیں، سب کو اس کا شدت سے انتظار تھا کہ ابوجہل اپنے ناپاک ارادہ کو عملی جامہ پہنائے۔حضور جب سجدہ ریز ہوئے۔ابوجہل ہاتھ میں پتھر لے کر اٹھا،حضور کے قریب جیسے ہی پہونچا فوراً لرزہ براندام،حواس باختہ ہوکر واپس لوٹ آیا۔کفار قریش نے کہا ابوالحکم! (ابوجہل) کیا ہوا؟ ابوجہل بولا میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جیسے ہی اس کے قریب گیا،میرے سامنے ایک نہایت خطرناک اونٹ ظاہر ہوا۔لگ رہا تھا مجھے کاٹ کھائے گا۔ایسا خطرناک اونٹ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا:

وہ جبریل امین تھے اگر وہ قریب آیا ہوتا تو اسے ہلاک کر ڈالتے (السیرۃ الحلبیہ ۱/۲۸۸)

شعب ابی طالب میں تین سال تک بنی ہاشم اور بنی مطلب کا اقتصادی بائیکاٹ کیا جس میں انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔الغرض ظلم کی انتہا کردی۔ جب تک حضور کے چچا ابو طالب اور حضور کی رفیق حیات ام المومنین خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا باحیات تھے،اس وقت تک کسی قدر تسلی ہوجاتی مگر ایک ہی سال ان دونوں کے انتقال کرنے کی وجہ سے رنج والم اور بڑھ گیا،اسی لیے حضور نے اس سال کا نام عام الحزن (رنج وغم کا سال) رکھا۔ابو طالب کی حیات میں کفار قریش کچھ ان کا پاس ولحاظ بھی رکھتے تھے مگر ان کے انتقال کے بعد اور زیادہ مطلق العنان ہوگئے اور ظلم وزیادتی کی انتہا کردی۔

طائف کا تبلیغی سفر:

مکہ مکرمہ میں مسلسل کئی سال تک دعوت وتبلیغ اور معجزات کے ظہور کے بعد بھی کفار مکہ کے دل جو پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے،نہیں پسیجے بلکہ اسلام اور داعی اسلام کے خلاف ہمیشہ کمربستہ رہے تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعوت حق کے لیے طائف کا رخ کیا کہ شاید وہاں کے لوگ دعوت اسلام قبول کریں اور دل کو کچھ راحت ملے۔ جب طائف پہونچے،سرداران ثقیف اور ان کے اشراف سے ملاقات کی اور یہ تین بھائی تھے۔ایک کا نام عبد یالیل تھا دوسرے کا نام عبد کلال تھا تیسرے کا نام حبیب تھا یہ لوگ عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کی اولاد تھے۔ان سے جب حضور نے گفتگو کی اور انھیں دعوت اسلام دی تو ان لوگوں نے نہایت دریدہ ذہنی کے ساتھ شان رسالت میں سخت گستاخی کی اور ناقابل بیان اہانت آمیز جملے نکالے اور دعوت اسلام ٹھکرا دی اور کہا: ہمارے شہر سے نکل جاؤ اور جہاں تمھیں نجات ملے وہاں چلے جاؤ۔[السیرۃ الحلبیہ ۱/۳۵۴]

اور اسی پر بس نہیں بلکہ اپنے احمقوں اور غلاموں کو حضور کے خلاف اکسادیا۔ وہ حضور کے پیچھے شور مچاتے پھرتے یہاں تک سارے اہل طائف جمع ہوگئے اور دو رویہ صفیں بنالیں۔حضور جب چلتے تو وہ لوگ قدمان مبارک پر پتھر مارتے یہاں تک کہ حضور کے مقدس پاؤں لہولہان ہوگئے۔اس پر بھی انھیں کچھ رحم نہ آیا بلکہ مزید پیغمبر اسلام پر پھبتیاں کستے،استہزا کے انداز میں ہنستے۔حضور کا جسم مبارک زخموں سے چور چور تھا۔قریب ہی ایک باغ تھا محبوب رب العالمین نے وہاں آکر دو رکعت نماز ادا فرمائی اور چشم گریاں سے اپنے رب کی بارگاہ میں یہ مناجات کی۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَشْکُوْ اِلَیْکَ ضَعُفَ قُوَّتِی وَ قَلَّتُ حِیْلَتِی وَھَوَانِی عَلٰی الناس یَا أرحمَ الراحمین انتُ رَبَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وانتَ رَبِّی اَلٰی مَنْ تَکِلُنِی اِنْ لَمْ یَکُنْ غَضَبٌ عَلَیَّ فَلَا اُبالِی۔[السیرۃ الحلبیہ ۱/۳۵۴]

ترجمہ! اے اللہ میں اپنی طاقت کی کمزوری اور اپنی قوت عمل کی کمی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا تیری بارگاہ میں شکوہ کرتا ہوں۔اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو میرا رب ہے۔تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے،اگر تو مجھ پر ناراض نہ ہو تو مجھے ان تکلیفوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔

اہل طائف کے طرز عمل سے حضور کے خاطر اقدس پر جو گزری ہوگی،اس کا اندازہ ہر شخص بآسانی لگا سکتا ہے۔بہرحال حضور نے ان سے رخصت ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اذا فعلتم ما فعلتم فاکتموا علی[السیرۃ الحلبیہ ۱/۳۵۴]

ترجمہ! میرے ساتھ تم لوگوں نے جو کچھ کیا اسے صیغہ راز میں رکھنا

کیوں کہ خدشہ یہ تھا کہ اگر اہل مکہ کو معلوم ہوگیا کہ طائف والوں نے کیا برتاؤ کیا ہے تو وہ خوشی کے جشن منائیں گے اور اسلام کے خلاف ان کا معاندانہ رویہ اور تیز ہوجائے گا۔

موسم حج میں تبلیغ اسلام:

جزیرۂ عرب میں اس وقت گنتی کے بس چند ہی شہر تھے جن میں مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، طائف۔ یہ سب بڑے مشہور شہر تھے۔ باقی آبادیاں صحراؤں میں بکھری ہوئی تھیں اور راستے پر امن نہ ہونے کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بڑا مشکل تھا اور ایسی صورت حال میں تجارتی کام کرنا بڑا دشوار تھا۔ اس وجہ سے مختلف قبائل کے سرداروں نے باہمی مشورے سے کچھ تجارتی بازار قائم کر لیے تھے۔ اس میں ہر تاجر اور صنعت کار کو آسانی رہتی۔ دور دراز شہروں سے لوگ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وہاں آتے، نامور شعرا بھی لمبے لمبے قصیدے لکھ کر لاتے۔ ان تجارتی مراکز میں عکاظ، مجنہ، اور ذوالمجاز بڑے مشہور تھے۔ یہ بازار موسم حج میں لگا کرتے تھے تاکہ لوگ ان بازاروں سے فائدہ بھی اٹھالیں اور حج بھی کر لیں علامہ احمد زینی دحلان رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

عرب جب حج کا ارادہ کرتے تو ماہ شوال میں عکاظ میں اقامت کرتے پھر مجنہ کے بازار میں آتے۔ وہاں بیس دن ان کا قیام رہتا پھر ذی المجاز کے بازار میں آتے وہاں ایام حج میں قیام پذیر رہتے۔(السیرۃ النبویہ ۱/۲۸۲)

تین سال کی خفیہ دعوت وتبلیغ کے بعد دس سال تک مسلسل نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم موسم حج کے موقع پر منیٰ اور عرفات میں حجاج کی قیام گاہوں پر تشریف لے جاتے۔ بازاروں میں آئے ہوئے قبائل عرب سے ملاقات کر کے انھیں دعوت حق دیتے۔ روایت میں ہے کہ حضور منی میں قبائل عرب کی منزلوں پر تشریف لے جاتے اور ان سے ارشاد فرماتے:

یا ایھا الناس ان اللہ یأمرکم أن تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئا

اے لوگوں فرمان خداوندی ہے کہ اسی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

دوسری روایت میں ہے: ربیعہ بن عباد کہتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ قبائل عرب کے پاس تشریف لے جاتے اور انھیں ان الفاظ میں دعوت اسلام دیتے۔

یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

اے لوگو لا الہ الا اللہ کہو فلاح پاؤ گے۔

حضور کے پیچھے ایک شخص تھا جو حضور پر مٹی پھینکتا تھا اور اس قدر پتھر مار رہا تھا کہ قدمان مبارک لہولہان کر دیا اور وہ یہ کہہ رہا تھا: اے لوگو اس کی بات مت سنو یہ جھوٹا صابی ہے۔ جو نیا دین لایا ہے میں نے معلوم کیا کہ یہ بدبخت شقی القلب کون ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ بدبخت ابولہب ہے۔[البدایۃ والنہایۃ ۲/۵۱۲]

موسم حج میں مدینہ طیبہ سے بہت سے قبیلے حج بیت اللہ کے ارادے سے منی میں فروکش تھے۔ اسی دوران جمرہ عقبہ کے پاس مدینہ طیبہ سے آئے ہوئے قبیلہ خزرج کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی جو باختلاف روایت چھ یا آٹھ افراد پر مشتمل تھی جس کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ابوامامہ اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث بن رفاعہ معروف بابن عفراء، رافع بن مالک بن عجلان، قطبہ بن عامر بن حدیدہ، عقبہ بن عامر، برحا بن عبداللہ رئاب، عبادہ بن صامت، ابوالہیثم بن التیہان۔

ان حضرات نے علمائے یہود سے سن رکھا تھا کہ نبی آخرالزماں کی بعثت کا وقت ہو چکا ہے، ان کے یہ اوصاف ہوں گے۔ چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو کی، انھیں دعوت حق دی، ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن حکیم کی تلاوت کی تو ان لوگوں نے علمائے یہود سے سنی ہوئی نشانیاں پا کر اسی وقت اسلام قبول کر لیا اور حضور کی بات ان کے دلوں پر ایسی اثر کر گئی کہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے:

بادروا الاتباعہ لاتسبقنا الیھود الیہ [السیرۃ النبویۃ للدحلان ۱/۲۸۸]

ان کی پیروی کی طرف سبقت کرو۔ کہیں یہود ہم پر سبقت نہ لے جائیں۔

پھران لوگوں نے رخصت ہوتے وقت حضور سے عرض کیا یارسول اللہ! ہم قبیلہ خزرج کے ہیں اوراوس وخزرج کے درمیان ایک عرصہ دراز سے خون ریز جنگیں چلی آرہی ہیں، آپس میں بڑا اختلاف وانتشار ہے۔ہم وہاں چل کرانھیں وہی پیغام دیتے ہیں جو آپ نے ہمیں دیا۔امید ہے کہ آپ کی برکت سے ہمارا اختلاف ختم ہوجائے گا اورسب لوگ متحد ہوکرآپ کا پیغام تسلیم کریں گے، آپ کی پیروی کریں گے۔اگرایسا ہوگیا تو پھر ہمارے نزدیک آپ سے زیادہ باعزت کوئی نہ ہوگا۔ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال دوبارہ حاضر بارگاہ ہوں گے۔

یہ عرض کرکے وہ لوگ مدینہ طیبہ واپس ہوگئے اورحضور بھی ان کی اس بات پرراضی تھے۔جب وہ لوگ مدینہ طیبہ پہونچے، اپنی قوم کو پیغامِ حق اورسیدالانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد آمد کی خوش خبری سنائی تو مدینہ طیبہ میں ہرطرف حضور کا ذکر پھیل گیا۔انصار کے گھر گھر میں اللہ کے رسول کا تذکرہ ہونے لگا اورسال آئندہ وہاں سے بارہ مرد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے جن میں پانچ تو وہی ہیں جو پہلے اسلام لاچکے تھے اوران کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ ہیں اسعد بن زرارہ، عوف بن عفراء، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر بن حدیدہ، عقبہ بن عامر، اوران کے علاوہ سات یہ ہیں معاذ بن حارث بن رفاعہ، یہ عوف بن عفراء کے بھائی ہیں، ذکوان بن عبدقیس زرقی خزرجی، عبادہ بن صامت، ابوعبیدہ الرحمٰن یزید بن ثعلبہ، ابوالہیثم بن التیہان، عویم بن ساعد، عباس بن نضلہ بن مالک بن العجلان۔یہ سبھی لوگ دولت اسلام سے شرف یاب ہوئے۔

پہلے یہ بیان ہوچکا ہے کہ ایک روایت کے مطابق سال اول میں مدینہ طیبہ کے صرف چھ ہی لوگ اسلام لائے تھے اور باقی سال دوم میں اسلام سے مشرف ہوئے۔اس کے لحاظ سے عبادہ بن صامت اور ابوالہیثم بن التیہان سال اول میں شریک نہ تھے، بلکہ سال دوم میں مشرف باسلام ہوئے ہیں۔

بہرحال یہ قافلہ جب مدینہ طیبہ پہونچا تو وہاں پرایک انقلاب برپا ہوگیا۔گھر گھر میں اسلام کا اجالا تیزی سے پھیلنے لگا، یہاں تک کہ اہل مدینہ نے اپنے

دونمائندے معاذ بن عفراء اور رافع بن مالک کو بارگاہ رسالت کی جانب اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ یارسول اللہ کسی صحابی کو دین اسلام کی تعلیم کے لیے ہمارے پاس بھیجیں، وہ ہمیں ہمارا دین سکھائیں اورلوگوں کو اللہ کی کتاب کی دعوت وتبلیغ کریں۔اس درخواست پر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ روانہ فرمایا۔

حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ پہونچے اوراسلام کی دعوت وتبلیغ شروع کی اسلام کے احکام سے لوگوں کو آگاہ کیا، چنانچہ اس کے اچھے اثرات مرتب ہونے لگے۔قبیلہ اوس اورقبیلہ خزرج جن کے درمیان ایک مدت دراز سے خون ریز جنگ چلی آرہی تھی، سب باتفاق رائے آپ کی اقتدا میں نماز پڑھتے۔اسلام کا پہلا جمعہ مدینہ طیبہ میں قائم ہوا جس میں اوس وخزرج دونوں قبیلے کے لوگ شریک ہوئے۔
اس طرح مدینہ طیبہ کے بہت سارے لوگ بارگاہ نبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور مدینہ کے ہر چہار جانب اسلام کا اجالا پھیلا۔
[السیرۃ النبویۃ۔احمد زینی دحلان ۱/۲۹۰]

مشرکین مکہ نے جب دیکھا کہ اسلام کی روشنی ہرطرف پھیلتی جارہی ہے۔صحرائے عرب اورمختلف دیار وامصار سے لوگ جوق درجوق آکرنوراسلام سے اپنے دل کوروشن ومنور کررہے ہیں اور ہرطرف محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بول بالا ہورہا ہے تو ظلم وستم کی آگ اور تیز کردی۔فرزندانِ توحید کا مکہ مکرمہ میں رہنا دوبھر کردیا، ظلم کی انتہا کردی جس کے نتیجے میں صحابہ کرام نے حضور کے حکم سے مکہ مکرمہ چھوڑ کرحبشہ کی جانب ہجرت کرلی۔اورنجاشی کے دربار میں پناہ لی۔کفار مکہ وہاں بھی ان کے خلاف برسرپیکار رہے، نجاشی کو بدظن کرنے کے لیے اپنے دونمائندے بھیجے مگر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایمان افروز تقریر سے نجاشی کے دل پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ ان نمائندوں کو ناکام ونامراد واپس آنا پڑا اورنجاشی نے بعد میں خود بھی اسلام قبول کرلیا۔

وہاں سے ان کی ناکامی کے بعد کفار مکہ نے دار الندوہ میں اکٹھا ہوکر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا اور اس ناپاک ارادے سے کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کرلیا، مگر حضور نے اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لٹا دیا تھا۔ وہ نہایت سکون سے اس پر آرام فرماتھے۔ حضور لوگوں کی امانتیں بھی ان کے حوالے کرکے وہاں سے رخصت ہوگئے اور اپنے یار غار سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ ہجرت مدینہ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اس پر بھی کفار مکہ کے دلوں میں اسلام اور داعی اسلام کے خلاف جو نفرت وعداوت کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، وہ سرد نہ ہوئی بلکہ حضور کے خلاف برسر پیکار ہوکر اپنے گھوڑ سواروں کو مدینہ طیبہ کے راستوں پر دوڑایا یہاں تک کہ وہ گھوڑ سوار جبل ثور پر بھی چڑھ آئے اور غار کے دہانے تک پہونچ گئے جس میں مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے یارِ غار سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تشریف فرماتھے۔ مگر اللہ رب العزت کو اپنے محبوب کی حفاظت منظور تھی، اس لیے مکڑیوں نے وہاں غار کے منہ پر جالا تان دیا اور وحشی کبوتری نے انڈا بھی دے دیا، جسے دیکھ کر وہ لوگ واپس ہوگئے۔

اس پر بھی آتش عداوت نہیں بجھی۔ پھر حضرت سراقہ بن مالک (جو ابھی مشرف باسلام نہ ہوئے تھے) کو دوڑایا اور وہ حضور کے قریب پہونچ بھی گئے، مگر ان کے گھوڑے کے پاؤں جب زمین میں دھنسنا شروع ہوئے تو لرزہ براندام ہوکر واپس ہوگئے۔

اس طرح کفار مکہ نے نور الٰہی کو بجھانے کے لیے اپنی قوت بھر ظلم وستم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیا۔ ہر لمحہ اسلام اور داعی اسلام کے خلاف برسر پیکار رہے، پھر بھی حضور دعوت وتبلیغ فرماتے رہے۔ ناصحانہ انداز میں انھیں وعظ وتذکیر کرتے رہے۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مکی داعیانہ زندگی کا ایک مختصر سا گوشہ ہے جو نذر قارئین کیا گیا۔ اس وقت ابھی حکم جہاد نازل نہیں ہوا ہے، کافروں سے کوئی محاذ آرائی نہیں ہوئی ہے، تاہم دعوت وتبلیغ اور اور اخلاق پیغمبرانہ سے متاثر ہوکر ہر چہار جانب سے عظیم شخصیات نے آکر اسلام کو اپنے گلے سے لگایا اور اپنے

قبیلوں میں جا جا کر خود دعوت حق کا فریضہ انجام دیا اور ان فرزندانِ توحید کے اخلاص وایثار سے پورے صحرائے عرب میں اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ مختلف دیار وامصار سے وفود بارگاہ نبوی میں حاضر ہوکر بیعت اسلام کرتے اور شمع نبوت کے ارد گرد دیوانہ وار نچھاور ہوتے۔ کیا اس کے بعد کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مذہب اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا ہے بلکہ اپنی جامعیت وکمال اور بے شمار خوبیوں کی وجہ سے اس نے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بسایا ہے۔ قرآن حکیم کے اعجاز اور اخلاق پیغمبرانہ اور حضور سے صادر ہونے والے معجزات کو دیکھ کر ظلمت وجہالت میں ڈوبے ہوئے انسانوں کے دل کی دنیا بدل لی، حضرت ابوذر غفاری اور ان کی طرح بہت سے صحابہ ہیں ان کے خلاف کون سی جنگ لڑی گئی؟ کون سے تیروسنان چلے؟ کون سی تلوار فضا میں لہرائی گئی؟ اس کی کوئی مثال تاریخ پیش نہیں کرسکتی، مگر جب حق ان کے سامنے واضح ہوگیا، حق وباطل کے درمیان فرق وامتیاز آشکارہ ہوگیا تو بسر وچشم ان حضرات نے اسلام قبول کیا اور اس کی ایسی لذت وچاشنی ملی کہ دنیاوی جاہ وحشم کو پس پشت ڈال دیا اور حق کی راہ میں ہر مشکل اٹھانے کے لیے ہمیشہ اپنے کو آمادہ رکھا اور کبھی بھی زبان پر حرف شکایت نہ لائے بلکہ اللہ ورسول کی رضا جوئی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا اور محض الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ان کا نصب العین رہا۔ دعا ہے کہ مولی تبارک وتعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے عقلی دلائل

رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آسان اور واضح سے واضح بات بھاری بھر کم الفاظ کے نیچے کچھ اس طرح دَب جاتی ہے کہ مدتوں ہم اس کی ہیبت سے مرعوب رہتے ہیں اور خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ کوئی بہت باریک اور پیچیدہ بات ہے، کچھ ایسا ہی حال ہمارے ذہن کا اس مسئلے میں بھی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عقل سلیم کے لیے رسالت محمدی کا ثبوت دنیا کی سب سے واضح اور مانوس حقیقت ہے۔ زحمت نہ ہو تو چودہ سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کے اُس تاریک دور میں قدم رکھیے جبکہ خدائے واحد کا ایک بھی پرستار روئے زمین پر نہیں تھا۔ پھر انسانوں پر اَبدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، رحمتوں کا سویرا ہوا۔ روح کی بہاروں کا موسم آیا۔ گل قدس کی خوشبو اڑی اور بہزاراں جاہ جلال فاران سے خورشید رسالت کی پہلی کرن چمکی۔ صدیوں کے بعد پھر حرم کی سر زمین سجدوں سے آباد ہوگئی۔ کہاں تو روئے زمین پر ایک بھی خدا کا ماننے والا نہیں تھا اور اب صرف عرفات کے میدان میں ایک لاکھ فرزندانِ توحید اپنی پیشانیوں میں سجدۂ بندگی کا اضطراب لیے کھڑے تھے اور خدا کا آخری رسول اُن پر رحمتوں کے پھول برسا رہا تھا۔

رسالتِ محمدی کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے والے صرف اتنی بات تاریخ سے دریافت کرنے کی زحمت فرمائیں کہ ماننے والوں نے پہلے خدا کو مانا یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو؟ تاریخ واضح طور پر شہادت دے گی کہ پہلے سید عربی صلی اللہ علیہ

وسلم کے آگے لوگوں کے دل جھکے، اس کے بعد اُن کے سروں کو خدا کا سجدہ نصیب ہوا۔ ماننے والوں نے پہلے رسالتِ محمدی کا اقرار کیا، اس کے بعد توحیدِ الٰہی کی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

اَب یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ پہلے پہل جن لوگوں نے رسالت کا اقرار کیا، حق کی شناخت کے لیے اُن کے پاس سوائے عقل سلیم کے اور کوئی مشعل نہیں تھی۔ اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ عقل کی ساری رہنمائی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے تک تھی۔ رسول مان لینے کے بعد عقل کو درمیان سے ہٹ جانا پڑا۔ اب ماننے والوں کے سامنے صرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔ وہ جب بھی حرکت میں آئی یقین کا سر جھک گیا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسان کو رسالت محمدی کی شناخت سب سے پہلے عقل ہی کے ذریعے ہوئی، عقل ہی کے مشورے پر دل جھکے، اس کے بعد اعترافِ حق کے لیے زبان کھلی۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ عقل کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس پر وہ رسالت و نبوت کا دعویٰ پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے بعد دل کی ساری کائنات کو قدموں میں ڈال دیتی ہے، تو اس کی تشریح مفصل طور پر ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

عقلِ سلیم کا کہنا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح شناخت تین باتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان تین باتوں کے ثابت ہو جانے کے بعد کسی دور کی عقل بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم ماننے سے ہرگز انکار نہیں کرسکتی۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت کا پہلا عقلی ذریعہ:

یہ ہے کہ عام انسانی زندگیوں کے درمیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ماحول کی تاثیرات سے اس درجہ بالاتر اور معصوم وممتاز ہوتی ہے کہ اسے دیکھتے ہی دنیا کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی معمولی انسان کی زندگی نہیں ہے، اس کے پیچھے ضرور کوئی آسمانی طاقت ہے جو پسِ پردۂ کارساز ہے۔ اس رُخ سے جب ہم محمد عربی صلی

الله علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں، تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، ہوش اُڑنے لگتا ہے اور عالمِ حیرت میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

تاریخ کی گہرائی میں اُترنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہونے والا رسول صلی الله علیہ وسلم ایک ایسے خاندان میں جنم لیتا ہے جہاں ہر طرف بتوں کی فرماں روائی ہے۔ پجاریوں کی سیادت وافسری کا منصب ہی گھر کا پیشہ ہے۔ آنکھیں کھولتا ہے تو سارا ماحول اخلاقی رذائل، روحانی کثافت اور شر وفساد کی غلاظتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہیں بھی قدم رکھنے کی کوئی صاف جگہ نظر نہیں آتی۔ بچپن ہی میں سر سے والدین کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ گرد وپیش شائستہ تربیت کا کوئی چشمہ صافی نہیں ہے جہاں وہ اپنا حلق بھی تر کرسکے۔ کسی درس گاہ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ اکتسابی علم کے ذریعے خیر وشر کے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو۔ ایسے پر آشوب، بلاخیز اور تاریک ماحول میں وہ ایامِ طفلی کا معصوم دور گزارتا ہے۔ شعور کی منزل سے آشنا ہوتا ہے۔ شباب کی خارزار وادی میں قدم رکھتا ہے۔

یہاں تک کہ چالیس سال کی طویل مدت وہ صحراؤں، غاروں اور ویرانوں کی بے خطر تنہائیوں میں نہیں، گمراہوں غارت گروں، ستم شعاروں، مئے نوشوں، بدکاروں، فتنہ پروروں اور جرائم پیشوں کی بھیڑ میں بسر کرتا ہے لیکن عقل اور تاریخ دونوں محوِ حیرت ہیں کہ پانی میں رکنے بعد...... بھی نہ اُس کا جسم بھیگتا ہے، نہ جیب و دامن میں کہیں نمی نظر آتی ہے۔ نشست و برخاست، رفتار وگفتار، سیرت واطوار، اخلاق وعادات، افکار وخیالات اور عبادات ومعاملات میں چالیس سال کی طویل صحبتوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لاکھوں زندگیوں کے بیچ میں وہ تنہا ایک نرالی، منفرد بےمثل اور عام سطح سے بالاتر زندگی گزار کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی اخلاقی برتری، کردار کی راستی اور معنوی تقدس کے آگے ماحول کی گردنیں جھکنے لگتی ہیں اور بالآخر ایک دن وہ سارے قبائل کی نگاہوں کا مرکز عقیدت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اچانک ایک پیغمبر کی

حیثیت سے وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ مجھے سجدہ کرو، میری عظمتوں کے آگے جھک جاؤ، وہ بار بار صرف یہ کہتا ہے کہ پتھر کے تراشے ہوئے بت تمہارے خدا نہیں ہیں۔ خدا وہ ہے جو ان پتھروں، درختوں اور دریاؤں کا خالق ہے، پرستش کا وہی مستحق ہے۔ پیشانی کے سجدے اُسی کو زیب دیتے ہیں۔ اپنی انسانیت کا سب سے اونچا اعزاز رذائل کے قدموں میں رائیگاں مت کرو۔ بس اتنی سی بات پر ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔ سارا ماحول سلگنے لگتا ہے، جان کے لالے پڑتے ہیں۔ اب گھر سے نکلنا مشکل ہے، رات کی تنہائی کے سوا کوئی انیس زندگی نظر نہیں آتا۔ رفتہ رفتہ حالات کی برہمی نقطۂ انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ تلواریں اُٹھتی ہیں وار خالی جاتا ہے، قتل کی سازش ہوتی ہے تار بکھر جاتے ہیں، قید کرتے ہیں زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہزار مخالفت اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود سیل نور کی طرح حقیقت کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ چڑھتے ہوئے سورج کا فروغ دیکھ کر جب مرعوب ہوجاتے ہیں تو کفر کے نمائندے خوشامد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تم اپنی ذات سے سارے قبیلوں میں ہر دلعزیز ہو، ہمارے معبودوں کے خلاف آواز اُٹھا کر اپنی ہر دلعزیزی کو صدمہ مت پہنچاؤ۔ تم اگر حکومت کا اقتدار چاہتے ہو تو سارا عرب تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ تمہیں اگر دولت کی خواہش ہے تو سارے قبائل کا سونا ہم تمہارے قدموں میں ڈھیر کردیں گے اور اگر تم اجازت دو تو عرب کی سب سے حسین اور زہرہ جمال دوشیزہ تمہارے حرم سرا کی زینت بنادی جائے۔ محمد ﷺ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوسکتا ہے لیکن شرط یہ کہ تم اپنے دعویٰ پیمبری سے دستبردار اور نئے دین کی تبلیغ بند کردو۔

پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ناقابل شکست عزم ویقین کے تیور میں جواب دیتے ہیں:

پیغمبر اپنے منصب کی دیانت کو کسی قیمت پر نہیں بیچتا۔ مجھے جادۂ حق سے

ہٹانے کے لیے جو معاوضہ تم نے پیش کیا ہے اُس کی تو وقعت ہی کیا ہے، تم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دو جب بھی میں دینِ حق کی تبلیغ اور اپنے منصب کے فرائض سے قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ خدا میرے ساتھ ہے، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری آواز پر فتح پانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

چونکہ اس وقت میرا موضوعِ سخن تاریخِ اسلام بیان کرنا نہیں ہے، اس لیے آگے کے واقعات کسی دوسرے لمحہ فرصت پر چھوڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس پوری داستان میں دراصل یہ نکتہ سب سے زیادہ قابلِ غور ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو شکست دینے کے لیے اہلِ مکہ نے ایک سے ایک حربہ استعمال کیا، بائیکاٹ کی مہم چلائی، وطن سے بے وطن کیا، ایذائیں دیں، پتھر برسائے، جنگ کی، خون بہائے، خود بھی قتل ہوئے، دوسروں کو بھی شہید کیا، یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن کسی مائی کے لال کی یہ جرأت نہ ہوسکی کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھری مجلس میں کہہ دیتا:

محمد! تمہاری پیغمبری کا یہ ڈھونگ ملک شام، فارس اور اُن دور دراز علاقوں میں تو چل سکتا ہے جہاں لوگ تمہاری اخلاقی کمزوریوں، بشری فروگزاشتوں اور کردار کی خامیوں سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ مکہ ہے! یہاں تمہاری زندگی کا ایک ایک خدوخال نظر میں ہے۔ ہم تمہاری اُن تمام کمزوریوں سے پوری طرح باخبر ہیں جن کا پیوند ایک پیغمبر کی زندگی کے ساتھ کسی طرح نہیں جوڑا جاسکتا۔ ہم نہ بھی تمہیں جھٹلائیں جب بھی تمہاری زندگی کے سیاہ دھبے بجائے خود تمہاری تکذیب کے لیے کافی ہیں۔

اور سن لیا جائے کہ اعترافِ صداقت کی یہ آخری منزل نہیں ہے، اس کے آگے ایک اور منزل بھی ہے جہاں جلالتِ حق کی ہیبت سے عقل کو پسینہ آنے لگتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دشمنی میں انسان صحیح اور غلط الزام کا فرق اٹھا دیتا ہے مانا کہ میرے سرکار کی زندگی ایک روشن آئینے کی طرح بالکل بے داغ و بے غبار تھی اور یہ بھی تسلیم کہ بشری کمزوریوں کا کوئی واقعہ دشمنوں کے علم میں نہیں تھا لیکن اپنے حریف کو شکست دینے اور رسوا کرنے کے لیے کیا واقعہ تراشا نہیں جاتا؟ کیا من گھڑت الزامات نہیں بیان کیے

جاتے؟ اور خاص کر ایسی حالت میں جبکہ پیغمبر کو مجروح کرنے کے لیے الزام تراشنا تلوار اُٹھانے سے زیادہ آسان تھا۔ عرب کے سخنوروں کا سارا گروہ ہم زبان ہی تھا۔ آن کی آن میں پیغمبر کے خلاف فرضی داستانوں کا دفتر تصنیف ہوسکتا تھا۔ لیکن عظمت خداداد کو عقیدوں کا خراجِ عقیدت پیش کرو کہ سیدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طیب و طاہر زندگی کا آفتاب اُس نقطۂ عروج پر تھا کہ سیاہی کا پیوند جوڑنے کے لیے کہیں سے بھی کوئی گہنائی ہوئی کرن اُنھیں نہیں مل سکی۔ ویسے اُڑانے کے لیے خاک اُڑا سکتے تھے لیکن دشمن اُس کے لیے کبھی تیار نہیں تھے کہ اپنی ہی آنکھیں غبار سے بھر جائیں۔

سرکار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے جو سپردِ قلم ہوا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے جس رُخ سے دیکھو، میرے سرکار کی زندگی اتنی جامع اور مکمل نظر آئے گی کہ ہر دور کے انسانوں کے لیے وہ بہترین نمونۂ عمل بن سکتی ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ زندگی کی نجات کے لیے اُس کے سوا کوئی اور نمونہ ہی نہیں ہے۔

چودہ سو برس کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی انسانی زندگی کے لیے اس سے بہتر سانچہ نہ آج تک تیار ہوسکا ہے، نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ اور حیرت انگیز تماشا یہ ہے کہ زمانہ کے انقلابات نے ہزاروں کروٹیں بدلیں، طبیعتوں اور مزاجوں کے پیمانے بنتے اور بگڑتے رہے۔ خطۂ ارضی مختلف رنگ و روپ، مختلف تہذیب و تمدن اور مختلف اندازِ معاشرت میں تقسیم ہوتا رہا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہا زندگی سب کو راس آئی۔ سب کی ضرورتوں کی کفیل ہوئی، سب کے لیے سازگار رہی اور اپنی رہنمائی میں سب کو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا آئی۔ ایک گدا سے لے کر بادشاہ تک، سپاہی سے لے کر سالار تک، عورت سے لے کر مرد تک، بچے سے لے کر بوڑھے تک، غلام سے لے کر آقا تک، عربی سے لے کر عجمی تک، دہقانی سے لے کر شہری تک اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب ہی اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ زندگی کا یہ پیمانہ میرے ہی لیے تراشا گیا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ نقشہ سامنے رکھ کر اب میں عقلِ سلیم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی محیر العقول اور جامع وکامل زندگی کیا خدا کے رسول کے سوا کسی اور عام بشر کی ہو سکتی ہے؟ کیا عالمی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کی ایسی زندگی پیش کی جاسکتی ہے؟ ؏

میں جانتا ہوں کیا وہ کہے گی جواب میں

رسول کی شناخت کا دوسرا عقلی ذریعہ:

رسول کی شناخت کا دوسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اُس کے تعلقات کی سطح عام انسانوں سے بہت اونچی ہوتی ہے۔ وہ کائنات میں خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عام بندوں کی طرح بے اختیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کارخانۂ قدرت میں تصرفات کی قدرت بھی اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے۔

تصرفات کی قدرت سے مسلح ہو کر آنا رسول کے لیے دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اُصولِ فطرت کے مطابق کوئی انسان اپنے برابر اور ہمسر کی اطاعت نہیں کرتا۔ اطاعت اُسی کی کرتا ہے جس میں برتری اور بڑائی کی کوئی وجہ ہوتی ہے یا جسے وہ اپنا بڑا سمجھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رسول کو ایسے کمالات اور قدرت واختیار سے مسلح کر کے بھیجا جائے کہ کوئی انسان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے اور اس کے آگے جھک کر اس کی اطلاعت کرنے میں اُسے کوئی عار محسوس نہ ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا شناسی کی راہ میں سب سے بڑا حجاب مادی طاقتوں سے مرعوبیت کا ہے۔ کیونکہ دنیا میں پہلے پہل انسان کی نظر انہیں طاقتوں سے روشناس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آنکھیں کھولتے ہی انسان نے سورج کو دیکھا، چاند کو دیکھا، دریاؤں کی قیامت خیز لہروں کو دیکھا، پہاڑوں کی ہیبت ناک چوٹیوں کو دیکھا پتھروں کی سخت چٹانوں کو دیکھا، قدآور اور گھنے درختوں کو دیکھا، آگ کے ہولناک شعلوں کو دیکھا، بادشاہوں کے جلال وجبروت کو دیکھا اور ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ احساسِ کمتری میں اُنہیں طاقتوں کو کائنات کی اصل سمجھ بیٹھا اور بالآخر اُنہی کے آگے

اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ حالانکہ یہ تمام طاقتیں جس طاقت کا کرشمہ تھیں، وہ حجابات کے پیچھے تھی لیکن چونکہ وہ پیکرِ محسوس میں نہیں تھی، اس لیے انسان کی نظر اُسے نہیں دیکھ سکی۔

ان حالات میں خدا کا رسول آتا ہے۔ آمد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ان مادی طاقتوں کی پرستش سے روک دے اور اُس کا سر اُس طاقت کے آگے جھکائے جو پس پردہ ان تمام طاقتوں کی خالق اور پروردگار ہے۔

عقل کہتی ہے کہ جب تک ذہن کی غیر واقعی ہیبت اور دلوں کی غلط گرویدگی کا طلسم نہیں ٹوٹ جاتا، پیشانیوں کا کسی مانوس آستانۂ عقیدت سے ہٹانا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک رسول اپنے ساتھ ایسی کائنات گیر قدرت لے کر آئے جس کے ذریعہ وہ ان مصنوعی خداؤں کی طاقت کا بھانڈا پھوڑ دے جب چاہے، ان کا طبعی نظام بدل دے، ان کی قوت تاثیر سلب کرے اور اُنہیں مرضی کا غلام بنا کر رکھے۔ پرستار بھی اپنے خداؤں کی بیچارگی بے بسی وبے طاقتوں اور گھٹنا ٹیک فرماں برداری کا تماشا دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ جب رسول کی قدرت وطاقت کا یہ حال ہے تو اس کے بھیجنے والے کی کیا شان ہوگی؟ اس لیے دراصل پرستش کے قابل وہی طاقت ہے۔ جس کی نمائندگی رسول کر رہا ہے۔ مغلوب طاقت پوجنے کے قابلِ نہیں ہو سکتی۔ اتنی تمہید کے بعد یہ حقیقت ہم ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ اس رخ سے بھی جب سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو اُن کی پیمبرانہ طاقت وقدرت کے نہایت حیرت انگیز اور دلربا مناظر سامنے آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اشارے پر ساری کائنات گردش کر رہی ہے۔ نگاہ اُٹھ جاتی ہے تو مادی طاقتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ کرۂ زمین پر کھڑے ہو کر انگلی کا اشارہ کرتے ہیں تو آسمان کا سیارہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ لبوں کو جنبش دیتے ہیں تو ڈوبا ہوا سورج منزل سے پلٹ آتا ہے، راہوں سے گزرتے ہیں تو پتھر کی بے جان دنیا درود وسلام کا خراج عقیدت پیش کرتی ہے، درختوں کو آواز دیتے ہیں تو وہ ایک اطاعت شعار خادم کی طرح دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں، اشارہ کر دیتے ہیں تو

واپس ہوجاتے ہیں، چٹانوں پہ قدم رکھ دیتے ہیں تو کفِ پا کا نقش اُتر آتا ہے۔ پہاڑوں پر تشریف لے جاتے ہیں تو کہسار کا دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے۔ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ حملہ آور کے لیے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ کھارے کنوئیں میں لعابِ دہن ڈال دیتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے وہ چشمۂ شیریں بن جاتا ہے۔ سنگریزوں کو ہاتھ لگا دیتے ہیں، تو جان پڑ جاتی ہے، اشارہ فرما دیتے ہیں تو کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ کبھی برہم ہوکر مشتِ غبار اڑا دیتے ہیں، تو ہر طرف طوفان اُمنڈنے لگتا ہے اور جب کبھی مائل بہ کرم ہوتے ہیں، تو ایک قطرۂ آب چشمۂ سیال بن جاتا ہے۔ مسکراتے ہیں تو نور کی کرن پھوٹتی ہے، چلتے ہیں، تو راستوں میں عطر بستا ہے۔ کسی کو چھودیتے ہیں تو مہکنے لگتا ہے، ہاتھ رکھ دیتے ہیں تو شفا ہوجاتی ہے۔ نظر پڑ جاتی ہے تو دلوں کے آئینے چمک اٹھتے ہیں، زبان حرکت میں آتی ہے تو غیب کے اسرار کھلتے ہیں، رُخ پھیر لیتے ہیں، تو پیٹھ پیچھے کی خبر رکھتے ہیں، جو چاہتے ہیں ہوجاتا ہے، جو سوچتے ہیں ڈھل جاتا ہے، جو کہہ دیتے ہیں مہر لگ جاتی ہے، جو کہہ دیتے ہیں دستور بن جاتا ہے، ادا ادا سے، بات بات سے ایک کائنات گیر اقتدار، ایک آسمانی بادشاہت ایک بااختیار نمائندگی اور ایک محبوب ودلآویز شخصیت کا جلال و جمال رہتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کی یہ ناتمام فہرست جو ہم نے پیش کی ہے، ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ جاسکتا ہے کہ یہ روایات ہیں اور روایات کا واقعہ کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ عقل انسانی کے پاس اگر کوئی کسوٹی ہے جس پر وہ روایت کو پرکھتی ہے اور پورا اترنے کے بعد صحت کا حکم لگاتی ہے تو ہم یہ مرحلہ طے کرنے کے لیے بھی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ تیار ہیں۔ عقل پرکھے اور حکم لگائے۔

ہمیں فخر ہے کہ جن وسائل وذرائع سے ہم تک یہ روایات پہنچی ہیں ان سے زیادہ قابلِ اعتماد اور ثقہ ذرائع آج تک دنیا کی کسی روایت یا کسی واقعہ کو میسر نہیں ہیں لیکن یہ دعویٰ بہرحال اپنی جگہ پر ناقابلِ تردید ہے کہ ان واقعات سے اور روایات کو صحیح مان لینے کے بعد عقل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی کہ اس نشان کا آدمی سوائے رسول کے کوئی عام انسان ہرگز نہیں ہوسکتا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ:

رسول ﷺ کی شناخت کا تیسرا عقلی ذریعہ یہ ہے کہ اُس کے ساتھ خدا کی کوئی ''آسمانی کتاب'' ہوتی ہے۔ رسول ﷺ کے ساتھ آسمانی کتاب کا ہونا دو وجہوں سے ضروری ہے۔

پہلی وجہ ہے کہ رسول خدا کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اُس کے پاس ایک ہدایت نامے کا ہونا ضروری ہے جس کے مطابق وہ بندوں کی رہنمائی کرے، اُنہیں راہ راست پر چلائے اور خدا کے احکامات اور اُس کی مرضی سے انہیں روشناس کرائے۔

عقل کہتی ہے کہ آسمان سے نازل شدہ کسی بھی الہامی کتاب میں درج ذیل امور کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے لیکن آنے والے مباحث کی روشنی میں ذرا بھی ذہن پر زور دیا جائے تو کیوں کا جواب خود بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ان امور کی نشاندہی جن کا کسی بھی الہامی کتاب میں ہونا ضروری ہے:

۱- عبادات اور جملہ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق احکام وقوانین اور مفید ہدایات جن کا تعلق عمل اور جوارح سے ہے۔

۲- عقائد، اصول اور ایمانیات جن کا تعلق قلبی تصدیق سے ہے۔

۳- خدا کی ذات وصفات سے متعلق واضح بیانات۔

۴- عالم آخرت اور جزا وسزا کی تفصیلات۔
۵- گزشتہ نبیوں، رسولوں، اُن کی کتابوں اور قوموں کے تذکرے۔
۶- جس رسول پر کتاب نازل ہوئی، اُس کے متعلق ہدایات۔
۷- خود اُس نازل شدہ آسمانی کتاب کے متعلق تذکرہ۔
۸- جس دور میں وہ کتاب نازل ہوئی اُس دور اور اُس دور کے لوگوں کے متعلق تذکرہ۔
۹- آئندہ کے واقعات اور اسرار غیب کی اطلاع۔
۱۰- کائنات کی تخلیق، آفرینش کی حکمت و مصلحت، آغاز وانجام اور درمیانی مراحل کا بیان۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اس ظاہری دنیا میں موجود نہ رہے جب بھی بندوں کو ایک مستند ذریعہ سے اپنے متعلق خدا کی مرضی اور اس کی ہدایات واحکامات کا علم ہوتا رہے۔ اور خدا شناسی کے لیے بیک واسطہ اس کی ایک زندہ نشانی، کائنات کے ہر دور میں انسانوں کے درمیان موجود رہے۔

اتنی تمہید کے بعد مدعائے نگارش یہ ہے کہ اس رُخ سے جب بھی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے ہمراہ قرآن نامی ایک الہامی کتاب نظر آتی ہے۔ ایک جامع اور مکمل کتاب کے لیے عقل جن امور کی نشان دہی کرتی ہے، وہ سارے امور قرآن میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اُن امور میں سے بعض امور تو وہ ہیں جو ہدایت وقانون کی کسی بھی کتاب کے لازمی اجزا کی حیثیت سے ضروری ہیں اور جن کے بغیر اس موضوع کی کوئی کتاب بھی جامع اور مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ اور بعض امور وہ ہیں جو سوائے خدا کی کتاب کے کسی بھی انسانی کتاب میں نہیں مل سکتے اور جہاں کسی طرح بھی انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے، مثال کے طور پر آئندہ واقعات کی اطلاع اور اسرار غیب کی نقاب کشائی، زمانہ ماقبل تاریخ کی تخمینی نہیں، چشم دید خبریں۔ کائنات کی کیفیت تخلیق، آفرینش کے رموز واسرار اور عالم ہستی

کے آغاز وانجام کی تفصیلات، خدا کی ذات وصفات کے متعلق واضح اطلاعات، عالم آخرت کی مفصل نشاندہی، قدرتی بناوٹوں کی طرح قرآن کا انداز بیان۔ یہ ہیں وہ اُمور جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور جن کا کسی انسانی کتاب میں ہونا تو درکنار، اُس کے علم ہی کا انسان کے پاس، سوائے خدا کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ یہی وہ منزل تھی جہاں سخنورانِ عرب کو پسینہ آ گیا اور وہ سب مل کر بھی قرآن کی ایک مختصر سے مختصر سورت کی مثال پیش کرنے سے قطعاً عاجز وقاصر رہے۔ قرآن انہیں چیلنج پہ چیلنج کرتا رہا کہ اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے کہ میں خدائے برتر کی کتاب نہیں، کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوں تو تم بھی انسان ہو، میری زبان بھی وہی ہے جس میں تم بہت بڑے ادیب اور مانے ہوئے سخن ور ہو، بنا لاؤ میری آیتوں کی طرح کوئی بھی عربی عبارت۔ انسان خدائی بناوٹوں کی نقل نہیں اتار سکتا۔ انسانی بناوٹوں کی نقل اتارنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہ اُس وقت کے سخنورانِ عالم اس چیلنج کا جواب دے سکے، نہ چودہ سو برس کی طویل مدت میں ''ربع مسکوں'' پر کوئی جواب دینے والا پیدا ہوا اور پھر نہ صرف یہ کہ ''قرآن ثانی'' پیش کرنے سے دنیا عاجز رہی بلکہ قرآن کے حرم میں کہیں سے نقب لگانے کی بھی کوئی گنجائش نہیں مل سکی کیونکہ قرآن صرف سفینوں میں نہیں، سینوں میں بھی محفوظ رہا اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

ہزار محاسن، ہزار اوصاف اور ہزار معجزانہ کمالات کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ کوئی قرآن پر ایمان نہ لائے لیکن یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اس کے معجزانہ کمالات، معجزانہ محاسن اور معجزانہ اوصاف کی موجودگی میں کوئی اس کے خدا کی کتاب ہونے سے انکار کردے۔

اسی طرح از روئے عقل یہ بھی ذہن وفکر کا کھلا ہوا تضاد ہے کہ اتنی بات تو تسلیم کر لی جائے کہ دنیا کو خدا کی یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے، حالانکہ

دونوں باتیں قطعاً ایک ہیں۔صاحب کتاب ہونے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پھر میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار آسان نہیں ہے۔ یا تو وہ ثابت کرے کہ قرآن جیسی کتاب انسان تصنیف کرسکتا ہے، یا یہ ثابت کرے کہ معاذ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل ہی نہیں ہوئی ہے۔لیکن ہمیں یقین ہے کہ عقل نہ وہ ثابت کرسکتی ہے، نہ یہ ثابت کرسکتی ہے۔ وہ اگر کچھ کرسکتی ہے تو صرف یہ کہ رسالتِ محمدی ﷺ کی روشن حقیقت کے آگے اپنا سر نیاز خم کردے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی سیرت کا مطالعہ-معنویت اور جہت

علامہ اسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ

بدایوں شریف

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ایک نمونۂ عمل ہے، قرآن کریم نے اس کو مسلمانوں کے لئے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ یہ لفظ اپنے معنیٰ کی وسعتوں کے اعتبار سے انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔اسے زندگی کے کسی ایک شعبے کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح لفظ ''سیرت'' بھی اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے، بعض حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سیرت یا مطالعۂ سیرت کا صرف یہ مطلب ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو تاریخی تسلسل اور جغرافیائی پس منظر میں سمجھ لیا جائے۔آپ کی ولادت کب ہوئی، کس طرح آپ کی پرورش ہوئی، پہلی وحی کب آئی، ابتداء میں کون کون لوگ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے، ہجرت کب ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے، کون سا غزوہ کس سن میں ہوا، اور اس کا نتیجہ کیا رہا، آپ کے بعض حسی معجزات، آپ کی بعثت اور دعوت کے نتیجے میں دنیا میں کیا سیاسی، جغرافیائی، اور معاشی انقلابات آئے وغیرہ وغیرہ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے امور بھی ''سیرت'' کا حصہ ہیں مگر ''سیرت'' کے معنیٰ اور مفہوم کی حدیں صرف یہیں آکر ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ سیرت کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ایک مرتبہ ایک جلسۂ سیرت میں راقم الحروف نے بارگاہِ رسالت میں حاضری

کے آداب پر صحابۂ کرام کے طرز عمل کے پس منظر میں خطاب کیا۔ تقریر کے بعد ایک پڑھے لکھے صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ کی تقریر اچھی تھی مگر اس کمی کا احساس رہا کہ آپ نے سیرت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یہ عجیب وغریب تنقید سن کر میں حیرت میں پڑ گیا کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اگر یہ سیرت نہیں ہے تو پھر آخر سیرت کسے کہتے ہیں؟ دراصل یہ تنقید اسی غلط فہمی کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی کہ سیرت صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات کو تاریخی تسلسل سے بیان کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ بھی سیرت ہے مگر صرف یہی سیرت نہیں ہے بلکہ سیرت کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ سیرت قرآنی تعلیمات کی عملی تصویر کا نام ہے ،اسلامی عقائد،اسلامی اعمال،اسلامی اخلاق،فرد کا نظام حیات،معاشرے کے مسائل، بین الاقوامی تعلقات وروابط،امن کے تقاضے ،جنگی قوانین وغیرہ یہ سب کے سب سیرت کے موضوعات میں شامل ہیں۔ اور سیرتِ طیبہ کو اسی وسیع مفہوم میں ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا گیا ہے۔ اگر سیرتِ پاک صرف واقعات کو تاریخی تسلسل سے بیان کرنے کا نام ہو،اور اس میں انسانی ہدایت کے گوشوں پر گفتگو نہ ہو تو پھر وہ ''اسوۂ حسنہ'' یا بہترین نمونہ کیسے ہوگی؟ تاریخ میں اپنے اپنے میدانوں میں عظیم اور عبقری شخصیات کی سوانح اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح کو یہی بنیادی نقطہ جدا کر دیتا ہے۔ تاریخ انسانی کی دیگر عظیم شخصیات کی سوانح انسان کی تاریخی معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا مطالعہ انسان کو آفاقی سعادتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔ سیرت کے اس وسیع مفہوم کے تناظر میں اگر مطالعۂ سیرت کی معنویت اور اہمیت پر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

سیرت طیبہ قرآن فہمی کا ایک بنیادی اور ناگزیر ماخذ ہے، قرآن کریم کی بے شمار آیات ایسی ہیں جن کے حقیقی معانی تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان آیات سے متعلق سیرت طیبہ کے بعض گوشوں سے پردہ نہ اٹھایا جائے، قرآن

کریم اور صاحب قرآن میں باہم ایسا رشتہ اور تعلق ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاحب قرآن کے اخلاق ہی کو قرآن فرمایا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں مطالعۂ سیرت کی اہمیت اس بات سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کی سورتوں کی تقسیم صاحب قرآن کی حیات مبارکہ کے دو مختلف ادوار کے حوالوں سے کی گئی ہے، یعنی جو سورتیں زمانۂ قیام مکہ میں نازل ہوئی ہیں، ان کو مکی کہا جاتا ہے اور جو سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں، ان کو ہم مدنی کہتے ہیں۔

مطالعۂ سیرت کے نتیجے میں انسان اپنے سامنے انسانیت کاملہ کی ایک ایسی اعلیٰ مثال دیکھتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں مکمل نظر آتی ہے۔ آپ انسانی زندگی کے جس پہلو اور جس گوشے کو بھی سامنے رکھ کر سیرت مبارکہ کا مطالعہ کریں تو ہر پہلو سے انسانی زندگی کا کمال آپ کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آئے گا، یہی وجہ ہے کہ مغرب کے مشہور اسکالر مائیکل ہارٹ نے جب دنیا کے سو عظیم انسانوں پر کتاب لکھی تو عیسائی ہونے کے باوجود اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کے حوالے سے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا۔

مطالعۂ سیرت کے نتیجے میں اسلام کے بنیادی عقائد، احکام، اخلاق اور ہر اس چیز کی معرفت ہوتی ہے جس کی ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہمارے لئے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

انسان کی ہدایت ورہنمائی اور ملتوں اور قوموں کی اصلاح احوال اور تربیت کے لئے ایک داعی، مبلغ، مصلح اور رہنما کو دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کے میدان میں جس جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے، اس کا ایک پورا نصاب سیرت میں موجود ہے۔ دعوت وتبلیغ چونکہ یہ منصب نبوت ورسالت کا حصہ ہے، اس لئے اس میدان میں اس وقت تک کامیابی نہیں مل سکتی جب تک دعوت وتبلیغ منہاج نبوی کے مطابق نہ ہو۔ لہٰذا کامیاب تبلیغ ودعوت کے لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مطالعۂ سیرت کی معنویت اور اہمیت کے بعد اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ عصر حاضر میں مطالعۂ سیرت کی جہت کیا ہونا چاہیئے۔

آج اسلام کو دہشت گرد مذہب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے اور (معاذ اللہ) رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر دہشت گردی کا الزام لگایا جارہا ہے۔کسی نے کہا کہ اسامہ کو اس کے حالات نے دہشت گرد نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو اس کے مذہب اور اس کے رسول کی تعلیمات نے آتنک وادی بنایا ہے۔ان حالات میں مطالعۂ سیرت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے،لیکن آج مطالعۂ سیرت کی جہت ذرا مختلف ہونا چاہیئے۔ جہاں تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) دہشت گردی کے الزام کا سوال ہے تو یہ ان مستشرقین کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے،جن کے دلوں میں اسلام اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بغض وعناد بھرا ہوا تھا۔مگر اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خود ہم نے عملی طور پر دنیا کے سامنے اپنے مذہب اور اپنے رسول کو کس طرح پیش کیا ہے؟ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ سیرت طیبہ پر جو سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے اس کا نام ''مغازیٔ رسول'' ہے یعنی حضور کے جنگی کارنامے۔ ہمارے یہاں بارہویں شریف کے جلوس میں دو داڑھی والے حضرات عربی لباس میں ملبوس ہاتھ میں لکڑی کی تلواریں لئے ہوئے جلوس کے آگے آگے چلتے ہیں،ممکن ہے یہ منظر اور جگہ بھی دیکھنے کو ملتا ہو،میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر پیغمبر امن وسلامتی کے جشن ولادت کے موقع پر ہم ہاتھ میں تلوار لے کر کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ اگر اعلان نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کی ۲۳ سالہ زندگی کو مختلف کاموں پر تقسیم کر کے دیکھا جائے تو بڑے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے غزوات میں شرکت فرمائی،اگر ان سب کو جمع کر کے ان کے گھنٹے اور دن بنا لئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان ۲۳ برسوں میں صرف چھ ماہ ایسے ہیں جن میں آپ کے ہاتھ میں تلوار رہے،گویا ساڑھے بائیس سال میں آپ یا تو لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف فرمارہے ہیں،یا پھر غریبوں اور

مسکینوں کو مال تقسیم فرمارہے ہیں،یا لوگوں کے درمیان مساوات قائم فرمارہے ہیں،کبھی غلاموں،مزدوروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک فرمارہے ہیں اور اپنے صحابہ کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم فرمارہے ہیں،کبھی آپ عورتوں اور بیواؤں کے حقوق کے سلسلہ میں لوگوں کو متنبہ فرمارہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اب اگر آپ ان ۶ ماہ (جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تلوار ہے) سے ان ساڑھے بائیس سال کا موازنہ کریں تو ایک نئی دنیا کی سیر ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ان چھ مہینوں میں بھی آپ نے لوگوں کو ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے اور فتنۂ وفساد رفع کر کے امن کے قیام کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔آج کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت ہے کہ سیرت طیبہ کے ان ساڑھے بائیس برسوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔سیرت طیبہ سے متعلق ہمارے خطابات ہوں یا مضامین ومقالات ان میں عموماً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات یا آخرت میں آپ کی شفاعت اور اللہ کے نزدیک آپ کے مقام رفیع کا بیان ہماری توجہ کا مرکز ہوا کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان امور کے بیان سے ہمارے ایمان بالرسول میں تازگی اور پختگی کا سامان ہوتا ہے اور ان امور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے بالخصوص ایسے حالات میں جب بعض حلقوں کی طرف سے امت کے تعلق بالرسول کو کمزور کرنے کی منصوبہ بند کوششیں کی جارہی ہیں،مگر ساتھ ہی ہمیں آج کے بدلتے حالات میں زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے ان گوشوں پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے جن میں فرد کی اصلاح اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کی سمت سفر کا آغاز کیا جاسکے۔آج مطالعۂ سیرت کی جہت کے تعین میں حضور کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ان گوشوں کو تحریراً،تقریراً اور عملاً سامنے لانے کی ضرورت ہے جن کا براہ راست تعلق انسان کی ہدایت ورہنمائی سے ہے۔آپ کا اخلاق،صبر ورضا،قناعت وتوکل،دشمنوں سے آپ کا حسن سلوک،مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ انسانوں پر آپ کی شفقت ونوازش،غیر مسلموں کے ساتھ آپ کا حسن معاملہ وغیرہ تاکہ ایک طرف تو ہم اپنی قوم

کے افراد کے لئے آپ کی زندگی کو ''اسوۂ حسنہ'' یا بہترین نمونے کے طور پر پیش کر سکیں جس پر عمل کر کے ہم اعلیٰ انسانی اقدار سے متصف ہو کر ابدی سعادتوں سے بہرہ مند ہوں، اور دوسری طرف ہم دوسری اقوام کے سامنے اپنے رسول کا صحیح تعارف کرا سکیں جس سے اسلام کی دعوت اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے راستے ہموار ہوں۔ آج اسلام دشمن میڈیا کی طرف سے یہ تأثر دیا جارہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صرف دو چیزیں دی ہیں ایک تلوار اور دوسری چار شادیوں کی اجازت۔ اس مکروہ پروپگنڈے کے جواب میں ہمیں مثبت طریقوں سے غیر مسلموں تک سیرت طیبہ کے اخلاقی، روحانی۔ اور آفاقی پہلوؤں کو پہنچانے کی ضرورت ہے۔

جب ہم مطالعۂ سیرت کا آغاز کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم غار حرا میں اللہ کے اولین پیغام کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد کے واقعات کو ہم سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر اسی واقعاتی تسلسل میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ جب آپ غار حرا سے اپنے کاشانۂ اقدس میں واپس تشریف لائے اور آپ نے اپنی شریک حیات سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پورا واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ خدیجہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی زوجۂ محترمہ نے جن الفاظ میں آپ کو تسلی دی، وہ خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں، آپ کو ڈر کس بات کا؟ میں دیکھتی ہوں کہ آپ اقرباء پر شفقت فرماتے ہیں، سچ بولتے ہیں، یتیموں اور بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں، اور مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ خدا آپ کو کبھی رنجیدہ نہ فرمائے گا'' حضرت خدیجہ کے ان کلمات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ کی بیوی کو آپ کی شخصیت میں جو سب سے اہم بات نظر آئی، وہ یہ نہیں تھی کہ آپ بہت طاقتور، بہادر اور جنگجو ہیں، لہٰذا آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو گزشتہ ۱۵ سالہ رفاقت کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں سب سے نمایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور مخلوق خدا کی دستگیری کے پہلو نظر آئے، اور ایسا کیوں نہ

ہو؟ کیونکہ آپ کی ۶۳ سالہ ظاہری حیات مبارکہ کا یہی غالب پہلو ہے جس کی جلوہ نمائی ان ۶۳ برسوں میں صبح وشام نظر آتی ہے۔ ہم جب خوارق عادات کی بات کرتے ہیں تو سیرت کے اس پہلو کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جود وسخا کے سلسلہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ دن بھر میں جو کچھ بھی دنیاوی مال ومتاع آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا، سب کو آپ اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ یہ بات چاہے معجزے کی اصطلاحی تعریف کے تحت نہ آتی ہو مگر کیا یہ کسی معجزے سے کم ہے؟

عصر حاضر میں مطالعۂ سیرت کی اس جہت کو مدنظر رکھنا نہ صرف یہ کہ آج وقت کی ضرورت ہے بلکہ ہماری اور پوری انسانیت کی ضرورت ہے، کیونکہ ہماری اور پوری انسانیت کی کامیابی اور فلاح کی ضمانت اسی سرچشمۂ ہدایت میں مضمر ہے۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا عالمی منشور

مولانا خوشتر نورانی

مدیر اعلیٰ: ماہنامہ جام نور، دہلی

قدرت کا یہ نظام ہے کہ اس دنیا میں طاقت ور اور کمزور دو طرح کے انسان پیدا ہوئے، ہورہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے۔ انسان کی یہ طبقاتی تقسیم خود انسانی اصول اور قوانین سے ختم نہیں کی جا سکتی۔ یہ ممکن نہیں کہ انسان ایک ہی ساخت اور ایک ہی Living Standerd لیکر دنیا میں آئے، اب دنیا میں انسان کے ان دو طبقوں (طاقت ور اور کمزور) کے درمیان اعتدال اور توازن قائم رکھنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ طاقت ور اپنی قوت کا غلط اور ناجائز استعمال نہ کرے بلکہ اپنی طاقت سے کمزوروں کی کمزوری دور کرے، ان کا سہارا بنے، ان کی دستگیری اور دلجوئی کرے۔ لیکن اقوام عالم کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے فطرت کے اس تقاضے کو کبھی پورا نہیں کیا، طاقت ور کو بے شمار حقوق مل گئے اور کمزور کو حقوق و اختیارات کم سے کم ملے یا ملے ہی نہیں۔ طاقت ور کو اپنی بے تحاشہ قوت کے نشے میں اپنی ذمہ داریاں یاد نہیں رہیں اور بے چارا کمزور دن بدن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ طاقت ور اپنی قوت کا بے محابہ استعمال کرتا رہا اور کمزور اپنی محرومی، پستی اور درماندگی پر گریہ کرتا رہا۔ انسان کے اس غیر متوازن طرز عمل نے زمین کی وسعتوں میں اصحاب حقوق و فرائض کے مختلف طبقات کو جنم دیا۔

ایک طبقہ دنیا کے تمام وسائل پر قابض ہے اور تمام ذرائع اسی کی ملکیت میں

ہیں جب کہ دوسرا طبقہ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے۔ ایک طرف عیش و عشرت کے تمام ساز و سامان ہیں، دوسری طرف انسانیت اپنے وجود کی بقا کے لیے بھی تڑپ رہی ہے۔ یہ تو ماضی کا آئینہ تھا، حال کا مشاہدہ بھی اس سے دگرگوں نہیں ہے۔ آج بھی طاقت ور کے ہاتھوں میں حکومت ہے، قانون ہے، مراعات ہے، حقوق ہیں، معیشت ہے اور تعلیم ہے، جب کہ کمزور کے دماغ میں ان چیزوں کا تصور بھی گناہ ہے۔ وہ زندہ بھی ہے طاقت وروں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے۔ انسان کے درمیان اس طبقاتی تقسیم کے عدم توازن کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ دونوں طبقوں نے اس عدم توازن، حقوق سلبی اور انارکی کو فطرت کا قانون سمجھ لیا۔ طاقت ور نے تمام حقوق و مراعات اور اختیارات کو اپنا پیدائشی اور ذاتی احقاق سمجھا اور کمزور اپنی کمزوری، محرومی اور پستی کو اپنی قسمت۔ اس عدم توازن کے نتیجے میں دونوں طبقوں کے درمیان بارہا جھڑپیں ہوئیں، بغاوتیں بھی ہوئیں مگر اس تصادم کا کوئی موثر نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر چند صدیاں قبل جب انسان مختلف تعلیم و تہذیب سے آشنا ہوا اور اس کا شعور بیدار ہوا تو اس کے ذہن میں حقوق انسانی کا تصور ابھرا اور پھر اس کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ بہت جلد اس جدوجہد نے عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا مرکز یورپ میں برطانیہ اور فرانس ہوئے اور پھر امریکہ ہوا۔

یہ بھی وقت کا ایک عجیب المیہ ہے کہ مہذب کہلانے والی قوم ایک عرصے تک کمزوروں کے حقوق سلب کرتی رہی، انہیں زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم کرتی اور کچلتی رہی، مگر جب اس نے ہوش سنبھالا تو مختلف ادوار میں اپنی فکر، اپنی عقل اور اپنی ذہنی سطح کے حساب سے انسانی حقوق متعین کر لیے کہ یہ ہیومن رائٹس ہیں، پھر اپنا ایک خود ساختہ سانچہ بنا لیا اور اسی کو معیار حق تسلیم کر لیا اور پھر اس پر مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے ذریعے دیے گئے انسانی حقوق کے صدیوں پرانے، آفاقی اور عملی تصور کو آنکا جانے لگا۔ جو تصور نہ کبھی زمانے کے بدلتے دھارے میں فرسودہ ہوا، نہ حالات کے مختلف ادوار، میں اس تصور میں تبدیلی کی ضرورت پڑی، یہ طرف داری

نہیں حقیقت کا اعتراف ہے۔اسی تصور سے مصطفیٰ جان رحمت نے جزیرۂ نما عرب کے طوائف الملوکانہ مزاج میں، جہاں معمولی باتوں پر خانہ بدوش قبیلوں کے درمیان برسوں لا حاصل جنگیں ہوا کرتی تھیں، صرف دس سال کی چھوٹی مدت میں بارہ لاکھ مربع میل میں ایک ایسی مستحکم اور بڑی مملکت قائم کردی جس نے پورے جزیرۂ عرب کو وحدت، اخوت، مساوات، اور محبت کی ایک لڑی میں پروکر رکھ دیا- آج بھی حقوق انسانی کے سلسلے میں آپ کی ہدایتیں ایک متوازن، خوشحال، تعلیم یافتہ، مہذب اور پر سکون ریاست کی ضمانت دیتی ہیں-اس کے برخلاف انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو انسانی حقوق کی بحالی کے لیے صدیوں تک مختلف کوششیں ہوتی رہیں، لیکن آج بھی وہ ان کوششوں کے نتیجے میں دنیا کو ان کے جائز اور بنیادی حقوق فراہم نہ کر سکے، آج انسانیت کے درمیان طبقاتی کشمکش اپنے عروج پر ہے، طاقت ور کے پاس سارے حقوق ہیں تو کمزور بنیادی حقوق سے بھی محروم-

حقوق انسانی کی بحالی کے لیے بتدریج جدو جہد:

☆ نئے عہد کے مؤرخین کا خیال ہے کہ دنیا حقوق انسانی کے تصور سے Magna Carta(منشور اعظم) کے ذریعے آشنا ہوئی، یہ شاہ برطانیہ جون Jhon کے عہد میں ۱۵ر جون ۱۲۱۵ء میں منظور ہوا۔ یہ منشور در حقیقت بادشاہ سے بعض طبقات کے حقوق پر غور کرنے کی اپیل تھی، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں-

☆ یورپ و امریکہ میں اس سلسلے میں مزید کوششیں ہوئیں اور شاہ کانکرڈ ثانی Concard II نے ایک منشور کے ذریعے پارلیمنٹ کے اختیارات متعین کیے-

☆ ۱۷۶۲ء میں فرانس کے معروف مفکر روسو Rousseaue نے معاہدۂ عمرانی لکھا، اسے انقلاب فرانس کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔اس کی بنیاد پر

۱۷۸۹ء میں فرانس کا منشور حقوق انسانی Declaration of the Rights of Man سامنے آیا-

☆ ۱۷۷۶ء میں امریکی ریاست ورجینا میں منعقدہ اجتماع نے George Mosion کا مرتب کردہ منشور حقوق انسانی منظور کیا-

☆ حقوق انسانی کے سلسلے میں مزید غور وفکر ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک صرف دس سالوں میں حقوق انسانی کے تعین اور اس کی بحالی کے لیے تین عالمی کانفرنسیں منعقد ہوئیں-(۱) برلن کانفرنس (۲) بروسیل کانفرنس (۳) ہیگ کانفرنس-

☆ اس سلسلے میں اہم موڑ ۱۹۴۱ء میں آیا جب امریکی صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم چرچل کے طویل مذاکرے کے نتیجے میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے ایک جامع منشور مرتب کرنے پر زور دیا گیا اور اس کا نام اٹلانٹک چارٹرس Atlantic Charters رکھا گیا-

☆ ۱۹۴۴ء میں موسکو میں کئی ممالک پر مشتمل ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس کے نتیجے میں موسکو ڈکلیریشن Moscow Declaration سامنے آیا-

☆ ۱۹۴۶ء میں سان فرانسسکو امریکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی جس میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے ایک بلیو پرنٹ تیار کیا گیا جسے Sanfrancisco Blue Print کہا گیا-

☆ اقوام متحدہ نے بھی حقوق انسانی کی تعیین اور اس کی بحالی کے لیے مختلف قرار دادیں منظور کیں، آخر ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو اس نے The Universal Declaration of Human Rights کے نام سے ایک عالمی حقوق انسانی منشور پاس کیا - یہ اس سلسلے کی آخری اور فائنل کوشش تھی۔ دنیا کی اکثریت نے اس منشور کی تائید کی اور جنھوں نے تائید

نہیں کی تو اس سے اختلاف بھی نہیں رکھا، یہاں تک کہ اسے انسانی تاریخ میں ایک انتہائی کامیاب اور انقلابی قدم تسلیم کر لیا گیا۔

اقوام متحدہ کے اس آفاقی اعلامیہ (Univresal Declaration) میں تیس دفعات ہیں جنہیں انسانی تاریخ کا ایک انقلابی قدم مانا گیا ہے۔ یہ تیس دفعات اس اعلامیہ کو مرتب کرنے اور پاس کرنے والوں کے لیے انقلاب آفریں اور نئی چیز ہوگی مگر اہل اسلام کے لیے نہیں۔ مصطفیٰ جان رحمت نے آج سے پندرہ سو برس پہلے جب دنیا جہالت اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، نہ علوم وفنون مدون ہوئے تھے، نہ تعلیم وثقافت سے آشنائی تھی اور نہ دنیا نے سائنسی اختراعات کی حیران کن بلندیوں کو چھوا تھا، حقوق انسانی کا ایک جامع دستور پیش کیا بلکہ اسے نافذ کر کے دکھایا۔ آج جب ہم اقوام متحدہ کے دفعات کا جائزہ لیں تو کاغذوں پر ان حقوق کے مطالبات بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن جب نفاذ کی بات آتی ہے تو سوسائٹی پر ان کے نتائج نہایت منفی مرتب ہوتے ہیں۔ ان ہی جیسی دیگر بہت سی خامیوں کی وجہ سے ہی آج تک کمزوروں کے حقوق کی مسلسل پامالی ہو رہی ہے۔

مغربی ماہر قانون Hens Calsan نے اس یونیورسل ڈکلریشن پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

''اس کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں انسانی حقوق تو بیان کر دیے گئے لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کوئی شخص ان حقوق کو توڑے تو اس کی سزا کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس میں آج تک حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک دراصل یہ Promotional law ہے Operational نہیں، یعنی ہم ان انسانی حقوق کے قوانین کی صرف سفارش کر سکتے ہیں، اس میں قوت نفاذ نہیں''۔

اس مختصر مگر نہایت اہم اقتباس نے اس ڈکلریشن کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔

اس کے علاوہ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سچائی بھی سامنے آتی ہے کہ انسانی حقوق کا پیمانہ اور معیار ہر دور میں بدلتا رہا ہے، کسی دور میں کسی جگہ ایک حق کو صحیح قرار دیا

گیا، پھر اس حق کو معیار تسلیم کر لینے کے بعد دنیا نے اس کی تشہیر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس حق کی ادائیگی کے لیے شور مچایا گیا اور اس سے انحراف کو جرم تسلیم کیا گیا۔ مگر دوسرے دور میں اسی حق کو دوسری جگہ ناحق مان لیا گیا۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں دنیا خصوصاً مغرب کے اس دوہرے اور متضاد رویے سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اسے صرف اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے عہد میں انسانی حقوق کے حوالے سے غلامی کا تصور بڑا عجیب تھا اور اسی تصور کو معیار حق تسلیم کیا جاتا تھا کہ جب ایک شخص کسی کی غلامی میں چلا گیا تو نہ صرف یہ کہ اپنے جان و مال اور جسم پر بھی اس کا اختیار ختم ہو جاتا تھا، بلکہ اسے انسانی حقوق اور انسانی مفادات کے ہر تصور سے عاری سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں آقا کا یہ بنیادی حق تھا کہ وہ غلام کی گردن پر اپنی غلامی کا پٹہ ڈال دے۔

یہ تو دور جاہلیت کا تصور تھا۔ وقت نے کروٹ لی اور دنیا نے اسے ناحق قرار دیا، لیکن ابھی سو یا ڈیڑھ سو سال قبل جرمنی اور اٹلی میں فاشزم اور نازی ازم نے سر ابھارا، جس میں انھوں نے یہ تصور پیش کیا کہ طاقتور کا کمزور پر حکومت کرنا اس کا بنیادی حق ہے اور کمزور پر واجب ہے کہ وہ طاقتور کے سامنے سر جھکا دے۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور اب اس تحریک اور اس تصور کو ایک گالی سمجھا جا رہا ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کے تصورات ہمیشہ یکساں نہیں رہے اور نہ رہنے کا کوئی امکان ہے۔ آج جن حقوق کو اقوام متحدہ کے ذریعے انقلابی بتا کر ان کی تشہیر کی جا رہی ہے، اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل وہ تبدیل نہیں ہوں گے؟

آج مصطفیٰ جان رحمت کا پوری انسانیت پر احسان عظیم ہے کہ انھوں نے انسانی حقوق کے تعین کی ایسی بنیاد فراہم کر دی ہے کہ جس پر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ کن حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے اور کن حقوق کا نہیں، آج اس اساس کو تسلیم کرنا دنیا کی مجبوری بنتی جا رہی ہے۔ صدیوں سے انسانی حقوق کے تعین کی جتنی بنیادیں فراہم کی گئیں، وہ انسانی عقل، انسانی فکر اور سوچ کی اُپج تھیں جس کی پرواز محدود، جس کا علم

محیط، اور جس کی عقل محصور، لیکن مصطفیٰ جان رحمت نے جو اساس دنیا کو دی، وہ اس ذات کی عطا تھی جس نے پوری کائنات اور انسانوں کو پیدا فرمایا۔ یہی وجہ تھی کہ انسانی حقوق کی یہ اساس زمان و مکان کے تغیر کے اثرات سے بے نیاز ہوگئی۔

حقوق انسانی کے دو عالمی منشور: ایک موازنہ:

اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے اس عالمی منشور میں فرد کی آزادی، عدل و انصاف اور مساوات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے- یہ منشور معاشی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے ساتھ سیاسی حقوق کا بھی احاطہ کرتا ہے- ذیل میں ہم ان ۳۰ر دفعات میں سے چند کا مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے حقوق انسانی سے موازنہ کیا جائے-

1 اقوام متحدہ کے اس عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۴ میں ہے کہ ’’کسی شخص کو غلام نہیں بنایا جا سکتا‘‘-

عالمی برادری نے یہ دستور تو بنا دیا مگر ان کے طاقتوروں نے آج بھی کمزور قوموں اور ملکوں کو اپنا ذہنی، معاشی اور سیاسی غلام بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ان کے شب و روز اسی پالیسی کو مستحکم کرنے میں صرف ہو رہے ہیں کہ دنیا کو اپنا غلام کیسے بنایا جائے، طاقتور ملکوں کا سپر پاور بننے کی دوڑ میں حصہ داری اسی جنونی تصور کا نتیجہ ہے۔ آج ان دستور کے مرتبین کا میڈیا کے ذریعے اسلامی نظریات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش، فیشن کے نام پر اپنی تہذیب کو دنیا پر مسلط کرنے کا جنون، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے عالمی معیشت پر قابض ہونے کی جد و جہد اسی تصور حکمرانی کا شاخسانہ ہے۔ اب دوسری طرف انسان کے سلسلے میں حضور سرور کونین کے تصور آزادی کی طرف دیکھا جائے تو وہاں قول و عمل کا کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اگر انسان کے سب سے اہم حق، حق آزادی کا تصور دیا، غلاموں کے خلاف جابرانہ برتاؤ سے منع کیا، مالکوں کے بے رحمانہ سلوک کو کالعدم قرار دیا، غلاموں کو آزاد کرنے کو نیکی بتایا اور آزاد کو غلام بنانے کی مذمت کی تو ان اقوال پر اپنی پوری زندگی عملی مظاہرہ کر کے دنیا کو دعوت فکر و

عمل بھی دی، وہ بھی ایسے وقت میں جب غلامی کا تصور اور ان کے ساتھ جانورانہ برتاؤ کو معیار حق سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں آپ نے صراحتاً فرمایا کہ ’’اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، ان میں سے ایک ہے و رجل اعتبد محررہ ’’وہ شخص جس نے اپنے آزاد کردہ غلام کو پھر سے غلام بنا لیا-‘‘ (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ)

آپ فرماتے ہیں کہ ’’غلام کو غلام کہہ کر نہ پکارا جائے، کیوں کہ اس کے اور مالک کے درمیان برادرانہ، پسرانہ یا دخترانہ رشتہ ہوتا ہے‘‘۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ’’وہ جنھیں تم نوکر کہتے ہو تمھارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارا معاون بنایا ہے‘‘۔ آپ مزید فرماتے ہیں کہ ’’انھیں نوکر کہہ کر ان کے احساسات کو مجروح نہ کیا جائے بلکہ انھیں اے میرے بچے کہہ کر بلاؤ‘‘۔

یونانی فلسفی ارسطو غلاموں کو روحوں والی مشین تصور کرتا تھا، جب کہ پیغمبر اسلام نے ایک انسان کی حیثیت سے غلاموں کو وقار بخشا اور فرمایا کہ ’’ان کے اندر بھی تمھاری ہی جیسی روح پائی جاتی ہے‘‘۔ اور ان غلاموں کو اسلامی سماج اور اسلامی خاندان کا ایک فرد قرار دے کر ان کی سماجی حیثیت کو بہت بلند کر دیا۔ رسول کریم ﷺ نے ایک غلام زید کو اپنا بنایا اور پھر اسے آزاد کرایا، جب حضرت زید کے والدین کو ان کی آزادی کی خبر ملی تو وہ آپ کے پاس آئے کہ زید کو واپس لے جائیں لیکن حضرت زید نے والدین کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے ساتھ ہی رہنا پسند کیا، کیوں کہ ان کے اور آپ کے خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی۔

مصطفیٰ جان رحمت نے غلاموں کو خاندان کے افراد کی حیثیت سے قبول کرنے اور نئی سوسائٹی میں ضم کرنے کے لیے انھیں شادی، قرابت داری اور سماجی وحدت کا حق بھی فراہم کیا اور انسانی وقار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے باندیوں کی طوائفانہ زندگی پر پابندی لگا دی۔ قرآن کہتا ہے کہ ’’تم سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھاری لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح کرو، اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے

فضل سے انھیں غنی کر دے گا''۔

رسول کریم کی یہ تمام کارروائیاں صرف اس لیے تھیں کہ غلامی کے عمل کو بتدریج ختم کر دیا جائے۔ ایسے میں بتایا جائے کہ انسانی تاریخ کا انقلابی قدم کون سا تھا؟ وہ جہاں قول وعمل میں عرش وفرش کا تضاد تھا اور ہے یا وہاں جہاں اس تصور اور خواب کو زمین پر اتار کر شرمندۂ تعبیر کر دیا گیا؟

☆ عالمی منشور کے آرٹیکل نمبرے میں ہے کہ ''قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہے''۔ اور آرٹیکل نمبر ۸ میں ہے کہ ''ہر شخص کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کے خلاف عدالت میں جانے کا اختیار ہے''۔

لیکن یہ قوانین اور حقوق بھی صرف منشور کی زینت کے لیے ہیں، دنیا میں ان حقوق کے نفاذ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دور کیوں جایئے انسانی حقوق کی ان دفعات کی حیثیت اس حقیقت سے دو کوڑی کی رہ جاتی ہے کہ برطانیہ میں آج بھی کوئن آف ویلز اور شاہی خاندان (Royal Family) کے خلاف برطانیہ کی کسی بھی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا۔

برطانیہ اور امریکہ نے برسوں سے ہزاروں بے گناہ افراد کو سیاسی قیدی بنا کر گوانتانا موبے اور ابو غریب جیل میں قید کر رکھا ہے اور ان پر ظلم و بربریت کی ساری حدیں ختم کر دی ہیں مگر ان میں سے آج تک کسی بھی فرد کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کے خلاف کسی بھی عدالت میں صفائی دینے کا موقع نہیں دیا گیا۔

دوسری طرف مصطفیٰ جان رحمت کا انسانی حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں مقدس کردار ملاحظہ فرمائیں جس کی مثال دنیا کا کوئی بھی منشور دینے سے قاصر ہے۔ عہد رسالت میں ایک معزز قبیلے کی عورت پر چوری کا الزام ثابت ہو جاتا ہے، حضور سرور کونین ﷺ اسلامی قانون کے تحت اس جرم کے پاداش میں اس عورت کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم جاری فرماتے ہیں۔ اس حکم سے سوسائٹی میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے کہ ایک بڑے خاندان کی عورت بھی اسلامی قانون سے بالاتر نہیں، کچھ لوگوں نے

چاہا کہ اس عورت کی سزا معاف کر دی جائے کیوں کہ وہ ایک معزز قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، لوگوں کے کہنے پر حضرت اسامہ بن زید جو حضور سے کافی قربت رکھتے تھے، بارگاہ رسول میں حاضر ہوئے اور اس عورت کے حق میں سفارش کی۔ حضور نے ان کی سفارش کو سنتے ہی فرمایا:

أتشفع في حدود الله يا اسامه! لو كانت فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها (اے اسامہ! تم اللہ کے حدود میں رعایت کی بات کرتے ہو؟ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ نے چوری کی ہوتی جب بھی میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا)

یہ تو فاطمہ بنت محمد (ﷺ) کی بات تھی، خود شارع اسلام مصطفیٰ جان رحمت نے اپنے آپ کو قانون سے ماورا نہیں سمجھا اور لوگوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ ان کے خلاف کوئی مقدمہ پیش کرنا چاہتے ہوں تو انھیں اس کا پورا حق ہے۔ چنانچہ آپ کی ظاہری حیات کے آخری ایام ہیں، ایسے میں آپ اعلان فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے تمھارے حق میں کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ بلا تردد سامنے آئے اور اپنا بدلہ لے لے، ایک شخص سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! ایک مرتبہ جب آپ جہاد کے لیے صف بندی فرما رہے تھے تو آپ کے عصا سے میرے سینے پر چوٹ لگ گئی تھی۔ حضور سرور کونین ﷺ نے فوراً اپنی قمیص اپنے جسم اطہر سے اوپر اٹھا دی اور فرمایا کہ تم بھی اپنے عصا سے میرے سینے میں اتنی ہی تیز ضرب لگاؤ جتنی تمھیں لگی تھی۔

عدل و انصاف اور مساوات کی اس سے بہتر مثال اور انسانی حقوق کی ادائیگی کی اس سے احسن تبلیغ کا کوئی فارمولہ کسی منشور میں ہے تو وہ دکھایا جائے؟

عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۶ میں ہے کہ ''جب لڑکا اور لڑکی بالغ ہو جائیں تو انھیں کسی قوم، ملک اور مذہب کی حد بندی کے بغیر شادی کرنے کا حق ہے''۔ اس منشور میں شادی ایک Civil contract دیوانی معاہدہ ہے، یعنی ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، خواہ شادی کرے یا نہ کرے، لیکن اگر کرے تو کیسے کرے؟ اور نہ کرے تو کن صورتوں میں نہ کرے اور اہلیت کے باوجود نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تو اس کی سزا کیا

ہے؟ پھر اگر اس دیوانی معاہدہ کو کسی نزاع کے سبب ختم کرنا چاہے تو اس کی کیا صورتیں ہوں گی؟ اس دفعہ میں ان تمام بنیادی سوالوں کا جواب نہ ہونے کے باوجود دنیا اسے انقلابی قدم مانتی ہے۔

اس عالمی دفعہ میں اگر مذہب کی قید لگادی جائے تو ہمارے لیے یہ کوئی نئی دفعہ نہیں، بلکہ مصطفیٰ جان رحمت نے آج سے صدیوں پہلے نکاح کا جو جامع اصول مرتب کر کے دنیا کو دیا، اس میں مذکورہ تمام سوالوں کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ شریعت کے نزدیک نکاح کا مقصد صرف تلذذ نفس اور افزائش نسل نہیں بلکہ نکاح شرعی اصولوں پر کیا گیا ایک ایسا معاہدہ ہے جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق جائز اور پیدا ہونے والی اولاد کا نسب شرعاً ثابت ہو جاتا ہے اور شوہر و بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق و فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ مصطفیٰ جان رحمت نے عقد نکاح کا مقصد اتنا ہمہ جہت اور با مقصد پیش کیا ہے کہ دنیا کا کوئی دستور اس کے گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ شریعت میں نکاح کا مقصد جہاں نسل انسانی کی بقا ہے، وہاں عفت و عصمت کی محافظت، آپسی الفت و محبت، سکون کا حصول، اللہ و رسول کے احکام کی تعمیل، اور حرام کاری سے اجتناب بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ شرعاً نکاح ایک دیوانی معاہدہ نہیں بلکہ عبادت ہے، اس لیے مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا **النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی** (نکاح میری سنت ہے تو جس نے اس سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں) یعنی نکاح کی اہلیت اور حرام کاری کے اندیشے کے باوجود کوئی نکاح نہیں کرتا تو وہ مجھ سے نہیں۔

اگر نکاح کے شرعی معاہدے کے بعد وہ مقصد حاصل نہیں ہو پا رہا ہے، یعنی زوجین کی زندگی سکون سے نہیں گزر رہی ہے، آپسی الفت و محبت کا فقدان ہے اور ان کے لیے حدود اللہ کو قائم رکھنا دشوار ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس معاہدے کو احسن طریقے سے ختم کرنے کے کئی جامع طریقے آپ نے انسانوں کو دیے تاکہ معاشرے اور فیملی میں فساد برپا نہ ہو، معاہدے کے ختم ہونے کے بعد عورت اور بچوں کا مستقبل

برباد نہ ہو اور مرد کا سکون غارت نہ ہو۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں کیا اور کوئی منشور دنیا کے سامنے اس سے بہتر رشتۂ ازدواج کا تصور پیش کر سکتا ہے؟

عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۷ میں ہے کہ ’’ہر شخص کو حق ملکیت ہے‘‘۔

مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں بلکہ تمام حقوق کی اساس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی منشور The universal Declaration of Human Rights میں جتنے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ حقوق تمام لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔ اس میں رنگ، نسل، جنس (مرد و عورت)، مذہب، زبان، سیاسی، سماجی، معاشی اور ملکی حیثیت کی بنیاد پر کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جائے گا، یہی بات بین الاقوامی سیاسی و سماجی معاہدہ International Covenant in Civil and Political Rights میں بھی کہی گئی ہے۔

ان تمام خوش کن دعووں کے باوجود کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں رنگ و نسل، زبان، جنس و مذہب اور سماجی و ملکی حیثیت کی بنیاد پر لوگوں میں امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ آج خود امریکی اور برطانوی شہریوں کو نمبر ایک کا شہری سمجھا جاتا ہے، جب کہ ایشیائی ممالک سے تعلق رکھنے والوں کو نمبر دو کا۔ یورپ و امریکہ میں امریکیوں اور یورپیوں کو جو حقوق و مراعات حاصل ہیں وہ دوسرے کسی اجنبی کو نہیں۔ پوری دنیا میں انگریزی زبان آج Status Symbol بن گئی ہے، انگریزی کے حوالے سے آج یہ رجحان عام ہے کہ جو اس زبان سے واقف ہے وہی تعلیم یافتہ اور مہذب ہے۔ پھر بھی اگر دنیا کے لیے یہ کاغذی قانون کوئی انقلابی اور حیران کن قدم ہو تو ہو، اہل اسلام کے لیے نہیں۔ دنیا نے کاغذوں پر مساوات کو جتنی اہمیت دی ہے، مصطفیٰ جان رحمت نے اس سے زیادہ اہمیت نہ صرف زبان سے دی بلکہ مساوات کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھا دیا، یہی وجہ ہے کہ وحدت انسانیت اور مساوات کا تصور اسلام کی اساسی تعلیمات میں شامل ہے اور جائے تعجب تو یہ ہے کہ حقوق انسانی کا یہ اساسی تصور مصطفیٰ جان رحمت نے اس

وقت دیا جب دنیا کو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی- حدیث پاک ہے:

یایها الناس الا ان ربکم واحد و ان أباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی و لا لأحمر علی أسود و لا لأسود علی احمر الا بالتقویٰ (مسند احمد، ۵/۴۱۱)

اے لوگو! سن لو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے- سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں ہے، فضیلت کی بنیاد صرف تقوی ہے-

اسلام نے تو نابالغ اور عورت کی حق ملکیت کو اس وقت تسلیم کیا تھا جب وہ خود ایک مال سمجھی جاتی تھی، اتنا ہی نہیں بلکہ غلاموں اور یتیموں کو بھی حق ملکیت دیا اور انھیں سوسائٹی کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا، سماج میں انھیں وقار اور عزت دی، جب کہ دنیا نے انھیں تمام انسانی حقوق و مراعات سے محروم کر رکھا تھا-

☆ عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۸ میں ہے کہ ہر شخص کو کوئی بھی عقیدہ، فکر، رائے اور مذہب اختیار کرنے کا بنیادی حق ہے''۔ بدقسمتی سے یہ بنیادی حق بھی صرف کاغذی حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس دستور کے مرتبین اور طاقتور ریاستیں اس بنیادی حق سے عام انسانوں کو محروم کر رہی ہیں اور اسے دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی اہانت اور اپنے ذاتی، ملکی اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال کر رہی ہیں- آج دنیا کے بہت سے ممالک بشمول ہندوستان میں تبدیلی مذہب پر پابندی کی بات ہو رہی ہے- پوری دنیا میں آج بنام دین، اسلام مسلمانوں کے ساتھ ظلم و جبر کیا جا رہا ہے، آزادی اظہار رائے کے نام پر مغربی دنیا اسلامی نظریات کا مذاق اڑا رہی ہے لیکن اسی آزادی اظہار کے نام پر کوئی عیسائی مذہب، مغربی قوانین اور ان کی پالیسی کے خلاف کچھ نہیں بول سکتا-

مصطفیٰ جان رحمت نے صدیوں پہلے انسانوں کو عقیدے، فکر، رائے اور

مذہب کی آزادی کا حق دے دیا تھا، اسلام کے نزدیک اگر کوئی شخص کوئی عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے تو اس پر کوئی پابندی اور جبر نہیں کہ اسے دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، ارشاد پاک ہے: لا اکراه فی الدین ''دین میں کوئی جبر نہیں- (سورہ بقرہ: ۲۵٦) ایک یہودی ہے تو یہودی رہے، ایک عیسائی ہے تو عیسائی رہے، ایک ہندو ہے تو ہندو رہے، اس کے مذہب و عقیدہ پر کوئی دباؤ نہیں، ہاں! لیکن انھیں اسلام کی دعوت ضرور دی جائے گی۔ اسے حقیقت سے آگاہ ضرور کیا جائے گا لیکن زبردستی اسلام میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ مصطفیٰ جان رحمت نے اس حوالے سے اپنے رب کا فرمان دنیا کے سامنے پیش کیا:

و قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر ''اور فرما دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے''۔ (کہف: ۲۹)

دنیا کا کوئی انصاف پسند مورخ یا محقق ایسی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتا کہ مصطفیٰ جان رحمت نے اسلام کی سربلندی اور توسیع کے لیے اپنے اس تصور سے انحراف کیا ہو اور اپنے اس اصول کو توڑا ہو-

☆ عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۲٦ میں ہے کہ ''ہر شخص کے لیے تعلیم کا حصول اس کا بنیادی حق ہے''۔

اہل اسلام کے لیے یہ دفعہ بھی کوئی نئی نہیں- مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے تعلیم کی اہمیت، ضرورت اور اس کے حصول کے لیے اس وقت انسانوں کو کہا جب نہ تو علوم وفنون نے ترقی کے مدارج طے کیے تھے، نہ لوگ اس کی اہمیت وضرورت سے آشنا تھے اور نہ تعلیم کے بہتر نتائج اور مقصد سے واقف- اس تاریک ماحول میں حضور نے جو تعلیم کا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا وہ آج کے ترقی یافتہ عالمی منشور کی دفعات سے کئی گنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ عالمی منشور نے تعلیم کے حصول کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کیا ہے جب کہ ہمارے نبی نے اس کے حصول کو فرض قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے

کہ کوئی کسی چیز کے حصول کو حق نہیں فرض قرار دے دے تو اس کے حصول کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے ہر اس تعلیم کو فرض قرار دیا ہے جو مذہب وملت کی بھلائی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہو۔ ارشاد نبی ہے:

"الحکمة ضالة المومن ،حیث و جدها فهو احق بها"۔ (حکمت مومن کی گم شدہ دولت ہے، وہ جہاں اسے پائے اس کا زیادہ حقدار ہے)

دو عالمی منشور کے درمیان بنیادی فرق:

مختلف طاقتور ریاستوں، سیکڑوں اعلیٰ دماغوں اور صدیوں کی ادھیڑ بن کے بعد حقوق انسانی کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے، وہ اہل اسلام کے لیے نہ تو نیا ہے اور نہ انقلاب آفریں، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مصطفیٰ جان رحمت کے پیش کردہ عالمی منشور کا ہی چربہ ہے، جس میں کچھ لایعنی حذف و اضافہ کے ساتھ اقوام متحدہ کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اب یہاں بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا عالمی منشور رسول اکرم کے منشور کا ہی چربہ ہے تو پھر اب تک عام انسان اپنے بنیادی حقوق سے کیوں محروم ہے؟ اور کیوں حکمراں اس منشور کی تشکیل کے ۶۰ر برس گزر جانے کے باوجود اب تک اپنی ریاستوں میں ان حقوق کو نافذ کر کے وہاں امن وامان، عدل و انصاف اور مساوات قائم نہیں کر سکے؟؟ میرا خیال ہے کہ اس کی چار بنیادی وجوہات ہیں، جن کی وجہ سے یہ منشور عالمی سطح پر ناکام ہو گیا، جب کہ نبی کریم ﷺ کا عالمی منشور عہد رسالت سے خلافت راشدہ تک صرف ۵۰ر سالوں سے بھی کم مدت میں اسلام سمتوں میں پھیل گیا اور اسی منشور سے نبی کریم نے ایک آئیڈیل سوسائٹی کی تشکیل دی تھی جو اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے۔

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی ناکامی کی چار بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے متفقہ اقتدار کا فقدان، دوسری قول وعمل میں تضاد، تیسری فطرت سے بغاوت اور چوتھی منشور کی تنفیذ کے نفسیاتی طریقے کا فقدان۔ جن کا ہم ترتیب وار مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اقوام متحدہ کے اس منشور کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہاں کوئی ایسا اقتدار اور قوت نافذہ نہیں جسے تمام ممالک تسلیم کریں، اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں اور جو خود انسانیت کی شیرازہ بندی کر سکے، جس کی وجہ سے منشور کی انقلابی دفعات کاغذ کا ہی حصہ بنی ہوئی ہیں اور دنیا میں کشمکش اور تصادم کا طوفان برپا ہے۔ آج ہر ملک اپنے سیاسی، معاشی اور مذہبی مفادات کے لیے ایک دوسرے کو دبانے کے لیے کوشاں ہے، نہ کوئی روکنے والا ہے اور نہ کوئی کسی کی سننے کو تیار ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے ذریعے جو منشور دیا گیا، وہاں اقتدار اعلیٰ اور قوت نافذہ پائی جاتی ہے جو اللہ کریم کی ذات ہے، جس کی اطاعت سبھی پر واجب ہے اور جس کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ قول وعمل کا تضاد ہے۔ جن لوگوں نے اس منشور کو مرتب کیا وہ خود منشور میں درج قوانین اور حقوق کی ادائیگی سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھنے لگے، جس کی وجہ سے دنیا سے عدل وانصاف اور امن وامان اٹھ گیا۔ جب کہ مصطفیٰ جان رحمت کی وہ واحد ذات ہے جس نے نہ صرف اپنے منشور کو پیش کیا بلکہ اس کو اپنی زندگی میں برت کر دکھایا۔ دنیا کا کوئی مورخ ایسی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتا کہ نبی نے حقوق کی ادائیگی کے قوانین صرف دوسروں کے لیے بنائے ہیں جب کہ وہ خود ان کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

۳۔ اقوام متحدہ کے اس منشور میں اپنے آپ کو ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ اور روشن خیال ثابت کرنے کے لیے عورت و مرد کے درمیان مساوات کی ہوڑ میں بعض ایسے قوانین بھی بنا دیے جو فطرت سے میل نہیں کھاتے، وہ حقوق صرف کاغذوں پر پڑھنے سے تو بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کا نفاذ ممکن نہیں۔ اگر ان حقوق کو طاقت کے زور پر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو سوسائٹی میں اس کے نہایت خراب اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۴- اقوام متحدہ کے منشور کے فلاپ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس کے نفاذ کا کوئی نفسیاتی منصوبہ یا طریقہ ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ ان حقوق کو طاقت کے بل پر قانون وعدالت اور سماجی، سیاسی اور معاشی قوت کے ذریعے نافذ کرنا چاہتے ہیں- انسان کی نفسیات ہے کہ جب کوئی چیز طاقت اور قانون کے زور پر نافذ کی جائے تو وہ قانون کو فریب دے کر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب موقع ملے اس سے نظریں چرالیتا ہے- نبی کریم کے منشور کی کامیابی کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اس کی تنفیذ کا ایک ایسا نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ حقوق کی ادائیگی مسلمانوں کے لیے عبادت بن گئی- اپنے اس منشور کو انہوں نے قانون کے ذریعے نافذ نہیں کیا بلکہ اسے اخلاقیات سے جوڑ دیا، حقوق ادا کرنے والوں کو اعلی کردار کا حامل قرار دیا، ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں ثواب و جزا کی بشارت سنائی اور حق سلب کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے انہیں وعیدیں سنائیں- اخلاق و قانون کا رشتہ بڑا گہرا ہے، اگر کسی معاشرے میں اخلاقی حس بیدار ہوجائے تو وہ قانون سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اور ہر شخص کسی دباؤ کے بغیر حقوق کی حفاظت کرنے کو تیار رہتا ہے- دو عالمی منشور کے اس اجمالی موازنے کے بعد اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ آج بھی مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کا عالمی منشور انسانیت کی درماندگی، پسماندگی اور خستہ حالی کا مداوا ہے، جسے دنیا کا کوئی دوسرا منشور نہیں کرسکتا-

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی معاشرت اور مستشرقین

(کثرت ازدواج کے تناظر میں)

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

اے.ایم.یو علی گڑھ

مغرب کی توپ ہو یا مغرب کا پوپ، اسے بہر حال اور بہر قیمت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہی چلنا ہے۔ اس پر کسی بھی مسلمان کو نہ متعجب ہونا چاہیے اور نہ غیر معمولی غم وغصہ کا شکار، البتہ اس کے تدارک کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ ہلال وصلیب کی یہ کشمکش یا جدید امریکی اصطلاح میں کہیں تو تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilization) نہ نیا ہے اور نہ انوکھا۔ یہ تصادم ۸ھ میں سریہ موتہ سے شروع ہوا یعنی گزشتہ زائد از چودہ سو سال سے جاری ہے اور شاید صبح قیامت تک جاری رہے گا۔ صدیوں پر محیط اس طویل عرصہ میں نشیب وفراز کے کتنے ہی دور آئے۔ اس دوران مسلح تصادم بھی ہوئے اور علمی معرکے بھی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہر دور کے پوپ مغرب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اسی طرح ہر دور کے بش اور بلیئر عالم اسلام پر مغرب کی عیسائی افواج کی یلغار کے قائد بنتے رہے ہیں اور بنتے رہیں گے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو تاریخ کے کسی بھی طالب علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں اور مستقبل شناس بخوبی جانتے ہیں کہ تصادم کے اس سلسلے میں اضافہ ہی ہوگا، کمی کا

کوئی امکان نہیں ہے، ہاں وقت کے ساتھ ساتھ اس کے نام اور نوعیت بدلتے رہیں گے لیکن اصلیت اور حقیقت یہی رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تاامروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

آٹھ صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد مغرب نے اپنی حکمت عملی یکسر بدل ڈالی تھی۔ اس نے خوب سمجھ لیا تھا کہ زور شمشیر سے نہ اسلام کو مٹایا جاسکتا ہے اور نہ عالم اسلام کو زیر کیا جاسکتا ہے، اس لیے قلم وقرطاس اور حکمت وسیاست کے ذریعہ اسلام اور عالم اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ ایک طرف صنعت وتجارت کے بہانے عالم اسلام کے ممالک پر ڈورے ڈالے گئے اور استعماراتی عزائم سے انھیں زیر کیا گیا تو دوسری طرف مشنری اسپرٹ اور علوم وفنون کی راہ سے انھیں ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی اور حقیقت یہ ہے کہ صلیبی تلواروں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ بارآور ثابت ہوئی۔ گزشتہ دوتین صدیوں سے عالم اسلام مغرب کی ان ہی شاطرانہ چالوں کا شکار ہے۔

یہی وہ دور تھا جب یورپ اپنے تاریک دور سے نکل کر نشأۃ ثانیہ کی طرف بڑھ رہا تھا، علوم وفنون سے غیر معمولی رغبت پیدا ہورہی تھی۔ اسی کے زیر اثر تحریک استشراق (Orientation) پیدا ہوئی جس کا مقصد مشرقی مذاہب وعلوم خصوصاً اسلام کا مطالعہ تھا۔ جگہ جگہ سوسائٹیاں اور ادارے قائم کیے گئے ہیں، جہاں باریک بینی سے اسلامی علوم اور اسلامی کتب کا مطالعہ کیا گیا لیکن اس کے پس پشت طلب علم کم اور نکتہ چینی وعیب جوئی کا جذبہ غالب تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ یورپ کے ہر فرد کی گھٹی میں اسلام دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وحقارت کا سیاہ سیال بھی شامل کیا جاتا تھا، اس لیے ناممکن تھا کہ کوئی شخص مدت العمر اس زہر کے اثر سے آزاد ہوسکے۔ آج بھی یورپ کی ہر زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسے قصے کہانیاں موجود ہیں جو اسلام کو انتہائی وحشی مذہب اور مسلمانوں کو انتہائی وجابر اور خوں آشام وخوں

خوار ثابت کرتی ہیں۔ ان قصے کہانیوں کے مصنفوں نے علمی بددیانتی، دجل وفریب اور عیاری ومکاری کی تمام حدود کو پار کرکے خود اپنے لٹریچر کو جھوٹ کا پلندہ بنادیا تھا۔ دنیا کا کوئی ایسا الزام اور برائی نہیں جو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات میں اور ان کی تعلیمات کے زیر اثر مسلمانوں کے کردار میں شامل نہ کی گئی ہو۔ جن لوگوں نے قرآن واحادیث اور سیر وتفاسیر کی کتابوں کے تراجم کیے، انہوں نے بھی کچھ اصل زبان کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے میں کج فہمی کی بدولت اور کچھ قصداً علمی بددیانتی کا بھرپور التزام کیا۔ بدقسمتی سے احادیث وتفاسیر کی کتب میں نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی بدولت انھیں ایسا مواد بھی مل گیا جس سے انہوں نے تل کا تاڑ اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالا۔ انہوں نے ان کتب سے ملنے والے ہر سراغ سے سرنگ بناڈالی اور پھر بزعم خود اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

اپنی زبانوں کے لٹریچر اور ایسے تراجم کو پڑھ کر جو مستشرق تیار ہوئے، ان سے علمی دیانت اور ہمدردانہ مطالعہ کی امید ہی نہیں کی جانی چاہیے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مستشرقین کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے متعصب، تنگ نظر عیب جوئی اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور ان سے اپنے پسندیدہ نتائج اخذ کیے۔ دوسری طرف چند وہ مستشرق بھی ہیں جنھوں نے دیانت اور انصاف کا دامن یکسر نہیں چھوڑا ہے اور جن چیزوں کو قابل تعریف سمجھا ہے، ان کی تعریف بھی کی ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ عمل جتنا شدید ہوتا ہے اس کا ردعمل بھی شدید تر ہوتا ہے۔ محبوب خلائق کو محسود خلائق بھی ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ آپ کی ذات ستودہ صفات ارواح طیبہ کی محبوب ہے تو ردعمل میں ارواح رذیلہ کی محسود ومعتوب بھی ہے۔ اگر آپ کی سیر وسوانح اور نعت ومناقب کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے تو حزب الشیطان نے سب وشتم، دروغ گوئی، الزام واتہام، دریدہ دہنی اور ہجونگاری کے تمام ریکارڈ بھی توڑ دیے ہیں۔ آپ سے عقیدت ومحبت رکھنے والے جاں نثاروں نے آپ کی حیات طیبہ کے ایک

ایک گوشے پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو محفوظ اور ریکارڈ میں رکھا ہے اور اس پر فخر کیا ہے۔ سیر وسوانح کی تصنیف وتالیف کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا، لیکن حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرکشش اور سحر کار شخصیت کا جادو اہل مغرب کے سر چڑھ کر بولا ہے۔ متعصب اور تنگ نظر مصنفوں اور آپ سے نفرت کرنے والوں نے بھی آپ کے سیرت نگاروں کی صف میں شامل ہونا باعث فخر سمجھا ہے۔ حد یہ کہ پروفیسر مارگولیتھ جیسا متعصب مصنف جس نے ۱۹۰۵ء میں ''ہیروز آف دی نیشن'' کے سلسلہ کی کتاب ''محمد'' تصنیف کی، اپنی کتاب کے مقدمے میں اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوا ہے: ''پیغمبر محمد کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں شریک ہونا قابل فخر ہے''۔

"The Biographers of the Prophet Mohammad from a long series. It is impossible to end but in wich it would be honourable to find a place.")

موجودہ دور کا ایک امریکی مصنف Michal. H. Hart ہے۔ اس نے " The 100- a ranking of the most influential Persons in history." کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس نے تاریخ عالم کی ان شخصیات کو منتخب کیا ہے جنھوں نے تاریخ عالم پر اپنے زبردست اثرات مرتب کیے ہیں، اسلامی شخصیات میں سے اس نے صرف دو شخصیتوں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لیا ہے لیکن تاریخ عالم کی سب سے موثر شخصیت وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی مانتا ہے اور انہیں سرفہرست رکھتا ہے۔ وہ اس کی وجہ بھی بتاتا ہے، اسی کے الفاظ میں:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاریخ انسانیت پر جو بے مثال دینی اور دنیوی اثرات ڈالے ہیں، وہ میری نظر میں انھیں اس بات کا مستحق قرار دیتے ہیں کہ انھیں

تاریخ انسانی کی موثر ترین شخصیت قرار دیا جائے'' (مترجم عاصم بٹ صفحات ۲۵ تا ۲۹ ومصنف مذکور نے مزید اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے: ''ممکن ہے کہ انتہائی متاثر کن شخصیات کی فہرست میں حضرت محمد کا شمار سب سے پہلے کرنے پر چند احباب کو حیرت ہو اور کچھ معترض بھی ہوں لیکن یہ واحد تاریخی ہستی ہے جو مذہبی اور دنیاوی دونوں محاذوں پر برابر کامیاب رہی)

مغربی علماء کا یہ رویہ بھی بڑا حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو وہ اسلام کو یہودیت اور عیسائیت کی انتہائی بگڑی ہوئی شکل اور لغویت کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور خود رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو تمام عیوب کا مجموعہ اور تمام برائیوں کا بانی قرار دیتے ہیں (العیاذ باللہ) یہی نہیں وہ تمام مشرقی اقوام کو فکر وعمل سے عاری بھی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف انھیں کے مطالعہ میں عمریں صرف کر دیتے ہیں، لاکھوں صفحات لکھ کر الماریاں ہی نہیں لائبریریاں بھر دیتے ہیں، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس طرف توجہ ہی نہ دیتے، بالکل نظر انداز کرتے، لیکن وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر اسلام کے خلاف جھوٹ اور غلط فہمی کا ہمالہ پہاڑ نہ کھڑا کیا گیا اور اس کی بدنامی میں ذرا بھی کسر کی گئی تو وہ اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر ہمارے عوام الناس کو اپنی آغوش میں کھینچ لے گا اور اس وقت ہم بے یار ومددگار رہ جائیں گے۔

مستشرقین کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کن پہلوؤں کو کمزور ثابت کیا جائے۔ قرآن چودہ صدیوں تک جس طرح محفوظ رہا ہے تو اس کے متعلق یہ ثابت کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ قرآن اصل نہیں ہے، اس میں بھی تحریف ہوئی ہے۔ البتہ اس کے جہاد سے متعلق بیانات واحکامات کو انہوں نے سیاق وسباق سے ہٹا کر خوب خوب ہدف تنقید بنایا، اسی طرح آپ کی بے داغ شخصیت اور ذات ستودہ صفات میں کہاں کمزوری تلاش کی جائے، یہ بھی مستشرقین کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا کیوں کہ آپ کے بدترین دشمنوں نے بھی آپ کی دیانت، امانت، صداقت، شجاعت، سیاست، احباب واہل خانہ کے ساتھ تو کیا دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور محبت ورحمت کے رویہ کی

شہادت دی ہے۔ جاں نثار صحابہ تو جاں نثار تھے ہی، انھیں تو آپ خیر مجسم ہی نظر آتے تھے، کفار مکہ بھی آپ کی شخصیت کے نہیں آپ کے پیغام کے مخالف تھے۔ دشمنوں کو بھی آپ الصادق، الامین اور کریم ابن کریم ہی نظر آتے تھے۔ اس لیے تلاش بسیار کے بعد انھیں کثرت ازدواج ہی ایک ایسا پہلو نظر آیا جس پر تنقید وملامت کے اپنے سارے ترکش خالی کیے جاسکتے تھے اور ایسا کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ داستان گوئی اور افسانہ طرازی کی ساری حدیں پار کردیں اور یہ ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی کہ معاذ اللہ آپ کی جنسی بے راہ روی حد سے بڑھی ہوئی تھی، کسی عیش وعشرت میں غرق شخص کی طرح آپ کو بھی نت نئی عورت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور یہ شوق اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

مغربی علما خوب جانتے ہیں کہ کثرت ازدواج کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جسے سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا۔ جنھیں وہ بھی اللہ کے رسول مانتے ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام۔ ان سب کے متعلق خود ان کی اپنی مذہبی کتاب عہد نامہ قدیم (Old testament) یا توریت کی شہادت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی تین، حضرت یعقوب کی چار، حضرت موسیٰ کی چار، حضرت داؤد کی نو اور حضرت سلیمان کے حرم میں تو ایک ہزار عورتیں تھیں۔

سامی مذاہب سے باہر اگر برصغیر میں دیکھیں تو یہاں کی مشہور مذہبی شخصیت رام کے والد راجہ دشرتھ کے تین، راجہ شانتنو کی دو اور پانڈو راجہ کے یہاں بھی دو رانیاں تھیں۔ دوسری مشہور مذہبی شخصیت کرشن کے یہاں بھی ہزاروں بیویوں کا ہونا تسلیم کیا جاتا ہے۔

کثرت ازدواج عربوں کا عام رواج بھی تھا اور ضرورت بھی۔ وہاں جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا تھا جن میں اکثر مرد مارے جاتے تھے اور عورتیں باقی رہ جاتی تھیں، اسی لیے ہر مرد کے گھر میں متعدد بیویاں اور جنگوں میں گرفتار کی گئی متعدد

باندیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے کثرت ازدواج کو تعداد کا پابند کیا، کچھ خاص رشتوں میں نکاح کو بند کیا۔ کثرت ازدواج پر بھی عدل کی ایسی شرط لگائی کہ جو عام حالات میں ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ قرآن چار بیویوں کی اجازت کے ساتھ مشورہ یہی دیتا ہے کہ چوں کہ عدل نہیں کرسکوگے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ایک بیوی پر ہی اکتفا کرو۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا: (نساء:۳)

نکاح کروان عورتوں سے جو تمھیں پسند آئیں۔ دو۔دو۔ تین تین اور چار چار سے، اور اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کرسکوگے تو پھر ایک ہی، یا وہ کنیزیں جن کے تم مالک بن جاؤ۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (نساء:۱۲۹)

اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی بیویوں کے ساتھ چاہے تم اس کے خواہش مند ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نہ کرو کہ ایک ہی کی طرف جھک جاؤ اور دوسری کو درمیان میں معلق چھوڑ دو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت ازدواج کو اختیار کیا تو اس کی خصوصی ضرورت، حالات اور وجوہات تھیں جن کی بدولت عمر کے آخری عشرے میں متعدد نکاح کیے گئے۔ آپ کے ہر ایک نکاح کا جائزہ، مغرب کی دروغ گوئی، اتہام طرازی، علمی بددیانتی اور یاوہ گوئی کے تمام تار و پود بکھیر سکتا ہے اور انھیں بے نقاب کرسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اسی کی کوشش کی گئی ہے۔

۱- عرب جیسے گرم ملک میں عام طور سے لڑکے لڑکیاں ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں خوب بالغ ہوجاتے ہیں، اس لیے وہاں اوائل عمر میں ہی شادی کا رواج تھا۔ آپ کی پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی جب کہ آپ شروع سے ہی

صحت منداور تندرست وتوانا تھے لیکن آپ نے ۱۲-۱۳ سال کا عرصہ مجرد رہ کر ہی گزارا۔ اس عرصہ کے متعلق کسی مستشرق کو کہیں سے بھی یہ سراغ نہ مل سکا کہ آپ نے کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا ہو۔

۲- آپ کی پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی اور وہ بھی اس عورت سے جس کی پہلے ہی دو شادیاں ہو چکی تھیں اور جو عمر میں آپ سے نہ صرف ۱۵ سال بڑی تھیں بلکہ کئی بچوں کی ماں بھی تھیں۔ آپ نے اگلے ۲۵ سال انھیں ایک عورت کے ساتھ گزارے، انھیں سے آپ کے دو یا تین بیٹے اور چار بیٹیاں بھی ہوئیں۔ ان کی حیات میں آپ نے کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی۔

۳- پہلی بیوی کی حیات کے آخری دس سالوں میں آپ اپنے مشن کی کامیابی اور کار رسالت کی بجا آوری میں ہمہ تن مشغول رہے۔ ادھر وہ خاتون اول بھی تقریبا پچپن سال کی ہو چکی تھیں، اس لیے ان کے ساتھ جنسی تعلق کوئی معنی نہ رکھتا ہوگا۔

۴- خاتون اول حضرت خدیجۃ الکبری کی وفات کے بعد جب کہ خود آپ کی عمر شریف پچاس سال سے تجاوز کر رہی تھی، آپ نے سودہ بنت زمعہ سے نکاح فرمایا۔ اس وقت حضرت سودہ بھی پچاس سال سے زائد عمر کی ہو چکی تھیں۔ صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف آپ کو اپنے گھر اور بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک ایسی عورت کی سخت ضرورت تھی جو آپ کو کار نبوت کے لیے فارغ کر کے اس فرض کو انجام دے سکے، دوسری طرف خود حضرت سودہ کا حال یہ تھا کہ وہ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ خاندان وقبیلہ کو چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئیں تھیں۔ وہاں حضرت سکران کا انتقال ہو گیا تو وہ بے یار ومددگار ہو گئیں۔ انھیں مدد اور سہارے کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے یہ نکاح دونوں کی سماجی اور عائلی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تھا، جنسی لذت کے لیے نہیں۔ پچاس سال سے زائد عمر کے عورت ومرد کے لیے گھریلو ضرورتیں ہی اہم ہوتی ہیں۔ اس لیے کیا کوئی ذی

عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نکاح کا مقصد جنسی تلذذ ہو سکتا ہے؟

۵- آپ نے تیسرا نکاح حضرت عائشہ صدیقہ بنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا۔ آپ کی تمام ازواج میں سے صرف یہی زوجہ کمسن اور کنواری تھیں۔ باقی تمام ہی بوقت نکاح ۳۵-۴۰ سے زائد عمر کی اور ایک ایک دو دو شوہر کی بیوہ مطلقہ تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ سے نکاح کی متعدد وجوہ تھیں۔ ان کے والد آپ کے سب سے بڑے جاں نثار اور ہمدم وہمساز وہمراز تھے۔ ان کے احسانات کا بدلہ اور دوستی وتعلق کو مزید مضبوط کرنے کا بڑا ذریعہ رشتہ مصاہرت ہو سکتا تھا۔ یہ رشتہ حضرت ابوبکر صدیق کے لیے باعث فخر اور آپ کے مقصد رسالت کے لیے باعث تقویت تھا۔ پھر دین اسلام چند عبادات ورسومات کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے اور ہر مسئلہ کی رہنمائی کرنے والا دین ہے۔ بنی نوع انسان کی تقریباً نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کے اپنے مخصوص مسائل، ضروریات اور معاملات ہوتے ہیں جنھیں ایک عورت ہی بہتر طور پر سمجھا سکتی ہے۔ آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ اور چند دوسری ازواج مطہرات کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا، ان کی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام کیا، ان کی ذہانت وفطانت کا رخ اسلام کی تبلیغ واشاعت کی طرف موڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے وقت کی بڑی عالمہ وفاضلہ ثابت ہوئیں۔ اسلامی علوم اور فقہی مسائل کا بہت بڑا حصہ حضرت عائشہ کی بدولت ہی امت کو حاصل ہوا۔ بڑے بڑے صحابہ نے اہم اور پیچیدہ مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کی اور کسب فیض کیا۔ یہ نکاح بہت ہی بابرکت ثابت ہوا جس نے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کی رہنمائی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

۶- چوتھا نکاح حضرت حفصہ بنت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہوا۔ اس نکاح کے پس پشت بھی کئی عوامل کارفرما تھے۔ ایک بڑا مقصد حضرت عمر فاروق کی اس فکر کو دور کرنا تھا جو حضرت حفصہ کے بیوہ ہو جانے

سے انھیں لاحق تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق کے بعد یہ دوسرے ایسے جاں نثار صحابی تھے جنہیں رشتہ مصاہرت میں داخل کرکے ان کے ساتھ تعلق کو مزید مضبوط بنایا جاسکتا تھا۔ حضرت حفصہ بجائے خود بہت ہی عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں جن کے زہد وتقویٰ کی شہادت خود جبریل امین نے دی تھی۔ انھوں نے اور ان کے سابق شوہر حضرت خنیس نے جنگ بدر میں اہم خدمات انجام دی تھیں اور اسی جنگ میں وہ شہید بھی ہوئے تھے۔ اس لیے خود ان کا یہ حق تھا کہ ان کی دلجوئی اور تسلی وتشفی کا سامان کیا جائے اور اس سے بہتر بدل کیا ہوسکتا تھا کہ انھیں شرف زوجیت بخشا جائے۔

اس نکاح کے وقت آپ کی عمر شریف تقریبا پچپن سال تھی اور اس کے بعد حیات ظاہری کے تقریبا آٹھ سال آپ انتہائی مصروف رہے۔ خود حضرت حفصہ کا سن ۳۵ سال سے زائد ہی تھا۔ اس عمر کی عرب عورت کا عہد شباب ڈھل چکا ہوتا ہے پھر ان کی تمام تر توجہ عبادت وریاضت کی طرف تھی اور اس کی شہادت خود حضرت جبریل امین نے ان الفاظ میں دی تھی:

”فانها قوامة صوّامة وانها زوجتك في الجنة“ وہ بہت عبادت کرنے والی، روزے رکھنے والی ہے اور وہ جنت میں بھی آپ کی زوجہ ہے۔ (الاستیعاب/مدارج النبوت)

اس طرح دونوں ہی کے حالات اس کی نفی کرتے ہیں کہ اس نکاح کے پس پشت ذرا سا بھی جنسی مقصد ہوسکتا ہے۔

۷- پانچواں نکاح حضرت زینب بنت خزیمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہوا۔ آپ سے قبل حضرت زینب کے تین نکاح ہوچکے تھے۔ دو شوہر جنگ بدر اور جنگ احد میں شہید ہوچکے تھے۔ خود اس مجاہدہ نے دونوں جنگوں میں مجاہدین کی خدمات انجام دی تھیں، اس لیے ان کا حق تھا کہ ان کی ایسی تالیف قلب کی جائے کہ تمام زخموں کا مداوا ثابت ہو۔ پس آپ نے ان

سے نکاح فرمالیا، حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال تھی اور اس اعزاز کے بعد وہ چند ماہ ہی حیات رہیں لیکن ام المومنین کا گراں قدر خطاب پاکر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

کیا کوئی بدباطن اس نکاح میں جنسی خواہش کا کوئی شائبہ بھی پاسکتا ہے؟

۸- آپ کا چھٹا نکاح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ انہوں نے راہ اسلام میں بڑی قربانیاں دی تھیں اور بڑی مصیبتیں اٹھائی تھیں، اس لیے جنگ احد کے بعد بیوہ ہوجانے پر ان کی دلدہی کے لیے آپ نے ان سے نکاح فرمالیا۔ نکاح کے وقت وہ خاصی معمر اور چار بچوں کی ماں تھیں۔ انہوں نے یہی کہہ کر اپنا عذر بھی پیش کیا تھا لیکن چونکہ آپ کی دلداری مقصود تھی، اس لیے آپ اور آپ کے بچوں کی کفالت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالی اور اس طرح ان کی برسوں کی ریاضت کا صلہ عطا فرمایا۔ ان حالات کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے پیچھے عشق ومحبت یا جنسی تلذذ کا شائبہ بھی ہوسکتا ہے؟

۹- ساتویں زوجہ محترمہ زینب بنت جحش ہیں۔ اس نکاح پر اس وقت بھی بڑی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی اور مستشرقین کے لیے تو یہ ایسا نشانہ ہے کہ وہ اپنے ترکش کے تمام تیر اسی نشانے پر برساتے ہیں۔ اس نکاح پر ایسی افسانہ طرازی کی گئی ہے کہ مستشرقین کی جہالت اور تنگ نظری پر انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے۔

اصل واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت زینب بنت جحش آپ کی پھوپی زاد بہن تھیں۔ آپ نے ان کی شادی اپنے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہ سے کرانی چاہی لیکن حضرت زینب اور ان کے اہل خانہ نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا کیوں کہ حضرت زید غلام رہ چکے تھے اور ایک قریش زادی کی شادی کسی غلام سے ہونا سخت معیوب سمجھا جاتا اور یہ نکاح ان کے اہل خاندان کے لیے سبکی کا باعث بنتا لیکن آپ اس رشتہ کے ذریعہ اکرام بنی آدم اور آزاد غلام کے امتیاز کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مکمل مساوات کا یہ انقلابی قدم آپ کا مطمح نظر

تھا، اس لیے آپ اس رشتہ کے لیے مصر رہے لیکن ادھر سے انکار ہی تھا۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں کہا گیا ہے کہ کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اللہ و رسول کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کرے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (احزاب:۳۶)

اگر اللہ و رسول کسی معاملہ میں فیصلہ فرما دیں تو پھر کسی مومن مرد یا مومن عورت کو اس معاملہ میں اختیار نہیں رہتا اور جو اللہ و رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس فرمان الٰہی کے بعد حضرت زینب اور ان کے اہل خانہ نے اس رشتہ کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا لیکن حضرت زینب کے یہاں جو احساس برتری تھا، وہ حضرت زید کو نگاہ میں نہ لا سکا۔ نتیجہ میں دونوں کے درمیان محبت والفت پیدا نہ ہو سکی، تعلقات خراب ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت زید طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آپ نے دونوں کو سمجھا کر اس رشتہ کو برقرار رکھنا چاہا کیوں کہ اس رشتہ کے ٹوٹنے سے نہ صرف ایک نکاح ٹوٹ رہا تھا بلکہ آپ کا انقلابی و اصلاحی قدم بھی ناکام ہوا جا رہا تھا۔ بہرحال یہ رشتہ برقرار نہ رہ سکا اور حضرت زید نے طلاق دیدی۔ حضرت زینب اور ان کے اہل خانہ کے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ خود آپ بھی حضرت زینب کے معاملے کو لے کر بہت فکرمند تھے۔ عام طور پر ایک غلام کی بیوی رہی عورت سے کوئی شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوتا، اس لیے وحی الٰہی نے حضرت زینب کو آپ کی زوجیت میں دے دیا لیکن بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ تھا کہ عربوں میں منھ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرنا بہت ہی معیوب تھا اور زید بن حارثہ ایک عرصہ تک زید بن محمد کے نام سے جانے جاتے تھے، انھیں زید بن محمد سے زید بن حارثہ بھی ایک قرآنی حکم نے بنایا تھا:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ" فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ" (الاحزاب:۵)

لوگوں کو ان کے باپ کی نسبت سے ہی پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ پھر تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں)

اب قرآن حکیم نے ہی عربوں کی اس رسم کو مٹانے کا اعلان فرمایا جس کے مطابق متبنیٰ کی مطلقہ یا بیوہ مثل سگے بیٹے، کی مطلقہ یا بیوہ کے ناجائز و حرام سمجھی جاتی تھی اور اس سے نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اللہ نے آپ کا نکاح حضرت زینب سے کر کے اس رسم بد کو مٹا ڈالا جس کی وجہ سے کئی قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی تھیں۔ حضرت زینب اس پر فخر کرتی تھیں کہ ان کا نکاح آسمانوں پر ہوا ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، جب کہ باقی ازواج کا نکاح ان کے ولیوں نے زمین پر کیا ہے۔

اس وقت منافقین اور یہود نے اس مسئلہ پر بڑی ہنگامہ آرائی کی تھی اور آپ کے دامن عصمت پر طرح طرح کے داغ لگانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے بعد مستشرقین نے تو اس واقعہ پر وہ افسانوی رنگ چڑھایا اور وہ کہانیاں بیان کیں کہ جن سے علم وانسانیت شرمسار ہی ہوئے۔

ان کہانیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اتفاقاً حضرت زینب پر آپ کی نگاہ پڑ گئی اور آپ ان پر عاشق ہو گئے اور بات یہاں تک پہنچی کہ آپ نے حضرت زید کو مجبور کر کے زینب کو طلاق دلائی اور تمام سماجی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر زینب سے نکاح کر لیا، اب ذرا حقائق پر نظر ڈالیے اور مستشرقین کی بد دیانتی ملاحظہ فرمائیے:

الف: حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی زاد بہن تھیں اور آپ سے تقریباً بیس ۲۰ سال چھوٹی تھیں، اس لیے ان کی پیدائش اور پرورش آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوئی تھی۔

ب: اس دور کے عربوں میں پردے کا رواج نہ تھا، اس لیے حضرت زینب کو بچپن سے جوانی تک آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔ یوں بھی اتنے قریبی رشتے میں ناممکن تھا کہ آپ سے اتنا گہرا پردہ ہوتا کہ کبھی نہ دیکھ سکتے۔

ج: حضرت زینب کا نکاح خود آپ نے اصرار کر کے حضرت زید سے کرایا تھا، اگر آپ خود انھیں پسند فرماتے تو پہلے ہی نکاح کر سکتے تھے۔

مندرجہ بالا دلائل مستشرقین کی جہالت و کج فہمی اور دیدہ دلیری کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ تعصب اور بد دیانتی نے بے بنیاد کہانیاں گھڑنے پر مجبور کیا ہے لیکن کیا علمی دنیا میں ان کی کوئی حیثیت ہوسکتی ہے؟

۱۰- آٹھویں زوجہ محترمہ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ یہ ایک بڑے جنگجو اور انتہائی دشمنی پر آمادہ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔ جنگ میں بنو مصطلق کو شکست دی جا چکی تھی اور اس قبیلہ کے بہت سے لوگ قتل اور گرفتار ہو چکے تھے۔ اسیروں میں سردار قبیلہ حارث کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ عام فاتحانہ شان تو یہ ہوتی کہ سردار قبیلہ کی بیٹی اور دوسرے اسیروں کو لونڈی غلام بنا کر خوب ذلیل کیا جاتا مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کب گوارا ہوسکتا تھا وہ اجسام کی نہیں قلوب کی تسخیر چاہتے تھے کیوں کہ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ، آپ نے جویریہ کو آزاد کر کے انھیں شرف زوجیت بخشا۔ اس رشتہ مصاہرت نے صحابہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ آپ کے سسرالی رشتہ داروں کو غلام نہ بنائیں، پس سب نے اسیران بنو مصطلق کو آزاد کر دیا۔ بنو مصطلق کے قبیلہ والوں کے لیے یہ حیرت انگیز اور پہلا خوشگوار تجربہ تھا جس نے بڑا گہرا تاثر چھوڑا۔ یوں اس حکمت عملی نے دشمن قبیلہ کو دوست اور مسلمان بنا دیا۔

اب بد باطن دیکھیں کہ اس ایک نکاح نے کتنے دلوں کو مسخر کیا، کتنے لوگوں کو آزادی دلائی اور کتنے دشمنوں کو دوست بنا دیا۔ کیا اس نکاح کے پس پشت جنسی جذبے کا کوئی شائبہ بھی ہوسکتا ہے؟

۱۱- آپ کی نویں زوجہ محترمہ حضرت ام حبیبہ تھیں۔ یہ آپ کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان، سردار مکہ کی بیٹی تھیں، والد، اہل خاندان اور اہل قبیلہ کی سخت دشمنی کے باوجود یہ ابتدا میں ہی داخل اسلام ہوگئی تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ

حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ وہاں ان کے شوہر نے صحبت بد اختیار کی، شراب نوشی نے اسے عیسائیت اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور اسی حال میں وہ چند روز میں ہی مر گیا۔ اب یہ وہاں یک و تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئیں تھیں۔ اگر مکہ واپس آتیں تو ایمان و اسلام سے دست بردار ہونے پر مجبور کی جاتیں یا پھر جان سے ہی ہاتھ دھوتیں۔ اس کس مپرسی کی حالت میں آپ نے فوراً دست تعاون بڑھا دیا۔ نجاشی والی حبشہ کی معرفت پیغام نکاح بھیجا۔ نجاشی نے نہ صرف بحکم نبوی نکاح کرا دیا بلکہ چار سو دینار کا مہر بھی اپنے پاس سے ادا کیا اور حاضرین کی ضیافت بھی کی۔ اس کے بعد آپ کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔

اس نکاح سے صرف آپ کو ہی سہارا نہ ملا بلکہ اس رشتہ کا خوش گوار اثر یہ ہوا کہ ابوسفیان اور اس کے قبیلہ کی دشمنی بھی کمزور پڑ گئی کیوں کہ عرب کی معاشرتی روایت کے مطابق داماد سے جنگ کرنا انتہائی معیوب تھا۔ یہ نکاح ۷ھ میں فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان اور ان کے قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اس طرح یہ نکاح بھی دشمنوں کو ختم کرنے والا اور اسلام کے دائرے کو وسیع کرنے والا ثابت ہوا۔

۱۲- دسویں زوجہ محترمہ حضرت صفیہ بنت اخطب رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ صفیہ یہودی سردار حی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ اس سے قبل دو یہودی سرداروں کے عقد میں رہ چکی تھیں لیکن جنگ خیبر میں اسیر ہو کر لونڈی بن گئی تھیں۔ آپ نے انھیں یہ موقع دیا کہ اگر وہ یہودی مذہب پر کار بند رہنا چاہیں تو انھیں آزاد کر کے باقی قبیلہ والوں کے پاس بھیج دیا جائے گا اور اگر اسلام قبول کرلیں تو کاشانہ نبوت میں داخل کرلیا جائے گا۔ وہ ذہنی طور پر پہلے ہی سے اسیر اسلام تھیں، اب باضابطہ اسلام قبول کر کے شرف زوجیت سے سرفراز ہوئیں۔

کیا دو دو اشخاص کے نکاح میں رہی عورت میں ایسی کشش ہوسکتی تھی کہ آپ توجہ فرماتے اور دشمن کی اس بیٹی کو شرف زوجیت عطا فرماتے؟ ظاہر ہے کہ اس کے پس پشت یہی جذبہ کارفرما تھا کہ اس سے یہود کی دشمنی میں کمی آئے گی۔

۱۳- گیارہویں اور آخری زوجہ حضرت میمونہ بنت حارث الہلالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ ۷ھ میں عمرۂ قضا کے بعد نکاح میں آئیں۔ اس سے قبل دو اشخاص کے نکاح میں رہ چکی تھیں اور خاصی معمر تھیں۔ یہ نکاح عم رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی درخواست پر عمل میں آیا تھا۔ حضرت میمونہ کی دوسری بہن حضرت عباس کی زوجہ تھیں۔ اس رشتہ نے ان کی آٹھ بہنوں کے خاندانوں کو آپ سے جوڑ دیا۔ دراصل عربوں میں اس قسم کے رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ رشتے اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے افراد کو مربوط کرنے والی کڑی تھے اور مختلف کڑیوں سے مل کر ہی ایک مضبوط زنجیر وجود میں آتی ہے۔

اس بات کا پھر ایک بار اعادہ کر دیا جائے کہ یہ تمام نکاح اس وقت ہوئے ہیں جب آپ کی عمر شریف پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی بلکہ بیشتر نکاح پچپن سے انسٹھ سال کی عمر میں ہوئے ہیں۔ ایک کو چھوڑ کر باقی سبھی ازواج مطہرات بوقت نکاح ادھیڑ عمر کی یا معمر خواتین تھیں۔

عین عالم شباب میں تو انسان جوانی دیوانی، کے زیر اثر جوش وجذبات سے مغلوب ہو کر عورتوں کی طرف راغب ہوتا ہے لیکن پچاس سال کی عمر کا مرد جب شادی کرتا ہے تو اس کا ذہن تاجرانہ ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے وہ جنسی جذبے کی تسکین کے لیے نہیں، نفع ونقصان کو پیش نظر رکھ کر شادی کرتا ہے۔ شادی سے اس کا مقصد دنیاوی، دینی یا گھریلو مسائل حل کرنا ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ عظیم انسان جس نے عالم شباب میں بھی کبھی اس کوچہ میں قدم نہ رکھا ہو اور اب جس کا مطمح نظر ایک عظیم مشن کی تکمیل ہو، جس کی تبلیغ واشاعت میں وہ ہمہ تن مصروف ہو۔ بھلا جنسی جذبے کی تسکین ہی مقصد ہوتی تو آپ نوخیز اور نوجوان عورتوں سے شادی کرتے اور کیا آپ کے لیے ان کی کمی تھی؟ ایک اشارے پر کتنی ہی کنواری لڑکیاں خود کو ہبہ کرنے پر آمادہ تھیں لیکن وہاں تو عشق ہی کسی دوسری شے سے تھا۔ وہاں تو ایک ہی جذبہ تھا، ایک ہی لگن تھی کہ جس طرح بھی ہو مخلوق کو اس کے خالق لاشریک تک پہنچادوں اور یہ جذبہ، یہ لگن کس درجہ کی

تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خود خالق نے کئی بار ٹوکا، کئی بار یاد دہانی کرائی کہ آپ تو بس بشیر ونذیر ہیں، آپ کے ذمہ تو بس پیغام رسانی ہے، زبردستی منوانا نہیں۔ کئی بار اس جذبہ کی شدت کو کم کرنے کے لیے یہ تنبیہ بھی کی گئی کہ کیا آپ اس غم میں خود کو ہلاک کرلیں گے کہ تمام مخلوق اپنے خالق تک کیوں نہیں پہنچ رہی؟

بہر حال! یہ اس عشق کے اسرار ورموز ہیں جن کی ان تک رسائی نہیں ہوسکتی جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے، جو حیوانی جذبے اور حیوانی تعلقات سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ مغرب کا جنس زدہ اور حیوانی جذبات سے مغلوب معاشرہ انبیاء ورسل اور وہ بھی سید الانبیاء وسید الرسل کے مقام بلند اور ان کے فکر وعمل تک بھلا کہاں پہنچ سکتا ہے؟ آپ کو تو خیر وہ نبی ورسول مانتا ہی نہیں بلکہ ہر برائی اور ہر خرابی کو آپ سے منسوب کرتا ہے۔ جن انبیائے سابقین کو اہل مغرب مانتے ہیں، ان کے متعلق بھی ایسی ہرزہ سرائی کرتے ہیں کہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان کے ماننے اور عقیدت ومحبت کا معیار کیا ہے؟ شاید ہی کوئی رسول ان کے اتہامات سے بچے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جھوٹ بولنا ان کی کتب سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کا شراب پی کر اپنی ہی بیٹی سے زنا ان کی کتابوں میں مذکور ہے۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ یہ صرف دو مثالیں ہیں ویسے ان کے ہاتھوں کسی بھی نبی ورسول کی عصمت محفوظ نہیں رہی ہے۔

عام مستشرقین کی افسانہ طرازیوں اور یاوہ گویوں کے باوجود معقول، معتدل اور منصف مزاج مستشرقین نے ان شادیوں کی نوعیت، ضرورت اور مصلحت کو سمجھا ہے اور اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں صرف دو مستشرقین کے اعتراف کا حوالہ کافی ہے۔

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شادیوں کے بارے میں جس آخری بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ اپنی اور اپنے قریبی ساتھیوں کی شادیوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جو عربوں میں پہلے سے جاری تھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تمام شادیوں میں سیاسی تعلقات میں دوستانہ اضافہ کا مقصد کارفرما نظر آتا ہے''

" The last feature to be noted about Mohammad's marriages is that he used both his own and Those of the closest companion to further political ends. This was doubtless a continuation of older Arabian practice all Mohammad's own marriages can be seem to have a tendency to promote friendly relgious in the political sphere." (Mohammad at Madina., -w.Montgomery watt. P. 287\88 oxford 1956.)

مستشرق جان بیگٹ گلب نے اپنی کتاب 'دی لائف ٹائمس آف محمد' میں آپ کی شادیوں سے متعلق حقیقت پسندانہ تبصرے کیے ہیں۔اس کے بقول:

''یہ بات قابل غور ہے کہ جب آپ جوان تھے تو خدیجہ کے بطن سے ان کے چھ بچے ہوئے لیکن ان کے بعد مصری باندی، ماریہ سے ایک بیٹے کے علاوہ بارہ عورتوں سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔آپ کی اکثر ازواج گو بہت جوان نہ تھیں لیکن ان میں سے کئی بچے پیدا کرنے کے قابل ضرور تھیں۔ مدینہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرصت کا وقت بہت کم ملتا تھا اور اکثر اوقات آپ ذہنی وجسمانی طور پر بہت تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے خصوصاً جب کہ آپ کی عمر ۵۰-۶۰ سال کے درمیان تھی۔ یہ حالات ایسے نہیں ہیں جن میں مرد زیادہ جنسی تعلقات کی طرف رغبت محسوس کرے۔''

"It is noticeable that the aposite the when a young man, had six children by Khadija, yet he had no children by the twelve women who followed her, except for a son by Mary, the egyptian concubine Most of his wives, though not in their first youth were

capable of bearing children, in Madina Mohammad had less and less leisure time and must often have mentally and physically exhausted, especially as he was in his fifties and laterly over sixty. These are not the circumstances under which men are interested in the indulgence of extreme sexuality." (The life times of Mohammad,- john Bagot Clubb P.239, London, 1970.)

مندرجہ بالا تمام نکاحوں کے پس پردہ عوامل کا جائزہ اس کا شاہد عادل ہے کہ ہر نکاح کسی عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے ہوا تھا۔تاریخی حقائق کی روشنی اور معتدل اغیار کی شہادت اس حقیقت کو اظہر من الشمس بنا دیتی ہیں کہ آپ کی متعدد شادیوں کا مقصد ضرورت، مصلحت، سیاست، تالیف قلب اور مدد ومعاونت تھا کیوں کہ صحیح اسلامی معاشرے میں نہ مغرب جیسی گرل فرینڈ کی گنجائش ہے اور نہ برصغیر کی ''منھ بولی بہن''، بنانے کا طریقہ۔ اسلام میں حرمت والے رشتے ہیں یا پھر بیوی کا رشتہ ہے۔ اسلام میں صرف جائز اور معروف رشتے ہیں۔ایک سے زیادہ بیویاں تو ہوسکتی ہیں لیکن داشتہ، طوائف اور جنسی دوست ہرگز نہیں۔اہل مغرب قانونی طور پر تو صرف ایک بیوی رکھتے ہیں لیکن غیر قانونی جسمانی تعلقات پر کوئی قدغن نہیں لگاتے، اسے جائز وروا سمجھتے ہیں۔اسی لیے انھیں اسلام کی کثرت ازدواج کی اجازت ناگوار ہے اور وہ اس پر طرح طرح کے لایعنی اعتراضات کرتے ہیں لیکن ان کے اعتراضات سے ڈر کر صراط مستقیم کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی تاریخ ولادت

مولانا ساحل شہسرامی (علیگ)

رسول اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بزم کائنات میں تشریف آوری کس سال اور کس مہینہ، کس دن اور کس تاریخ کو ہوئی؟ اس سلسلہ میں ارباب تاریخ و سیرت مختلف نظر آتے ہیں۔ ہاں اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان مختلف روایات میں سے ۱۲/ربیع الاول دوشنبہ کی صبح کی روایت عملاً امت مسلمہ کے نزدیک ہمیشہ سے معمول بہا اور مقبول رہی ہے۔ ذیل کی تفصیلات میں ان مختلف روایات کا ترجیحی رخ متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کی وضاحت بھی کہ آخر کیا سبب ہے کہ امت مسلمہ نے ۱۲/ربیع الاول دوشنبہ کی روایت کو متعین طریقہ سے قبول کیا اور دوسری روایتیں قابل اعتنا نہیں ہوئیں، تاکہ دور حاضر کے اخبارات و جرائد کے حقیقی مقاصد نگاہوں کے سامنے آسکیں جو اس راویانہ تاریخی اختلاف کو بہت زیادہ اچھال کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ ایسے راویانہ اختلافات نہ کوئی اجنبی چیز ہیں اور نہ اس سے کسی متعین اور راجح قول کی صداقت اور استحکام پر اثر پڑتا ہے۔ فن تاریخ و رجال اور جرح وتنقید سے واقف حضرات اسے خوب جانتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کی تعیین کے سلسلہ میں چار زاویۂ بحث ہیں (۱) سال کون سا تھا (۲) مہینہ کون سا تھا (۳) دن کون سا تھا (۴) اور تاریخ کون سی تھی؟ اسے اتفاق ہی کہئے کہ ہر ایک کے سلسلے میں روایتوں کے اختلافات موجود ہیں۔ لیکن حضرات محدثین، رجال جرح وتنقید اور ارباب سیر کی

تصریحات کی روشنی میں ہر باب میں تعیین اور ترجیح کی منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

احقر ان بحثوں کو اسی مذکورہ ترتیب سے پیش کرتا ہے۔

ولادت نبوی کس سال ہوئی؟

اس سلسلے میں اولاً سات روایتیں ہیں۔ (۱) واقعۂ اصحاب فیل کے سال (۲) اس واقعہ کے دس سال بعد (۳) پندرہ سال بعد (۴) ۲۳ سال بعد (۵) تیس سال بعد (۶) چالیس سال بعد (۷) ستر سال بعد۔

لیکن جمہور اصحاب سیرت وحدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری واقعۂ اصحاب فیل ہی کے سال ہوئی۔ جب مکہ مکرمہ میں ابرہہ کے حملہ آور ہاتھی سواروں کو ننھے منے پرندوں کے پنجوں کی کنکریاں ہلاک کر رہی تھیں تو آپ سیدتنا آمنہ بنت وہب کے شکم مبارک میں تشریف فرما تھے۔ حدیث وسیرت کے جلیل القدر امام سیدنا علی بن محمد ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ اعلام النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

وآیةالرسول من قصة الفیل أنّه کان فی زمانهٖ حملاً فی بطن اُمّه بمکّة لانّهٗ ولد بعد خمسین یوماً من الفیل (اعلام النبوۃ ص ۲۷۰)

واقعۂ فیل سے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا گہرا رابطہ یوں ہے کہ اس دور میں مکہ معظّمہ کے اندر شکم مادری میں تھے کیونکہ آپ کی ولادت مبارکہ واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے:

قال ابن اسحاق وحدَّثنی المطلب بن عبد الله بن قیس بن مخرمة عن أبیه عن جدّه قال وُلدت انا ورسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم عام الفیل فنحن لدتان (سیرت ابن ہشام-۱/۱۷۵)

سیر ومغازی کے امام حضرت ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ مجھ سے مطلب بن

عبداللہ نے اپنے والد کے توسط سے اپنے جد کریم حضرت قیس بن مخرمہ سے روایت کرتے ہوئے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ان کے دادا قیس بن مخرمہ نے فرمایا: میں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دونوں واقعۂ فیل کے سال پیدا ہوئے ،اس لیے ہم دونوں ہم عمر ہیں۔

بلکہ امام بخاری علیہ الرحمہ کے استاذ گرامی حضرت ابراہیم بن منذر نے تو واقعۂ فیل کے سال کے علاوہ کی جتنی روایتیں ہیں سب کو وہم وخطا قرار دیا ہے۔

تفسیر روح المعانی میں ہے:-

روی أن القصة وقعت فی السنّة التی ولد فیها النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال ابراهیم بن المنذر شیخ البخاری لا یشك فی ذلك أحدٌ من العلماء وعلیه الاجماع وكل ماخالفه وهم ای من انها كانت قبل بعشر سنین أو بخمس عشرة سنة أو بثلاثٍ و عشرین سنة أو بثلاثین سنة او باربعین سنة أو بسبعین سنة الا قوال المذكوره فی كتب السیر (روح ا لمعانی-۳۰/۲۶۹)

واقعہ فیل اسی سال واقع ہوا جس میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ چنانچہ حضرت امام بخاری کے شیخ ،حضرت ابراھیم بن منذر فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا روایت میں کسی ایک عالم کو بھی شک کی گنجائش نہیں اور اسی پر امت کا اجماع ہے۔اس کے ماسوا سیرت کی کتابوں میں جو روایات منقول ہیں کہ واقعۂ فیل، ولادت مبارکہ سے دس سال، پندرہ سال، تیئیس سال، تیس سال، چالیس سال یا ستر سال پیشتر واقع ہوا۔سب کی حیثیت وہم وخیال سے زیادہ نہیں۔

اس لیے یہ متعین ہے کہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری واقعۂ فیل کے سال ہوئی کہ خود ارشاد نبوت ہے وُلِدْتُ عَامَ الْفِیْلِ۔میری ولادت عام الفیل میں ہوئی۔

اس تعین کے بعد دوسرا اختلاف یہ ہے کہ واقعۂ فیل کے سال ہوئی تو اس

کے کتنے دنوں کے بعد؟ اس سلسلہ میں بھی چار روایتیں ناچیز کو ملیں:

(۱) پچاس دن بعد (۲) پچپن دن بعد (۳) ایک مہینہ کے بعد (۴) چالیس دن کے بعد-لیکن پچاس دن والی روایت زیادہ مشہور ومقبول ہے۔

حاشیۂ اعلام النبوت میں سیرت ابن کثیر کے حوالے سے ہے:

والمقصود ان رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ولد عام الفیل علی قول الجمهور فقیل بعده بشهر و قیل باربعین یوما و قیل بخمسین یوما وهو ا شهر وقیل بعده بعشر سنین وقیل بثلاثین سنة قیل بأربعین سنةً(اعلام النبوة -ص ۲۷۰)

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ جمہور کے قول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واقعۂ فیل کے سال پیدا ہوئے۔ اس کے بعد یہ روایات بھی ہیں (۱) واقعۂ فیل کے ایک مہینہ بعد (۲) چالیس دن بعد (۳) پچاس دن بعد-یہی زیادہ مشہور ہے (۴) دس سال بعد (۵) تیس سال بعد (۶) چالیس سال بعد۔

وذُكِرَ أن الفیل جاء مكّةَ فی ا لمحرم و أنّهٗ صلی الله تعالیٰ علیه وسلم وُلد بعد مجی الفیل بخمسین یوما وهو الاكثر والا شهر-۵ (الروض الانف-۱/۱۸۴)

تاریخ میں یہی ذکر ہے کہ اصحاب فیل مکہ معظّمہ میں ماہ محرم الحرام میں داخل ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی آمد کے پچاس دن بعد ظاہری دنیا میں تشریف لائے۔یہی روایت زیادہ شہرت رکھتی ہے۔

سیدنا امام ابوجعفر کی ایک روایت پچپن دن سے متعلق بھی وارد ہے۔شیخ الدلائل حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث الہ آبادی مہاجر مدنی قدس سرہٗ اپنی مبارک تصنیف "الدُّرُّالمُنَظَّم فی مولِد النبی الاعظم" میں یہ روایت نقل کرتے ہیں:-

اخرج ابن سعد وابن ابی الدنیا و ابن عساكر عن ابی جعفر محمد بن علی قال كان قدوم اصحاب الفیل للنصف من المحرم فبین

الفیل و بین مولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خمسة و خمسون لیلة (الدرالمنظم ص۸۰)

حضرت ابن سعد، ابن ابی الدنیا اور ابن عساکر نے اپنے اپنے طبقات میں حضرت امام جعفر صادق کے والد مکرم حضرت امام باقر محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی یہ روایت (تخریج) ذکر کی کہ اصحاب فیل کی آمد ماہ محرم کے دوسرے عشرہ میں ہوئی تو واقعہ فیل اور ولادت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مابین پچپن دنوں کا فاصلہ تھا۔

تفسیر روح البیان میں ہے:

قال فی فتح الرحمٰن کان هذا عام مولد النبی علیه السلام فی نصف المحرم و ولد علیه السلام فی شهر ربیع الاول فبین الفیل و مولده الشریف خمس و خمسون لیلة وهی سنة سِتَّة الافٍ ومائة و ثلاث وستین من هبوط آدم علی حکم التواریخ الیونانیّة المعتمدة عندالمورخین و بین قصّة الفیل والهجرة الشریفة النبویة ثلاث و خمسون سنة (روح البیان -۱۰/۵۱۰)

تفسیر فتح الرحمٰن میں ہے کہ واقعۂ فیل ماہ محرم کے وسط میں نبی اکرم علیہ السلام کی ولادت مبارکہ کے سال ہوا اور نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ربیع الاول شریف کے مہینہ میں دنیا میں تشریف لائے تو واقعۂ فیل اور ولادت کے درمیان پچپن دنوں کا فاصلہ تھا۔ معتمد یونانی تاریخوں کے مطابق ولادت مبارکہ کے وقت سیدنا آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں تشریف لائے ہوئے چھ ہزار ایک سو تریسٹھ سال ہو چکے تھے۔ واقعۂ فیل اور ہجرت نبویہ کے درمیان ترپن سالوں کا فاصلہ موجود ہے۔

تفسیر روح المعانی میں ہے:

حضرت سہیلی اس بات کے قائل ہیں کہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واقعۂ فیل کے پچاس دن بعد دنیا میں تشریف لائے۔ واقعۂ فیل محرم الحرام میں اور ولادت مبارکہ ربیع الاول شریف میں ہوئی اور حضرت حافظ دمیاطی نے فرمایا کہ

واقعۂ فیل کے پچپن دن بعد ولادت ہوئی۔ چالیس دن بعد اور ایک مہینہ بعد کی بھی روایتیں ہیں لیکن مشہور وہی قول ہے جسے حضرت سہیلی نے اختیار کیا۔ (روح المعانی- ۳۰/۲۶۹)

مہینہ کون سا تھا؟

اس سلسلہ میں چھ روایتیں ہیں (۱) رجب (۲) صفر (۳) ربیع الآخر (۴) محرم (۵) رمضان (۶) اور ربیع الاول لیکن صحیح مشہور، معتبر اور قول جمہور ربیع الاول ہے اور باقی روایتیں ناقدین حدیث کے نزدیک سہو ہیں یا ان کے راویوں میں ضعیف اور مجروح راوی موجود ہیں۔

مشہور مصری محدث وفقیہ علامہ محمد زاہد الکوثری اپنے مقالات میں تحریر فرماتے ہیں:

قد اتفق جمهرة النقلة علی ان مولده کان عام الفیل و انه کان یوا لاثنین فأن شهر مولده هوشهر ربیع الاول –و ذکر شهر سواهٔ لمولده علیه السلام لیس الا من قبیل سبق القلم عند النقاد (مقالات کوثری-ص۴۰۵)

ناقدین حدیث کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ واقعۂ فیل کے سال، پیر کے دن، ربیع الاول شریف کے مہینے میں ہوئی۔ اور ربیع الاول شریف کے سوا کسی اور مہینہ میں ولادت مبارکہ کا تذکرہ محققین نقاد کے نزدیک سبقت قلم کے قبیل سے ہے۔

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ رسالہ مبارکہ ”نطق الہلال بارخ ولاد الحبیب والوصال“ میں تحریر فرماتے ہیں:

کیا مہینہ تھا؟ رجب، صفر، ربیع الآخر، محرم، رمضان سب کچھ کہا گیا اور صحیح و مشہور و قول جمہور ربیع الاول ہے۔ مدارج میں ہے: مشہور آنست کہ در ربیع الاول بود- شرح الھمزیہ میں ہے: الاصح فی شهر ربیع الاول ۔مواهب میں ہے:

وھوقول جمهور العلماء پھرکہا: فی ربیع الاول علیٰ الصحیح ۔شرح زرقانی میں ہے: قال ابن کثیر ھوالمشھور عندالجمھور -اسی میں ہےوعلیه العمل -علماءباآنکہ اقوال مذکورہ سے آگاہ تھے،محرم ورمضان ورجب کی نفی فرمائی- مواہب میں ہےلم یکن فی المحرم ولافی رجب ولارمضان شرح ام القریٰ میں ہے:لم یکن فی الأشھر المحرم أو رمضان ۔یہاں تک کہ علامہ ابن الجوزی وابن جزّار نے اسی پر اجماع نقل کیا۔نسیم الریاض میں تلقیح سے ہے:اتفقوا علیٰ أنه ولد یوم الاثنین فی شھر ربیع الاول ۔اسی طرح ان کی صفوہ میں ہے کما للزّرقانی ثمّ عزاه لابن الجزّار ۔پس اس کا انکار اگر ترجیحات علماواختیار جمہور کی ناواقفی سے ہوتو جہل ورنہ مرکب کہ اس سے بدتر (فتاویٰ رضویہ-۱۲/۲۵)

الدرالمنظم میں حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما کے حوالے سے ولادت بعثت اور ہجرت تینوں کو ماہ ربیع الاول اور یوم دوشنبہ کے ساتھ خاص فرمایا۔وہ لکھتے ہیں:

وَفی إنسان العیون وعن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنھما : ولد یوم الاثنین فی ربیع الاول و انزلت علیه النبوة یوم الاثنین فی ربیع الاول و هاجر إلی المدینة یوم الاثنین فی ربیع الاول۔ (الدرالمنظم ص ۴۷)

سیدالمفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے مروی ہے کہ آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن ربیع الاول شریف کے مہینہ میں رونق آرائے بزم کائنات ہوئے اور اسی دن اور اسی مہینہ میں آپ کو نبوت بھی عطا کی گئی اور آپ نے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت بھی فرمائی۔

مشہور محدث ومصنف حضرت علامہ امام یوسف بن اسماعیل نبہانی قدس سرہٗ نے بھی اس پر اتفاق نقل فرمایا۔آپ لکھتے ہیں:

صحیح ومشہور جس پر امام بخاری قدس سرہٗ کے استاد محترم حضرت ابراھیم بن منذر قدس سرہٗ اور حضرت خلیفہ بن خیاط قدس سرہٗ اور دوسرے محدثین کرام نے اجماع

نقل کیا ہے،وہ یہ ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔ہاں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ پیر کے دن ربیع الاول شریف کے مہینہ میں پیدا ہوئے۔

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا آپ ربیع الاول کی دوتاریخ کو دنیا میں تشریف لائے یا آٹھ کو یا دس کو یا بارہ کو۔یہ چار مشہور اقوال ہیں(جواہر البحار اردو-ص ۲۷)

اور شبلی بھی اس سے متفق ہیں-وہ لکھتے ہیں:

تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔(سیرۃ النبی ص ۱۱۰-حاشیہ)

دن کون سا تھا؟

اس سلسلہ میں تقریباً اجماع ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن رونق آرائے بزم کائنات ہوئے۔اس سلسلہ میں احادیث کریمہ بھی کثرت سے وارد ہیں۔البتہ ایک نہایت ضعیف قول جمعہ کا ہے۔

حاشیۂ اعلام النبوت میں ہے:

نہایت بعید بلکہ نہایت غلط ہے اس کا کہنا جس نے یہ کہا کہ سرکار کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جمعہ کے دن سترہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ (اعلام النبوۃ ص ۲۷۰)

پیر کی روایات میں حضرت سیدنا ابن عباس،سیدنا عکاشہ،سیدنا ابن خربوذ اور حضرت ابن اسحاق مطلبی رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی روایات ناچیز کی نگاہ سے گزریں جن سے دوشنبہ کی تعین ہوتی ہے۔"الدرالمنظم فی مولد النبی الاعظم" میں حضرت شیخ الدلائل نے یہ احادیث کریمہ ذکر فرمائی ہیں جو انہیں کے حوالے سے پیش کی جاتی ہیں۔

وروی احمد فی المسند عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنھما قال: ولد صلی الله تعالیٰ علیه وسلم یوم الاثنین و استنبی یوم الاثنین و خرج مهاجراً من مکة إلی المدینة یوم الاثنین و دخل المدینة یوم الاثنین ورفع الھجر الاسود یوم الاثنین (شرح المواھب للزرقانی)رفیه إرسال صحابی

لانه لم يدرك ذلك و كان فى الهجرة ابن ثلاث السنين (الدرالمنظم ص۴۴)

مسند امام احمد میں سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مالک دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ پیر کے دن پیدا ہوئے، اسی دن میں نبوت عطا کی گئی، مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی، اسی دن مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے۔ اور اسی دن حجر اسود کو اٹھا کر خانہء کعبہ میں نصب کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے مروی کہ شہنشاہ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ پیر کے دن ربیع الاول شریف کے مہینے میں ہوئی۔ آپ کو نبوت کی ذمہ داری بھی پیر کے دن ربیع الاول میں عطا ہوئی اور آپ کی ہجرت مدینہ بھی پیر کے دن ربیع الاول شریف میں ہوئی۔ (ایضا-ص۴۷)

حضرت امام مسلم سیدنا ابوقتادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پیر کے روزے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہی عظیم اور مبارک دن ہے جس میں میری پیدائش ہوئی، مجھے نبوت کی ذمہ داری عطا کی گئی اور مجھ پر نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ (ایضاً-ص٦٦)

حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کی روایت بہت طویل ہے جس میں ان کی بارگاہ رسالت سے شیفگتی اور محبت نبوی کی خوشبو رچی بسی ہے اور عقیدت نے ایک نیا انداز سیکھا ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے:

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن دنیا میں تشریف لائے۔ پیر ہی کے دن نبوت کریمہ کی ذمہ داری عطا کی گئی اور پیر ہی کے دن وصال حق سے سرفراز ہوئے۔ (ایضاً ص۸۹)

اخرج الزبير بن بكار وابن عساكر عن معروف بن خرّ بوذ قال كان ابليس يخرق السمٰوت السبع فلما ولد عيسىٰ حجب من ثلاث سمٰوت فكان يصل الىٰ اربع فلما ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم حُجِبَ من السبع قال ولد يوم الاثنين حين طلع الفجر

حضرت زبیر بن بکار اور ابن عساکر نے حضرت معروف بن خرّ بوذ سے روایت کی کہ انھوں نے فرمایا: پہلے ابلیس لعین کی ساتوں آسمان تک رسائی تھی، جب سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لائے تو آپ کی برکت سے تین آسمانوں سے روک دیا گیا۔ اب وہ صرف چار آسمان تک پہنچ پاتا تھا۔ لیکن جب رسول اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رونق افزائے بزم کائنات ہوئے تو ساتوں آسمان سے روک دیا گیا۔ راوی کہتے ہیں کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ٹھیک طلوع فجر صادق کے وقت دنیا میں تشریف لائے۔

انہی روایاتی صراحتوں کے پیش نظر ائمہ اسلام نے دوشنبہ شریف کو یوم ولادت تسلیم کرنے پر اتفاق کیا ہے اور جمعہ کا قول یوں بھی رافضیوں کی جانب منسوب ہے جیسا کہ آگے آتا ہے- امام اہل سنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

ولادت شریف کا دن کیا ہے؟ الجواب۔ بالاتفاق دوشنبہ صرح به العلامة ابن حجر فى افضل القرىٰ۔ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن کو فرماتے ہیں: ذلك يومٌ وُلِدتُ فيه۔ میں اسی دن پیدا ہوا۔ رواه مسلم عن ابى قتادة رضى الله تعالىٰ عنه (فتاویٰ رضویہ-۱۲/۲۵)

علامہ محمد ابو یوسف اسمٰعیل نبہانی قدس سرہٗ نے بھی اس پر اتفاق ذکر کیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے جواہر البحار کا حوالہ گزرا۔ اور اپنی تصنیف عالی حجۃ اللہ علیٰ العالمین میں بھی اس کی صراحت فرمائی ہے:

مواہب لدنیہ شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دوشنبہ کو طلوع فجر کے وقت دنیا میں تشریف لائے۔ (حجۃ اللہ علی العالمین ص۲۲۷)

تاریخ کون سی تھی؟

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اتنی سی بات تو متعین ہوجاتی ہے کہ آقائے رحمت سرور کونین روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ واقعۂ فیل کے

سال، ربیع الاول شریف کے مہینے میں دوشنبہ کے دن ہوئی۔ احادیث طیبہ، روایات سلف اور اقوال ائمہ کے مطابق یہی صحیح، درست اور محقق ہے۔ اس کے سوا باقی جو اقوال ہیں یا تو وہ سرے سے سہو وخطا ہیں یا ان کے راویانہ سلسلے میں شدید ضعف ہے۔ اب بحث صرف اس سے متعلق رہ جاتی ہے کہ وہ تاریخ عالم افروز کون سی تھی جس کی صبح نسیم رحمت نے ظلمتوں سے بھری پڑی اس دنیا کو شمع بزم ہدایت کی روشن، تاباں، سراپا نور کرنوں سے منور اور درخشاں کر دیا جس سے افق تا افق جگمگا اٹھے؟ اس سلسلے میں بھی آٹھ اقوال ملتے ہیں:

(۱) دو (۲) آٹھ (۳) دس (۴) بارہ
(۵) سترہ (۶) اٹھارہ (۷) بائیس (۸) نو

لیکن ان میں اہم ترین بارہ اور آٹھ کے اقوال ہیں۔ اور آٹھ نو کے اقوال بعض حضرات کے نزدیک نتیجتاً ایک ہیں۔ جو آٹھ کہتے ہیں ان کا مقصود یہ ہے کہ آٹھ تاریخ کا دن گزار کر آنے والی صبح میں وہ نور مجسم جلوہ بار ہوا اور نو کے قائلین کا مطلب یہ ہے کہ نو کی ابتدائی صبح میں وہ نور سراپا رحمت تشریف لائے۔

نو تاریخ کی روایت کا مدار دراصل محمود پاشا فلکی مصری کی تحقیق پر ہے۔ محدثین نے اسے بیان نہیں کیا۔ بعد کے مصنفین پاشا کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے نو کی روایت نقل کرتے چلے آئے۔ لیکن ماہرین فلکیات نے اس کی تحقیق دلائل کے ساتھ رد کر دی ہے۔ اکثر محدثین آٹھ ربیع الاول کے قائل ہیں۔ اور فن زیج اور علم ہیئت کے اصول بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ جو فلکیات میں اپنے وقت کے امام تھے، ان کی تحقیق بھی نو تاریخ کی روایت کو رد کرتی ہے اور آٹھ والی روایت کی تائید۔ وہ فرماتے ہیں:

وان کان اکثر المحدثین والمورخین علیٰ ثمان خلون وعلیه اجمع اهل الزیجات و اختاره ابن حزم والحمیدی و روی عن ابن عباس و جبیر بن مطعم رضی الله تعالیٰ عنهم و بالا ول صدر مغلطائی و اعتمده

الذهبی فی تذهیب الذهبی فی تذهیب التهذیب تبعا للمزی فی التهذیب وحکی المشهور بقیل – صحح الدمیا طی عشراخلت –

اقول: وحا سبنا فوجد نا غرة المحرم ا لو سطیة عام و لادته صلی الله تعالیٰ علیه وسلم یوم الخمیس فکانت غرة شهر الولادة الکریمة الوسطیة یوم ا لاحد والهلالیة یوم الاثنین فکان یوم الاثنین الثامن من الشهر ولذا اجمع علیه اهل الزیج وبمجرد ملاحظة الغرة الوسطیة یظهر استحالة سائر الاقوال ما خلا الطرفین والعلم بالحق عند مقلب الملوین

(تحفۂ حنفیہ، پٹنہ، جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ/ فتاویٰ رضویہ قدیم ۱۲/ ۲۷)

تاریخ ولادت نبوی کے سلسلے میں اکثر محدثین اور مورخین آٹھ ربیع الاول کے قائل ہیں اور اہل زیجات اور ماہرین فلک کا تو ۸؍ کی روایت پر اجماع ہے۔ اسی روایت کو ابن حزم اندلسی، حمیدی نے اپنا مختار قول بتایا اور حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی تاریخ مروی ہے۔ پہلا قول (۲؍ ربیع الاول) مغلطائی کا ہے اور امام ذہبی نے تذہیب التہذیب میں اسی روایت کو معتمد قرار دیا کیونکہ امام مزی نے تہذیب میں اسی روایت پر اعتماد فرمایا اور ۱۲؍ ربیع الاول کی مشہور روایت کو لفظ قیل سے بیان کیا۔ امام دمیاطی نے ۱۰؍ ربیع الاول کی روایت کو صحیح قرار دیا۔

میں (امام احمد رضا) عرض کرتا ہوں: میں نے فن زیج کے اصول کی روشنی میں حساب لگایا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے سال ماہ محرم کا غرّہ وسطیہ جمعرات کے دن پڑتا ہے۔ اس طور سے ماہ ولادت مبارکہ ربیع الاول شریف کا غرۂ وسطیہ اتوار کے دن اور غرۂ ہلالیہ پیر کے دن پڑے گا۔ پس پیر کا دن ۸؍ ربیع الاول کو واقع ہوگا۔ اسی لیے سارے اہل زیج اور فلکیات کے ماہرین کا ۸؍ تاریخ کی روایت پر اتفاق ہے۔ اور اگر صرف غرۂ وسطیہ کا لحاظ کیا جائے تو یوم ولادت کے سلسلے میں فن زیج کی روشنی میں سوائے دو اور بارہ ربیع الاول کی روایت کے کوئی صحیح نہ ہوگی

اورحقیقت حال کاعلم اس ذات کریم کے پاس ہے جوشب وروزکوگردش دیتا ہے۔

لیکن ترجیح ۱۲؍تاریخ کی روایت ہی کو حاصل ہے۔سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

سائل نے یہاں تاریخ سے سوال نہ کیا؟ اس میں اقوال بہت مختلف ہیں ۔دو، آٹھ، دس، بارہ، سترہ، اٹھارہ، بائیس، سات قول ہیں مگر اشہر و اکثر و ماخوذ ومعتبر بارہویں ہے۔مکہ معظّمہ میں ہمیشہ اسی تاریخ میں مکان مولد اقدس کی زیارت کرتے ہیں۔کمافی المواہب والمدارج (فتاویٰ رضویہ-۱۲/۲۶)

دویا اٹھارہ اور بائیس تاریخ کی روایتیں نہایت ضعیف ہیں۔سترہ کی روایت رافضیوں کی جانب منسوب ہے۔اب رہ گئے تین اقوال (۱) آٹھ (۲) دس (۳) بارہ- دس تاریخ طبقات ابن سعد میں سیدنا امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب منسوب ہےلیکن اس روایت میں تین ایسے راوی ہیں جن پر فنی اعتبار سے تنقید کی گئی ہے جیسا کہ علامہ زاہد الکوثری نے مقالات میں ذکر کیا ہے۔اس لیے اس قول کا پہلو بھی کمزور نکلا۔اب ساری گفتگو سمٹ کر ان دو اقوال میں آ گئی (۱) آٹھ (۲) بارہ چنانچہ علامہ زاہد الکوثری مصری محدث وفقیہ متوفی ۱۳۷۱ھ لکھتے ہیں:

فيدور الاختلاف المتعد به فى تعيين اليوم من شهر ربيع الاول هو عند انقضاء اليوم الثانى ،ام العاشر،ام الثانى عشر فلا يعتدون برواية تقدّم مولده عليه السلام على تلك الايام ولا برواية تاخره عنها بعدم استناد هما علىٰ شى يلتفت إليه – فدارالبحث فى ترجيح الراجح من تلك الروايات الثلاث ...... و اماالقول بان مولده فى اليوم العاشرمن الشهر فقد عزاه ابن سعد فى طبقات إلى محمد ن الباقررضى الله تعالىٰ عنه لكن فى سنده ثلاثة رجال متكلم فيهم ـ (مقالات کوثری-ص۴۰۵ اور ۴۰۷)

اب قابل ذکر اختلاف صرف ماہ ربیع الاول کا دن متعین کرنے کے سلسلہ میں دائر رہا کہ وہ ساعت ہمایوں ۲؍ربیع کا دن گزار کر آئی یا دس کو یا بارہ کو۔لہٰذا دو ربیع

الاول سے پہلے کی کوئی روایت معتبر رہی اور نہ ہی بارہ ربیع الاول کے بعد کا کوئی قول۔ اس لیے کہ ان تین روایتوں کے سوا مقدم یا مؤخر روایات میں کوئی قابل التفات سند اور بنیاد نہیں رکھتیں ۔لہٰذا اب بحث ان تین ہی روایات کے درمیان گردش کرے گی کہ ان میں سے کون راجح ہے............دس ربیع الاول کے قول کو طبقات ابن سعد میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔لیکن اس روایت کی سند میں تین ایسے راوی ہیں جن کے بارے میں کلام ہے۔

نو تاریخ کے قائلین میں بھی بہت سے مورخین اور اصحاب سیرت شامل ہیں لیکن متاخر مورخین کی بنیاد مشہور مصری ماہر فلکیات علامہ محمود پاشا کی تحقیقات ہیں جو انھوں نے فن ریاضی اور توقیت وھیت کی روشنی میں پیش کی ہیں۔

شیخ محمد خضری بک کی نورالیقین، علامہ محمد زاہد الکوثری کے مقالات، سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین، شبلی کی سیرۃ النبی وغیرہ میں محمود پاشا کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے ہی نو کی روایت مختار قرار دی گئی ہے۔چنانچہ شبلی لکھتے ہیں:

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹؍ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰؍اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔(سیرۃ النبی ۱/۱۰۹)

لیکن آگے چل کر واضح ہوگا کہ بارہ ربیع الاول شریف کی تاریخ مبارک ہی کثیر صحیح روایات اور اکابرین اسلام کی عملی تائیدات سے راجح اور محقق ہے-اور علامہ پاشا مصری کی تحقیقات جمہور کے پلیٹ فارم سے کیسے کھسک گئیں؟ اس کی بھی تفصیل آگے آئے گی۔

اب ناچیز جمہور کے اس موقف کو کہ بارہ ربیع الاول شریف کی تاریخ ہی راجح معتبر اور مستند روایات سے ثابت ہے، تین مرحلوں میں پیش کرتا ہے۔ پہلے مرحلے میں وہ روایات پیش ہوں گی جن سے صراحتاً یا اشارۃً اس موقف کا اثبات ہوتا ہے۔دوسرے مرحلے میں ائمہ سیر کے اقوال اور انھیں کے ساتھ متاخرین کی تائیدات

اورتیسرے مرحلے میں علامہ پاشا کی تحقیقات کا اجمالی جائزہ-واللہ الموفق

بارہویں شریف کی مؤید روایتیں:

اس سلسلے میں چار اہم روایتیں ناچیز کے پیش نظر ہیں۔سیدنا حضرت جابر بن عبداللہ اور سید المفسرین، حبر الأمۃ حضرت عبداللہ بن عباس جیسے جلیل الشان صحابہ کرام اور سید التابعین حضرت سعید بن مسیّب اور امام المغازی حضرت محمد ابن اسحاق رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی تصریحات یہی ہیں کہ سرکار دوعالم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری بارہ ربیع الاول شریف کی جاں بخش اور ایمان نواز صبح نور کو ہوئی-ان روایات کے متن یہ ہیں۔

(۱-۲) حضرت امام ابن ابی شیبہ اپنے مصنف میں حضرت جابر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما کی روایت ان سندوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

عن عثمان عن سعید بن میناء عن جابر و ابن عباس انّھما قالا: ولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول وفیہ بعث وفیہ عرج بہ الی السماء و فیہ ھاجر و فیہ مات۔

سیدنا حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے فرمایا: سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واقعۂ فیل کے سال پیر کے دن ۱۲؍ربیع الاول شریف کو دنیا میں تشریف لائے اور اسی دن تاریخ اور مہینہ میں آپ کو نبوت کی ذمہ داری عطا کی گئی، آپ معراج میں آسمانوں پر تشریف لے گئے، ہجرت فرمائی اور وصال حق سے سرشار ہوئے۔

(۳) شیخ الدلائل حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث الہ آبادی مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے ''الدر المنظم میں مولد النبی الأعظم'' میں حضرت سید التابعین سعید بن مسیّب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ان لفظوں میں پیش کی ہے:

وفی انسان العیون من سعید بن المسیب و لد رسول اللہ صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عند ا بھار النھار ای وسطہ و کان ذلك لمضی ثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من ربیع الاول (الدر المنظم ص۷۹)

(۴) سیرت ابن ہشام میں حضرت ابن اسحاق کی اس سلسلے میں یہ مشہور ترین روایت درج ہے:

عن محمد بن اسحق المطلبی قال ولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یوم الإثنین عشرۃ لیلۃً خلت من شھر ربیع الاول عام الفیل (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام-قاھرہ -۱/۱۷۵)

امام سیر ومغازی حضرت محمد بن اسحاق مطلبی نے فرمایا یا سید رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول شریف کو واقعۂ فیل کے سال رونق آرائے بزم کائنات ہوئے۔

یہ چار روایتیں صراحتاً جمہور کے موقف کو ثابت کرتی ہیں۔مزید ایک اور روایت سے ایک پہلو پر اشارۃً بھی اس مدّعا کا ثبوت نکلتا ہے۔

(۵) امام جلال الدین سیوطی قدس سرہٗ متوفی ۹۱۱ھ نے خصائص الکبریٰ میں اور شیخ الدلائل قدس سرہٗ نے الدر المنظم میں حضرت امام ابوجعفر محمد بن علی کی یہ روایت ذکر کی ہے:

اخرج إبن سعد و ابن ابی الدنیا و ابن عساکر عن أبی جعفر محمد بن علی قال کان قدوم اصحاب الفیل للنصف من المحرم فبین الفیل و بین مولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خمسۃ و خمسون لیلۃ (الدر المنظم ص۸۰)

ابن سعد، ابن ابی الدنیا اور ابن عساکر نے اپنے اپنے طبقات میں حضرت امام جعفر صادق کے والد مکرم حضرت امام باقر محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی یہ روایت ذکر کی کہ اصحاب فیل کی آمد ماہ محرم کے وسط میں ہوئی اس طور سے واقعۂ فیل اور ولادت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے درمیان پچپن دنوں کا فاصلہ تھا۔

تفسیر روح البیان میں فتح الرحمٰن کے حوالے سے اس روایت کی تائید ملتی ہے۔ مفسر علام سورۂ فیل کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

قال فی فتح الرحمن کان هذا عام مولد النبی علیه السلام فی نصف المحرم و ولد علیه السلام فی شهر ربیع الاول فبین الفیل و مولده الشریف خمس و خمسون لیلة وهی سنة ستة آلاف و مائة و ثلاث و سنین من هبوط آدم علیٰ حکم التواریخ الیونانیة المعتمدة عند المورخین و بین قصة الفیل و الهجرة الشریفة النبویة ثلاث و خمسون سنة (روح البیان-۱۰/۵۱۰)

تفسیر فتح الرحمٰن میں ہے کہ واقعۂ فیل ماہ محرم کے وسط میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے سال ہوا اور نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ربیع الاول شریف کے مہینہ میں تشریف لائے تو واقعۂ فیل اور ولادت مبارکہ کے درمیان پچپن دنوں کا فاصلہ تھا۔ معتمد یونانی تاریخوں کے مطابق ولادت مبارکہ کے وقت سیدنا آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں تشریف لائے ہوئے چھ ہزار ایک سو ترسٹھ سال ہو چکے تھے۔ واقعۂ فیل اور ہجرت نبویہ کے درمیان ترپن سالوں کا فاصلہ موجود ہے۔

صاحب تفسیر روح المعانی نے بھی حافظ دمیاطی کے حوالے سے یہ قول نقل کیا ہے جیسا کہ گزرا- ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ اور واقعۂ فیل کے درمیان پچپن دنوں کا فاصلہ ہے۔ اب ان روایات سے تاریخ ولادت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ واقعۂ فیل کس مہینہ اور کس تاریخ کو واقع ہوا؟

واقعۂ فیل کے تعین میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ فتح الرحمٰن اور روح البیان کی صراحت ابھی گزری کہ تاریخ کا یہ اہم ترین واقعہ ماہ محرم کے دوسرے عشرہ میں واقع ہوا۔ عصر جدید کے بہترین فاضل محقق اپنی قابل قدر تصنیف ضیاء القران میں قدرت کی بالادست قوتوں کے مظہر اس واقعہ کے رونما ہونے کی تاریخ سترہ محرم الحرام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

یہ عبرت انگیز واقعہ کس سال ظہور پذیر ہوا اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں لیکن صحیح قول وہ ہے جو ابن عباس اور دیگر محققین علماء سے منقول ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً پچاس دن پہلے یہ واقعہ رونما ہوا۔ عربی مہینہ کے ماہ محرم کی سترہ تاریخ تھی اور بارہ ربیع الاول کو سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رونق افزائے بزم گیتی ہوئے۔ ارشاد نبوی ہے وُلِدتُ عام الفیل کہ میری ولادت عام الفیل میں ہوئی (ضیاء القرآن-۵/۶۶۵)

اب اگر پچپن دن کی روایت کو اس روایت کے ساتھ ملا دیا جائے اور محرم و صفر دونوں مہینوں کو تیس دنوں کا مہینہ قرار دیا جائے تو تاریخ ولادت باسعادت بارہ ربیع الاول ہی برآمد ہوتی ہے۔ کیونکہ محرم کے مہینہ میں سترہ کے بعد تیرہ دن باقی رہتے ہیں پھر پورا صفر کا مہینہ تیس دن کا تسلیم کیا جائے اور پھر اس میں ماہ ربیع الاول کے بارہ دنوں کا اضافہ کیا جائے تو پچپن دن ہاتھ آتے ہیں جو مذکورہ بالا روایتوں کے مطابق ہے۔ (۱۳+۳۰+۱۲=۵۵)

اور ایسا تو ہوتا رہتا ہے کہ دو ماہ مسلسل تیس دن کے ہوں۔ اس لیے محرم اور صفر کے مہینوں کو مسلسل تیس دنوں کا تسلیم کر کے اس روایت کو بارہ ربیع الاول کی روایت کی تائید سمجھنا کوئی مستبعد نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فتاویٰ رضویہ میں ہے: کئی کئی مہینے متواتر تیس کے ہو جاتے ہیں اور کئی کئی انتیس کے۔ اور علم ہیئت کی رو سے چار مہینے پے در پے ۳۰ کے ہو سکتے ہیں اور تین ۲۹ کے۔ کماهو مصرح به فی الزیجات القدیمة والجدیدة و شروحها و أجابوه علی التجربة والا ستقرا و منهم من تکلف بیانه بالا ستد لال ولم یتم۔ شریعت مطہرہ میں ہیئت والوں کی اس تجدید استقرائی کا بھی اعتبار نہیں۔ ثبوت شرعی سے اگر چار مہینے لگاتار ۲۹ کے ثابت ہوں تو مانے جائیں گے اور مثلاً چھ مہینے متواتر روز ہلال ابر رہے اور ثبوت نہ ہو تو سب مہینے تیس کے لیے جائیں گے لان الثابت لایزول بالشک (فتاویٰ رضویہ قدیم-۴/۵۳۵)

اصحاب سیرت اور ائمۂ فن کے تائیدی اقوال:

احادیث طیبہ کے اسی تسلسل کی بنیاد پر اکثر ارباب سیر و مغازی اور ائمۂ فن نے ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخی روایت کو ترجیح دی بلکہ سیر و مغازی کی تدوین کا سہرا جن اصحاب فن کے سر جاتا ہے ان کی اولین تصانیف میں ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخ ہی درج ہے۔ حضرت موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ، حضرت ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ، حضرت محمد ابن اسحاق مطلبی متوفیٰ ۱۵۱ھ، حضرت ابن عمر واقدی متوفیٰ ۲۰۷ھ، حضرت ابن ہشام عبدالملک متوفی ۲۱۳ھ حضرت محمد بن سعد متوفیٰ ۲۳۰ھ اور مشہور مورخ و محدث حضرت ابن جریر طبری متوفیٰ ۳۱۰ھ قدست اسرارہم نے اپنی اپنی تصانیف میں آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری عام الفیل ۱۲؍ربیع الاول دوشنبہ کے دن ہی ذکر کی ہے جو مستند روایات کی روشنی میں ثابت شدہ ہے۔ یہ پیش رو مصنفین اور ان کی تصانیف، ثقاہت اور روایت کی اولیت کا وہ شرف رکھتے ہیں کہ بعد کے سارے مصنفین سیرت ان کے خوشہ چیں ہیں۔ اس لیے ان کی صراحتیں مکمل طور سے قابل اعتنا ہیں۔

اب اقوال و روایات کا وہ تسلسل دیکھئے جن میں مصنفین سیرت نے ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخ کو مختار اور صحیح ماننے کی صراحت کی ہے۔

(۱) امام المغازی محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ فرماتے ہیں:

ولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یوم الاثنین لإثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من شہر ربیع الاول عام الفیل۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول کو جلوہ افروز ہوئے۔

(۲) سیرت و مغازی کے امام حضرت علامہ ابن ہشام متوفیٰ ۲۱۳ھ اپنی کتاب سیرت نبویہ میں امام ابن اسحاق کی یہی روایت نقل کرتے ہوئے برقرار رکھتے ہیں (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۱/۱۷۵)

(۳) حضرت امام علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ تاریخ و سیرت کے اہل تحقیق اور عالم اسلام کی مشہور شخصیت ہیں۔ اپنی مستند تصنیف اعلام النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں جو متاخرین کا ماخذ ہے:

لِأَنَّہٗ ولد بعد خمسین یوما من الفیل و بعد موت أبیہ فی یوم الاثنین الثانی عشرمن شہر ربیع الاول (اعلام النبوۃ-ص۲۷۰)

واقعۂ فیل کے پچاس روز بعد اور اپنے والد مکرم کے وصال پانے کے بعد آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔

(۴) مشہور مفسر اور محقق مورخ امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے فرمایا:

ولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یوم الاثنین عام الفیل لاشنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شہر ربیع الاول (طبری-۲/۱۲۵)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ پیر کے دن ۱۲؍ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی۔

(۵) مشہور مفسر، محدث اور مورخ علامہ ابوالفدا اسمٰعیل بن کثیر متوفیٰ ۷۷۴ھ نے فرمایا:

ولد صلوات اللہ علیہ و سلامہ یوم الاثنین لما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث غیلان بن جریر عن ابی قتادۃ ان اعرابیا قال یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ما تقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذاک یوم ولدت فیہ وانزل علی فیہ۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت بروز پیر ہوئی۔ امام مسلم نے اپنی صحیح مسلم میں غیلان بن جریر کے واسطہ سے ابو قتادہ سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن کے روزے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں تو آپ نے فرمایا اس دن میری ولادت ہوئی اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔

پھر آپ نے حضرت ابن اسحٰق کے قول کو مختار قرار دیا اور اس پر حضرت جابر و حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی حدیث پاک کو بطور شہادت پیش کیا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر جلد اول)

(۶) فلسفۂ تاریخ کے عظیم محقق علامہ ابن خلدون متوفی ۱۴۰۶ء لکھتے ہیں:

ثم ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفيل لاثنتى عشرة ليلة خلت من ربيع الاول لأربعين سنة من ملك كسرىٰ نوشيروان (تاریخ ابن خلدون ۱/۱۰۷) ملک کسریٰ نوشیرواں کے چالیسویں سال عام الفیل میں ۱۲/ ربیع الاول کو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

(۷) مشہور محدث و امام ابن جوزی متوفیٰ ۵۹۷ھ اپنی کتاب الوفاء میں تحریر فرماتے ہیں:

ولد رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يوم الاثنين لعشر خلون من ربيع الاول عام الفيل و قيل ليلتين خلتا منه –قال ابن اسحاق ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين عام الفيل لاثنتى عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الاول (الوفالابن الجوزی)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن دس ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا کہ ربیع الاول کی دو تاریخ تھی۔ امام ابن اسحاق نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول عام الفیل کو پیدا ہوئے۔ لیکن ان تین اقوال میں سے بارہ کے قول کو اپنی دوسری تصنیف میلاد النبی میں راجح اور صحیح قرار دیا ہے- پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ اپنی تصنیف جان جاناں میں لکھتے ہیں:

علامہ ابن جوزی نے ولادت باسعادت کی تاریخ کے سلسلے میں تین مختلف اقوال نقل کیے ہیں (۱) ۱۲/ربیع الاول (حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ) (۲) ۸/ربیع الاول (حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)، (۳) ۲/ربیع الاول (حضرت

عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ)- یہ اقوال نقل کرکے فرمایا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (ابن جوزی میلاد النبی ص ۳۱)(جان جاناں ص ۱۷۶)

(۸) شارح بخاری امام احمد بن محمد ابوبکر بن عبدالملک بن احمد قسطلانی مصری شافعی متوفیٰ ۹۳۳ھ مواہب لدنیہ میں اور اس کے شارح علاّم محمد اسماعیل نبہانی انوار محمدیہ میں رقم طراز ہیں:

قد اختلف فی عام ولادته صلى الله تعالىٰ عليه وسلم والاكثرون انه ولد عام الفيل بخمسين يوما وانه فى شهر ربيع الاول يوم الاثنين لثنتى عشرة خلت منه عند طلوع الفجر (الانوار المحمدیۃ عن المواہب اللدنیۃ ص ۲۷-ترکی)

سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سال ولادت میں اختلاف ہے لیکن اکثر اس پر متفق ہیں کہ آپ واقعۂ فیل کے سال اس کے پچاس دن بعد دنیا میں تشریف لائے۔ طلوع فجر صادق کا وقت تھا، پیر کا دن اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ۔

(۹) علامہ جعفر بن حسین برزنجی علیہ الرحمہ اپنی مقبول ترین تصنیف مبارک مولود برزنجی میں لکھتے ہیں:

واختلف فی عام ولادته و فی شهر ها و یومها علی اقوال العلماء المروية ، والراجح انها قبل فجر الاثنين ثانى عشر ربيع الاول من عام الفيل الذى صده الله تعالىٰ عن الحرام (مولود برزنجی ص ۲۷)

سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے سال مہینہ اور دن تینوں پر علماء کرام کی روایات مختلف ہیں لیکن راجح یہی ہے کہ آفتاب رسالت کا طلوع، طلوع فجر سے ذرا پہلے پیر کے دن بارہ ربیع الاول کو واقعۂ فیل کے سال ہوا۔

(۱۰) مشہور محدث فقیہ و مصنف حضرت امام علامہ محمد یوسف ابن اسماعیل نبہانی متوفیٰ ۱۳۵۰ھ اپنی عظیم اور ضخیم تصنیف سیرت حجۃ اللہ علی العالمین میں حضرت امام ماوردی شافعی علیہ الرحمہ کے قول کو نقل کرنے کے بعد ارقام

فرماتے ہیں:

وقال الحافظ ابن رجب الحنبلی فی کتابه" لطائف المعارف فیما لمواسم العام من الوظائف" المشهور الذی علیه الجمهور انه صلی الله علیه وسلم ولد یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول وهو قول ابن اسحاق وغیره (حجۃ اللہ علی العالمین ص۲۳۰)

حافظ الحدیث ابن رجب حنبلی اپنی کتاب'' لطائف المعارف فیما لمواسم العام من الوظائف'' میں فرماتے ہیں: مشہور روایت جس پر جمہور امت ہے، یہ ہے کہ مدنی تاجدار رسول عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول کو دنیا میں تشریف لائے۔ یہی قول ابن اسحاق وغیرہ کا ہے۔

(۱۱) حضرت شیخ مرزوقی اپنی تصنیف منظومۃ عقیدۃ العوام اور حضرت سید علوی مالکی اس کی شرح جلاء الافہام میں لکھتے ہیں:

ولد النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم بمکّة الامینة وکان ذلك صبیحة یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول الموافق ۲۰/اپریل ۵۷۱ء وهو موافق عام الفیل (جلاء الافہام ص۵۷، مکہ مکرمہ)

جائے امان مکہ معظّمہ میں آقائے دوعالم نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت کریمہ پیر کی صبح بارہ ربیع الاول کو ہوئی جو واقعۂ فیل کا سال تھا اور عیسوی تاریخ ۲۰/اپریل ۵۷۱ء تھی۔

(۱۲) حضرت شیخ محمد بن محمد العزّ رحمہ اللہ اپنے رسالہ مولد میں تحریر فرماتے ہیں ؎

وبثان عشر من ربیع اول — فی یوم لاثنین المفخّم ذی الجدا
و بعام فیل صح ذاك کما آتیٰ — وروی الثقات به الحدیث معضّدا

(مجموعۂ مولد النبی للبرزنجی والدبیع والعرب ص۶۷-۶۸-مصر)

ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو پیر جیسے انعامات خداوندی والے باعظمت

دن میں واقعۂ فیل کے سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ یہی صحیح ہے جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے اور اس سلسلے میں ثقہ راویوں نے مستحکم حدیثیں روایت کی ہیں۔

(۱۳) اب کچھ جدید محققین عرب کی تصریحات دیکھئے۔

علامہ محمد الصادق ابراہیم عرجون ازہری لکھتے ہیں:

وقد صحَّ عن طرق کثیرة انّ محمدا علیه السلام ولد یوم الاثنین لاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل من زمن کسریٰ نوشیروان وبقول اصحاب التوفیقات التاریخیة ان ذلك الموافق المکمل للعشرین من شهر اغسطس سنة ۵۷۰ بعد میلاد المسیح علیه السلام (محمد رسول اللہ ۲/۱۹-مصر)

یہ بات کئی صحیح ذرائع سے ثابت ہو چکی ہے کہ بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن بارہ ربیع الاول عام الفیل کو نوشیرواں کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اہل تطبیق علماء کے قول کے مطابق یہی تاریخ ۲۰/اگست ۵۷۰ء عیسوی کے موافق بنتی ہے۔

(۱۴) مشہور مصری محقق علامہ محمد رضا لکھتے ہیں:

ولد النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فی فجر یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلةً مضت من ربیع الاول عشرین اغسطس ۵۷۰ واهل مکّة یزورون موضع مولده فی هذا الوقت (محمد رسول اللہ-جلد اول-مصر)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بوقت فجر بروز پیر بارہ ربیع الاول مطابق ۲۰/اگست ۵۷۰ء عیسوی کو پیدا ہوئے اور اہل مکہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقام ولادت کی زیارت کے لیے اسی تاریخ کو جایا کرتے تھے۔

(۱۵) ماضی قریب کے مشہور مصری مؤرخ ومصنف علامہ ابوزہرہ اپنی تصنیف خاتم النبیین میں لکھتے ہیں:

الجمهرة العظمى من علماء الرواية على ان مولده عليه الصلوٰة والسلام فى ربيع الاول من عام الفيل فى ليلة الثانى عشر منه و قد وافق ميلاده بالسنة الشمسية نيسان اغسطس۔ (معمولات اہل سنت ص ١١٧)

علمائے روایت کی بڑی کثرت اس بات پر ہے کہ آپ کا یوم میلاد عام الفیل کو بارہ ربیع الاول ہے اور آپ کا یوم میلاد سن شمسی نیسان اگست کے موافق ہے۔ مزید فرمایا کہ جمہور علماء نے اسی روایت پر انحصار کیا ہے۔ دوسری سب تاریخیں عقل کے سہارے پر مبنی ہیں اور روایات مشہور نہ بھی ہوں تو بھی ان کے مقابلہ میں عقل کو ترجیح نہیں ہوتی بلکہ روایت کو عقل پر ترجیح ہوتی ہے۔

(١٦) ابھی چند سالوں پہلے مشہور وہابی تنظیم رابطۂ عالم اسلامی کے زیر اہتمام سیرت کے موضوع پر تصنیفی مقابلہ ہوا تھا، جس میں پہلا انعام غیر مقلد عالم صفی الرحمٰن مبارک پوری کی الرحیق المختوم کو ملا۔ اسی مقابلہ میں شامل پانچویں انعام کی مستحق تصنیف سیرۃ نبی الھدیٰ والرحمۃ میں اس کے مصنف الاستاذ عبدالسلام ہاشم الحافظ لکھتے ہیں:

فى عام الفيل وبمكّة المكرمة وقد مضت اربعون سنة على بداية حكم كسرىٰ انوشيروان لبلاد فارس و فى يوم الاثنين الثانى عشر من شهر ربيع الاول الموافق لعشرين من شهر اغسطس سنة ٥٧١ للميلاد ولد أكمل خلق الله سيدنا و حبيبنا محمد عليه افضل الصلوٰة والسلام من الصّلب الظاهر (سیرۃ نبی الھدیٰ والرحمۃ ص ٥١- مکہ مکرمہ)

واقعۂ فیل کے سال مکہ مکرمہ میں پیر کے دن بارہ ربیع الاول کو مخلوقات الٰہیہ میں سب سے کامل ذات گرامی ہمارے آقا، ہمارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلب طاہر سے پیدا ہوئے۔ اس وقت ملک فارس کے کسریٰ نوشیرواں کی سلطنت کے آغاز کو چالیس سال گزر چکے تھے اور عیسوی تاریخ ٢٠؍اگست ٥٧١ء تھی۔

ان کے علاوہ متقدمین سے شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی، امام غزالی،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اقوال کا حوالہ ان کی تصانیف کے حوالے سے معمولات اہل سنت میں مذکور ہے جن سے بارہ تاریخ کی تائید ظاہر ہے۔

اب اردو مصنفین سیرت کی کچھ صراحتیں ملاحظہ کیجئے:

(١٧) مجاہد جنگ آزادی، علامہ مفتی عنایت احمد کاکوروی علیہ الرحمہ متوفیٰ ١٢٧٩ھ مخالفین کے بھی معتمد ہیں اپنی مقبول عام تصنیف سیرت، تواریخ حبیب الٰہ میں لکھتے ہیں:

بارہویں تاریخ ربیع الاول کی اسی سال میں جس میں قصہ اصحاب فیل واقع ہوا تھا بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور سارا عالم آپ کے نور سے روشن ہوا اور بہت سے عجائب وخوارق اس بات میں ظہور میں آئے۔ (تواریخ حبیب الٰہ-ص ١٣)

(١٨) مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ متوفیٰ ١٣٤٠ھ تحریر فرماتے ہیں:

اشہر و اکثر و ماخوذ ومعتبر بارہویں ہے۔ مکہ معظّمہ میں ہمیشہ اسی تاریخ میں مکان مولد اقدس کی زیارت کرتے ہیں۔ کما فی المواھب والمدارج ......علامہ قسطلانی وفاضل زرقانی فرماتے ہیں۔ المشهور انه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ولد يوم الإثنين ثانى عشر ربيع الاول وهو قول محمد بن اسحاق امام المغازى وغیرہ۔ شرح مواہب میں ابن کثیر سے ہے: هو المشهور عند الجمهور۔ اسی میں ہے هو الذى عليه العمل۔ شرح الھمزیہ میں ہے۔ هو المشهور وعليه العمل۔ اسی طرح مدارج وغیرہ میں تصریح کی (فتاویٰ رضویہ-١٢/ ٢٦) اس وقت شمسی تاریخ بستم اپریل ٥٧١ء تھی (ایضا-١٢/ ٢٧)

(١٩) غلام امام شہید اپنے مولد شریف میں لکھتے ہیں:

بارہویں تاریخ ربیع الاول دوشنبہ کے دن وقت صبح صادق بعد چھ ہزار سات سو پچاس برس زمانہ آدم علیہ السلام سے (انوار ساطعہ ص ١٩١)

(۲۰) علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی مدارج النبوۃ (۱۴/۲) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے مگر قول مشہور یہی ہے کہ واقعۂ اصحاب فیل سے پچپن دن کے بعد ۱۲/ربیع الاول مطابق ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء ولادت باسعادت کی تاریخ ہے۔ اہل مکہ کا بھی اسی پر عمل درآمد ہے کہ وہ لوگ بارہویں ربیع الاول ہی کو کاشانۂ نبوت کی زیارت کو جاتے ہیں اور وہاں میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے ہیں (سیرۃ المصطفیٰ ص ۵۸)

(۲۱) جدید طرز کے محقق فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری (پاکستان) عید میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت کے عنوان سے اپنے خطاب میں کہتے ہیں:

متقدمین ومتاخرین علماء ومحدثین کی اکثریت نے ۱۲/ربیع الاول کو ہی تاریخ میلاد رسول قرار دیا۔ دور جدید کے بعض ماہرین فلکیات اور بعض علماء نے ۹/ربیع الاول کی تاریخ بھی بیان کی ہے...... جدید تحقیق اور مورخین محدثین کی روایات کے مطابق وہ مبارک گھڑیاں جب آفتاب نبوت حضرت سیدہ آمنہ کی گود میں جلوہ فگن ہوا اور خاتم الانبیاء نے حضرت عبداللہ کے گھر کو رونق بخشی، ہمارے پاکستانی نظام الاوقات کے مطابق چار بج کر بیس منٹ کا وقت تھا۔ انگریزی مہینہ کی ۲۱/اپریل اور بعض روایات کے مطابق ۱۹/اپریل ۵۷۱ء تھا۔ دیسی اور ہندی حساب سے یکم جیٹھ بہار کی سہانی صبح صادق تھی (عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت ص ۱۲۹-۱۳۰)

ان حضرات کے علاوہ مشہور فاضل ڈاکٹر محمد عبیدہ یمانی نے اپنی کتاب "علموا اولادكم محبة رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم" ص ۹۹ میں مصر کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے حیات محمد میں، مشہور غیر مقلد نواب صدیق حسن خاں نے الشمامۃ العنبریۃ میں، اور نئے مکتب فکر کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی نے سیرت سرور عالم میں بارہ ربیع الاول کی روایت کو ہی ترجیح دی ہے۔ بلکہ مشہور محقق اور بزرگ فاضل ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ نے اپنی کتاب "جان جاناں" میں تو ہندوؤں

کی ایک مذہبی کتاب سے بھی اس روایت کی تائید پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ہندوؤں کی مذہبی کتاب بھاگوت پران اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں لکھا ہے:

وہ مظہر حق ۱۲/ربیع الاول بروز پیر پیدا ہوگا امن والے شہر میں ایک سردار کے یہاں جس کا نام عبداللہ ہوگا۔ اس کی ماں کا نام آمنہ ہوگا۔

(بھاگوت پران-اسکند ۱۲-باب ۲-شلوک ۱۸) (جان جاناں ص ۱۳۴)

روایات کا یہ تسلسل اور یہ صف در صف تصریحات جمہور کے مضبوط موقف کو ثابت کرنے کے لیے کافی سے زائد ہیں۔ اب ذرا ایک نگاہ تحقیق پاشا پر بھی ڈالتے چلیں۔

محمود پاشا فلکی کے قول کا تنقیدی جائزہ:

۶۱۰ھ میں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شاہزادے سیدنا ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال پرملال ہوا۔ اس حادثۂ جانکاہ کے غم میں جہاں دلوں کی دنیا غموں کی تاریکیوں میں ڈوب گئی، وہیں یہ رونقوں سے لبریز ہری بھری کائنات بھی ظلمتوں میں نہا گئی۔ سورج گہن بہت گہرا تھا۔ ماہ شوال میں جس وقت یہ حادثہ ہوا، اس وقت آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف ۶۳ سال تھی۔ اسی تاریخی واقعہ کی روشنی میں مصر کے مشہور ہیئت داں علامہ محمود پاشا نے علوم فلکیات اور زیج و توقیت کی روشنی میں آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت مسعودہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب آئیے اس بات کا جائزہ لیں کہ یہ تعین متعین ہی ہے یا اس میں جمہور کے موقف کی تائید بھی نکل سکتی ہے۔ لیکن اس کی وضاحت کے لیے چند بنیادی مقدمات کی تشریح ضروری ہے تا کہ یہ خالص علمی باتیں متوسط ذہنوں سے بھی کچھ قریب ہو جائیں۔

روایتوں کے اختلاف کا سبب:

یہ سارے روایاتی اختلافات اس بنیاد پر ہیں کہ اصحاب فیل کے عبرت انگیز واقعہ کا سال متعین نہیں، یونہی اس کی تاریخ بھی۔ گو مختلف اقوال میں ۱۷ محرم الحرام محققین کے نزدیک راجح ہے۔ اس تعین کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ اہل عرب کا دستور یہ تھا کہ وہ کسی اہم واقعہ کو بنیاد بنا کر دنوں اور سالوں کا تخمینہ لگایا کرتے تھے جیسا کہ تاریخ طبری میں سیدنا امام زہری اور امام شعبی کی یہ روایت درج ہے:

خانہ کعبہ کی تعمیر سے پیشتر عرب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ سے تاریخ کا حساب کرتے تھے۔ پھر جب سیدنا اسمٰعیل اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں کعبہ مقدسہ کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی تو تعمیر کعبہ سے تاریخ کا حساب کرنے لگے۔ البتہ جب یہ عرب ادھر ادھر منتشر ہونے لگے تو جو قبیلہ تہامہ سے باہر ہو جاتا تھا وہ اپنی اس علیحدگی سے تاریخ کا حساب کرتا تھا اور بنی اسماعیل میں سے جو لوگ تہامہ میں رہ جاتے تھے وہ سعد، ہند اور جہینہ بنی زید کے تہامہ سے خروج کے دن سے تاریخ کا حساب لگاتے۔ یہ طریقہ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اجداد کرام میں سے حضرت کعب بن لوئی کی وفات تک جاری رہا۔ اس کے بعد پھر بنی اسماعیل نے واقعہ فیل تک کعب کی موت سے تاریخ متعین کی اور واقعۂ فیل کے بعد اسی سے تاریخ کا شمار ہونے لگا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک تک یہی طریقہ رائج رہا۔ پھر آپ نے ۱۷ھ میں واقعۂ ہجرت سے تاریخ کی باضابطہ تعیین فرمائی جو قمری مہینوں کے حساب سے ہوتی ہے۔ طبری کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ ہجری سال کی تعیین اور ترویج سے پیشتر سالوں کا حساب محض واقعات کے سہارے ہوتا تھا جو مختلف حافظوں کے اختلافات سے ظن وتخمین اور بے یقینی کا شکار ہوتا رہتا تھا۔

سال اور مہینوں کی بے ترتیبی:

پھر سال کے مہینوں کی ترتیب میں بھی باضابطگی نہیں تھی۔ عرب جس موسم

میں اپنے مفادات زیادہ دیکھتے اس سے پر تقدس مہینوں کو ٹال دیتے تاکہ انھیں اس کے تقدس کی رعایت اور احکام خداوندی کی پاسداری میں اپنا کاروبار زندگی نہ چھوڑنا پڑے اور اپنے مفادات سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ اسی لیے ذی الحجہ جو حج کا مہینہ ہے، ہر مہینہ میں گردش کر جاتا۔ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ میں بھی عرب کی اس بے ضابطگی کی تصریح موجود ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

''مہینے زمانۂ جاہلیت میں معین نہ تھے۔ اہل عرب ہمیشہ شہر حرم کی تقدیم تاخیر کر لیتے جس کے سبب ذی الحجہ ہر ماہ میں کرجاتا۔ قَالَ اللّٰہ تَعَالیٰ اِنَّمَا النسئی زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَہٗ عَاماً وَّ یُحَرِّمُوْنَہٗ عاماً لِیُوا طئوا عِدَّۃِ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ (توبہ-۳۷) (ترجمہ: ان کا مہینے پیچھے ہٹانا نہیں مگر اور کفر میں بڑھنا۔ اس سے کافر بہکائے جاتے ہیں۔ ایک برس اسے حلال ٹھہراتے ہیں اور دوسرے برس اسے حرام مانتے ہیں کہ اس گنتی کے برابر ہو جائیں جو اللہ نے حرام فرمائی) یہاں تک کہ صدیق اکبر و مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہما نے جو ہجرت سے نویں سال حج کیا وہ مہینہ واقع میں ذیقعدہ تھا۔ سال دہم میں ذی الحجہ اپنے ٹھکانے سے آیا۔ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حج فرمایا اور ارشاد کیا: اِنَّ الزَّمَانَ قَد اِستدار کَھَیئَتِہٖ یَومَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الأَرض۔ الحدیث رَواہ الشیخان۔ یعنی زمانہ دورہ کر کے اسی حالت پر آ گیا جس پر روز تخلیق زمین و آسمان تھا (فتاویٰ رضویہ-۱۲/۲۵)

شمسی اور قمری سال کا فرق:

عیسوی سال شمسی ہوتا ہے اور ہجری سال قمری۔ چونکہ عیسوی سال کی بنیاد گردش آفتاب پر ہے اور اسلامی سال کی بنا گردش قمر پر، اسی لیے انھیں شمسی اور قمری کہتے ہیں۔ شمسی سال، قمری سال سے بڑا ہوتا ہے کیونکہ شمسی سال میں تین سو پینسٹھ دن تقریباً پونے چھ گھنٹے ہوتے ہیں اور قمری سال تین سو چون یا پچپن دن کا ہوتا ہے

(فتاویٰ رضویہ-۴/ ۵۱۸) اس طور سے شمسی سال، قمری سے تقریباً گیارہ دن بڑا ہوتا ہے۔اسی لیے دائمی تقومی پاکستان کے مرتب کے مطابق شمسی سال کا بتیس مہینہ، قمری سال کے تینتیس مہینہ کے برابر ہوتا ہے۔غیاث اللغات میں اس فرق کی بہت واضح تفصیل موجود ہے۔چنانچہ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

پس بمقابلۂ تعداد ایام ہر دو تاریخ در مدت دو سال و ہشت ماہ و شانزدہ روز و چہار گھڑی زیادت یک ماہ در شہور قمری پیدا گشت چرا کہ سال شمسی سہ صد و شصت و پنج روز و رُبع روز باشد و سال قمری سہ صد و پنجاہ و چہار روز و بست و دو گھڑی باشد و دریں جا مراد از روز مجموع روز و شب است کہ شصت گھڑی باشد۔پس ازینجا دریافت شد کہ سال قمری کوتاہ باشد از سال شمسی بدہ روز و پنجاہ و سہ گھڑی و نہ پل۔و سال شمسی دراز باشد از سال قمری بہفت گھڑی کم یازدہ روز تقریبی (غیاث اللغات ص۵۲۰ تحقیق لفظ فصل) ہجری تقویم سے پہلے شمسی نظام تقویم ہی رائج تھا۔اہل عرب قمری سال کو شمسی سال سے مطابق رکھنے کے واسطے ہر تین سال میں ایک مہینہ کا اضافہ کر دیتے تھے۔

ان تفصیلی مقدمات سے یہ بات واضح اور متعین ہوگئی کہ ولادت اقدس کے زمانہ میں ایسا باضابطہ تقویمی نظام رائج نہیں تھا جس سے کسی چیز کے بارے میں شمسی اور قمری نظام توقیت کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔مصری فاضل محمود پاشا نے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ، سیدنا حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یوم وصال سے ۶۳ سال قبل یعنی ۵۳/ہجری قبل مان کر قمری سال کی مطابقت سے تاریخ کی تخریج کی ہے۔حالانکہ ہجرت سے قبل ۵۳/شمسی سال کی مطابقت قمری سال سے لی جائے تو کم وبیش ایک ڈیڑھ سال کا اضافہ ہوگا کیونکہ یہ ۵۳/سال عرب میں رائج تقویم کے مطابق ہیں جو شمسی نظام سے چلتا تھا، نہ کہ ہجری تقویم کے مطابق جو قمری مہینوں سے چلتے ہیں اور مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات خوب واضح ہے کہ شمسی سال قمری سے بڑا ہوتا ہے۔اس لیے اگر اس مدت کا حساب قمری سال کے اعتبار سے لگایا جائے تو یہ تخمینہ ضرور اس سے زائد ہوگا۔اس لیے

بجائے ۵۳ سال قبل ہجرت کے ۵۴/سال قبل ہجرت فرض کر کے قمری مہینوں سے حساب لگایا جائے تو ایک صورت میں جمہور کے قول کے مطابق دوشنبہ کا دن ۱۲ یا ۱۳/ربیع الاول کو مل جاتا ہے۔وہ کیسے؟ اس کی تفصیل جناب شہاب الدین صاحب کانپوری سے سنیے۔وہ اپنے مضمون ''تاریخ ولادت کا تحقیقی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

چونکہ ۵۴ ہجری قبل کا سال عالمی تقویم کے مطابق شنبہ (سنیچر) سے شروع ہوتا ہے، اس لیے اس تقویم کے مطابق ۱۳/ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن آتا ہے جیسا کہ حضور کی ولادت مکۃ المکرّمہ کی مقامی رویت ہلال کے مطابق ہے۔اس لیے عالمی قمری تقویم کی تاریخ میں ایک دن کا تفاوت کوئی معنی نہیں رکھتا۔کیونکہ چاند کی تاریخ ایک مقام سے دوسرے مقام کی تاریخ سے ایک آدھ دن آگے پیچھے ہوسکتی ہے۔

تاہم عالمی ہجری تقویم جس کا ۵۴/ہجری قبل کا سال یکشنبہ (اتوار) سے شروع ہوتا ہے، اگر محرم اور صفر کے مہینے ۳۰/۳۰/دنوں کے لیے مان لیے جائیں (تقویم میں محرم ۳۰/دن کا اور صفر ۲۹/دن کا مانا گیا ہے) تو اس صورت میں ۱۲/ربیع الاول دوشنبہ کو ہی آتا ہے۔

اس طرح اس تاریخ کے بارے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔یقینی طور پر مقامی رویت ہلال کے مطابق ۱۲/ربیع الاول ۵۴/ہجری قبل میں بروز دوشنبہ کو ہی پڑا ہوگا جو مطابق ۵۷۰ء کے ہوتا ہے اس طرح سے اگر ہم حضور کی ولادت ۵۴/ہجری قبل ۵۷۰ء مان لی جائے تو حضور کی وفات شمسی سال کے مطابق ۶۳/ویں سال میں اور قمری سال کے مطابق پورے ۶۴/سال میں ہوتی ہے۔

محمود پاشا فلکی نے حضور کی ولادت کا سال ۵۳ھ ہجری قبل کا تعین کیا ہے۔یہ سال عالمی قمری (ہجری) تقویم کے مطابق جمعہ کے دن سے شروع ہوتا ہے۔اس طرح سے دوشنبہ کا دن ۸/ربیع الاول کو آتا ہے۔پھر بھی اگر محرم اور صفر کے مہینوں کو ۲۹/۲۹/دن کا مان لیا جائے تو ۹/ربیع الاول دوشنبہ ۵۳ ہجری قبل میں آسکتا ہے جو مطابق ۵۷۱ء کے ہوتا ہے۔اسی طرح سے اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور کی ولادت

۹/ربیع الاول بروز دوشنبہ کو ہی ہوئی ہے تو محمود پاشا نے جو ۹/ربیع الاول ۵۳ ہجری قبل مطابق ۵۷۱ء کا تعین کیا ہے، وہ ہجری تقویم کے مطابق درست ہے۔

لیکن جہاں تک سوال ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ۹/ربیع الاول کو متولد ہونے کا تو اس سلسلہ میں قرون اولیٰ کے اہل سیر اور مورخین کی کوئی مستند روایت نہیں ملتی ہے جب کہ ۱۲/ربیع الاول بروز دوشنبہ کے بارے میں مستند اور صحیح روایات موجود ہیں اور اس پر محدثین و علمائے کرام کا اتفاق بھی ہے۔ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-نومبر ۱۹۹۰ء ص ۲۸-۲۹)

اس اقتباس سے جہاں علامہ محمود پاشا کے استدلال سے ذرا ہٹ کر ۱۲/ربیع الاول کی تائید کا پہلو نکلتا ہے، وہیں مخالفین کے حلقہ سے ایک ایسی تحریر بھی سامنے آتی ہے جو جمہور اہل سنت کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ ورنہ ناچیز کے نزدیک نہ علامہ پاشا کا استدلال اتنا اہم ہے اور نہ دارالعلوم دیوبند کی یہ تردید۔ ہاں اس حلقہ کے لیے ضرور لمحۂ فکریہ ہے جو علامہ پاشا کی تحقیقات پر یقین کی حد تک اعتماد رکھتے ہیں اور ان کے تعین کو حتمی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے لیے تو موقفِ جمہور کے استحکام اور ترجیح کے لیے احادیث طیبہ، ائمہ سلف کا عہد بہ عہد اسی تاریخ کا مختار اور راجح بتانا اور مسلمانوں کا تعامل کافی ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

اور شک نہیں کہ تلقی امت بالقبول کے لیے شان عظیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: الفطر یوم یفطر الناس والاضحی یوم یضحی الناس عید الفطر اس دن ہے جس دن لوگ عید کریں اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس روز لوگ عید سمجھیں۔ رواہ الترمذی عن ام المومنین الصدیقة رضی الله تعالیٰ عنه بسند صحیح لاجرم عید میلاد والا بھی کہ عید اکبر ہے، قول و عمل جمہور مسلمین ہی کے مطابق بہتر ہے۔ فالا وفق العمل ما علیه العمل (فتاویٰ رضویہ- ۱۲/۲۶-۲۷)

بلکہ اصول حدیث کا یہ مسلم ضابطہ ہے کہ جس روایت کو جمہور امت نے قبول کر لیا مختلف روایات کے درمیان اسے ہی ترجیح ہوگی۔ چنانچہ ملک العلماء علامہ سید محمد ظفر الدین قادری رضوی قدس سرہٗ لکھتے ہیں:

الحدیث الضعیف یکون قویا بعمل اهل العلم قال الملا علی القاری فی المرقاة اول الفصل الثانی من باب ما علی الماموم من المتابعة رواه الترمذی و قال غریب والعمل علیٰ هذا عند اهل العلم قال النووی وإسناده ضعیف نقله غیرك فکان الترمذی یرید تقویة الحدیث بعمل اهل العلم ......وقال الامام السیوطی فی التعقبات باب الصلاة تحت حدیث صلوٰة التسبیح نقلا عن الامام البیهقی: "تداولها الصالحون بعضهم من بعض وفی ذلك تقویة للحدیث المرفوع ......وقد صرح غیر واحد بان من دلیل صحة الحدیث قول أهل العلم به و إن لم یکن له إسناد یعتمد علیٰ مثله اه۔ هذه اقوال العلماء فی احادیث الاحکام فما ظنك بأحادیث الفضائل (صحیح البہاری ص ۶-۷)

حدیث ضعیف پر علما اور محدثین نے اگر عمل کر لیا تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔

مرقاۃ شرح مرقات باب ''ماعلیٰ الماموم من المتابعۃ'' کی فصل ثانی کی پہلی حدیث کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں: امام ترمذی نے یہ حدیث روایت کی اور فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے لیکن علما کا عمل اسی پر ہے۔ حضرت امام نووی فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند ضعیف ہے جسے......نقل کیا۔ امام ترمذی نے جو یہ فرمایا کہ علما کا اس حدیث پر عمل ہے، اس بات سے وہ اس حدیث کی تقویت بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام سیوطی اپنی کتاب تعقبات باب الصلوٰۃ میں صلوٰۃ التسبیح کی حدیث کے تحت امام بیہقی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس روایت کو صالحین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک دوسرے سے اس کی روایتیں سنیں۔ صلحا کے اس طرز عمل سے حدیث مرفوع کی تقویت ہوتی ہے......بے شمار محدثین نے فرمایا ہے کہ اگر علما اور محدثین کسی حدیث کے قائل ہوں تو یہ اس حدیث کی صحت کی ضمانت ہے اگر چہ اس کی سند اصولاً مکمل طور سے قابل

اعتماد نہ ہو۔علما اور محدثین کی یہ رائیں تو ان احادیث کے بارے میں ہیں جن سے
احکام ثابت ہوتے ہیں تو پھر فضائل میں ضعیف احادیث کیوں نہ معتبر ہوں گی۔
اس لیے بارہ ربیع الاول کی تاریخ ہی عمل کے لیے منتخب اور متعین ہوگی۔اب یہاں یہ
سوال بھی ذہن میں سر ابھارتا ہے کہ آخر تین روایتوں کے درمیان بارہ ربیع الاول کی
تاریخ ہی کو کیوں اکابرین ملت اور امت مسلمہ نے قبول اور منتخب کیا؟

بارہ ربیع الاول کی روایت پر کیوں عمل ہوا؟

اس کا جواب مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ اس روایت کی پشت پر صحیح
اور معتبر کثیر روایات کے ذخیرے ہیں، آثار صحابہ اور عمل تابعین کی تائیدات ہیں اور
اصحاب زیج کے تخمینی اندازوں سے بھی اس کی تقویت کے سامان ہوتے ہیں تو پھر بھلا
امت مسلمہ اسے نہ قبول کرے تو اور کسے قبول کرے؟ مزید برآں اس کا سبب یہ بھی
ہے کہ محققین کے نزدیک اس سلسلے میں باقوت روایتیں آٹھ، دس اور بارہ ربیع الاول
کی ہیں۔اس کے سوا نقد وتحقیق کے معیار سے فروتر ہیں جیسا کہ علامہ کوثری اور شبلی
وغیرہ کے بیانات گزرے۔تو بارہ ربیع الاول ان تین روایتوں کی آخری سرحد ہے
جس سے آگے تاریخ ولادت کی روایت تحقیق کی روشنی میں نہیں بڑھ سکتی اور یہاں
آکر ولادت مبارکہ کا یقین ہو جاتا ہے۔اسی لیے ظن وتخمین کا پہلو چھوڑ کر اس یقین
کے پہلو کو امت نے قبول کیا جس کے بعد شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔چنانچہ علامہ
زاہد الکوثری مصری لکھتے ہیں:

والعادة المتبعةُ فی البلاد الاسلامیة الاحتفاء بالمولد الشریف فی
اللّیلة الثانیة عشرة من شهر ربیع الاول لأنّ ولادتهٗ لم تتاخر عن هذا التّاریخ
عندالجمیع فیحتفون به فی لیلة لا یبقیٰ ایُّ خلاف یعتد به بعدها فی کونه
علیه السلام مولود اقبل ذالك الزمن (مقالات کوثری-ص۴۱۴)

اسلامی ملکوں میں یہی رواج ہے کہ عید میلاد النبی کا جشن ربیع الاول شریف

کی بارہویں شب میں مناتے ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ سبھی محققین کے نزدیک تاریخ
ولادت مبارکہ ۱۲/ سے آگے نہیں بڑھی۔اسی لیے آپ کی ولادت مبارکہ کا جشن اسی
رات میں مناتے ہیں جس کے بعد سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولات مبارکہ
کے سلسلے میں کوئی قابل لحاظ اختلاف باقی نہیں رہ جاتا۔

اختلاف روایات کا سبب:

اس سے پہلے یہ گفتگو آچکی ہے کہ اختلافات کی اصل بنیاد عام فیل کا متعین
نہ ہونا ہے۔اور اس کے تعین کے فقدان کا سبب صرف یہ ہے کہ عرب کے یہاں نہ
تاریخ نویسی کا اہتمام تھا اور نہ ہی کوئی باضابطہ تقویمی نظام رائج تھا بلکہ وہ کسی اہم واقعہ
سے کسی کی عمر یا مدت کا تعین کرتے۔گو عرب بڑے قوی الحافظہ تھے اور ہزاروں سال
کی روایتیں اور نسبی سلسلے ان کے ذہن و دماغ میں بڑی صحت کے ساتھ ایسے محفوظ
رہتے جیسے آج کل کمپیوٹر کے سینۂ معلومات میں۔لیکن پھر بھی حافظہ اور اس کی قوت کا
اختلاف انسانی فطرت ہے اور اس فطرت انسانی کی بنا پر یہ روایاتی اختلافات موجود
ہیں جو نہ کوئی انہونی چیز ہیں اور نہ قابل تعجب بلکہ اس دور میں اس کے مناظر عام طور
سے دیکھے جا سکتے ہیں۔اس کے باوجود دور حاضر کے بعض مستشرقین ان اختلافات پر
حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں۔جب کہ خود سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ
والتسلیم کی تاریخ ولادت میں اس سے کہیں زیادہ اور فاصلے کے اختلافات موجود
ہیں۔یہاں تو تاریخ اور مہینہ کا ہی اختلاف ہے بلکہ حقیقتاً صرف تاریخ کا اختلاف ہے
کیونکہ ماہ ربیع الاول شریف کے علاوہ جتنی روایات ہیں، محققین اسے وہم سے تعبیر
کرتے ہیں۔جب کہ سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تاریخ ولادت میں
صرف تاریخ اور مہینوں کا ہی اختلاف نہیں بلکہ وسیع اور طویل سالوں کے اختلافات
موجود ہیں۔پھر بھی بانی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت مبارکہ کے مختصر
اختلاف پر حیرت وتعجب کا اظہار خود باعث حیرت واستعجاب ہے، بلکہ سوائے اسلام

دشمنی کے اس کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

علامہ محمد زاہد الکوثری مصری لکھتے ہیں:

کما انه لا عجب فی اختلاف الرواة فی تاریخ میلاده صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لانه ولد بین امة امیة لا تخرب ولا تکتب ولا تورخ الا باحداث معروفة عندهم فی مبداء الامر ـ

فلا محل فی ان یعیبنا البرنس قیستانو "" علی هذا الاختلاف مع سعیه فی تکثیر الروایات عن کل من هب ودب فی تاریخه الکبیر عن الاسلام متناسیا مبلغ الاختلاف العظیم بالسنین لابالا یام الواقع فی میلاد عیسیٰ علیه السلام مما لاطریق معه إلی تحدید زمنه اصلا لتباعد مابین روایا تهم من التفاوت الشاسع الذی لا جامع له بخلاف ماهنا لان تحدید زمن ولادة نبینا صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ثبت بروایة راجحة ایدتها درایة نا جحه کما سبق ـ (مقالات کوثری۔ص ۴۰۷-۴۰۸)

تاریخ ولادت نبوی کے سلسلے میں راویوں کا اختلاف کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسی قوم کے درمیان تشریف لائے جو ناخواندہ تھی۔ وہ شروع ہی سے حساب کتاب اور تاریخ کا تعین اپنے ماحول کے معروف واقعات کے ذریعہ کیا کرتی تھی۔

اس لیے مستشرق مسٹر ''برنس قیستانو'' کا اس اختلاف روایات کو لے کر ہم پر بے جا تنقید کرنا بالکل بے محل ہے، جب کہ خود ان کا یہ حال ہے کہ اپنی عظیم تاریخی تصنیف میں اسلام کے بارے میں ہر کہ ومہ سے کثیر روایات کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ غالبًا وہ فراموش کر چکے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت مبارکہ کے سلسلے میں دنوں کا ہی نہیں بلکہ سالوں کا عظیم اختلاف موجود ہے اور اس سلسلے کے سلجھانے کی بھی کوئی صورت نہیں کیونکہ ان روایات میں ناقابل ترجیح تفاوت موجود ہے۔ اس کے برخلاف تاریخ ولادت نبوی کا راجح مختار محقق تعین، مضبوط اور

راجح روایت سے ثابت ہے جس کی تائید عقل سلیم بھی کرتی ہے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت گذشتہ سطروں میں ہو چکی۔

آقائے کائنات رسول دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس جہان رنگ و بو میں تشریف آوری کی ساعت مسعود کون سی تھی؟ اس کے تعین کے سلسلے میں مختلف زاویوں سے بحث کے بعد یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ ۱۲/ربیع الاول پیر کی صبح جاں نواز ہی نبوی انوار و تجلیات سے اولاً سرفراز ہوئی جن سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا ۔

تم آئے، روشنی پھیلی، ہوا دن، کھل گئی آنکھیں
اندھیرا سا اندھیرا چھا رہا تھا بزم امکاں میں

(حسنؔ)

ایک مومن کے لیے احادیث طیبہ، اقوال سلف، ترجیحات ائمہ اور تعامل امت کی تائیدات کسی بھی روایتی رخ کو متعین کرنے کے سلسلے میں تسکین قلب اور اطمینان روح کے لیے کافی ہیں۔ وہ ان قوی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کبھی بھی ظن و تخمین اور وہم و تشکیک کا شکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسلام کے مسلمات میں شک کی راہیں پیدا کرنا یہود و نصاریٰ کی جدوجہد کا محور رہا ہے۔ چنانچہ مشہور برطانوی جاسوس ہمفرے اپنی یادداشتوں میں اسلام کو کمزور کرنے کے یہودی طریقۂ کار کی ہدایتوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود قرآن میں کمی بیشی کر کے لوگوں کو شک میں مبتلا کیا جائے۔ خاص طور پر کفار اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں توہین آمیز آیات نیز امر بالمعروف اور جہاد سے متعلق آیتوں کو قرآن سے حذف کیا جائے اور ان قرآنوں کو ترکی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کر کے بازاروں میں لایا جائے۔ غیر عرب مسلم حکومتوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں قرآن، اذان اور نماز کو عربی زبان میں پڑھنے سے پرہیز کریں۔

دوسرا مسئلہ احادیث و روایات میں تشکیک پیدا کرنا ہے اور قرآن کی طرح

اس میں بھی تحریف وترجمہ سے کام لینا ہے(ہمفرے کے اعترافات ص ۱۱۶)

دور حاضر کے محققین کا تجزیہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ عالم عرب کے مشہور محقق مولانا سید محمد علوی مالکی مکی دام ظلہٗ اپنی قابل قدر مختصر تالیف ’ المستشرقون بین الانصاف والعصبیۃ‘‘ میں اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حدیث نبوی کے موضوع پر کام کرنے والے بہت سے اہل تحقیق مستشرقین کے دوطرح کے نقطۂ نظر ہیں۔ایک حدیث سے متعلق اور دوسرا راویوں سے متعلق۔حدیث کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ لوگ ان صحیح احادیث سے متعلق بھی شبہات پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں جن پر ہمارے محققین علماء اعتماد کر چکے ہیں اور ہمارے علماء کی ان کاوشوں سے تجاھل برتتے ہیں جو انھوں نے حدیث صحیح وغیر صحیح کو چھاننے پھٹکنے کے سلسلے میں کی ہیں۔(مستشرقین کا انصاف وتعصب ص ۳۸)

علوم اسلامی کی خدمت کے نام پر ذہنی تشکیک اور فکری انتشار کا کارنامہ یورپ کے مستشرقین عرصۂ دراز سے انجام دے رہے ہیں۔ ماضی قریب کے چند نام نہاد اسلامی مفکرین جیسے شبلؔی اور مودودی نے بھی تحقیقات اسلامی کے عنوان سے ان اسلامی مسلّمات کو زک پہنچانے میں اپنی پوری توانائی صرف کردی جس پر امت مسلمہ پورا وثوق، یقین اور اعتماد رکھتی تھی۔

اب مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات کی شک انگیز خدمات قابل قدر ہیں یا قابل مذمت۔ ارباب فکر ونظر مذکورہ بالا محققین کے حوالہ جات کی روشنی میں خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں اور اسی سے غیر مقلد اور وہابیت نواز اخبارات و جرائد کے داخلی مقاصد اوران کے فکری کاز کا رشتۂ عمل بھی واضح ہوجاتا ہے۔ہاں اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ نام نہاد تحقیق ہی کے نام پر کیوں نہ ہو،فکری انتشار کی کوشش کبھی بھی قابل قدر نہیں ہوسکتی،خصوصاً جب کہ دلائل اور براہین اس سے اِباء کرتے ہوں۔

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی دعائیں بھی درس دیتی ہیں

ڈاکٹر محمد افضال برکاتی

میڈیکل چیمبر، ریلوے روڈ، اٹاوا

کائنات کی آفرینش سے پہلے اور آج تک، ہر زمانہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا زمانہ ہے۔اسی نے زمانے کو پیدا فرمایا اوراس میں موجود ہر شے کو اپنی قدرت کاملہ سے وجود بخشا اور حکمت بالغہ سے درجہ بدرجہ اس کی پرورش کر کے کمال عروج تک پہنچایا۔ اس کو راحت وآرام بخشا تو کبھی مصائب وتنگی سے گزار کر اس کی آزمائش کی۔اس کا احسان عظیم ہے کہ مصائب وآلام سے نجات دلانے کے لئے اس نے صبر اور دعا جیسی عظیم نعمتیں بھی عطا فرمائیں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے اخلاف اور امت کو دعا ومناجات کے الفاظ وآداب سکھلانے کے لئے حضرت آدم کو اس کی تعلیم کا سبب بنایا اور خود حضرت آدم کو مستجاب الدعوات قرار ٹھہرایا۔ آلام ومصائب کی الٹ پلٹ کا یہ سلسلہ ہر نبی کے دور میں چلتا رہا۔ضرورت کے اعتبار سے دعائیں نازل ہوتی رہیں۔اُمتیں سختیاں اور مصیبتیں جھیلتی رہیں اور دعائیہ کلمات کے ساتھ ساتھ بارگاہ ایزدی میں اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کو واسطہ بنا کر اس کی رحمت، نصرت اور مغفرت طلب کرتی رہیں۔انبیاء ومرسلین نے بھی انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضی وغضب سے بچانے کے لئے دعا ومناجات میں کوئی کسر نہ چھوڑی جیسا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ خبر دی ہے: ہر نبی کی ایک دعا خصوصا قبول ہوتی

ہے۔ ہر نبی نے اپنی وہ دعا استعمال کر لی اور میں نے اپنی دعا روز قیامت کے لئے بچا رکھی ہے اپنی امت کی شفاعت کے واسطے۔ چنانچہ میری وہ دعا انشاء اللہ ہر اس امتی کو پہنچے گی جو اس طرح مرے کہ رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو [بخاری، مسلم] کے حدیث پاک کا سیاق وسباق ہمیں خبر دے رہا ہے کہ روز جزا کی وحشت اور ہولناکی، پیدائش حضرت آدم سے قیامت برپا ہونے تک عالم دنیا میں رونما ہو چکے بڑے سے بڑے روح فرسا حادثے سے بڑھ کر ہوگی کہ اس دن امت تو دور ہر مستجاب الدعوات نبی ورسول جو دنیا میں اللہ کے فضل سے بزدلی اور کم ہمتی سے دور تھا، خوف الٰہی میں مبتلا ہوگا سوائے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے کہ اس دن شفاعت کا بند دروازہ آپ ہی کے لب اقدس کے مخصوص دعائیہ الفاظ کی جنبش سے کھلے گا جس سے دعا کی اہمیت اور افادیت ہم پر منکشف جاتی ہے۔ اسی لئے رحمت عالم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ہاں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز گرامی نہیں۔ (ترمذی)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ جو نفوس قدسیہ اس کے وہاں زیادہ بلندی پر فائز ہیں، ان کے لئے اس نے آزمائشیں بھی زیادہ سخت اور کٹھن مقرر کر رکھی ہیں۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ سخت آزمائشوں سے گزارا گیا تا آنکہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ نے سب سے زیادہ مشقتوں اور صعوبتوں سے دوچار کیا جیسا کہ ایک حدیث پاک میں آپ خود ارشاد فرماتے ہیں: 'مجھے اللہ کی راہ میں اس قدر ڈرایا گیا کہ کوئی اتنا نہیں ڈرایا جاتا' اور مجھے اس قدر ایذا پہنچائی گئی کہ کسی کو اس قدر ایذا نہیں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے خطاب فرمایا: تو تم صبر کرو جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لئے جلدی نہ کرو [احقاف-۳۵] چنانچہ رحمت عالم نے کمال صبر، کمال عفو ودرگزر اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور آپ کے لطیف وخبیر رب تعالیٰ نے بیشمار خیر وعافیت کی طلب اور طاغوتی قوت سے دفاع کے لئے قرآنی سورتیں اور آیات آپ کو عطا فرمائیں۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی تو حضور نے

فرمایا: توریت انجیل وزبور میں اس کی مثل کوئی سورت نازل ہوئی۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیات کے نزول پر فرشتہ آسمان سے نازل ہوا اور سلام کے بعد دو ایسے نوروں کی بشارت دی جو حضور سے پہلے کسی نبی کو عطا نہ ہوئے، ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرے سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں (مسلم) ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہیں۔ اسی طرح آپ کے کمال علم ومعرفت کی نسبت رَبِ زدنی علما آیت نازل ہوئی اور دفاعی باب میں معوذتین' آیت الکرسی اور قل ھو اللہ شریف وغیرہ کا نزول ہوا۔ ان کے علاوہ متعدد دعائیہ آیات سے آپ کو نوازا گیا اور بہ نظر شفقت ومحبت دیگر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی مخصوص دعائیں بھی آپ پر نازل فرمائی گئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ متخلق باللہ [اپنے رب کے اخلاق کریمہ پر چلنے والے] ہیں۔ اللہ نے اپنی صفت رافت ورحمت غیر متناہیہ میں سے حضور کو بھی متناہی [Extreme] صفت رافت ورحمت عطا فرمائیں اور آگاہ فرمایا: بالمومنین رؤف رحیـــــم مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان [سورۂ توبہ-۱۲۸] چنانچہ امت مرحومہ پر گزرنے والے مالی وبدنی نقصان، دشمن کا غلبہ وقتال، سیلاب وخشک سالی، شیطان ونفس کا غلبہ، وبا وبیماری جیسے آلام ومصائب میں رحمت ایزدی کو متوجہ کرنے اور امداد طلب کرنے کے لئے آپ نے اپنی امت کو بیشمار دعائیں تعلیم فرمائی ہیں جن کو کتب احادیث میں سے موتیوں کی طرح چُن چُن کر اسلاف محفوظ کر چکے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رحمت عالم کا قول، آپ کا فعل اور تقریر (کسی بات کو جاری رکھنا) خود اللہ ہی کی جانب سے ہیں: وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیی یوحی اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے [سورۂ نجم:۳-۴] اسی لئے رحمت عالم کی دعائیں بھی اقسام وحی سے ہیں جو درحقیقت اللہ کی جانب سے ہیں اور یقیناً بارگاہ الٰہی میں مقبول ہیں۔ مزید کرم بالائے کرم یہ کہ آپ نے امت کو یہ بھی تعلیم فرمایا کہ بارگاہ خداوندی میں دعا کے آداب کیا ہیں، وہ کون سے

خاص اوقات ہیں جن میں بندے کی دعا قبول ہوتی ہے وہ کون سی حالتیں ہیں جن میں قبولیت دعا کے زیادہ امکان ہیں وہ کون لوگ ہیں جن کی دعا مقبول ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں دعا کی فضیلت واہمیت سمجھا کر اس کے جذبۂ شوق کو ابھارا ہے۔

چنانچہ آپ کے ارشادات کا نچوڑ یہ ہے کہ: دعا ہی عبادت ہے، دعا عبادت کا مغز ہے، تقدیر کو دعا بدل سکتی ہے۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ بہت جلد قبول ہونے والی دعا وہ جو غائب (کسی دوسرے) غائب کے لئے کرے، قبول نہ کی جانے والی دعا وہ ہے جس میں سائل گناہ کی طلب کرے یا رشتہ دار سے قطع تعلق طلب کرے۔ اللہ کے نزدیک سب سے پیاری دعا وہ ہے جو عافیت کے لئے مانگی جائے۔ اللہ غافل اور لاپرواہ کی دعا قبول نہیں کرتا یعنی اللہ کو پکارنے کے بعد سائل قصد ومطالبہ میں سستی وغفلت یالاپرواہی برتے یا اظہار مقصد میں ناکام رہے۔ باپ کی دعا اپنی اولاد کے حق میں ایسی ہی مقبول ہے جیسی پیغمبر کی دعا اس کی امت کے حق میں مقبول ہے۔ وہ تین شخص ہیں جن کی دعائیں رد نہیں ہوتیں پہلا روزہ دار جب افطار کر رہا ہو، دوسرا انصاف پرور حاکم، تیسرا مظلوم (اگر چہ کافر ہو) حدیث شریف میں ہے کہ مظلوم کی دعا اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اُٹھا لیتا ہے، اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مجھے اپنی عزت کی قسم میں ضرور تیری مدد کروں گا اگر چہ کچھ دیر بعد سہی (ترمذی) جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے (ترمذی)۔

آداب دعا یہ ہیں: ہاتھوں کو پھیلانا، قبلہ رخ ہونا، باوضو ہونا، دل کی گہرائیوں سے الفاظ نکالنا، دل کو حاضر رکھنا، قبولیت کی اچھی امید رکھنا، کم از کم تین بار دعا مانگنا ، دعا سے فراغت کے بعد دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا، قبولیت میں جلدی نہ کرنا، وسیلہ اختیار کرنا، کھانے پینے لباس اور کاروبار میں حرام سے بچنا، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا، اس کے بعد دعا کرنا اور آخر میں پھر درود پڑھنا [معجم طبرانی]۔

اوقات قبولیت یہ ہیں: لیلۃ القدر، یوم عرفہ رمضان المبارک کا مہینہ جمعہ کا دن، رات کا دوسرا نصف، رات کا پہلا نصف، وقت سحر، جن حالتوں میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ وہ یہ ہیں: اذان کے وقت، اذان اور اقامت کے دوران، ختم قرآن کے بعد، آب زمزم پیتے وقت، خانہ کعبہ کے پاس حاضر ہوتے وقت، بارش برستے وقت مسلمانوں کے اجتماع میں۔

قبولیت دعا کی قوی امید رکھنے سے پہلے ضروری یہ ہے کہ ضروریات اہل سنت کی پیروی کرے اور شریعت کی پیروی بھی لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بدعتی وبد مذہب کا کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں فرماتا [ابن ماجہ] اسی طرح شریعت کی عدم پیروی سائل کو دعا کی قبولیت سے محروم کرسکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: جب کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں، سو یہ بھی میرا حکم مانا کریں [بقرہ۔۱۸۶]۔ پھر بھی دعا اسی وقت قبول ہوتی ہے جب وہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہو [حدیث]

دس سنہری درس:

(۱) جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا کسی انسان کی طرف کوئی حاجت ہو تو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز حاجت پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے، بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیہ درود اور وہ کلمات پڑھے جو ترمذی اور سنن نسائی میں منقول ہیں۔

(۲) اللہ کی جانب پوری طرح متوجہ ہو کر خشوع وخضوع کے ساتھ دعا شروع کرے۔ سرکار ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔ جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں [ابویعلیٰ]

(۳) ہمیں کثرت سے دعا مانگنی چاہیے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے: اللہ تین

چیزوں میں سے ایک عطا فرماتا ہے۔: یا تو فوراً اس کی دعا قبول کر لیتا ہے یا اس کو آخرت میں اجر عطا فرما دیتا ہے یا اس سے اتنی مصیبت دور کر دیتا ہے [مسند امام احمد]

(۴) دعا پہلے اپنے لئے مانگے پھر دوسرے مومنین کے لئے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جب کوئی شخص اپنے بھائی کے لئے پس پشت دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں آمین! اللہ تجھے بھی اس کے مثل عطا کرے۔ [بزار]

(۵) بعض مقتدی امام کی دعا سے پہلے ہی اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ دعا کی عادت ڈالنی چاہیے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو مصیبت میں دعا کا قبول ہونا پسند ہو، وہ راحت میں، اللہ سے بکثرت دعا کرے [ترمذی]

(۶) بلاشبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم وسیع علم رکھنے والے اور اللہ کی جانب سے معارف عالیہ کثیر ووافر مقدار میں عطا کئے جانے والے تھے۔ اللہ نے آپ کو کمال فصاحت وبلاغت سے نوازا تھا۔ آپ نے خود ہی فرمایا: مجھ کو ہی جامع اور اوّلین وآخرین کلمات دئے گئے [مسند امام احمد] دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے برسر منبر فرمایا: اے لوگو! مجھے مکمل وجامع کلمات اور کلام میں اختصار عطا کیا گیا۔ آپ کو آسان ترین الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب بیان کرنے کا ملکہ عطا فرمایا گیا۔ چنانچہ آپ سے منقول دعائیں اختیار کرنا ہمارے لئے بہتر ہے کہ یہ کلمات بارگاہ الٰہی میں مقبول بھی ہیں۔ مثلاً یہ دعا: اے اللہ میری خطاؤں کو برف اور اولوں کے پانی سے دھوڈال اور نادانستہ گناہوں سے مجھے اس طرح پاک کر دے جس طرح سفید کپڑے کو میل سے پاک کرتا ہے اور مجھے گناہوں سے اتنا دور رکھ جتنا مشرق اور مغرب میں فاصلہ ہے (بخاری۔مسلم) اور یہ دعا:

اے اللہ ہمیں زیادہ دے اور کمی نہ کر، ہمیں باعزت بنا اور ذلیل نہ کر، ہمیں محروم نہ کر، ہمیں برتری دے اور ہم پر کسی دوسرے کو برتر نہ کر، ہمیں راضی رکھ اور ہم سے راضی ہو [ترمذی سنن نسائی] بارش کے لیے دعا: اے اللہ ہم پر ایسی بارش نازل فرما جو فریاد کا مداوا ہو، خوشگوار ہو اور نفع بخش ہو، ضرر پہنچانے والی نہ ہو، جلد برسنے والی ہو، دیر لگانے والی نہ ہو [سنن ابوداؤد] اور بارش سے نقصان پر: اے اللہ ہمارے اردگرد ہو اور ہمارے اوپر نہ (ہو) یا اللہ! ٹیلوں قلعوں پہاڑوں نالوں اور درختوں کے اُگنے کی جگہ (بارش فرما) [بخاری، مسلم] خوف دشمن کے وقت: اے اللہ! ہم تجھے ان کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں [ابوداؤد] دشمن کے گھیرے سے نکلنے کی دعا: اے اللہ ہماری پردہ پوشی فرما اور ہمیں عافیت وامن میں رکھ۔ [مسند امام احمد] عربی زبان میں ان دعاؤں کو ادا کرنا بہتر ہے۔

(۷) بزرگ ومتبرک مقامات قبولیت دعا کے لئے تریاق ہیں جیسا کہ قرآنی آیات سے ثابت ہے۔ قرون اُولیٰ میں اسلاف کا یہی معمول رہا ہے۔ اسی لئے صالحین کا دستور رہا ہے کہ انبیاء، اولیاء کے موالد ومزارات پر حاضر ہو کر استغفار بجالاتے ہیں۔ عرس وزیارت میں بھی یہ فائدہ متصور ہے کہ کثرت تلاوت قرآن وذکر سے قبور مزارات پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے حاجت کے وقت قبولیت کے لئے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جاکر دعا کرنا منقول ہے۔

(۸) جب دعا مانگے تو یہ نہ مانگے کہ میرے رب بس بس مجھے اتنا ہی عطا کرے دے بلکہ وسعت اختیار کرے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم تمنا کرو تو زیادہ تمنا کرو، کیوں کہ اپنے رب عزوجل سے سوال کر رہے ہو [معجم اوسط] اور دعا میں اختیاری طرز تخاطب اختیار نہ کرے کہ سرکار نے فرمایا: تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یوں

نہ کہے الٰہی اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے تو مجھے روزی دے بلکہ پورے عزم کے ساتھ مانگے کیونکہ رب تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا [بخاری]۔

(۹) دعا کے لئے سن رسیدہ باعمل شخص کا انتخاب کرنا چاہیے کہ رحمت عالم نے فرمایا: جو بوڑھا مسلمان ہدایت یافتہ ہو اور سنت کا پابند ہو، اللہ تعالیٰ اس سے حیا فرماتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے اور اللہ تعالیٰ اس کو نہ دے۔قبولیت دعا پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس کی عزت اور جلال کے واسطے سے تمام نیک کام پورے ہوتے ہیں [صحیح مستدرک للحاکم]

(۱۰) جب کلفتیں اور مصائب وآلام چاروں طرف سے گھیر لیں اور کوئی روشن راستہ نظر نہ آرہا ہو تب ہمیں چاہیے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا بار بار مطالعہ کریں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میری مصیبتوں کو یاد کرکے مسلمانوں کی تمام مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں [مؤطا امام مالك]

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ مسلمان چاہے کہیں ہو اور کسی بھی حال میں ہو اپنے پروردگار جل جلالہٗ سے دعا ومناجات میں مشغول رہے۔ اگر اسے نفع وخیر حاصل ہو تو من جانب اللہ سمجھے اور اگر کوئی ضرر ونقصان پہنچے تو اسے اپنی شامت اعمال تصور کرے۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذائیں

ن.ق.ش.(لاہور)

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے ذریعہ عظمت ونجات ہے۔آپ کی تعلیم اس قدر کامل ومکمل ہے کہ اس سے صحت منداور لذیذ غذاؤں تک کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے اور ان کو استعمال کر کے ظاہری ومادی فائدے کے علاوہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ادائیگی کا ثواب بھی نصیب ہوسکتا ہے۔ وہ مسلمان بڑا ہی خوش نصیب ہے جو کسی چیز کو اس لئے پسند کرے کہ وہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی۔اس طرح اس چیز کا استعمال عبادت اور ذریعہ ثواب بن جاتا ہے۔

شہد:

عربی میں شہد کی مکھی کو نحل کہتے ہیں۔قرآن کریم کی ایک سورۃ کا نام نحل ہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہوئے شہد کی مکھی اور شہد کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ارشاد فرمایا ہے:

''اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں اور چھتوں میں، پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھا اور اپنے رب کی راہیں چل جو تیرے لئے نرم اور آسان ہیں۔اس کے پیٹ سے ایک چیز پینے کی رنگ برنگ نکلتی ہے جس میں لوگوں کے لئے تندرستی ہے۔بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور کریں۔'' (آیت نمبر ۶۸۔۶۹)

قابلِ غور ہے یہ آیت کہ کس طرح ایک مکھی پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور جب وہ اس کے پیٹ میں رہ کر باہر آتا ہے تو میٹھا لذیذ بھی ہوتا ہے اور صحت بخش بھی۔ خدا کی پیدا کردہ اس لذیذ مفید نعمت کی اہمیت، افادیت اور لذت کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مزید کیا جاسکتا ہے: دو چیزوں سے صحت حاصل کرو شہد اور قرآن کریم سے۔

اس حدیث میں شہد کو صحت بخش ہونے کے ساتھ قرآن کریم کو بھی ذریعہ صحت فرمایا گیا۔ کیوں کہ شہد تو جسمانی امراض کو ختم کرنے اور جسم کو صحت یاب کرنے والی ایک غذا ہے اور قرآن کریم روحانی امراض کو ختم کرنے اور روح کو جلا بخشنے والی کتاب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ہم اتارتے ہیں قرآن میں وہ چیز جو ایمان والوں کے لئے شفا اور صحت و رحمۃ المومنین ہے۔ (۸۲/۱۷)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے بھائی کے پیٹ میں درد ہے یا اس نے کہا کہ میرے بھائی کو اسہال (دستوں) کی شکایت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے شہد پلادو۔

وہ شخص چلا گیا اور پھر واپس آ کر عرض کرنے لگا کہ میں نے شہد پلایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر شہد ہی پلانے کا حکم دیا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ جب وہ چوتھی مرتبہ خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔

اس ارشاد کو سن کر وہ شخص چلا گیا اور پھر شہد پلایا اور وہ صحت یاب ہوگیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق شہد کی افادیت پر کس قدر یقین تھا۔ مریض گھبرایا مگر آپ شہد ہی پلواتے رہے اور آخر کار اللہ کا ارشاد سچ ہوا اور مرض ختم ہوگیا۔ شہد کی یہ تاثیر آج بھی باقی ہے شرط یہ ہے کہ شہد بھی اصلی ہو اور مسلمان بھی اصلی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص ہر مہینے تین دن شہد چاٹ لے تو اسے کوئی بڑی تکلیف نہیں ہوگی۔ یعنی شہد کا استعمال صحت کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کو طبی تحقیق نے بھی ثابت کیا اور اطبا نے تسلیم کیا کہ شہد بہت سی بیماریوں کی دوا ہے مثلاً جسم اور خاص طور پر پھیپھڑوں کے لئے قوت بخش ہے۔ قلب کے لیے فرحت بخش ہے۔ کھانسی دمہ اور ٹھنڈ سے ہونے والی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ لقوہ اور فالج کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ خون کو صاف کرتا ہے اگر سرمہ کی طرح آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کی بیماری سے بچاتا اور نظر کی حفاظت کرتا ہے۔ غرض کہ بے شمار امراض کا علاج ہے۔

کھجور: کھجور ایک بہترین میوہ بھی ہے اور غذا بھی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے۔ سورہ رحمٰن کی دسویں آیت میں اس طرح فرمایا گیا: اس میں میوے ہیں اور غلاف والی کھجوریں۔

میووں کے تذکرے کے بعد خاص طور پر نخل (کھجور) کا ذکر اس کی افادیت و اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جس کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہوتی ہے:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص روزانہ صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیا کرے، اسے اس دن زہر اور جادو سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

کھجور کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم عجوہ ہے جو درمیانہ سائز کی ہوتی ہے اور اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ یوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کھجور کو پسند فرمایا ہے لیکن عجوہ کی خاص طور پر افادیت بیان فرمائی اور اس کو بہت سے امراض کا علاج بتایا جیسا کہ اسی حدیث میں فرمایا گیا جو روزانہ صبح سات عجوہ استعمال کرے وہ دن بھر زہر اور جادو کے اثر سے بچا رہے گا۔ غور فرمایئے، زہر اور جادو کس قدر تکلیف دہ چیزیں ہیں اور اس کا اعلان کتنا معمولی سا ہے۔ اس عجوہ کے

بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور عجوہ جنت کا پھل ہے اس میں زہر سے شفاء دینے کی تاثیر ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر اپنا نورانی ہاتھ رکھا، مجھے اس کی ٹھنڈک دل تک محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہیں دل کی تکلیف ہے، تم حارث بن کلیدہ ثقفی کے پاس جاؤ کیونکہ وہ طبیب ہے۔'' اسے چاہیے کہ مدینہ کی عجوہ کھجور کے سات دانے لے کر انہیں گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہارے منہ میں ڈال دے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ تازہ کھجوریں اور ککڑی ایک ساتھ تناول فرماتے تھے۔ کھجور اور ککڑی کا استعمال صرف ایک اتفاق نہ تھا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس عمل سے کھجور کی گرم تاثیر اور ککڑی کی سرد تاثیر کو ختم کرنے کا طریقہ سکھایا۔ یا اس مقصد کے لئے آپ کا ایک دوسرا عمل یہ تھا کہ آپ تربوز تازہ کھجور کے ساتھ کھاتے تھے اور فرماتے تھے: یہ تربوز گرمی کو ختم کرتا اور کھجور سردی کو دور کرتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحت کا کس قدر خیال فرماتے تھے، اور مفید غذاؤں کے استعمال کا کس طرح طریقہ تعلیم فرماتے تھے۔

بسر سلمی کی بیٹی عطیہ اور بیٹے عبداللہ نے بیان کیا کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکھن اور تازہ کھجوریں پیش کیں اور آپ مکھن و کھجور کو پسند فرماتے تھے۔

تمر خشک کھجور کو کہا جاتا ہے، جو مکھن کے ساتھ واقعی بہت لذیذ بھی ہوتی ہے اور مکھن اس کی گرم و خشک تاثیر کو ختم کر دیتا ہے غرض کہ کھجور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذا تھی۔ اب امت کے لیے اس کا استعمال فائدے کے علاوہ ذریعۂ ثواب بھی ہے۔

گوشت:

گوشت صحت وقوت کے لئے ایک نہایت ہی مفید غذا ہے۔ مسلمانوں کے لیے جن جانوروں کا گوشت حلال کیا گیا وہ اس کو نہ صرف بطور غذا استعمال کرتے ہیں بلکہ بڑے شوق اور میلان طبع سے استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ بھی خیال کر لیا جائے کہ اس مرغوب غذا کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور عمل کیا ہے تو پھر اس کا استعمال سنت نبوی پر عمل بھی ہوگا۔ لہٰذا اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱- حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا والوں اور جنت والوں دونوں کے کھانوں کا سردار گوشت ہے۔

۲- حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا اور آخرت میں بہترین سالن گوشت ہے۔

سب حصوں کا گوشت مزے میں برابر نہیں ہوتا بلکہ سر، پائے، سینہ، ران وغیرہ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ مزا ہوتا ہے۔ جو جس کو پسند ہوتا ہے، وہ اس حصہ کو استعمال کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض حصوں کا گوشت خاص طور پر پسند تھا جو ان چند احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت لایا گیا۔ اس میں سے دست آپ کو دیا گیا کیونکہ آپ دست کو پسند فرماتے تھے۔ لہٰذا آپ نے اسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

۲- حضرت ضیاء بنت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ ہم نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا کہ اس میں سے ہمارا حصہ بھیج دیں۔ میں نے عرض کیا صرف گردن کا گوشت بچا ہے جو آپ کے لیے بھیجتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے کھلا بھیجا۔ یہی بھیج دو کیوں کہ گردن کا گوشت بکری کا عمدہ حصہ ہے۔ گردن کا گوشت خیر سے قریب اور نقصان سے بعید تر ہے۔

۳- ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا: کاندھے کا گوشت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھا۔

۴- حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کاندھے کا گوشت پسند فرماتے تھے۔

۵- حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: پاکیزہ گوشت پیٹھ کا ہے۔

۶- حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھنی ہوئی ران لے گئیں آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔

۷- حضرت عبداللہ ابن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھایا۔

۸- حضرت مغیرہ بن شیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا میں ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوا۔ گھر والے نے بکری ذبح کی تو آپ نے دست بھوننے کی فرمائش کی، جو آپ کے سامنے لایا گیا پھر آپ نے چھری لی اور اس سے میرے لئے دست میں سے کاٹنے لگے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت بہت پسند تھا اور خاص طور سے ران، دست، گردن، پیٹھ، کاندھے کا گوشت وہ بھی بھنا ہوا پسندیدہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بہترین شوق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائے تو بہترین غذا اور لذیذ کھانے بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن لذیذ کھانوں کے حاصل کرنے کے لئے حرام و ناجائز طریقے اختیار کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کو اگر روکھی سوکھی روٹی ملے تو بھی خدا کا شکر ادا کر کے کھائے اور خوش رہے اور اگر بہترین غذائیں میسر ہوں تو ان

کو بھی استعمال کر کے خدا کا شکر ادا کرے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا کہ آپ کئی کئی دن بھوکے رہتے تھے۔ معمولی کھانا ملتا تو بھی خوش ہو کر کھا لیتے اور جب عمدہ کھانے میسر ہوتے تو ان کو بھی خوش ہو کر استعمال کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پرندوں کا گوشت استعمال کرنا بھی ثابت ہے:

۱- حضرت زید الجری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغ کا گوشت کھاتے دیکھا۔

۲- حضرت ابراہیم ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ان کے دادا حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرخاب کا گوشت کھایا۔

۳- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے بمقام مرالظہر ان ایک خرگوش کو اس کے بل سے نکالا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک گئے مگر میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لائے۔ انہوں نے اسے ذبح کر کے اس کے دست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیئے آپ نے اسے قبول کر لیا اور بھنوانے کے بعد اس میں سے کچھ تناول فرمایا۔

کدّو:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبزیوں میں سب سے زیادہ کدّو (لوکی) پسند تھا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک درزی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ کھانے میں جو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا۔ شوربہ میں کدو اور گوشت تھا۔ میں نے دیکھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیالے کے کناروں سے کدّو کے ٹکڑے تلاش کر کے نکال لیتے اور تناول فرماتے تھے۔ اس دن سے ہی میں کدّو کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔

ثرید وحلوہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثرید وحلوہ بھی پسند تھا۔ ثرید ایک تو اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو شوربے یا پتلی دال میں روٹی بھگو کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نرم جلد ہضم ہونے والا کھانا ہے۔ اس کو اللہ کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے تھے۔ ثرید کی ایک دوسری قسم بھی ہے جو میٹھی ہوتی ہے، اس کو حلوہ کہا جاتا ہے۔ یہ ستو میں کھجور خشک، دودھ اور گھی ملا کر مالیدے کی طرح بنایا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں ہی قسم کا ثرید پسند تھا جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا: روٹی سے تیار کیا ہوا اور ستو سے تیار کیا ہوا۔ خاص طور پر حلوہ کی پسندیدگی کا ذکر بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: حضور علیہ السلام حلوے اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

سالن روٹی:

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے اہل خاندان سے دریافت فرمایا کہ کوئی سالن ہے تو عرض کیا گیا گھر میں سرکہ کے سوا کچھ نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی منگایا اور اسی سے کھانا تناول فرمانا شروع کر دیا۔ آپ کھاتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: سرکہ کتنا اچھا سالن ہے، سرکہ کتنا اچھا سالن ہے۔

حضرت یوسف ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھ کر فرمایا: یہ ہے سالن یہ ہے سالن۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہانڈی کی کھرچن کو پسند فرماتے تھے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھنے ہوئے

گوشت، لوکی، شہد اور حلوہ جیسی نفیس غذائیں پسند فرمائیں، اس کی شان یہ بھی تھی کہ جب انہیں سالن کی جگہ سرکہ، حلوے کی جگہ کھجور اور جو کی روٹی کا ٹکڑا اور ہانڈی کی کھرچن میسر ہوتی تو وہ اس کو بھی پسند فرما کر رزاقِ حقیقی کا شکر ادا کرتے اور اس پر بھی خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ درحقیقت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح انسانیت کے دونوں طبقوں، دولتمندوں اور غریبوں کو سہارا عطا فرمایا کہ اگر گوشت والے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ادا کرنے کا ثواب پائیں تو سرکہ چٹنی اور روٹی پر زندگی بسر کرنے والے بھی یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیں کہ یہ معمولی کھانے صرف انہیں کی تقدیر میں نہیں بلکہ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پسند فرمایا اور خوش ہو کر استعمال فرمایا۔ ان کا اگر مزید حال معلوم کرنا ہے تو حضرت مالک بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس بیان سے اندازہ کیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے اجتماع کے کبھی نہ روٹی سیر ہو کر کھائی اور نہ کبھی گوشت پیٹ بھر کے کھایا۔

یعنی جب کوئی اجتماع ہوتا دعوت وغیرہ ہوتی تب تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو کر کھانا تناول فرما لیا کرتے تھے۔ ورنہ حال یہ تھا کہ حضرت مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ایک مرتبہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا اور کہنے لگیں: میں جب کبھی کھانا سیر ہو کر کھاتی ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ حضرت مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: ایسا کیوں ہوتا ہے تو فرمایا مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے جب خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دن دو مرتبہ روٹی اور گوشت پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

دودھ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ بھی بہت پسند تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر بکری کا دودھ استعمال کیا اور گائے کا بھی استعمال کیا۔ گائے کے دودھ کے

متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد بھی موجود ہے۔ جس کو حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تم گائے کا دودھ استعمال کرو کیونکہ اس میں شفا ہے اور اس کے گھی میں دوا کی تاثیر ہے اور اس کے گوشت میں بیماری ہے۔ یعنی گائے کا دودھ اور مکھن نہایت ہی مفید اور مقوی ہیں، لیکن حضور علیہ السلام نے اس کا گوشت پسند نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح بکری کا گوشت کھانا سنت ہے اسی طرح گائے کے گوشت سے بچنے کی کوشش کرنا بھی جائز ہے۔ بہر حال حدیث میں گائے کے گوشت کی حرمت نہیں بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے، ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے لئے گائے ذبح فرمائی اور دوسری حدیث میں ہے کہ ازواج مطہرات کی طرف سے حج میں گائے ذبح فرمائی۔

مذکورہ احادیث سے جہاں نبی کریم رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذاؤں کا پتہ چلا وہیں کھانے کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ہر قسم کی حلال طیب غذاؤں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے چاہے وہ بکری اور مرغی کا گوشت جیسی اعلیٰ اور گرانقدر غذا ہو یا کھجور اور جو کی روٹی جیسی معمولی غذا ہو۔ بس یہ خیال ضرور کرنا چاہیے کہ عمدہ کھانے ملنے پر غرور وتکبر نہ کیا جائے۔ بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور معمولی کھانا نصیب ہونے پر ناشکری نہ کی جائے بلکہ اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ اعلیٰ نعمتوں پر شکر ادا کرنے سے وہ نعمتیں جاری رہتی ہیں اور معمولی نعمتوں پر شکر ادا کرنا ان نعمتوں کے اعلیٰ ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ [بشکریہ نقوش لاہور، رسول نمبر]

سلام بہ حضور سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضور صاحب البرکات سید شاہ برکت اللہ عشقی قدس سرہٗ

یَا شَفِیْعَ الْوَرٰی سَلَامٌ عَلَیْك — یَا نَبِیَّ الْھُدٰی سَلَامٌ عَلَیْك
خَاتَمَ الْاَنْبِیَاء سَلَامٌ عَلَیْك — سَیِّدَ الْاَصْفِیَاء سَلَامٌ عَلَیْك
جِئْتُ یَا مُصْطَفٰی سَلَامٌ عَلَیْك — لَكَ اَھْلِیْ فِدَا سَلَامٌ عَلَیْك
اَعْظَمَ الْخَلْقِ اَشْرَفَ الشُّرَفَا — اَفْضَلَ الْاَزْکِیَا سَلَامٌ عَلَیْك
طَلَعَتْ مِنْكَ کَوْکَبُ الْعِرْفَان — اَنْتَ شَمْسُ الضُّحٰی سَلَامٌ عَلَیْك
کُشِفَتْ مِنْكَ ظُلْمَۃُ الظُّلَمَا — اَنْتَ بَدْرُ الدُّجٰی سَلَامٌ عَلَیْك
وَاجِبٌ حُبُّكَ عَلَی الْمَخْلُوْق — یَا حَبِیْبَ الْعُلٰی سَلَامٌ عَلَیْك
مَطْلَبِیْ یَا حَبِیْبِیْ لَیْسَ سِوَاك — اَنْتَ مَطْلُوْبُنَا سَلَامٌ عَلَیْك
مَقْصَدِیْ یَا حَبِیْبِیْ لَیْسَ سِوَاك — اَنْتَ مَقْصُوْدُنَا سَلَامٌ عَلَیْك
اِنَّكَ مَقْصَدِیْ وَ مَلْجَائِیْ — اِنَّكَ الْمُدَّعَا سَلَامٌ عَلَیْك
سَیِّدِیْ یَا حَبِیْبِیْ مَوْلَائِیْ — لَكَ رُوْحِیْ فِدَا سَلَامٌ عَلَیْك
مَھْبَطُ الْوَحْیِ مَنْزِلُ الْقُرْاٰن — صَاحِبُ الْاِھْتِدَا سَلَامٌ عَلَیْك

ھٰذَا قَوْلُ غُلَامِكَ الْعِشْقِیْ
مِنْہُ یَا مُصْطَفٰی سَلَامٌ عَلَیْك